www.idaraghufran.org

نام کتاب: علمی و تحقیقی رسائل (جلد13)

مصنّف: مفتی محمد رضوان خان

طباعتِ اوّل: ذوالقعدۃ1441ھ - جولائی2020ء

صفحات: 640

ملنے کے پتے

رسائل کی اجمالی فہرست

تفصیلی فہرست رسالہ اول

(محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائد وافکار)

تفصیلی فہرست رسالہ دوم

(قیامِ رمضان وباجماعت نوافل کی تحقیق)

مضامین	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

’’مجلسِ فقہی‘‘ ادارہ غفران، راولپنڈی

مولانا مفتی محمد رضوان خان صاحب حفظہ اللہ (مدیر: ادارہ غفران، راولپنڈی) کے علمی وتحقیقی رسائل کی تیرہویں جلد بحمداللہ تعالیٰ، تیار ہوکر، تدوین، تحقیق، مراجعت اور کتابت وغیرہ کے جملہ متعلقہ مراحل سے گزر کر اشاعت کے مرحلہ میں داخل ہورہی ہے۔

علمی وتحقیقی رسائل کی اشاعت کا یہ سلسلہ پہلی جلد سے شروع ہوکر الحمدللہ تعالیٰ، بتوفیقِ الٰہی تیرہویں جلد کی اشاعت تک پہنچ چکا ہے۔

تیرہویں جلد میں مندرجہ ذیل دو تحقیقی رسائل شامل ہیں:

(1)...محمد بن عبدالوھاب نجدی کے عقائد وافکار

(2)...قیامِ رمضان وباجماعت نوافل کی تحقیق

مزید کئی جلدوں کے رسائل پر بھی بحمداللہ تعالیٰ مختلف جہات سے کام جاری ہے، اور بحمداللہ تعالیٰ کئی رسائل پر بڑی حد تک کام ہوچکا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بعافیت واستقامت اس سلسلہ کو حسبِ مراد انجام دینے کی توفیق عطاء فرمائے۔آمین۔

اراکینِ مجلس ادارہ غفران نے اس جلد کے رسائل ومقالات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور مفید مشورے اور قابلِ اصلاح امور کی نشاندہی کی، اس طرح اراکینِ مجلس کی نظرِ ثانی اور جزوی اصلاح وترمیم کے بعد اس جلد کے رسائل ومقالات بھی الحمدللہ تعالیٰ حتمی شکل میں منقّح ہوئے۔

اراکینِ مجلس نے مفتی محمد رضوان صاحب دامت برکاتہم کے ان رسائل کو حسبِ سابق

تعصب سے بالاتر ہوکر معتدل تحقیق پر مبنی اور وقت کے اہم موضوع سے متعلق محسوس کیا۔

دعاء ہے کہ یہ مجموعہ، اللہ کی بارگاہ میں قبول ومنظور ہو، اور بطورِ خاص علمی وفقہی دنیا میں امتِ مسلمہ کی دنیا وآخرت کی صلاح وفلاح اور افراط وتفریط سے حفاظت اور اعتدال کے قائم ہونے کا باعث ہو، اور غلط فہمی، لاعلمی یا تعصب کی بناء پر جو مسلمانوں میں باہمی اختلافات اور دوریاں پیدا ہوگئی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کاوِش کے ذریعے ان دوریوں کو ختم فرمائے، اور جملہ اراکینِ مجلسِ فقہی کے لیے مغفرت اور ترقی درجات کا ذریعہ بنے۔ آمین۔

اسمائے گرامی: اراکینِ مجلسِ فقہی، ادارہ غفران

(1)......مفتی محمد رضوان صاحب (صدر مجلس)

(2)......مفتی محمد یونس صاحب (نائب صدر)

(3)......مولانا طلحہ مدثر صاحب (ناظم)

(4)......مولانا محمد ناصر صاحب (رکن)

(5)......مولانا طارق محمود صاحب (رکن)

(6)......مولانا عبدالسلام صاحب (رکن)

(7)......مولانا غلام بلال صاحب (رکن)

(8)......مولانا محمد ریحان صاحب (رکن)

(9)......مولانا شعیب احمد صاحب (رکن)

23 / جمادی الاخریٰ / 1441ھ 18 / فروری / 2020ء بروز منگل

ادارہ غفران، چاہ سلطان، راولپنڈی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی وتحقیقی سلسلہ

محمد بن عبدُالوھاب نجدی

کے عقائدوافکار

عرب کے شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور سلاطین آلِ سعود کا تعارف

وھابیہ ونجدیہ اور ائمہ حرمین شریفین کے عقائدوافکار

وھابیہ ونجدیہ پر وارد شدہ مختلف اعتراضات وشبہات کا علمی وتحقیقی جائزہ

اس سلسلہ میں علمی، فقہی واجتہادی اختلاف کی حقیقت

متأول وبدعتی کی تکفیر کا حکم

مشائخِ دیوبند کے وھابیہ ونجدیہ سے اختلاف کی نوعیت

اس سلسلہ میں طرفین کے معتدل موقف کی تعیین وتوضیح

مصنِّف

مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

فہرست

(فصل نمبر 1)

حلف بغیر اللہ اور سجود لغیر اللہ کا مسئلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(از مؤلف)

آج کل ہمارے معاشرہ میں عجیب صورتِ حال ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ شرک اور دین میں بدعات جیسی گمراہی کی چیزوں کے اختیار کرنے سے منع کرے، توحید وسنت کے مطابق شرعی احکام ادا کرنے کی ترغیب دے، غیرُ اللہ کے نام کی گیارہویں اور قبروں پر عرس وغیرہ کی شکل میں ہونے والے شرک وبدعات پر مشتمل گناہوں کو شریعت کے خلاف قرار دے، یا جو شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ، نبیوں اور بزرگوں کو اللہ کی صفتِ حاجت روائی میں شریک سمجھنے سے انکار کرے، اللہ ہی کو تمام مشکلات میں حاجت روا سمجھے اور ہر مصیبت میں صرف اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ومدد طلب کرنے اور پکارنے کا اہتمام کرے، اور نبیوں کو اللہ تعالیٰ کے بعد اور بزرگوں اور پیروں کو نبیوں کے بعد درجہ دے۔

اسی طرح جو شخص شادی بیاہ میں ڈھول، بینڈ باجا بجوانے، ناچ رنگ کروانے، موسیقی، آتش بازی اور فائرنگ کرنے اور پٹاخے چھڑوانے سے منع کرے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق شادی بیاہ کو انجام دینے کی ترغیب دے، یا عرسوں، زیارتوں اور تعزیوں وغیرہ میں خواتین کو جوق در جوق اور بے محابا بن سنور کر جانے کی اجازت نہ دے، یا جو شخص زیارتوں اور بزرگوں کے مزاروں پر تھال طباق، اور ڈھول ڈھماکوں، قوالیوں اور ناچ گانا اور چراغاں وغیرہ کرانے کو غلط کہے، اور قبروں پر شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ پر ہی جانے کا حکم کرے، یا تعزیوں پر مہندی، علَم اور دوسری چیزیں، اور قبروں اور زیارتوں پر جھنڈے، چادر رومال وغیرہ چڑھانے کو یا کسی پیر کی فاتحہ میں مروّجہ کھانا، دال کچوری، پراٹھے، انڈا مرغ، اور برف وشربت وغیرہ کے مخصوص کردینے اور کھانے پینے کی چیزیں سامنے رکھ کر ختم

پڑھانے کو نوا یجاد عمل بتائے، یا جو عاشوراء اور محرم میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ وغیرہ کے نام کی مخصوص عقیدے کے مطابق سبیل لگانے اور دوسری قسم کے فاتحہ کے مخصوص کھانے کو غیر ثابت کہے، اور سنت سے ثابت شدہ احکام کے مطابق سادہ طریقے پر ایصالِ ثواب کرنے کی تلقین کرے، یا جو شخص نامحرَم عورتوں سے بزرگوں اور پیروں کی خدمت کرنے اور پیروں کے عورتوں کے پاس بے پردہ جانے کو اور عورتوں کے بے پردہ پیر صاحب کی خدمت کرنے کو عیب قرار دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواتین سے پردہ کرنے کے مطابق برتاؤ کرنے کی تاکید کرے، یا کسی نمائشی پیر جی کی مجلسِ سماع میں ڈھولک کی تال پر وجد کرنے اور قوال کی تال پر مسرور اور بے خود ہو جانے کی نمائش اور ریاء کاری کرنے سے منع کرے، یا جو شخص بچوں کے پیدا ہونے یا شادی بیاہ اور خوشی کے موقع پر مختلف قسم کی شریعت کے خلاف رسمیں ادا کرنے سے روکے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سنت طریقہ کو اختیار کرنے کا حکم کرے، یا کسی بزرگ، پیر کے نام کا چولہا، چراغ جلانے، شاہ مدار کی بدھی چوٹی کی رسم ادا کرنے اور میاں کی کڑاہی اور شیخ سدو یا کسی دوسرے بزرگ کے نام پر بکرا ذبح کرنے کو شریعت کے خلاف قرار دے، اور اس کے مقابلہ میں شرعی طریقہ پر صدقہ خیرات کرنے اور اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنے کو بتلائے، یا کسی کے مرے پیچھے اس کے لئے تیجا، چالیسواں، سالانہ اور فاتحہ وغیرہ کر کے ذات برادری اور عزیز واقارب اور امیر وغریب کو دعوت کا سماں بنا کر کھانا کھلانے سے منع کرے، اور رسموں تاریخوں اور دنوں اور مختلف چیزوں کی پابندیوں کو چھوڑ کر شرعی طریقہ پر اور سادہ وغیر رسمی انداز میں اخلاص کے ساتھ ایصالِ ثواب کرنے کا حکم دے، یا جو عاشوراء اور محرم میں تاشوں باجوں کے ساتھ بڑے بڑے جلوس نکالنے اور ماتم ونوحہ کرنے اور سینہ کوبی اور زنجیر زنی کرنے کو ناجائز قرار دے، یا جو شبِ برائت کی آتش بازی کرنے اور اسی قسم کی بہت سی رسموں میں پیسہ ومال خرچ وضائع کرنے کو برا بتائے، اور اس پیسے ومال کو شریعت وسنت کے مطابق اللہ کے راستے میں خرچ اور صدقہ وخیرات کرنے

کا حکم لگائے۔

اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے والے پر فوراً ''وہابی'' ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں مذہبِ اسلام میں تو جائز ہیں، منع نہیں ہیں، مگر یہ شخص ان چیزوں سے وہابی ہونے کی وجہ سے منع کرتا ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیزیں تو مذہبِ اسلام اور شریعتِ محمدیہ میں ہی جائز نہیں، اور بلکہ خود حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی جائز نہیں، جن کو ''بڑا پیر'' اور غوثِ اعظم وغیرہ قرار دے کر ان کے نام سے بعض اہم اور بڑی بدعات ومنکرات کو اختیار کیا جاتا ہے، کیونکہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ، دراصل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے فقہ سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے بھی توحید وسنت کی دعوت دی ہے اور شرک وبدعات سے منع کیا ہے، اس طرح تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو بھی وہابی کہنا پڑے گا۔

پھر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شروع میں وہابی کا لقب شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین کے لئے استعمال ہوتا تھا، اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، عرب کے مشہور علاقۂ نجد سے تعلق رکھتے تھے، جو بارہویں صدی ہجری میں ایک موحد ومخلص عالمِ دین گزرے ہیں، ان کا تعلق حنبلی فقہ سے تھا، جس طرح سے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا تعلق بھی حنبلی فقہ سے تھا، اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مزاج میں شرک وبدعات اور منکرات کے خلاف دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں کچھ سختی تھی، لیکن وہ سختی دین کی وجہ سے تھی، اور کچھ مسائل میں ان کا حنفی فقہ وغیرہ سے اختلاف تھا، لیکن وہ اختلاف اس درجے کا نہ تھا کہ جس کی وجہ سے ان کی تکفیر یا تضلیل وتفسیق کی جائے اور ان کو برا بھلا کہا جائے۔

ان کا اصل مقصود توحید وسنت کی دعوت دینا، اپنے زمانے میں رائج شرک وبدعات اور رسوم و گناہوں سے روکنا اور اسلامی احکام وقوانین کا نافذ کرنا تھا، لیکن ان کے ساتھ اہلِ بدعت و باطلین اور سیاسی لوگوں کے اختلاف اور ان کی طرف نسبت کرنے والے بعض لوگوں کے

افراط وتفریط پر مبنی طرزِ عمل کی وجہ سے دنیا کے مختلف علاقوں میں ان کے خلاف ایک مہم کے طور پر نفرت پھیلائی گئی، بطورِ خاص ہندوستان میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں اصل اہل السنۃ والجماعۃ کو بدنام اور کمزور کرنے کے لیے ان کو وہابیوں کا لقب دے کر ان سے بہت سخت نفرت پیدا کی گئی، جس کے نتیجے میں وہابی کا لفظ بطور گالی اور نفرت کے استعمال ہونے لگا، جو شخص شرک و بدعت سے منع کرتا اور توحید وسنت کی دعوت دیتا، اس کو ناواقفیت یا ضد اور عناد کے طور پر وھابی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا، جن میں ہندوستان و پاکستان میں سنت کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنے والے علماء، صلحاء، اور دِین دار عوام کو اور بطورِ خاص اہلِ دیوبند کو نشانہ بنایا گیا، ہندوستان و پاکستان کے کم علم اور ناواقف عوام، اور بدعات سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ایک عرصہ سے وھابی کا لقب زیادہ تر اسی حیثیت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیو بند مسلک کے عقائدوافکار، اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہیں، اور ان کا تعلق فقہ حنفی سے ہے، اور شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے صحیح متبعین کے عقائد وافکار بھی اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق تھے، لیکن وہ فقہ حنفی کے بجائے، فقہ حنبلی سے تعلق رکھتے تھے، اور آج بھی دنیا بھر میں ان کے سلسلہ کے بے شمار افراد موجود ہیں اور سعودی عرب کے حکمران اور ائمہ وغیرہ بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متبعین میں داخل ہیں، تاہم دوسرے مسالک اور دوسری جماعتوں کی طرح، ان کے سلسلہ میں بھی غالی یا افراط وتفریط کے مرتکبین کی نفی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ معصوم ذات تو انسانوں میں صرف انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی ہی ہوتی ہے۔

لیکن کسی بزرگ یا جماعت کی طرف نسبت کرنے والے بعض لوگوں کے افراط یا تفریط اور غلو پر مبنی طرزِ عمل کی وجہ سے اس جماعت کے بانی یا مقتداء اور اس کے صحیح متبعین کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا، جیسا کہ اگر کچھ لوگ اپنے آپ کو حنفی کہیں، اور وہ اس کے باوجود مختلف شرک

وبدعات پر مشتمل امور کا ارتکاب کریں، تو ان امور کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ یا صحیح اور مستند فقہ حنفی کی طرف منسوب کرنا درست نہ ہوگا۔

اسی طرح سے اگر کسی کو شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے ساتھ بعض مسائل میں علمی وفقہی اختلاف ہو، تو محض اس کی وجہ سے بھی شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے صحیح متبعین کا گمراہ ہونا لازم نہیں آتا۔

کیونکہ متکلمینِ اہل السُنۃ والجماعۃ اور فقہاء و مجتہدینِ اہل السنۃ والجماعۃ کا سینکڑوں فروعی مسائل میں باہم اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن ان کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر یا تضلیل و تفسیق نہیں کی جاتی، پس کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کے مسائل میں اختلاف کی وجہ سے، شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے ساتھ اہلُ السنۃ والجماعۃ اور اس سے بڑھ کر اہلِ اسلام سے امتیازی درجہ کا سلوک اختیار کیا جائے، اور ان کے خلاف ہر طرح کے جھوٹے سچے الزامات کی بوچھاڑ کی جائے۔

اور اس پر مزید یہ کہ وھابی یا وھابیت کے لفظ کو اس طرح کی گالی بنالیا جائے کہ اس لفظ کے سنتے ہی نفرت کا اظہار کیا جائے۔

اس طرزِ عمل سے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچا، اور اب تک پہنچ رہا ہے۔

چنانچہ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ بعض لوگ لاکھوں روپے خرچ کر کے حرمین شریفین کا سفر کرتے ہیں، لیکن ان کو وہاں جا کر حرمین شریفین کے ائمۂ کرام کی اقتداء میں باجماعت نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی، کیونکہ ان کے نزدیک موجودہ زمانے کے ائمہ حرمین شریفین وھابی ہیں، جن کو یہ لوگ بہت بڑا گستاخِ رسول، بلکہ دوسرے کافروں سے بھی نعوذ باللہ تعالیٰ بدتر سمجھتے ہیں۔

حالانکہ تحقیق کرنے سے محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے صحیح متبعین کا گستاخِ رسول یا کافر ہونا ثابت نہیں ہوا، بلکہ ان کا مومن و مسلم اور توحید وسنت کا داعی، اور اللہ اور اس کے رسول

سے صحیح محبت کرنے والا مسلمان ہونا ثابت ہوا۔

اور کسی مومن و مسلم کو بلا تحقیقِ صحیح کے کافر یا گستاخِ رسول وغیرہ قرار دینا سخت گناہ کی بات ہے، اور اس پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، یہاں تک کہ بعض احادیث کی رو سے کسی مسلمان کو کافر قرار دینے پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے والے کی طرف ہی کفر کا یہ حکم لوٹ کر آتا ہے، پھر کسی مستند عالمِ دین اور متقی و متبعِ سنت شخص کو، جس کے مومن و متقی اور متبعِ سنت ہونے کی ہزاروں لاکھوں لوگ گواہی دیں، یہاں تک کہ ائمہ حرمین شریفین بھی ان کو اپنا مقتدا و امام قرار دیں، اس کو کافر قرار دینے کا وبال کتنا سخت ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ ہر انصاف پسند مومن لگا سکتا ہے۔

اس لیے وھابیت کی مذکورہ برائی یا مذکورہ تصور کو ذہن سے نکال کر اس سلسلہ میں صحیح اور معتدل راہِ عمل کو اختیار کرنا چاہیے۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے پیروکاروں کے ذریعہ سے موجودہ سعودی عرب کی بنیاد 1745 عیسوی میں اس وقت رکھی گئی، جب محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے درمیان گفت وشنید کے بعد باہمی جدوجہد کا معاہدہ قرار پایا۔ اس معاہدے میں طے ہوا کہ حکومتی انتظامات کی ذمہ داری محمد بن سعود اور ان کا قبیلہ اور اصلاحِ عقائد کی ذمہ داری محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کا قبیلہ ادا کرے گا۔

اس کے نتیجہ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی اور محمد بن سعود نے مل کر مذہبی وسیاسی تحریک کا آغاز کیا، اور اس میں کامیابی حاصل کی اور نشیب وفراز کے ساتھ سلسلہ آگے چلتا رہا اور مختلف سیاسی وغیر سیاسی لوگوں سے مقابلہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ انہوں نے سعودی عرب اور مکہ مکرمہ میں حکومت حاصل کرلی، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

اس لیے سعودی عرب کی موجودہ حکومت بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی فکر سے تعلق رکھتی ہے اور حرمین شریفین کے اکثر ائمہ کرام بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرزِ فکر کے حامل

ہیں، اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائد وافکار کا تعلق سعودی عرب کے موجودہ حکمرانوں اور حرمین شریفین کے ائمہ کرام کے ساتھ بھی وابستہ ہے، جن کی اقتداء میں سال بھر اور بطورِ خاص ماہِ رمضان میں اور بالاخص حج وعمرہ کے مواقع پر لاکھوں کروڑوں مختلف المسالک علماء، صلحاء واولیاء اور عامۃ المسلمین کو نماز ادا کرنی پڑتی ہے، اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان سے واسطہ پیش آتا ہے، اس حیثیت سے محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کا تعلق قائم ہو گیا ہے، اور یہ مسئلہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے، اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائد وافکار کی تحقیق ضروری ہو گئی ہے۔

اسی ضرورت ومقصد سے بندہ محمد رضوان نے شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے عقائد وافکار کی تحقیق کے لیے ''محمد بن عبدالوھاب نجدی کے عقائد وافکار'' کے نام سے بحمداللہ تعالیٰ ایک تحقیقی وغیر روایتی مضمون مرتب کیا، جس میں اہلِ نجد حکمرانوں کا اجمالی تعارف اور شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے متبعین، اور اہلِ نجد کے بعض حکمرانوں کی اپنی تحریر کردہ عبارات اور ان کے چند مستند ومعتبر ترجمان حضرات اور ان کے مقتدائے خاص علامہ ابنِ تیمیہ وغیرہ کے حوالہ سے مواد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور مختلف مسائل میں دیگر فقہاء بالخصوص حنفیہ اور بالأخص محققینِ مشائخِ دیوبند کے اصولی موقف کو بھی سامنے رکھا گیا ہے، تاکہ ایک خالی الذہن غیر متعصب اور انصاف پسند کو اعتدال کا راستہ اختیار کرنے اور افراط وتفریط سے بچنے میں سہولت حاصل ہو۔

اس مضمون کو آئندہ اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ممکن ہے اور سابقہ تحقیقات اور ان کی اشاعت کے بعد کے تجربہ سے اندازہ ہے کہ بعض لوگوں کو اور بطورِ خاص وہ لوگ کہ جنہوں نے پہلے سے اس سلسلہ میں کوئی خاص دوسرا موقف اختیار کر رکھا ہو اور اس سے بڑھ کر اس کی نشر واشاعت بھی کر رکھی ہو، اس مضمون میں مذکور بندہ کی تحقیق سے اتفاق نہ ہو اور وہ اس سلسلہ میں اپنے موقف کے دفاع اور اپنی صفائی کے

لیے بندہ کو سلفیت، وھابیت اور غیر مقلدیت وغیرہ کے القابات سے سرفراز فرمائیں، کیونکہ آج کل پختہ علم اور تزکیۂ نفس سے محروم بعض ظاہری علم رکھنے والے حضرات کا طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ انہیں جہاں اپنے پہلے سے اختیار کردہ اور بیان کیے ہوئے قول وموقف کے خلاف کسی دوسرے کی تحقیق دکھائی یا سنائی دے، تو وہ فوراً سے پہلے اس دوسرے پر غیر مقلد اور متفرد وغیرہ ہونے کا الزام عائد کر دیتے ہیں، جیسا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اس طرح کے فیصلے کا اختیار دیا گیا ہو، یا ان کے پاس اس کی دلیل یا برہان نازل ہوئی ہو، لیکن ان بے چاروں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کسی کے موقف اور دلیل کو ملاحظہ کیے اور اس پر غور وفکر کیے بغیر، اس طرح کا الزام وحکم لگانا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اور کیا اس طرح کے الزام اور حکم لگانے کی آخرت میں باز پرس نہ ہوگی؟

لقولہٖ تعالیٰ:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (سورة قٓ، رقم الآية ١٨)

اور اگر کچھ لوگ خود تو تحقیق کرنے کی نعمت وتوفیق سے محروم رہے، اور ان کے حصے میں بعض اقوال کی تقلیدِ محض یا تقلیدِ جامد آئی، اور ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے کو تحقیق کی نعمت عطا فرمائی، اور اس نے اپنا فریضہ اور ذمہ داری سمجھتے ہوئے، تحقیق کے نتیجہ میں فیما بینہٗ و بین اللہ کوئی رائے قائم کی، تو ان لوگوں کو دفعِ دخل مقدر کا کیا حق پہنچتا ہے، اسی وجہ سے بندہ پہلے بھی اپنی متعدد تحقیقات وآراء کے متعلق عرض کر چکا ہے کہ بندہ کا اصل مقصود دوسرے لوگوں کی خوشنودی کے بجائے رضائے الٰہی کی خاطر افراط وتفریط کی نشاندہی اور راہِ اعتدال کی جستجو ہے، جو شریعت کا مطمحِ نظر ہے اور اس میں یہ بھی داخل ہے کہ جس شخص یا فرد سے جس درجہ کا اختلاف یا اتفاق ہو، اس کو اسی درجہ پر رکھا جائے، کسی سے کسی مسئلہ میں اختلاف کی وجہ سے اس سے کُلی اختلاف کرنا یا کسی مسئلہ میں دوسرے سے اتفاق کی وجہ سے کُلی اتفاق کرنا، اور اسی طرح سے فروعی وفقہی اور اجتہادی اختلاف کو اصولی اختلاف کا درجہ

دینا، اصولِ شریعت کی روشنی میں درست اور معتدل طرزِ عمل نہیں، کیونکہ آخرت میں ہر چیز کے متعلق حساب وکتاب ہونا ہے، جس میں کسی سے اتفاق یا اختلاف کا معاملہ بھی داخل ہے، اس لیے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے کہ وہ محض اپنے جذبات یا سابقہ مرجوح یا غیر تحقیقی رائے پر کسی حتمی موقف کی بنیاد قائم نہ کرے، بلکہ حقائق پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھے، اور اپنی کسی سابقہ رائے کے مرجوح یا خطا ظاہر ہونے کے بعد اس سے رجوع کرنے میں کوئی شرم وعار محسوس نہ کرے، اور جس چیز کا حقیقی علم اس کے پاس نہیں، اس کے فیصلے کو اللہ کے لیے اور آخرت کے دن پر چھوڑ دے، اللہ وآخرت کے حتمی وقطعی فیصلوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرے، جیسا کہ آج کل بعض لوگوں کا طرزِ عمل ہوگیا ہے کہ ان کو جس سے کوئی علمی وفقہی اختلاف ہوجائے، وہ جب تک اس کو کافر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گستاخ یا اکابر کا گستاخ یا کم از کم فاسق وگمراہ قرار نہیں دے دیتے اور اس کے دل میں چھپی ہوئی نیت پر بھی حملہ نہیں کر دیتے، جس کا تعلق، اُس کے اور اللہ کے درمیان ہے، اس وقت تک ان کے جذبات کی تسکین نہیں ہوتی۔

حالانکہ اس طرح کے حساب وکتاب کا اصل اختیار تو اللہ تعالیٰ کو ہے، جہاں ہر شخص اپنے عمل اور اس کی نیت ومقصد کے اعتبار سے ہر چیز کا حساب دینے کے لیے اللہ کے حضور پیش ہوگا، اور غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے کی علمی وفقہی تحقیق سے اختلاف کرنے اور اس کے مقابلہ میں معقول اور ٹھوس دلائل پیش کرنے کے بجائے، محض اس دوسرے کے تدین وایمان اور نیت پر حملہ کرنے اور مختلف قسم کے الزامات عائد کرنے کا بار چند ایسے اشخاص وافراد ہی اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی جرأت وہمت کرتے ہیں، جن کو آخرت کے حقیقی حساب وکتاب کا پوری طرح استحضار نہیں ہوتا، یا پھر ان کو دوسرے سے ضد وعناد اور تحاسد وتباغض ہوتا ہے، یا وہ علمی وفقہی دلائل سے محروم ہوتے ہیں اور وہ دوسرے کے ذاتی تشخص پر الزامات کی بوچھاڑ کر کے ہی اپنا پیٹ بھرتے ہیں، اور اس طرح اپنی عاقبت وآخرت کے خسارہ کا سامان

کرتے ہیں۔

اس مذکورہ طرزِ عمل کے لوگوں کی موجودہ دور میں کمی نہیں، جن میں بعض ایسے افراد واشخاص بھی پائے جاتے ہیں، جو بظاہر اہلِ علم اور عوام کے مقتدا اور نہ جانے کیا کچھ سمجھے جاتے ہیں۔
ان حضرات وافراد کو سلفِ صالحین کی پاکیزہ سیرت کو سامنے رکھنا چاہیے، جن کے دل دوسروں سے ذاتی تحاسد وتباغض اور ضد وعناد سے پاک تھے، اور ان کی زبانیں اس طرح کی الزام تراشیوں اور افترا پردازیوں سے محفوظ تھیں، اور انہوں نے جس وقت جو رائے اختیار کی، وہ اپنے اور اللہ کے درمیان حق وصواب سمجھتے ہوئے اختیار کی، اسی وجہ سے جب اور جس وقت خود سے یا کسی دوسرے کی تحقیق کے ذریعے سے انہیں اپنی سابقہ رائے کا مرجوح یا خطا ہونا ظاہر ہو گیا، انہوں نے فوراً اس سے رجوع کر لیا، اور اس میں اپنی کوئی ذلت وعار محسوس نہیں کی، زیرِ بحث مسئلہ میں بھی اس طرح کے کئی حضرات کی آراء موجود ہیں، اس لیے مذکورہ حضرات وافراد اسی مضمون میں ان سلفِ صالحین کی سیرت ملاحظہ کر کے، اپنی روش کا جائزہ لے سکتے ہیں، اور بآسانی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جن اسلاف واکابر کے وہ نام لیوا ہیں، ان کی اتباع واقتداء کا کتنا حصہ ان کے مقدر میں آیا۔

اب جبکہ بیسویں صدی عیسوی کا اختتام ہو چکا ہے، اور اکیسویں صدی کے دو عشرے بھی گزر چکے ہیں، اور جدید ترین وسائل وذرائع کے ایجاد ہونے کے نتیجے میں دنیا سمٹ کر ایک گاؤں کی مانند ہو چکی ہے، ہمیں جمود وخمود کی اپنی سابقہ روِش کو ترک کر کے آگے بڑھنا چاہیے اور آنے والے دور کے مختلف چیلنجز سے نمٹنے کی تیاری کرنی چاہیے، جس کا اہم ذریعہ یہ ہے کہ ہم تحقیق کے میدان میں وسعتِ نظر سے کام لیں اور آگے بڑھیں، تاریخ سے سبق سیکھیں، غیر تحقیقی اور روایتی باتوں سے باہر نکل کر تحقیق اور غور وفکر کو بروئے کار لائیں اور حقائق پر نظر کریں، اور بلاوجہ کی بدگمانیوں، بدزبانیوں اور الزام تراشیوں اور آپس میں نااتفاقیوں میں مبتلا ہو کر اپنی دنیا وآخرت کی خرابی کا سامان کرنے سے اپنے آپ کو بچائیں۔

مجھے امید ہے کہ اگر خالی الذہن ہو کر، بنظرِ انصاف واعتدال آنے والے مضمون کو ملاحظہ کیا جائے گا، تو راہِ اعتدال کی تشخیص اور افراط وتفریط کی تعیین میں مشکل پیش نہ آئے گی، ورنہ تو ان جھگڑوں کا اصل خاتمہ قیامت کے دن ہی ہوگا، جو اصل فیصلے اور بدلے کا دن ہے، اللہ نہ کرے ہمیں وہ وقت دیکھنا پڑ جائے کہ طرفین کے دونوں قسم کے بزرگانِ دین تو اپنی نیک نیتی، اجتہاد اور تحقیق کے باعث اجروانعام کے مستحق ٹھہریں اور ہم جیسے لوگ دلائل وحقائق کی اتباع کے بجائے، محض ان پر بے جا طعن وتشنیع اور ان کی شان میں زبان درازی کرنے کی وجہ سے قابلِ مؤاخذہ قرار پائیں۔

اللہ حفاظت عطا فرمائے اور امتِ مسلمہ کو صحابۂ کرام، ائمہ مجتہدین اور سلفِ صالحین کے نقشِ قدم پر چل کر مطلوبہ اتحاد واتفاق اپنے اندر پیدا کرنے اور اس کو قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اور موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کے بکھرے ہوئے اور منتشر شیرازہ کو متحد اور متفق ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

محمد رضوان خان

26/ جمادی الاخریٰ/ 1440 ہجری 04/ مارچ/ 2019ء، بروز پیر

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

(مقدمہ)

سلاطینِ آلِ سعود کی تاریخ وتعارف

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی ولادت 1115 ہجری، بمطابق 1703 عیسوی کو ''نجد'' کے علاقے ''العیینۃ'' میں ہوئی، اسی سال دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی پیدا ہوئے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے والد ''عبدالوہاب بن سلیمان نجدی'' (المتوفیٰ: 1158 ہجری، بمطابق 1745 عیسوی) بھی علمِ دین اور علمِ فقہ سے مناسبت رکھتے تھے، اور اپنے زمانے میں ایک عرصے تک ''عیینۃ'' اور ''حریملا'' میں عہدۂ قضا پر مامور رہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے دادا ''سلیمان بن علی بن محمد بن احمد بن راشد بن برید بن مشرف تمیمی نجدی حنبلی'' (المتوفیٰ: 1098 ہجری، بمطابق 1687 عیسوی) بھی اپنے زمانے کے مشہور عالم اور علمائے نجد کے مرجع وماویٰ تھے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے چچا ''ابراہیم بن سلیمان'' بھی ممتاز عالمِ دین تھے۔

شیخ محمد حیات بن ابراہیم سندھی حنفی مدنی (المتوفیٰ: 1163 ہجری، بمطابق 1750 عیسوی) کا شمار، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ممتاز اساتذۂ کرام میں ہوتا ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے پچاس سال تک دعوتِ توحید وسنت کی خدمات سرانجام دیں، اور ان کا انتقال 1206 ہجری، بمطابق 1792 عیسوی میں ہوا۔

پھر ان کے بعد ان کے بیٹوں نے توحید وسنت کے سلسلہ کو آگے بڑھایا، اور پھر ان کی آل میں یہ سلسلہ آگے چلا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے دعوت وتبلیغ کی خاطر بہت سی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت

کیں، اوراسی دوران ان کو اپنے آبائی علاقے ''عیینة'' سے نکلنا پڑا، اوروہ ''درعیة'' پہنچے، جہاں ان کی ملاقات ''امیر محمد بن سعود'' سے ہوئی، ''امیر محمد بن سعود'' ان کی دعوت سے متاثر ہوئے، اوران کے ساتھ مل کر توحید وسنت کی اشاعت اوراس کے نفاذ کی جدوجہد کا عہد کیا، محمد بن سعود (المتوفیٰ: 1765 عیسوی) اور محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفیٰ: 1792 عیسوی) کے درمیان باہمی جدوجہد کے معاہدہ میں یہ طے ہوا کہ حکومتی انتظامات کی ذمہ داری محمد بن سعوداوران کا قبیلہ اوراصلاحِ عقائد کی ذمہ داری محمد بن عبدالوہاب نجدی اوران کا قبیلہ ادا کرے گا۔

اس کے نتیجہ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی اور محمد بن سعود نے مل کر مذہبی وسیاسی تحریک کا آغاز کیا، اوراس میں کامیابی حاصل کی اورنشیب وفراز کے ساتھ سلسلہ آگے چلتا رہا اورمختلف سیاسی وغیرسیاسی لوگوں سے مقابلہ ہوتا رہا۔

سعودی عرب کے موجودہ حکمران بھی چونکہ آلِ سعود سے تعلق رکھتے ہیں، اوروہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد وافکار کے پیروکار ہیں، اس لیے پہلے سلاطینِ آلِ سعود کی تاریخ پر طائرانہ نظرڈال لینا مناسب ہے۔

سعودبن محمد بن مقرن، سعودی شاہی خاندان یعنی آلِ سعود کی بنیاد ہیں، سعود بن محمد کا خاندان نجد کے وسط میں ایک قصبہ ''درعیة'' میں ایک معروف خاندان تھا، سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں سعود بن محمد کے آباءواجداد نے کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ حاصل کیے، جو علاقے میں زراعت کی چند اقسام میں سے ایک اہم ذریعہ تھا، وقت گزرنے کے ساتھ درختوں کے جھنڈوں میں اضافہ ہوتا گیا اوران کا قبیلہ علاقے کے رہنماؤں کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔

سعود بن محمد کی وفات کے دودہائیوں بعدان کے بیٹے محمد بن سعود نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی سے وہ تاریخی معاہدہ کیا، جوعرب میں ان کی فتح اور''امارتِ درعیة'' کے بعد پہلی

سعودی ریاست پر منتج ہوا، سعود بن محمد کے دیگر تین بیٹے ثنیان، مشاری اور فرحان تھے، جو تینوں ''محمد بن سعود'' کے بھائی تھے۔

محمد بن سعود بن محمد آلِ مقرن ''درعیۃ'' کے امیر تھے، ان کو پہلی سعودی ریاست اور آلِ سعود (جو ان کے والد سعود بن محمد آل مقرن کے نام پر ہے) کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

کچھ عرصے کے لیے محمد بن سعود کے بعض بھائیوں کی آل سے بعض افراد نے حکومت کی، لیکن ان کا دورِ حکومت محمد بن سعود کی آل کے مقابلہ میں زیادہ طویل اور اہمیت کا حامل نہیں رہا۔

محمد بن سعود سے لے کر تا حال آلِ سعود کے حکمرانوں کا اجمالی تعارف ذکر کیا جاتا ہے۔

آلِ سعود کی سلطنت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک دور 1744 عیسوی سے شروع ہو کر 1818 عیسوی تک ہے۔

دوسرا دور 1824 عیسوی سے شروع ہو کر 1891 عیسوی تک ہے۔

تیسرا دور 1902 عیسوی سے شروع ہو کر تا حال (2019 عیسوی) تک ہے۔

اسی ترتیب و تقسیم کے لحاظ سے آلِ سعود کے حکمرانوں کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

سلطنتِ آلِ سعود کا پہلا دور

(1744 عیسوی تا 1818 عیسوی)

سلطنتِ آلِ سعود کا پہلا دور ''محمد بن سعود'' سے شروع ہوتا ہے، اور ''مشاری بن سعود'' پر اختتام پذیر ہوتا ہے، جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

(1)

''محمد بن سعود''

(1744ء تا 1765ء)

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا مذہبی وسیاسی قوت و برتری میں ساتھ دینے والی پہلی شخصیت

''محمد بن سعود'' کی تھی، جنہوں نے 1158 ہجری میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ہاتھ پر بیعت کی، جس کے بعد باہمی جدوجہد سے فتوحات حاصل کر کے ''محمد بن سعود'' نے بیس سال حکومت کی، اور 1765 عیسوی میں ان کا انتقال ہوا۔

اس وقت تک شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی حیات تھے، جن کا انتقال 1792 عیسوی (1206 ہجری) میں ہوا۔

''محمد بن سعود'' پہلی سعودی ریاست کے بانی شمار ہوتے ہیں۔

پہلی سعودی ریاست کے بانی محمد بن سعود کے پانچ بیٹے تھے:

(1) عبدالعزیز (2) سعود (3) عبداللہ (4) فیصل (5) علی۔

(2)

''عبدالعزیز بن محمد بن سعود''

(1765ء تا 1803ء)

امیر ''محمد بن سعود'' کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ''عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' ان کے جانشین ہوئے ''عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' نے اپنے والد کی وفات کے بعد 38 سال حکومت کی، امیر عبدالعزیز کو 1803 عیسوی میں ایک جفا کار نے عصر کی نماز پڑھاتے وقت عین سجدہ کی حالت میں خنجر سے شہید کردیا۔

(3)

''سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود''

(1803ء تا 1814ء)

امیر ''عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے ''سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' امیر مقرر ہوئے، 1811 عیسوی میں جب ''سعود بن عبدالعزیز'' کا دورِ حکومت تھا، محمد علی پاشا مصری (المتوفیٰ: 1849 عیسوی) نے (جو خلافت عثمانی ترکی کے گورنر مصر

تھے، لیکن انہوں نے نئی خود مختار مصری ریاست قائم کی، اور خدیو مصر بنے، ان کے بعد مصر کے والی خدیو ہی نسل در نسل کہلاتے رہے، تاآنکہ 1955 عیسوی میں کرنل جمال عبدالناصر نے فوجی بغاوت کے نتیجے میں خدیو سلطنت کا خاتمہ کر کے جدید سیکولر سوشلسٹ مصر کی بنیاد رکھی، آلِ محمد علی کی سلطنت اور جدید مصر کے بانی، اور مصر کے خدیو یا والی تھے) شام اور عراق میں شکست کھانے کے بعد، اپنے بیٹے ''طوسون پاشا'' کو (جو 1805 عیسوی سے 1849 عیسوی تک مصر کا والی رہا) سعودی عرب پر حملے کے لیے بھیجا، مگر وہ وادی صفراء میں شکست کھا گیا۔

1818 عیسوی میں محمد علی پاشا نے اپنے دوسرے بیٹے ابراہیم پاشا (المتوفیٰ: 1848 عیسوی) کو نجدیوں کے خلاف فوج دے کر بھیجا، اس نے ''درعیة'' مقام کا محاصرہ کیا، جس کے نتیجے میں محمد علی پاشا کو فوجی برتری حاصل ہوگئی، اور اس نے آلِ سعود کے چند افراد کو گرفتار کرلیا، جن میں ''محمد بن سعود'' کے بھائی ''مشاری بن سعود'' بھی تھے، لیکن محمد علی پاشا کو محمد بن عبدالوہاب نجدی اور سعود خاندان کی عوامی طاقت اور اثر ورسوخ کو ختم کرنے میں پوری طرح کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

اسی دوران، 1814 عیسوی (1229 ہجری) میں امیر ''سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' کا انتقال ہوگیا۔

(4)

''عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود''

(1814ء تا 1817ء)

''سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے ''عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' ان کے جانشین مقرر ہوئے۔

لیکن ان کو مصر کے والی ابراہیم پاشا نے شکست دے دی، اور ان کو گرفتار کرلیا، اور 17 دسمبر

1818 عیسوی (18 صفر 1243 ہجری) کو پھانسی دے کر قتل کر دیا، اس لڑائی میں آلِ سعود کے کئی افراد قتل ہوئے، اور ابراہیم پاشا نے ''محمد بن سعود'' کے بھائی ''مشاری بن سعود'' سمیت کئی افراد کو گرفتار کرلیا۔

''عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود'' کے ساتھ ہی امرائے نجد کا وہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، جو براہِ راست شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی سے مستفید ہوا تھا۔

(5)

مشاری بن سعود

1820 عیسوی میں مشاری بن سعود، محمد علی پاشا کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے، وہ ''درعیۃ'' واپس آئے، تو بہت سے لوگ دوبارہ ان کے زیرِ سایہ رہنے کے لیے تیار ہو گئے، اوران کی بیعت کرلی، مگر محمد علی پاشا مصری کے نمائندے ''حسین بے'' نے ''مشاری بن سعود'' کو ''درعیۃ'' پہنچنے پر دوبارہ گرفتار کرلیا، اور وہ اسی اثناء میں فوت بھی ہو گئے، ''مشاری بن سعود'' کے ساتھ آلِ سعود کے اور بھی کئی لوگ گرفتار ہوئے۔

اگلے 84 سال تک آلِ سعود کی حکومت میں اتار چڑھاؤ آتا رہا، جزیرہ نما عرب پر تسلط کے لیے مصر، سلطنتِ عثمانیہ اور دیگر عرب خاندان ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہے۔

1819 عیسوی سے لے کر 1824 عیسوی تک آلِ سعود کی سلطنت کا دور منقطع رہا۔

سلطنتِ آلِ سعود کا دوسرا دور

(1824 عیسوی تا 1891 عیسوی)

سلطنتِ آلِ سعود کا دوسرا دور ''ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' سے شروع ہوتا ہے، اور ''عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' پر اختتام پذیر ہوتا ہے، جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

(1)

”ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“

(1824ء تا 1834ء)

”مشاری بن سعود“ کی وفات کے چند سال بعد، آلِ سعود کی دوسری نسل کے طور پر ”ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“ منظرِ عام پر آئے، ان کو آلِ سعود کی ریاست کا دوسرا بانی شمار کیا جاتا ہے، 1822 عیسوی میں ترکی بن عبداللہ نے آلِ سعود کی سلطنت کو منظّم کرنے کی کوششیں شروع کیں، ان کا دورِ حکومت 1824 عیسوی سے 1834 عیسوی تک رہا۔

1824 عیسوی میں ان کے ہاتھوں مصری اور عثمانی مغلوب ہوئے، تو مصری حکومت کی طرف سے آلِ سعود کے گرفتار شدہ بعض افراد کو اس شرط پر رہائی دی گئی کہ وہ رہائی کے بعد آلِ سعود کے خلاف منصوبہ بندی کا حصہ بنیں گے، چنانچہ رہائی پانے والے افراد میں سے آلِ سعود کے ایک فرد ”مشاری بن عبدالرحمٰن بن حسن بن مشاری بن سعود“ نے ”ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود“ کو قتل کر دیا۔

(2)

”مشاری بن عبدالرحمٰن بن حسن بن مشاری بن سعود“

(مئی 1834ء تا 18 جون 1834ء)

”ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“ کو قتل کرنے کے بعد ”مشاری بن عبدالرحمٰن بن حسن بن مشاری بن سعود“ ”درعیۃ“ اور صرف چالیس دن ”ریاض“ کا امیر رہا۔

(3)

”فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“ (حکومتِ اول)

(1834ء تا 1838ء)

اس کے بعد آلِ سعود کی تیسری نسل کے ایک فرد اور ”ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“ کے بیٹے

’’فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ نے عوامی حمایت سے ’’ترکی بن عبداللہ‘‘ کے قاتل ’’مشاری بن عبدالرحمٰن بن حسن بن مشاری بن سعود‘‘ کی حکومت کو وقتی طور پر ختم کردیا، اور خود حکومت کی۔

لیکن کچھ عرصے بعد، ’’فیصل بن ترکی‘‘ کو محمد علی پاشا کی طرف سے مقرر کردہ سپہ سالار ’’خورشید پاشا‘‘ نے 1838 عیسوی میں ’’الدیلم‘‘ کے مقام پر شکست دے دی، اور ان کو قید کر کے مصر بھیج دیا۔

’’فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ نے 1834 عیسوی کے بعد سے 1838 عیسوی تک حکومت کی، درمیان میں چند سال کے لیے ان کی حکومت ختم ہوگئی، پھر اس کے بعد انہوں نے دوسری مرتبہ 1843 عیسوی سے 1865 عیسوی تک تادمِ حیات حکومت کی، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

(4)

’’خالد بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود‘‘

(1838ء تا 1841ء)

1838 عیسوی میں جب ’’فیصل بن ترکی‘‘ کا دورِ حکومت تھا، محمد علی پاشا نے ’’خالد بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود‘‘ کو ساتھ ملایا اور ان کو استعمال کر کے 1838 عیسوی میں ’’فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ پر حملہ کیا، اور محمد علی پاشا نے ’’خالد بن سعود‘‘ کی حمایت کی بنا پر بغیر کسی رکاوٹ کے ’’ریاض‘‘ کو فتح کرلیا۔

’’فیصل بن ترکی‘‘ نے ’’خالد بن سعود‘‘ کی حمایت کی وجہ سے کسی مزاحمت کے بغیر مصریوں کو اپنی گرفتاری دے دی، جس کے بعد ’’خالد بن سعود‘‘ نے ترکی کی عثمانی حکومت کے سائے میں حکمرانی کی۔

1841 عیسوی میں ’’خالد بن سعود‘‘ کی وفات ہوئی۔

(5)

”عبداللہ بن ثنیان بن ابراہیم بن ثنیان بن سعود“

(1841ء تا 1843ء)

جب 1840 عیسوی میں برطانیہ سے معاہدہ کے بعد محمد علی پاشا نے سعودی عرب سے فوجیں نکال لیں، تو پھر ”خالد بن سعود“ کی گرفت بھی کمزور ہوگئی۔

اور 1841 عیسوی میں آلِ سعود کی حکومت کے پہلے بانی ”محمد بن سعود“ کے بھائی کی نسل میں سے ”عبداللہ بن ثنیان بن ابراہیم بن ثنیان بن سعود“ نے ”خالد بن سعود“ کی حکومت ختم کی، اور خود سال بھر مشکل سے حکومت کی۔

1843 عیسوی میں ”فیصل بن ترکی“ نے مصریوں کی قید سے آزاد ہوکر ”عبداللہ بن ثنیان“ پر قابو پا کر اسے قید کردیا، اور وہ اسی قید وبند کے حال میں فوت ہوا۔

(6)

”فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“ (حکومتِ دوم)

(1843ء تا 1865ء)

جیسا کہ پہلے گزرا کہ 1843 عیسوی تک ”فیصل بن ترکی“ مصریوں کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے، اور ”ریاض“ پہنچے، اور دوبارہ سعودی سلطنت کو منظّم اور مستحکم کیا، اور انہوں نے دوسری مرتبہ 1843 عیسوی سے 1865 عیسوی تک تادمِ حیات حکومت کی۔

1865 عیسوی میں ”فیصل بن ترکی“ نے وفات پائی۔

(7)

”عبداللہ بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“ (حکومتِ اول)

(1865ء تا 1871ء)

”فیصل بن ترکی“ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ”عبداللہ بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن

محمد بن سعود'' کی حکومت قائم ہوئی، جنہوں نے 1865 عیسوی سے 1871 عیسوی تک حکومت کی۔

لیکن ''عبداللہ بن فیصل'' کوان کے بھائی ''سعود بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' نے تختِ شاہی سے اتار دیا، اور خود حکومت کی، جس کے بعد دوبارہ ''عبداللہ بن فیصل بن ترکی'' تخت نشین ہوئے۔

''عبداللہ بن فیصل'' نے مختلف اوقات میں تین مرتبہ حکومت کی، درمیان میں دوسرے حضرات کی حکومت رہی، ان کی دوسری اور تیسری مرتبہ حکومت کا ذکر آگے آتا ہے۔

(8)

''سعود بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' (حکومتِ اول)

(1871ء تا 1871ء)

''سعود بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' نے ''عبداللہ بن فیصل بن ترکی'' کو برخواست کرنے کے بعد 1871 عیسوی میں کچھ عرصہ حکومت کی۔

انہوں نے بھی دو مرتبہ حکومت کی، ان کی دوسری مرتبہ کی حکومت کا ذکر آگے آتا ہے۔

(9)

''عبداللہ بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' (حکومتِ دوم)

(1871ء تا 1873)

''سعود بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' سے 1871 عیسوی میں ''عبداللہ بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود'' نے دوبارہ حکومت حاصل کر لی، اور خود 1873 عیسوی تک حکومت کی۔

اور انہوں نے ''سعود بن فیصل'' کو جلاوطن کر دیا۔

عبداللہ بن فیصل کے تیسرے دورِ حکومت کا ذکر آگے آتا ہے۔

(10)

’’سعود بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ (حکومتِ دوم)

(1873ء تا 1875ء)

’’سعود بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ نے دوسری مرتبہ ’’عبداللہ بن فیصل بن ترکی‘‘ کو سلطنت سے برخواست کرنے کے بعد 1873 عیسوی سے 1875 عیسوی تک حکومت کی۔

1875 عیسوی میں ’’سعود بن فیصل بن ترکی‘‘ کی وفات پر ان کی حکومت کا سلسلہ ختم ہوا۔

(11)

’’عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ (حکومتِ اول)

(1875ء تا 1876ء)

’’عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ دوسری سعودی ریاست کے آخری حکمران اور آلِ سعود کی چوتھی نسل کے طور پر تھے، اور یہ جدید سعودی عرب کے بانی ’’عبد العزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود‘‘ کے والد ہیں۔

ان کا پہلا مختصر دورِ حکومت 1875 عیسوی سے 1876 عیسوی تک رہا۔

(12)

’’عبداللہ بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ (حکومتِ سوم)

(1876ء تا 1889ء)

1876 عیسوی ’’’’عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی‘‘ کو آلِ رشید نے تخت سے اتار دیا، اور ان کی جگہ ’’عبداللہ بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘ کو تیسری دفعہ حکومت ملی، انہوں نے تیسری اور آخری مرتبہ تقریباً 13 سال حکومت کی، ’’عبداللہ بن فیصل‘‘ کا تیسرا اور آخری دورِ حکومت 1876 عیسوی سے 1889 عیسوی تک رہا۔

(13)

”عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود“ (حکومتِ دوم)

(1889ء تا 1891ء)

”عبداللہ بن فیصل بن ترکی“ کے بعد ”عبدالرحمٰن بن فیصل“ کی قیادت میں آلِ سعود اور آلِ رشید کے درمیان جھگڑا شروع ہوا، جریملاء کے مقام پر دونوں کی لڑائی ہوئی، جس میں آلِ سعود کے مقابلے میں آلِ رشید کامیاب ٹھہرے، جس کے بعد ”عبدالرحمٰن بن فیصل“ اپنے خاندان کے ساتھ ”احساء“ سے ہوتے ہوئے قطر چلے گئے اور وہاں سے دولتِ عثمانیہ کے گورنر سے کویت میں پناہ کی درخواست کی، جو قبول ہوئی اور وہ کویت چلے گئے، جہاں انہوں نے شیخ تبادک کے یہاں پناہ حاصل کی۔

”عبدالرحمٰن بن فیصل“ کی وفات 1928 عیسوی میں ریاض میں ان کے بیٹے عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کے دورِ حکومت میں ہوئی۔

1891 عیسوی سے لے کر 1902 عیسوی تک آلِ سعود کی سلطنت کا دور منقطع رہا۔

سلطنتِ آلِ سعود کا تیسرا دور

(1902 عیسوی سے تا 2019 عیسوی)

سلطنتِ آلِ سعود کا تیسرا دور 1902 عیسوی میں ”ریاض“ کے دوبارہ فتح ہونے کے وقت سے شروع ہوتا ہے، اور اس کا آغاز عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن آلِ سعود سے ہوتا ہے، جس کا پہلا حصہ ”نجد، حجاز اور اس کے ملحقات“ میں سلطنت سے متعلق ہے، جو 1902 عیسوی سے 1932 عیسوی تک جاری رہا۔

اور دوسرا حصہ ”مملکتِ سعودی عرب کے قیام“ سے متعلق ہے، جو 1932 عیسوی سے شروع ہوا، اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

(1)

عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن آلِ سعود

(1902 عیسوی تا 1953 عیسوی)

عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن آلِ سعود (المعروف بابنِ سعود) کا نسب نامہ اس طرح سے ہے:

’’عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود‘‘

عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آلِ سعود کی ولادت 26 نومبر 1876 عیسوی کو ہوئی، اور ان کی وفات 76 سال کی عمر میں 9 نومبر 1953 عیسوی کو ہوئی۔

نجد کا سعودی خاندان انیسویں صدی کے آغاز میں جزیرہ نمائے عرب کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو گیا تھا، لیکن مصری حکمران محمد علی پاشا نے آلِ سعود کی حکومت کو 1818 عیسوی میں ختم کر دیا تھا۔ سعودی خاندان کے افراد اس کے بعد تقریباً 80 سال پریشان پھرتے رہے، یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسی خاندان میں پانچویں نسل کے طور پر ایک زبردست حکمران ظاہر ہوئے، جن کا نام عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن تھا، جو عام طور پر سلطان ابن سعود کے نام سے مشہور ہیں۔

’’عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن آلِ سعود‘‘ انیسویں صدی کے آخر میں اپنے والد کے ساتھ عرب کے ایک ساحلی شہر کویت میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ باحوصلہ انسان تھے اور اس دھن میں رہتے تھے کہ کسی طرح اپنے آباواجداد کی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کر لیں۔ آخرکار 1902 عیسوی میں جبکہ ان کی عمر چھبیس (26) سال تھی، انہوں نے صرف 25 ساتھیوں کی مدد سے نجد کے صدر مقام ریاض پر تسلط حاصل کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے نجد کا باقی حصہ بھی فتح کر لیا، اور آلِ سعود کو منظّم کیا۔

1902 عیسوی ہی میں عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے نجدی حکمرانوں کے حریف آلِ رشید سے

ریاض شہر واپس لیا اور اسے آلِ سعود کا دار الحکومت قرار دے کر جدید سعودی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

1913 عیسوی میں ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' نے خلیج فارس کے ساحلی صوبے ''الحساء'' پر جو عثمانی ترکوں کے زیر اثر تھا، تسلط حاصل کرلیا۔

اس کے بعد یورپ میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی، جس کے دوران عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے برطانیہ سے تعلقات بہتر کیے اور ترکوں کے خلاف کارروائی کی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد شریف حسین نے خلیفہ بننے کا اعلان کردیا، لیکن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے 1913 عیسوی سے 1926 عیسوی کے دوران الاحساء، قطیف، نجد، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سمیت باقی کئی علاقوں کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیا، اور اس طرح عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے پورے حجاز پر تسلط حاصل کرلیا، اور جنوری 1926 عیسوی کو ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' حجاز کے بادشاہ قرار پائے، اور اگلے سال جنوری 1927 عیسوی کو انہوں نے **شاہِ نجد و حجاز و ملحقاتھا** کا خطاب اختیار کیا۔

20 مئی 1927 عیسوی کو معاہدہ جدہ کے ذریعے برطانیہ نے مملکتِ حجاز ونجد کے تمام مقبوضہ علاقوں پر ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' کی حاکمیت تسلیم کرلی۔

1932 عیسوی میں اس مملکت کا نام ''**المملكة العربية السعودية**'' رکھ دیا گیا۔

مارچ 1938 عیسوی میں تیل کی دریافت نے ملک کو معاشی طور پر زبردست استحکام بخشا اور مملکت میں خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔

''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' نے سعودی عرب کی بنیاد رکھنے کے بعد 1953 عیسوی تک حکومت کی، پھر یہ سلسلہ ان کے بیٹوں میں منتقل ہوگیا اور ان کے بعد تسلسل کے ساتھ آنے والے 6 سلاطین انہی کے بیٹے تھے۔

سعودی عرب کے بادشاہ شاہ سلمان ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' کے بیٹوں میں سے چھٹے بادشاہ ہیں۔

سب سے پہلے جس ملک نے ابنِ سعود کی بادشاہت کو تسلیم کیا، وہ روس تھا، روس نے 11 فروری، 1926 عیسوی کو حجاز ونجد پر سعودی حکومت کو تسلیم کیا، لیکن برطانیہ نے تاخیر سے معاہدۂ جدہ کے بعد ان کی حکومت کو تسلیم کیا۔

اس طرح سعودی ونجدی مملکت اپنے دوسری مرتبہ زوال کے تقریباً ایک سو سال بعد ایک بار پھر قوت سے ابھر کر، عرب کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن گئی۔

مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں کو اپنے زیرِ انتظام کرنے کے بعد ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' نے حجاز کا انتظام سنبھالنے اور جدید دور کے اسلامی دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے لیے 13 تا 19 مئی 1926 عیسوی کے درمیان دنیا بھر کے مسلمان رہنماؤں پر مشتمل ایک موتمر اسلامی طلب کی، جس میں تیرہ اسلامی ملکوں نے شرکت کی، اس موتمر میں اسلامی ہند کے ایک وفد نے بھی شرکت کی، اگرچہ یہ موتمر اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی، لیکن اتحادِ اسلامی کی تحریک میں اس کو ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہوئی، یہ مسلمانوں کا پہلا بین الاقوامی اجتماع تھا، جسے ایک مسلمان سربراہِ مملکت نے طلب کیا تھا۔

1930 عیسوی میں ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' نے عسیر اور نجران کے علاقوں کو بھی سعودی مملکت میں شامل کرلیا۔ یہ دونوں علاقے چونکہ یمن کی سرحد پر واقع تھے اور ان پر یمن کا بھی دعویٰ تھا، اس لیے سعودی عرب کا یمن سے تصادم ہوگیا۔ سعودی عرب کی فوجوں نے جو یمن کی فوجوں کے مقابلے میں زیادہ منظّم اور دینی جذبے سے سرشار تھیں، یمن کو بھی شکست دے دی اور 1934 عیسوی میں یمن کے ایک بڑے حصے پر تسلط حاصل کرلیا، لیکن اسی سال بعض ممتاز مسلمانوں کی کوششوں سے، جن میں ترکی کی عبقری شخصیت اور ممتاز عالم امیر شکیب ارسلان کا نام قابلِ ذکر ہے، طائف میں سعودی عرب اور یمن کے درمیان 20 مئی 1934 عیسوی کو ایک معاہدہ ہوگیا اور سعودی فوجوں کو یمن سے واپس بلوالیا گیا۔ سعودی افواج نے اس سے پہلے اردن کو بھی اپنے دائرۂ اقتدار میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن

انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

اگر ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' اردن اور یمن کی مہمات میں کامیاب ہوجاتے، تو پورا جزیرہ نمائے عرب ان کے ماتحت آجاتا، تاہم اس وقت بھی ابنِ سعود کی حکومت، رقبے کے لحاظ سے ایشیا میں سب سے بڑی عرب حکومت تھی اور یمن، عمان اور بعض ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر پورے جزیرہ نمائے عرب پر اس سعودی ونجدی حکومت کی بالادستی قائم ہوچکی تھی۔

22 ستمبر 1932ء عیسوی کو نجد وحجاز کی اس نئی حکومت کو سعودی عرب (عربی: **المملكة العربية السعودية**) کا نام دیا گیا، جو دراصل آلِ سعود کے جدالجد ''سعود'' کی طرف منسوب ہے۔

''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' اور ان کے نجدی ساتھی چونکہ محمد بن عبدالوہاب کے پیروکار ومعتقد تھے، اس لیے ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' نے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کی، ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن'' بادشاہت کو تو ختم نہ کر سکے، لیکن وہ اکثر کام علماء کی ایک مجلس سے مشورے کے بعد انجام دیتے تھے، اور انہوں نے اس بات کی غیر معمولی کوشش کی کہ ملک میں اسلامی احکام پر عمل کیا جائے، انہوں نے ملک میں شراب کی خرید وفروخت بند کردی، جو ان کے دورِ حکومت سے پہلے حجاز وغیرہ میں عام ہوگئی تھی، وہ جب تک زندہ رہے، انہوں نے کئی قسم کی معاشرتی برائیوں کو پھیلنے کا موقع نہ دیا، دینی تعلیم کے فروغ کے لیے 1948 عیسوی میں جامعہ ازہر کے طرز پر ایک کالج قائم کیا۔

ان کے بڑے کارناموں میں عرب کے خانہ بدوشوں کو بستیوں میں آباد کرنا اور انہیں زراعت پر مائل کرنا تھا، جبکہ ان کی حکومت نے لوگوں کی اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کیا، ان کا ایک اور کارنامہ ملک میں مثالی امن وامان کا قیام ہے۔

چونکہ عرب کا بیشتر علاقہ ریگستان اور بنجر پہاڑی علاقوں پر مشتمل تھا اور آمدنی کے ذرائع کم تھے اس لیے سلطان عبدالعزیز ملک کو معاشی وتعلیمی لحاظ سے زیادہ ترقی نہ دے سکے، لیکن ان کے

اخیر دور حکومت میں عرب میں تیل کے کنوئیں اس کثرت سے نکل آئے کہ ملک کی کایا پلٹ گئی اور حکومت کو کروڑوں روپے سالانہ آمدنی ہونے لگی، اس فاضل آمدنی سے سلطان نے کئی مفید اور تعمیری کام کیے، جن میں سب سے اہم کام ریل کی پٹری بچھانا تھا، یہ پٹری خلیج فارس کی بندرگاہ دمام سے دارالحکومت ریاض تک بچھائی گئی جو ساڑھے تین سو میل لمبی ہے، یہ کام 1951 عیسوی میں مکمل ہوا، عبدالعزیز کا 51 سالہ دورِ حکومت 1953 عیسوی میں ان کے انتقال کے ساتھ ختم ہوا، وہ سعودی ونجدی حکومت کے نئے بانی تھے اور انہوں نے ایک پسماندہ اور بے وسائل ملک کو جس طرح ترقی کے راستے پر ڈالا، اس کی وجہ سے ان کا شمار تاریخِ اسلام کے ممتاز حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

(2)

سعود بن عبدالعزیز

(1953 عیسوی تا 1964 عیسوی)

عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کے بعد ان کے بڑے بیٹے سعود بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی، سعودی عرب کے حکمران بنے۔

سعود بن عبدالعزیز کی ولادت 12 جنوری 1902 عیسوی کو ہوئی، اور ان کی وفات 67 سال کی عمر میں 23 فروری 1969 عیسوی کو ہوئی، 2 نومبر 1964 عیسوی کو ایک مجلس نے، جو شاہی خاندان کے ایک سو افراد اور ستر علما پر مشتمل تھی، شاہ سعود کو تخت سے اتار دیا اور ان کے بھائی فیصل بن عبدالعزیز کو ان کی جگہ بادشاہ نامزد کر دیا۔

(3)

فیصل بن عبدالعزیز

(1964 عیسوی تا 1975 عیسوی)

سعود بن عبدالعزیز کے معزول ہونے کے بعد ان کے بھائی، فیصل بن عبدالعزیز بن عبد

الرحمٰن بن فیصل بن ترکی آل سعود، سعودی عرب کے حکمران بنے۔

1953 عیسوی میں جب سعود بن عبدالعزیز بادشاہ بنے، شاہ فیصل ولی عہد قرار دیے گئے تھے۔شاہ فیصل بن عبدالعزیز آلِ سعود کی ولادت اپریل 1906 عیسوی میں ہوئی، اور ان کو 69 سال کی عمر میں 25 مارچ 1975 عیسوی کو ان کے بھتیجے نے شاہی دربار میں گولی مار کر قتل کر دیا۔

اتحادِ اسلام، شاہ فیصل کا بہت بڑا نصبُ العین تھا اور انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اس مقصد میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

1962 عیسوی میں رابطۂ عالم اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی، جو مسلمانوں کی پہلی حقیقی بین الاقوامی تنظیم ہے، اگرچہ یہ تنظیم اوران کے بھائی شاہ سعود بن عبدالعزیز کے زمانے میں قائم ہوئی تھی، لیکن اس کے اصل روح رواں ان کے بھائی شاہ فیصل تھے، جو اس وقت وزیرِ خارجہ تھے۔

شاہ فیصل 1966 عیسوی میں ترکی گئے، اور اس طرح وہ ترکی کا دورہ کرنے والے پہلے عرب سربراہ بن گئے، اس دورے سے نہ صرف سعودی عرب اور ترکی کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں مدد ملی، بلکہ عربوں اور ترکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو گیا اور پرانے زخم بھرنے لگے۔

(4)

خالد بن عبدالعزیز

(1975 عیسوی تا 1982 عیسوی)

فیصل بن عبدالعزیز کے بعد ان کے بھائی خالد بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی، سعودی عرب کے حکمران بنے۔

خالد بن عبدالعزیز کی ولادت 13 فروری 1913 عیسوی میں ہوئی، اور ان کی وفات 69 سال کی عمر میں 13 جون 1982 عیسوی کو ہوئی۔

خالد بن عبدالعزیز، شاہ فیصل کے تخت نشین ہونے کے بعد 2 نومبر 1964 عیسوی کو ولی عہد سلطنت اور نائب وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے، اور وہ 24 مارچ 1975 عیسوی کو، شاہ فیصل کی شہادت کے بعد، سریر آرائے سلطنت ہوئے۔

یہ اپنے دورِ حکومت میں بالغ نظر سیاست دان، مدبر اور غیر معمولی درجے کے منتظم ثابت ہوئے۔

(5)

فہد بن عبدالعزیز

(1982 عیسوی تا 2005 عیسوی)

خالد بن عبدالعزیز کے بعد ان کے بھائی فہد بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی، سعودی عرب کے حکمران بنے۔

شاہ فہد بن عبدالعزیز کی ولادت 16 مارچ 1921 عیسوی کو ہوئی، اور ان کی وفات 84 سال کی عمر میں یکم اگست 2005 عیسوی میں ہوئی۔

شاہ فہد ولی عہد بننے سے پہلے 1975 عیسوی میں سعودی عرب کے وزیرِ تعلیم رہے۔

ایک طویل عرصہ حکمرانی کے بعد 1997 عیسوی میں شاہ فہد نے دل کے عارضے میں مبتلا ہونے کے بعد خود کو روزمرہ کے حکومتی معاملات سے علیحدہ کر لیا تھا اور شاہی اختیارات اپنے سوتیلے بھائی ولی عہد شہزادہ عبداللہ کو منتقل کر دیے تھے۔

شاہ فہد سے پہلے یہاں کے سربراہانِ مملکت کو ''جلالۃُ الملک'' پکارا جاتا تھا، لیکن شاہ فہد نے ''جلالۃُ الملک'' بدل کر ''خادم الحرمین الشریفین'' کا لقب پسند کیا۔

(6)

عبداللہ بن عبدالعزیز

(2005 عیسوی تا 2015 عیسوی)

فہد بن عبدالعزیز کے بعد ان کے بھائی عبداللہ بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی،

سعودی عرب کے حکمران بنے۔

شاہ فہد کی وفات کے بعد ان کے بھائی ''عبداللہ'' شاہی تخت پر، یکم اگست 2005 عیسوی کو بیٹھے۔ ''فورب میگزین'' کے مطابق شاہ عبداللہ دنیا کے آٹھویں طاقتور ترین انسان تھے۔

عبداللہ بن عبدالعزیز کی ولادت یکم اگست 1924 عیسوی کو ہوئی، اور ان کی وفات 90 سال کی عمر میں 23 جنوری 2015 عیسوی میں ہوئی۔

(7)

سلمان بن عبدالعزیز

(2015 عیسوی سے تاحال 2019 عیسوی)

عبداللہ بن عبدالعزیز کے بعد ان کے 79 سالہ بھائی شاہ سلمان بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی، سعودی عرب کے حکمران بنے، جنھیں شہزادہ نائف بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد ولی عہد کا منصب دیا گیا تھا۔

سلیمان بن عبدالعزیز کی ولادت 31 دسمبر 1935 عیسوی کو ہوئی، اور یہ تاحال (2019 عیسوی) سعودی عرب کے حکمران ہیں۔

سعودی عرب کے موجودہ (2019 عیسوی کے) حکمران سلمان بن عبدالعزیز آلِ سعود نے 28 اپریل 2015ء کو اپنے شاہی فرمان کے ذریعے شہزادہ محمد بن نائف بن عبدالعزیز کو ولی عہد مقرر کیا، شہزادہ محمد بن نایف کی والدہ شہزادی الجوہرہ بنتِ عبدالعزیز بن مساعد کے نام سے مشہور ہیں، شہزادہ محمد بن نایف نے شہزادی ریما بنتِ سلطان بن عبدالعزیز سے شادی کی۔

شہزادہ محمد بن نایف بن عبدالعزیز، 30 اگست 1959ء کو جدہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد شہزادہ نایف بن عبدالعزیز سعودی عرب کے وزیر داخلہ اور سابق ولی عہد تھے، جو 16 جون 2012ء میں فوت ہو گئے تھے۔

اس کے بعد سلمان بن عبدالعزیز نے 28 اپریل 2015 عیسوی کو ہی اپنے شاہی فرمان

کے ذریعے، اپنے بیٹے شہزادہ محمد بن سلمان کو نائب ولی عہد مقرر کیا، اس وقت شہزادہ محمد بن سلمان بن عبدالعزیز نائب ولی عہد کے ساتھ نائب وزیراعظم، وزیر دفاع اور اقتصادی ترقی کونسل کے صدر بھی ہیں۔

محمد بن سلمان آلِ سعود کی پیدائش 31 اگست 1985 عیسوی میں ہوئی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے نجدی حکمرانوں کے ابتداء سے لے کر اب تک کا اجمالی نقشہ سامنے آجاتا ہے، اور اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فردِ بشر ہونے کی حیثیت سے سعودی ونجدی حکمرانوں سے بھی مختلف لغزشیں صادر ہوئی ہوں گی، لیکن اس کے باوجود، اسلامی و مذہبی اعتبار سے مجموعی طور پر سعودی ونجدی حکمرانوں کا دورِ حکومت ان کے زمانے کے دوسرے عام مسلمانوں کی مملکت سے بہتر اور عمدہ رہا، جو وقت گزرنے کے ساتھ دورِ انحطاط کا حصہ بنتا رہا، لیکن اب بھی انحطاط کے دور میں موجودہ سعودی حکمرانوں کا وجود بہت غنیمت ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے عالمِ اسلام اور اسلامی دنیا کے مرکز ہونے کی حیثیت سے دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں اور ملکوں کو سعودی حکومت سے قرب حاصل ہو اور دینی و مذہبی اعتبار سے غلط فہمیاں اور دوریاں کم یا ختم ہوں، جس میں دوسرے ملکوں کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ سعودی حکمرانوں کو بھی ایک قدم آگے بڑھ کر وسعتِ ظرفی وقلبی کے ساتھ کردار ادا کرنے کی ضروت ہوگی۔

کیونکہ بعض سعودی حکمرانوں اور عوام کی طرف سے دوسرے ممالک کے حکمرانوں اور عوام کے ساتھ غیر معمولی خشک اور لااُبالی پن والا رویہ سامنے آتا ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمان حکمرانوں اور عوام کو ایک دوسرے سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو اتحاد واتفاق کے ساتھ نئے عالمی چیلنجز کا بحسن وخوبی مقابلہ کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.

(باب نمبر1)

شیخ محمد بن عبدُالوہاب نجدی

اوران کے متبعین کے عقائدوافکار

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفیٰ: 1206ھجری) عرب کی ایک نہایت عظیم علمی شخصیت اوراسلام کے عظیم مجاہد گزرے ہیں، اوران کے عقائدوافکار کے متعلق مختلف نظریات وآراء پائی جاتی ہیں، اوران پر مختلف قسم کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں، تاہم خود شیخ محمد بن عبد الوھاب نجدی کی اپنی تحریرات اور مکتوبات سے ہی بیشتر اعتراضات وشبہات کا بے بنیاد الزام و بہتان ہونا اوران کے بنیادی عقائدوافکار کا اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہونا معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ کئی اہلِ علم حضرات، بالخصوص مشائخِ دیوبند نے بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ اوران کے متبعین پر کلام کیا ہے۔

اس باب میں پہلے مرحلے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی چند تحریرات ومکتوبات ذکر کیے جاتے ہیں، پھر دوسرے مرحلے میں، ان شاء اللہ تعالیٰ چند دیگر اہلِ علم حضرات اور بعض حکمرانِ آلِ سعود اور پھر بعض اہم مشائخِ دیوبند اور دوسرے چند اہلِ علم حضرات کے حوالہ جات وعبارات کو مفید توضیح وتشریح کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

جس کے ضمن میں ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے کہ جس شخصیت کے کلام وعبارت سے جو کچھ ظاہر ہورہا ہو، اس کی ترجمانی کرنے میں امانت ودیانت کا اہتمام کیا جائے، اور کسی قسم کی خیانت کا ارتکاب نہ کیا جائے، اگرچہ وہ کسی کے جذبات کے موافق ہو یا مخالف، کیونکہ علمی دیانت داری کا تقاضا یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ حق کو سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(فصل نمبر 1)

شیخ محمد بن عبدُ الوہاب نجدی کے مکتوبات وحوالہ جات

سب سے پہلے اس سلسلہ میں خود شیخ محمد بن عبدالوہاب کی عبارات وتصریحات نقل کی جاتی ہیں، جن کے ضمن میں ان شاء اللہ تعالیٰ بندہ محمد رضوان کی طرف سے بعض توضیحات بھی ذکر کی جائیں گی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا پہلا اور دوسرا مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ایک رسالہ، جو اہلِ قصیم کے لیے لکھا گیا، جب انہوں نے شیخ موصوف کے عقیدہ کے متعلق سوال کیا، اور وہ ''عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم'' کے عنوان سے شائع ہوا، اس رسالہ کا مضمون اردو ترجمہ سمیت درجِ ذیل ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

أشهد الله، ومن حضرني من الملائكة، وأشهدكم، أني أعتقد ما اعتقدته الفرقة الناجية، أهل السنة والجماعة: من الإيمان بالله، وملائكته، وكتبه، ورسله، والبعث بعد الموت، والإيمان بالقدر خيره وشره.

ومن الإيمان بالله: الإيمان بما وصف به نفسه في كتابه على لسان رسوله صلى الله عليه وسلم، من غير تحريف ولا تعطيل؛ بل أعتقد أن الله سبحانه وتعالى ليس كمثله شيء، وهو السميع

البصير .فلا أنفى عنه ما وصف به نفسه، ولا أحرف الكلم عن مواضعه، ولا ألحد فى أسمائه وآياته، ولا أكيف، ولا أمثل صفاته تعالى بصفات خلقه، لأنه تعالى لا سمى له، ولا كفء له، ولا ند له، ولا يقاس بخلقه .فإنه سبحانه أعلم بنفسه وبغيره، وأصدق قيلا، وأحسن حديثا؛ فنزه نفسه عما وصفه به المخالفون من أهل التكييف والتمثيل، وعما نفاه عنه النافون من أهل التحريف والتعطيل، فقال: (سبحان ربک رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين)

والفرقة الناجية وسط فى باب أفعاله تعالى، بين القدرية والجبرية، وهم فى باب وعيد الله بين المرجئة والوعيدية، وهم وسط فى باب الإيمان والدين بين الحرورية والمعتزلة، وبين المرجئة والجهمية، وهم وسط فى باب أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بين الروافض والخوارج.

وأعتقد أن القرآن كلام الله، منزل غير مخلوق، منه بدأ وإليه يعود، وأنه تكلم به حقيقة، وأنزله على عبده ورسوله، وأمينه على وحيه وسفيره بينه وبين عباده: نبينا محمد صلى الله عليه وسلم .

وأومن بأن الله فعال لما يريد، ولا يكون شىء إلا بإرادته، ولا يخرج شىء عن مشيئته، وليس شىء فى العالم يخرج عن تقديره، ولا يصدر إلا عن تدبيره؛ ولا محيد لأحد عن القدر المحدود، ولا يتجاوز ما خط له فى اللوح المسطور.

وأعتقد الإيمان بكل ما أخبر به النبى صلى الله عليه وسلم مما

يكون بعد الموت: فأومن بفتنة القبر ونعيمه، وبإعادة الأرواح إلى الأجساد؛ فيقوم الناس لرب العالمين، حفاة عراة غرلا، تدنو منهم الشمس، وتنصب الموازين وتوزن بها أعمال العباد،: (فمن ثقلت موازينه فأولئک هم المفلحون ومن خفت موازينه فأولئک الذين خسروا أنفسهم فی جهنم خالدون) وتنشر الدواوين، فآخذ كتابه بيمينه،وآخذ كتابه بشماله.

وأومن بحوض نبينا محمد صلى الله عليه وسلم بعرصة القيامة، ماؤه أشد بياضا من اللبن، وأحلى من العسل، آنيته عدد نجوم السماء، من شرب منه شربة لم يظمأ بعدها أبدا.

وأومن بأن الصراط منصوب على شفير جهنم، يمر به الناس على قدر أعمالهم.

وأومن بشفاعة النبی صلى الله عليه وسلم، وأنه أول شافع وأول مشفع، ولا ينكر شفاعة النبی صلى الله عليه وسلم إلا أهل البدع والضلال؛ ولكنها لا تكون إلا من بعد الإذن والرضى، كما قال تعالى: (ولا يشفعون إلا لمن ارتضى)وقال تعالى:(من ذا الذی يشفع عنده إلا بإذنه)وقال تعالى: (وكم من ملک فی السماوات لا تغنی شفاعتهم شيئا إلا من بعد أن يأذن الله لمن يشاء ويرضى)وهو لا يرضى إلا التوحيد، ولا يأذن إلا لأهله، وأما المشركون فليس لهم من الشفاعة نصيب، كما قال تعالى: (فما تنفعهم شفاعة الشافعين)

وأومن بأن الجنة والنار مخلوقتان، وأنهما اليوم موجودتان،

وأنهما لا يفنيان.

وأن الـمـؤمـنين يرون ربهم بأبصارهم يوم القيامة كما يرون القمر ليلة البدر، لا يضامون فى رؤيته.

وأومـن بـأن نبيـنـا مـحـمـدا صـلـى الـلـه عليه وسلم خاتم النبيين والـمـرسـلـين، ولا يـصـح إيـمـان عبد حتى يؤمن برسالته ويشهد بنبوته.

وأن أفضل أمته: أبـو بكر الصديق، ثم عمر الفاروق، ثم عثمان ذو الـنـورين، ثم على المرتضى، ثم بقية العشرة، ثم أهل بدر، ثم أهل الشجرة أهل بيعة الرضوان، ثم سائر الصحابة رضى الله عنهم.

وأتـولـى أصـحـاب رسـول الـلـه صـلـى الله عليـه وسلم وأذكر مـحـاسـنهم، وأترضى عنهم، وأستغفر لهم، وأكف عن مساويهم، وأسـكـت عـمـا شـجـر بيـنهم، وأعتقد فضلهم عملا بقوله تعالى: (والـذيـن جـاء وا مـن بعدهم يقولون ربنا اغفر لنا ولإخواننا الذين سبـقـونـا بـالإيمان ولا تجعل فى قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا إنـك رؤوف رحيـم)وأتـرضـى عـن أمهات المؤمنين المطهرات من كل سوء.

وأقـر بـكـرامـات الأولـيـاء ومـا لهـم مـن الـمكاشفات، إلا أنهم لا يستحقون من حق الله تعالى شيئا، ولا يطلب منهم ما لا يقدر عليه إلا الله .ولا أشهـد لأحد من المسلمين بجنة ولا نار، إلا من شهد لـه رسـول الـلـه صـلـى الـلـه عـليه وسلم، ولكنى أرجو للمحسن وأخـاف عـلـى المسىء، ولا أكفر أحدا من المسلمين بذنب، ولا

أخرجه من دائرة الإسلام .

وأرى الجهاد ماضيا مع كل إمام برا كان أو فاجرا، وصلاة الجماعة خلفهم جائزة.

والجهاد ماض منذ بعث الله محمدا صلى الله عليه وسلم إلى أن يقاتل آخر هذه الأمة الدجال، لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل .

وأرى وجوب السمع والطاعة لأئمة المسلمين، برهم وفاجرهم، ما لم يأمروا بمعصية الله .ومن ولى الخلافة واجتمع عليه الناس، ورضوا به، وغلبهم بسيفه حتى صار خليفة، وجبت طاعته، وحرم الخروج عليه.

وأرى هجر أهل البدع ومباينتهم حتى يتوبوا، وأحكم عليهم بالظاهر وأكل سرائرهم إلى الله .وأعتقد أن كل محدثة فى الدين بدعة.

وأعتقد أن الإيمان: قول باللسان، وعمل بالأركان، واعتقاد بالجنان، يزيد بالطاعة وينقص بالمعصية؛ وهو بضع وسبعون شعبة، أعلاها: شهادة أن لا إله إلا الله، وأدناها: إماطة الأذى عن الطريق .

وأرى وجوب الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر على ما توجبه الشريعة المحمدية الطاهرة.

فهذه عقيدة وجيزة، حررتها وأنا مشتغل البال، لتطلعوا على ما عندى .والله على ما نقول وكيل.

ثم لا يخفى عليكم، أنه بلغنى أن رسالة سليمان بن سحيم قد

وصلت إليكم، وأنه قبلها وصدقها بعض المنتمين للعلم فى جهتكم؛ والله يعلم أن الرجل افترى على أمورا لم أقلها، ولم يأت أكثرها على بالى.

فمنها: قوله: إنى مبطل كتب المذاهب الأربعة، وإنى أقول: إن الناس من ستمائة سنة ليسوا على شىء، وإنى أدعى الاجتهاد، وإنى خارج عن التقليد، وإنى أقول: إن اختلاف العلماء نقمة، وإنى أكفر من توسل بالصالحين، وإنى أكفر البوصيرى لقوله: يا أكرم الخلق، وإنى أقول: لو أقدر على هدم قبة رسول الله صلى الله عليه وسلم لهدمتها، ولو أقدر على الكعبة لأخذت ميزابها وجعلت لها ميزابا من خشب، وإنى أحرم زيارة قبر النبى صلى الله عليه وسلم، وإنى أنكر زيارة قبر الوالدين وغيرهما، وإنى أكفر من حلف بغير الله، وإنى أكفر ابن الفارض وابن عربى، وإنى أحرق دلائل الخيرات وروض الرياحين وأسميه روض الشياطين.

جوابى عن هذه المسائل، أن أقول: سبحانك هذا بهتان عظيم! وقبله من بهت محمدا صلى الله عليه وسلم أنه يسب عيسى بن مريم ويسب الصالحين، فتشابهت قلوبهم بافتراء الكذب وقول الزور.

قال تعالى: (إنما يفترى الكذب الذين لا يؤمنون بآيات الله)الآية، بهتوه صلى الله عليه وسلم بأنه يقول: إن الملائكة وعيسى وعزيرا فى النار، فأنزل الله فى ذلك:(إن الذين سبقت لهم منا الحسنى أولئك عنها مبعدون)

وأما المسائل الأخر، وهي: أني أقول: لا يتم إسلام الإنسان حتى يعرف معنى "لا إله إلا الله"، وأني أعرف من يأتيني بمعناها، وأني أكفر الناذر إذا أراد بنذره التقرب لغير الله، وأخذ النذر لأجل ذلك، وأن الذبح لغير الله كفر والذبيحة حرام.

فهذه المسائل حق، وأنا قائل بها .ولي عليها دلائل من كلام الله وكلام رسوله، ومن أقوال العلماء المتبعين كالأئمة الأربعة .وإذا سهل الله تعالى، بسطت الجواب عليها في رسالة مستقلة، إن شاء الله تعالى.

ثم اعلموا وتدبروا قوله تعالى:(يا أيها الذين آمنوا إن جائكم فاسق بنبأ فتبينوا أن تصيبوا قوما بجهالة)الآية (الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص٨ الى١٣ ،القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم، الرسالة الأولى:رسالة الشيخ إلى أهل القصيم لما سألوه عن عقيدته، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں اللہ کو گواہ بنا کر اور جو فرشتے میرے پاس حاضر ہیں، ان کو گواہ بنا کر اور آپ لوگوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرا عقیدہ وہی ہے، جو اہلُ السنۃ والجماعۃ ،فرقۂ ناجیہ کا ہے، یعنی اللہ پر ایمان، اور اس کے فرشتوں پر ایمان، اور اس کی کتابوں پر ایمان، اور اس کے رسولوں پر ایمان، اور موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان، اور خیر اور شر کی تقدیر پر ایمان۔

اور اللہ پر ایمان، ان صفات کے ساتھ، جن صفات سے اللہ نے اپنے آپ کو اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر متصف کیا ہے، بغیر تحریف اور تعطیل کے، بلکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں، اور وہ سمیع ہے، بصیر ہے، پس میں ان میں سے کسی صفت کی نفی نہیں کرتا، جس کے ساتھ اللہ نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے، اور نہ میں کلمات کی اس کے مواضع سے تحریف کرتا ہوں، اور نہ میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی آیات میں الحاد کرتا ہوں، اور نہ میں اللہ کو کسی کیفیت کے ساتھ متصف کرتا ہوں، اور نہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس کی مخلوق کی صفات کے مثل ہونے کا قائل ہوں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعیین نہیں فرمائی، کوئی اس کا کفو نہیں، اور نہ کوئی اس کا شریک ہے، اور نہ اُس کو اِس کی مخلوق پر قیاس کیا جاسکتا، پس بے شک اللہ سبحانہٗ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ جانتا ہے، اور وہ اپنے قول میں سب سے سچا اور اپنی بات میں سب سے اچھا ہے، پس اللہ کی ذات ان صفات سے پاک ہے، جن کے ساتھ اہلِ تکییف اور اہلِ تمثیل میں سے مخالفین متصف کرتے ہیں، اور ان صفات سے بھی پاک ہے، جن کی اہلِ تحریف اور اہلِ تعطیل میں سے نفی کرنے والے نفی کرتے ہیں، پس اللہ عزوجل کا ارشاد ہے کہ ''**سبحان ربک رب العزة عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للّٰہ رب العالمین**''

اور فرقۂ ناجیہ، اللہ تعالیٰ کے افعال کے باب میں ''قدریة'' اور ''جبریة'' کے مابین وسط واعتدال پر ہے، اور فرقۂ ناجیہ، اللہ کی وعید کے باب میں ''مرجئة'' اور ''وعیدیة'' کے مابین ہے، اور فرقۂ ناجیہ، ایمان اور دین کے باب میں ''حروریة'' اور ''معتزلة'' اور ''مرجئة'' اور ''جهمية'' کے مابین ہے، اور

فرقۂ ناجیہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام کے باب میں ''روافض'' اور ''خوارج'' کے مابین ہے۔

اور میرا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، جو غیر مخلوق ہونے کی حیثیت سے نازل کیا گیا، اللہ ہی سے اس کی ابتدا ہوئی، اور اسی کی طرف وہ عود کرے گا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کا حقیقی کلام کیا ہے، اور اس قرآن کو اپنے بندے اور رسول پر نازل کیا ہے، جو کہ اللہ کی وحی کا امین ہے، اور اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفیر ہے، جو ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور میرا اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ کی صفت ''**فعال لما یرید**'' ہے، اور کوئی چیز بھی اس کے ارادہ کے بغیر نہیں ہوتی، اور کوئی چیز اس کی مشیت کے بغیر نہیں نکلتی، اور کوئی چیز عالم میں اس کی تقدیر سے خارج نہیں، اور نہ کوئی چیز اس کی تدبیر کے بغیر صادِر ہوتی ہے، اور کسی کے لیے اللہ کی مقرر کردہ مقدار سے ہٹنے کا اختیار نہیں ہے، اور لوحِ محفوظ میں جو کچھ اللہ نے لکھ دیا ہے، اس سے کسی چیز کے تجاوز کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہر اس چیز پر ایمان لایا جائے، جس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کے بعد کے متعلق خبر دی ہے، پس میں قبر کے فتنے (اور قبر کے عذاب) اور قبر کی نعمتوں پر ایمان رکھتا ہوں، اور روحوں کے جسموں کی طرف اعادہ پر بھی ایمان رکھتا ہوں، پھر (قیامت کے دن) لوگ ربُّ العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے، جو ننگے پاؤں، اور ننگے جسم ہوں گے، سورج ان کے قریب ہوگا، اور موازینِ قسط کو قائم کیا جائے گا، جن کے ذریعے سے بندوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا ''**فمن ثقلت موازینه فأولئک هم المفلحون ومن خفت موازینه فأولئک الذین خسروا أنفسهم فی جهنم خالدون**'' اور

نامۂ اعمال پھیلائے جائیں گے، پس کوئی اپنے نامۂ اعمال کو دائیں ہاتھ میں لینے والا ہوگا، اور کوئی اپنے نامۂ اعمال کو بائیں ہاتھ میں لینے والا ہوگا۔

اور میں ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بروزِ قیامت ''حوض'' پر بھی ایمان رکھتا ہوں، جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے، اس کے برتن آسمانوں کے ستاروں کے عدد کے برابر ہیں، جس نے اس میں سے ایک مرتبہ پی لیا، تو وہ اس کے بعد کبھی بھی پیاسا نہیں ہوگا۔

اور میں اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ پل صراط کو جہنم کے گڑھے کے اوپر قائم کیا جائے گا، جس سے لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے گزریں گے۔

اور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر بھی ایمان رکھتا ہوں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے شفاعت کرنے والے ہیں، اور سب سے پہلے آپ کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار، صرف اہلِ بدعت اور گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت، اللہ کی طرف سے اجازت اور رضا کے بعد ہی ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''**ولا یشفعون إلا لمن ارتضی**'' نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''**من ذا الذی یشفع عندہ إلا بإذنہ**'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ''**وکم من ملک فی السماوات لا تغنی شفاعتھم شیئا إلا من بعد أن یأذن اللہ لمن یشاء ویرضی**'' اور اللہ صرف توحید سے ہی راضی ہوگا، اور جو شفاعت کے اہل ہوں گے، ان ہی سے راضی ہوگا، لیکن مشرکین کو شفاعت سے کوئی حصہ حاصل نہیں ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''**فما تنفعھم شفاعة الشافعین**''

اور میں اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ جنت اور جہنم دونوں اللہ کی مخلوق ہیں،

اور وہ اس وقت بھی موجود ہیں، اور وہ کبھی فنا نہیں ہوں گی۔

اور میں اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ مومنین قیامت کے دن اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے اسی طرح سے دیکھیں گے، جس طرح سے چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں، اس کے دیکھنے میں کوئی شک نہیں کرتے۔

اور میں اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ''خاتم النبیین'' اور ''خاتم المرسلین'' ہیں، اور کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لے آئے، اور آپ کی نبوت کی شہادت نہ دے دے۔

اور میں اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اس امت کی سب سے افضل شخصیت ''ابوبکر صدیق'' رضی اللہ عنہ ہیں، پھر ''عمر فاروق'' رضی اللہ عنہ ہیں، پھر ''عثمان ذوالنورین'' رضی اللہ عنہ ہیں، پھر ''علی المرتضٰی'' رضی اللہ عنہ ہیں، پھر باقی ''عشرۂ مبشرہ'' ہیں، پھر اہلِ بدر ہیں، پھر بیعتِ رضوان والے ''اہلِ شجرہ'' ہیں، پھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام سے محبت رکھتا ہوں، اور ان کے محاسن کا ذکر کرتا ہوں، اور ان کو رضی اللہ عنہم سمجھتا ہوں، اور ان کے لیے استغفار کرتا ہوں، اور ان کی برائی سے اپنے آپ کو روکتا ہوں، اور جو ان کے مابین اختلافات ہوئے، ان سے سکوت اختیار کرتا ہوں، اور عمل کے اعتبار سے ان کی فضیلت کا اعتقاد رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے کہ ''وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ'' اور امہات المومنین کو بھی ہر برائی سے پاک سمجھ کر رضی اللہ

عنہن قرار دیتا ہوں۔

اور میں اولیائے کرام کی کرامات کو تسلیم کرتا ہوں، اوران کے مکاشفات کو بھی تسلیم کرتا ہوں، لیکن اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کے کسی حق کا مستحق نہیں سمجھتا، اوران سے ایسی چیزوں کے طلب کرنے کو روا نہیں سمجھتا، جن پر اللہ کے علاوہ کوئی قادر نہیں، اور میں مسلمانوں میں سے کسی کے لیے جنت اور جہنم کی گواہی نہیں دیتا، سوائے اس کے، جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہی دے دی ہو، لیکن میں نیک عمل کرنے والے کے لیے اچھی امید رکھتا ہوں، اور برے عمل کرنے والے پر خوف رکھتا ہوں، اور میں مسلمانوں میں سے کسی کو، کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیتا، اور نہ ہی اس کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتا۔

اور میں جہاد کو ہر امام کے ساتھ جائز سمجھتا ہوں، چاہے وہ نیک ہو یا فاجر ہو، اوران کے پیچھے نماز پڑھنے کو بھی جائز سمجھتا ہوں۔ [1]

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے جہاد کا آغاز ہو گیا تھا، جو اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک اس امت کا آخری شخص دجال سے قتال نہ کر لے، جس کو کسی ظلم کرنے والے کا ظلم، اور عدل کرنے والا کا عدل باطل نہیں کر سکتا۔

اور میں ائمۂ مسلمین کی بات سننے اور اطاعت کرنے کو واجب سمجھتا ہوں، خواہ وہ نیک ہوں یا فاجر ہوں، جب تک کہ وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ کریں، اور جس کو خلافت وحکومت حاصل ہو گئی، اور اس پر لوگ جمع ہو گئے، اور اس سے راضی ہو گئے، اور وہ اپنی تلوار کے ذریعے سے لوگوں پر غالب ہو گیا، یہاں تک کہ وہ خلیفہ بن گیا، تو اس کی اطاعت واجب ہے، اور اس کے خلاف خروج حرام ہے۔

---

[1] علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں اس مسئلہ کو وضاحت وتوضیح کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اہلِ بدعت، کافر نہیں، اور جب بدعتی سے بہتر امام میسر نہ ہو، نہ ہی اس کو امامت پر رکھنے اور ہٹانے کا اختیار ہو، تو اس کی اقتداء میں بلا کراہت نماز جائز ہے، اور وہ بعد میں واجب الاعادہ بھی نہیں، جیسا کہ دوسرے باب میں اس کا ذکر آتا ہے۔ محمد رضوان۔

اور میں اہلِ بدعت سے ترکِ تعلق اور ان سے علیحدگی کا قائل ہوں، یہاں تک کہ وہ توبہ کرلیں، اور میں ان پر ظاہری اعمال کے اعتبار سے حکم لگاتا ہوں، اور ان کی پوشیدہ چیزوں کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں، اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ دین میں ہر نو ایجاد عمل بدعت ہے۔ [1]

۔اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت ''قول باللسان وعمل بالارکان واعتقاد بالجنان '' ہے، ایمان نیک عمل سے زیادہ ہوتا ہے، اور گناہ سے کم ہوتا ہے۔ [2]

اور ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، جن میں سے اعلیٰ شعبہ ''شهادة أن لا إله إلا الله'' ہے، اور ان میں سے ادنیٰ شعبہ ''إماطة الأذى عن الطريق'' ہے۔

اور میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کو واجب سمجھتا ہوں، ان چیزوں پر، جن کو شریعتِ محمدیہ طاہرہ نے واجب قرار دیا ہے۔

پس یہ واضح اور مختصر عقیدہ ہے، جس کو میں نے تحریر کردیا ہے، باوجودیکہ میں اس وقت مصروف ہوں، تاکہ تمہیں میرے عقیدے کی خبر ہوجائے، اور ہم جو بات کہتے ہیں، اللہ اس پر نگران ہے۔

پھر تم پر یہ بات مخفی نہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سلیمان بن سحیم کا رسالہ تمہاری طرف پہنچ گیا ہے، جس کو آپ میں سے بعض دیانت دار اہلِ علم حضرات نے قبول کرلیا ہے، اور اس کی تصدیق کردی ہے، اور اللہ یہ بات جانتا ہے کہ اس شخص (یعنی سلیمان بن سحیم) نے مجھ پر چند امور میں جھوٹ باندھا ہے، جن کا میں قائل نہیں ہوں، اور ان میں سے اکثر چیزیں میرے دل میں نہیں ہیں۔

---

[1] اہلِ بدعت کے متعلق تفصیلی حکم اگلے باب میں آتا ہے۔ محمد رضوان۔

[2] ایمان کے کم یا زیادہ ہونے کا مسئلہ بھی، ائمہ مسلمین میں اختلافی ہے، جبکہ بعض حضرات اس کو صرف نزاعِ لفظی یعنی لفظی اختلاف قرار دیتے ہیں، حقیقی ومعنوی اختلاف نہیں سمجھتے۔ محمد رضوان۔

ان میں سے سلیمان بن سحیم کا یہ کہنا بھی ہے کہ میں مذاہبِ اربعہ کی کتب کو باطل قرار دیتا ہوں، اور میں یہ کہتا ہوں کہ لوگ چھ سو سال سے درست طریقے پر نہیں ہیں، اور میں اجتہاد کا دعویٰ کرتا ہوں، اور میں تقلید سے خارج ہوں، اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ علماء کا اختلاف نقمت اور زحمت ہے، اور میں نیک لوگوں کے ساتھ وسیلہ پکڑنے والوں کو کافر قرار دیتا ہوں، اور بوصیری کی ان کے اس قول پر تکفیر کرتا ہوں کہ ''یا اکرم الخلق'' اور میں یہ بات کہتا ہوں کہ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبے کو منہدم کرنے پر قادر ہو گیا، تو میں اس کو منہدم کردوں گا، اور میں اگر کعبہ پر قادر ہو گیا، تو میں اس کے میزاب کو نکال دوں گا، اور اس کی جگہ لکڑی کا میزاب قائم کردوں گا، اور یہ کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کو حرام قرار دیتا ہوں، اور یہ کہ میں والدین وغیرہ کی قبر کی زیارت کا انکار کرتا ہوں، اور یہ کہ میں اللہ کے علاوہ قسم اٹھانے والے کو کافر قرار دیتا ہوں، اور یہ کہ میں ابنِ فارض اور ابنِ عربی کو کافر قرار دیتا ہوں، اور یہ کہ میں ''دلائل الخیرات'' اور ''روض الریاحین'' کو جلا دیتا ہوں، اور اس کا نام ''روض الشیاطین'' رکھتا ہوں۔

ان تمام مسائل کے بارے میں میرا جواب یہ ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ ''سُبۡحَانَکَ ھٰذَا بُھۡتَانٌ عَظِیۡمٌ'' اور اس سے پہلے بھی وہ لوگ ہوئے ہیں، جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان لگایا ہے کہ وہ عیسیٰ بن مریم کو برا بھلا کہتا ہے، اور صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کو برا بھلا کہتا ہے، پس ان لوگوں کے دل جھوٹ باندھنے اور جھوٹی بات کرنے میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِآيَاتِ

اللہِ‘‘لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بہتان لگایا تھا کہ وہ ملائکہ اور عیسیٰ اور عزیر کو جہنمی بتلاتے ہیں، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ’’اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی أُولٰئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ‘‘

اور جہاں تک ان کے علاوہ دوسرے مسائل کا تعلق ہے، جو یہ ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ انسان کا اسلام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ کے معنیٰ کو پہچان نہ لے، اور میں اس کے معنیٰ کی پہچان کراتا ہوں، جو میرے پاس آتا ہے، اور میں اس کی تکفیر کرتا ہوں، جو اللہ کے علاوہ کسی اور کا تقرب حاصل کرنے کے لیے نذر مانتا ہے، اور اس کی وجہ سے نذر کو لیتا ہے، اور اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام پر ذبح کرنا کفر ہے، اور ذبیحہ حرام ہے۔

پس یہ مسائل حق ہیں، اور میں ان کا قائل ہوں، اور میرے پاس ان مسائل پر دلائل ہیں، اللہ کے کلام سے اور رسول کے کلام سے اور علمائے متبوعین سے، جیسا کہ ائمہ اربعہ، اور جب اللہ تعالیٰ سہولت عطا فرمائے گا، تو میں ان شاء اللہ تعالیٰ مستقل رسالے میں تفصیل کے ساتھ ان کا جواب دوں گا۔

پھر تم جان لو، اور تدبر کرو، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ’’یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنْ جَاءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ‘‘(عقیدةُ الشیخ)

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے اپنے ایک اور رسالہ میں جو انہوں نے’’عبداللہ بن سحیم‘‘ کی طرف لکھ کر ارسال کیا تھا، اس میں مندرجہ بالا مسائل کے دلائل بھی تحریر کیے تھے۔ [1]

---

[1] وأما المسائل الأخر، وهی: أنی أقول: لا یتم إسلام الإنسان حتی یعرف معنی "لا إله إلا الله"، ومنها: أنی أعرف من یأتینی بمعناها، ومنها: أنی أقول: الإله هو الذی فیه السر، ومنها: تکفیر الناذر إذا أراد به التقرب لغیر الله، وأخذ النذر کذلک، ومنها: أن الذبح للجن کفر، والذبیحة حرام ولو سمی الله علیها إذا ذبحها للجن، فهذه خمس مسائل کلها حق، وأنا قائلها.

ونبدأ بالکلام علیها لأنها أم المسائل، وقبل ذلک أذکر معنی "لا إله إلا الله"، فنقول: التوحید نوعان: توحید الربوبیة وهو: أن الله سبحانه متفرد بالخلق والتدبیر عن الملائکة والأنبیاء وغیرهم،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور اس مکتوب میں شیخ موصوف نے پختہ قبروں اور ان پر بنائے گئے گنبدوں کو توڑنے اور

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وهـذا حـق لا بد منه، لكن لا يدخل الرجل في الإسلام لأن أكثر الناس مقرون به، قال الله تعالى:(قل مـن يـرزقـكـم مـن السـمـاء والأرض أمن يملك السمع والأبصار)إلى قوله:(أفلا تتقون)وإن الذى يـدخـل الـرجـل فى الإسلام هو توحيد الألوهية، وهو: أن لا يعبـد إلا الـلـه، لا مـلكا مقربا، ولا نبيا مرسلا؛ وذلك أن النبى صلى الله عليه وسلم بعث وأهل الجاهلية يعبدون أشياء مع الله: فمنهم من يـدعو الأصنام، ومنهم من يدعو عيسى، ومنهم من يدعو الملائكة، فنهاهم عن هذا، وأخبرهم أن الله أرسـلـه ليـوحـد، ولا يـدعـى أحد من دونه، لا الملائكة ولا الأنبياء؛ فمن تبعه ووحد الله، فهو الذى شهـد أن لا إلـه إلا الـلـه، ومـن عـصاه ودعا عيسى والملائكة، واستنصرهم والتجأ إليهم، فهو الذى جحد لا إله إلا الله، مع إقراره أنه لا يخلق ولا يرزق إلا الله.

وهـذه جـملة لها بسط طويل، لكن الحاصل: أن هـذا مـجمع عليه بين العلماء .ولـما جرى فى هذه الأمة مـا أخبـر بـه نبيها صلى الله عليه وسلم، حيث قال: " لتتبعـن سنن من كان قبلكم، حذو القذة بـالـقـذة، حتى لو دخلوا جحر ضب لدخلتموه "، وكـان مـن قبـلهم كما ذكر الله عنهم:} اتخذوا أحبـارهـم ورهبـانهم أربابا من دون الله {، فـصـار نـاس مـن الـضالين يدعون أناسا من الصالحين فى الشـدة والـرخـاء، مثـل عبـد القادر الجيلانى، وأحمد البدوى، وعدى بن مسافر، وأمثالهم من أهل العبـادة والـصـلاح، فـأنـكـر عليهم أهل العلم غاية الإنكار، وزجروهم عن ذلك، وحذروهم غاية التـحذير والإنذار من جميع المذاهب الأربعة فى سائر الأقطار والأمصار، فلم يحصل منهم انزجار، بـل استـمـروا على ذلك غاية الاستمرار .وأمـا الـصـالـحـون الـذين يكرهون ذلك فحاشاهم من ذلك .وبين أهل العلم أن أمثال هذا هو الشرك الأكبر.

وأنت ذكرت فى كتابك تقول: يـا أخى، ما لنا والله دليل إلا من كلام أهل العلم؛ وأنا أقول: كلام أهـل الـعـلـم رضـى، وأنـا أنـقـلـه لك، وأنبهك عليه؛ فتفكر فيه، وقم لله ساعة ناظرا ومناظرا، مع نفسك ومع غيرك .فإن عرفت أن الصواب معى، وأن دين الإسلام اليوم من أغرب الأشياء، أعنى ديـن الإسـلام الصرف، الذى لا يمزج بالشرك والبدع، وأما الإسلام الذى ضده الكفر، فلا شك أن أمة مـحمد صلى الله عليه وسلم آخر الأمم، وعليها تقوم الساعة، فإن فهمت أن كلامى هو الحق فاعمل لنفسك.

واعـلم أن الأمر عظيم، والخطب جسيم .فـإن أشـكل عليك شىء، فسفرك إلى المغرب فى طلبه غير كثير .واعتبـر لنفسك حيث قلت لى فيما مضى: إن هـذا هو الحق الذى لا شك فيه، لكن لا نـقـدر على تغييره، وتكلمت بكلام حسن؛ فلما غربلك الله بولد المويس، ولبس عليك، وكتب لأهـل الـوشـم يستهزء بالتوحيد، ويزعم أنه بدعة، وأنه خرج من خراسان، ويسب دين الله ورسوله، لـم تـفـطـن لـجهـلـه وعـظـم ذنبـه، وظننت أن كلامى فيه من باب الانتصار للنفس .وكـلامى هذا لا يـغيـرك، فـإن مـرادى أن تفهم أن الخطب جسيم، وأن أكابر أهل العلم يتعلمون هذا ويغلطون فيه، فضلا عنا وعن أمثالنا .فلعله إن أشكل عليك تواجهنى؛ هذا إن عرفت أنه حق وإن كنت إذا نقلت

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

منہدم کرنے کے شریعت کے موافق ہونے کی بھی تصریح کی ہے۔ [1]

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کی مذکورہ تفصیلی عبارت سے معلوم ہوا کہ ان کے بنیادی عقائدوافکار وہی ہیں، جو اہلُ السنۃ والجماعۃ کے ہیں، اوران کی طرف بہت سی باتیں غلط اور جھوٹی منسوب کی گئی ہیں، جو کہ بہتان میں داخل ہیں، اور جن چیزوں کو شیخ موصوف نے شرک وکفر قرار دیا، ان کو دوسرے فقہائے کرام نے بھی شرک وکفر قرار دیا ہے۔

البتہ ان چیزوں میں مبتلا شخص اگر کسی معتبر تاویل کا قائل ہو، تو اس پر متعین طور پر صریح کفرو شرک کا حکم لگانے سے بعض اہلِ علم حضرات نے احتیاط اختیار کی ہے، اورانہوں نے ''لزومِ کفر'' اور''التزامِ کفر'' میں فرق کیا ہے، ہمیں علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی معلوم ہوا، جیسا کہ آگے دوسرے باب میں آتا ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا تیسرا مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کا ایک رسالہ، وہ ہے، جوانہوں نے اہلِ عراق کے ایک

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

لک عبارات العلماء، عرفت أنی لم أفهم معناها، وأن الذی نقلت لک کلامهم أخطؤوا، وأنهم خالفهم أحد من أهل العلم، فنبهنی علی الحق، وأرجع إلیه إن شاء الله تعالی(الرسائل الشخصیة "مطبوع ضمن مؤلفات الشیخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص ۶۴ الیٰ ۶۶، القسم الأول: عقیدة الشیخ وبیان حقیقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم، الرسالة الحادیة عشره: رسالته إلی عبد الله بن سحیم، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الریاض، المملکة العربیة السعودیة)

[1] وأما بقیه المسائل، فالجواب عنها ممکن إذا خلصنا من شهادة أن لا إله إلا الله، وبیننا وبینکم کلام أهل العلم .لکن العجب من قولک: أنا هادم قبور الصحابة، وعبارة الإقناع فی الجنائز یجب هدم القباب التی علی القبور، لأنها أسست علی معصیة الرسول؛ والنبی صلی الله علیه وسلم صح عنه أنه بعث علیا لهدم القبور .ومثل صاحب کتابکم لو کتب لکم أن ابن عبد الوهاب ابتدع، لأنه أنکر علی رجل تزوج أخته، فالعجب کیف راج علیکم کلامه فیه(الرسائل الشخصیة "مطبوع ضمن مؤلفات الشیخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص ۷۵، ۷۶، القسم الأول: عقیدة الشیخ وبیان حقیقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم، الرسالة الحادیة عشره: رسالته إلی عبد الله بن سحیم، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الریاض، المملکة العربیة السعودیة)

عالم ''سویدی'' کی طرف ارسال کیا، جنہوں نے محمد بن عبدالوہاب کی طرف ایک مکتوب بھیجا تھا، جس میں شیخ موصوف کے اقوال وافکار کے متعلق سوال کیا گیا تھا، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اس رسالے میں فرماتے ہیں:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

من محمد بن عبد الوهاب، إلى عبد الرحمن بن عبد الله، السلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

أما بعد، فقد وصل كتابك وسر الخاطر، جعلك الله من أئمة المتقين، ومن الدعاة إلى دين سيد المرسلين .وأخبرك أنى، ولله الحمد، متبع ولست بمبتدع؛ عقيدتى ودينى الذى أدين الله به: مذهب أهل السنة والجماعة، الذى عليه أئمة المسلمين، مثل الأئمة الأربعة وأتباعهم إلى يوم القيامة .لكنى بينت للناس إخلاص الدين لله، ونهيتهم عن دعوة الأحياء والأموات من الصالحين، وغيرهم، وعن إشراكهم فيما يعبد الله به من الذبح والنذر والتوكل والسجود وغير ذلك مما هو حق الله، الذى لا يشركه فيه ملك مقرب ولا نبى مرسل، وهو الذى دعت إليه الرسل من أولهم إلى آخرهم، وهو الذى عليه أهل السنة والجماعة .

وبينت لهم أن أول من أدخل الشرك فى هذه الأمة هم الرافضة الملعونة الذين يدعون عليا وغيره، ويطلبون منهم قضاء الحاجات وتفريج الكربات .وأنا صاحب منصب فى قريتى، مسموع الكلمة .فأنكر هذا بعض الرؤساء، لأنه خالف عادة نشؤوا عليها.

وأيضا ألزمت من تحت يدى بإقام الصلاة، وإيتاء الزكاة، وغير ذلك من فرائض الله، ونهيتهم عن الربا، وشرب المسكر، وأنواع من المنكرات، فلم يمكن الرؤساء القدح فى هذا وعيبه، لكونه مستحسنا عند العوام؛ فجعلوا قدحهم وعداوتهم فيما آمر به من التوحيد وأنهى عنه من الشرك، ولبسوا على العوام أن هذا خلاف ما عليه أكثر الناس .وكبرت الفتنة جدا، وأجلبوا علينا بخيل الشيطان ورجله، منها: إشاعة البهتان بما يستحى العاقل أن يحكيه فضلا عن أن يفتريه .

ومنها ما ذكرتم: أنى أكفر جميع الناس إلا من اتبعنى، وأزعم أن أنكحتهم غير صحيحة .ويا عجبا! كيف يدخل هذا فى عقل عاقل؟ هل يقول هذا مسلم أو كافر أو عارف أو مجنون؟! وكذلك قولهم: إنه يقول: لو أقدر أهدم قبة النبى صلى الله عليه وسلم لهدمتها .

وأما "دلائل الخيرات "، فله سبب، وذلك أنى أشرت على من قبل نصيحتى من إخوانى أن لا يصير فى قلبه أجل من كتاب الله، ويظن أن القرائة فيه أجل من قرائة القرآن .وأما إحراقه والنهى عن الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم بأى لفظ كانن فهذا من البهتان.

والحاصل: أن ما ذكر عنا من الأسباب غير دعوة الناس إلى التوحيد والنهى عن الشرك، فكله من البهتان .وهذا لو خفى على غيركم، فلا يخفى على حضرتكم (الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن

مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص ٣٦، ٣٧، القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم، الرسالة الخامسة: رسالته إلى السويدى عالم من العراق، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد بن عبدالوہاب کی طرف سے عبدالرحمٰن بن عبداللہ کی طرف

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

امابعد! پس آپ کا مکتوب اور گرامی نامہ موصول ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو ائمۂ متقین میں سے بنائے، اور آپ کو سید المرسلین کے دین کی دعوت دینے والوں میں سے بنائے، میں آپ کو اس بات سے آگاہ کرتا ہوں، اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں کہ میں اتباع کرنے والا ہوں، بدعت کرنے والا نہیں ہوں، میرا عقیدہ اور میرا دین، جس پر میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں، وہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے، جس پر ائمۂ مسلمین ہیں، جیسا کہ ائمۂ اربعہ، اور قیامت تک ان کی اتباع کرنے والے، لیکن میں لوگوں کے لیے دین کو خالص اللہ کے لیے بیان کرتا ہوں، اور میں لوگوں کو صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) وغیرہ سے دعاء کرنے سے منع کرتا ہوں، خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ، اور لوگوں کو اللہ کی عبادت والی چیزوں میں شرک کرنے سے منع کرتا ہوں، مثلاً غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا، اور نذر ماننا اور توکل کرنا اور سجدہ کرنا وغیرہ، یہ سب اللہ کا حق ہے، جس میں اللہ کے ساتھ نہ تو کوئی مقرب فرشتہ شریک ہوسکتا، اور نہ کوئی نبی ورسول شریک ہوسکتا، اور اسی چیز کی طرف شروع سے آخر تک سب رسولوں نے دعوت دی، اور اسی پر اہلُ السنۃ

والجماعۃ ہیں۔

اور میں لوگوں کے سامنے یہ بات بیان کرتا ہوں کہ اس امت میں سے سب سے پہلے شرک کو داخل کرنے والے رافضی ملعون ہیں، جو حضرت علی وغیرہ سے دعاء کرتے ہیں، اور ان سے اپنی حاجات کے پورا ہونے اور تکلیفوں کے دور ہونے کو طلب کرتے ہیں، اور میں اپنے علاقے میں صاحبِ منصب ہوں، جس کی بات کو سنا جاتا ہے، پس بعض رؤسا نے اس پر نکیر کی، کیونکہ میرا یہ طرزِ عمل اُن کی اس عادت کے خلاف تھا، جس پر یہ رؤساء پلے بڑھے ہیں۔

اس کے علاوہ میں نے اپنے زیرِ انتظام نماز کو قائم کرنے اور زکاۃ کو ادا کرنے، اور اس کے علاوہ دوسرے اللہ کے فرائض کو انجام دینے کا التزام کیا ہے، اور میں لوگوں کو سود سے، اور شراب کے پینے سے، اور مختلف قسم کے منکرات سے منع کرتا ہوں، تو رؤسا اس چیز کو گوارا نہیں کرتے، اور وہ اس کو عیب سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ عوام کے نزدیک مستحسن عمل ہے، پس اُن رؤسا نے میرے توحید کے امر کرنے اور شرک سے منع کرنے کو ردوقدح اور عداوت کا ذریعہ بنالیا، اور عوام پر یہ تلبیس پیدا کردی کہ میرا طرزِ عمل اکثر لوگوں کے خلاف ہے، اور فتنے کو بہت ہوا دے دی، اور ہمارے اوپر شیطان اور اس کے پیروکاروں نے چڑھائی شروع کردی، اور ایسے بہتان کی نشرواشاعت شروع کردی، جس کے بیان کرنے سے عاقل بھی حیا کرتا ہے، چہ جائیکہ اس بہتان کو کسی پر لگایا جائے۔

اور ان میں سے ایک بہتان یہ ہے، جس کا تم نے ذکر کیا ہے کہ میں اپنی اتباع کرنے والوں کے علاوہ تمام لوگوں کو کافر قرار دیتا ہوں، اور میں یہ گمان کرتا ہوں کہ ان کا نکاح صحیح نہیں ہے، اور یہ بات انتہائی تعجب خیز ہے، کسی عاقل کی عقل میں یہ کیونکر داخل ہوسکتی ہے، کیا کوئی عاقل خود سے کسی کے متعلق یہ فیصلہ کرسکتا

ہے کہ یہ مسلمان ہے، یہ کافر ہے، یہ عارف ہے، یہ مجنون ہے؟ اور اسی طریقے سے ان لوگوں کا یہ اعتراض کرنا کہ اگر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبے کو منہدم کرنے پر قادر ہو گیا، تو میں اس کو منہدم کر دوں گا، یہ بھی درست نہیں۔

جہاں تک دلائل الخیرات کا تعلق ہے، تو اس کا ایک سبب ہے، جس کی طرف میں اس سے پہلے اپنے بھائیوں کو نصیحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکا ہوں کہ کسی کے دل میں اللہ عزوجل کی کتاب کے مقابلے میں اس کی زیادہ عظمت پیدا نہ ہو جائے، اور وہ یہ گمان کر بیٹھے کہ اس دلائل الخیرات کو پڑھنا قرآن کی قرائت سے زیادہ عظیم ہے، جہاں تک دلائل الخیرات کو جلانے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے سے منع کرنے کا تعلق ہے، جن الفاظ میں بھی ہو، تو یہ میرے اوپر بہتان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے متعلق جو باتیں ذکر کی گئی ہیں، وہ سب کی سب بہتان ہیں، سوائے لوگوں کو توحید کی دعوت دینے اور شرک سے بچنے کے، اور یہ بات اگر تم لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں پر مخفی رہ گئی ہو، تو تمہارے پاس جو لوگ حاضر ہیں، ان پر مخفی نہیں رہ سکتی (عقیدة الشیخ)

مذکورہ عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کے عقائد وافکار، اہلُ السنۃ والجماعۃ اور فرقۂ ناجیہ کے مطابق تھے، اور ان پر عائد کیے گئے الزامات جھوٹ وافتراء پر مبنی تھے، اور وہ توحید وسنت کے زبردست داعی، اور شرک و بدعات سے منع کرنے والے تھے۔

اور متکلف و متصنع صوفیائے کرام اور اہلِ بدعت میں جو غیر مسنون طریقے رائج ہو گئے تھے، اور ان میں غلو اور حدود سے تجاوز ہو گیا تھا، شیخ موصوف ان سے منع کرتے تھے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا چوتھا مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ایک رسالہ، وہ ہے، جو انہوں نے مکہ مکرمہ کے اہم علماء کی طرف ارسال کیا، جس میں وہ فرماتے ہیں:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

من محمد بن عبد الوهاب، إلى العلماء الأعلام فى بلد الله الحرام، نصر الله بهم سيد الأنام، وتابعى الأئمة الأعلام؛ السلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

وبعد، جرى علينا من الفتنة ما بلغكم وبلغ غيركم، وسببه: هدم بنيان فى أرضنا على قبور الصالحين، فلما كبر هذا على العامة، لظنهم أنه تنقيص للصالحين، ومع هذا نهيناهم عن دعواهم، وأمرناهم بإخلاص الدعاء لله، فلما أظهرنا هذه المسألة مع ما ذكرنا من هدم البنيان على القبور، كبر على العامة جدا، وعاضدهم بعض من يدعى العلم، لأسباب أخر التى لا تخفى على مثلكم؛ أعظمها: اتباع هوى العوام مع أسباب أخر .فأشاعوا عنا أنا نسب الصالحين وأنا على غير جادة العلماء، ورفعوا الأمر إلى المشرق والمغرب، وذكروا عنا أشياء يستحى العاقل من ذكرها .

وأنا أخبركم بما نحن عليه (خبرا لا أستطيع أن أكذب)بسبب أن مثلكم لا يروج عليه الكذب على أناس متظاهرون بمذهبهم عند الخاص والعام .فنحن ولله الحمد متبعين، غير مبتدعين على مذهب الإمام أحمد بن حنبل .وحتى من البهتان الذى أشاع

الأعداء: أنى أدعى الاجتهاد ولا أتبع الأئمة .

فإن بان لكم أن هدم البناء على القبور، والأمر بترك دعوة الصالحين، لما أظهرناه وتعلمون، أعزكم الله، أن المطاع فى كثير من البلدان، لو تبين بالعمل بهاتين المسألتين، أنها تكبر على العامة الذين درجوا هم وإياهم على ضد ذلك .فإن كان الأمر كذلك، فهذه كتب الحنابلة عندكم بمكة شرفها الله مثل: "الإقناع "و"غاية المنتهى "و"الإنصاف"، التى عليها اعتماد المتأخرين، وهو عند الحنابلة كـ"التحفة "و"النهاية "عند الشافعية .وهم ذكروا فى باب الجنايز هدم البنا على القبور، واستدلوا عليه بما فى صحيح مسلم عن على رضى الله عنه: " أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعثه بهدم القبور المشرفة وأنه هدمها "

واستدلوا على وجوب إخلاص الدعوة لله، والنهى عما اشتهر فى زمنهم من دعاء الأموات بأدلة كثيرة، وبعضهم يحكى الإجماع على ذلك .فإن كانت المسألة إجماعا فلا كلام، وإن كانت مسألة اجتهاد فمعلومكم أنه لا إنكار فى مسائل الاجتهاد؛ فمن عمل بمذهبه فى محل ولايته لا ينكر عليه.

وما أشاعوا عنا من التكفير، وأنى أفتيت بكفر البوادى الذين ينكرون البعث والجنة والنار، وينكرون ميراث النساء، مع علمهم أن كتاب الله عند الحضر، وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث بالذى أنكروا، فلما أفتيت بكفرهم مع أنهم أكثر الناس فى

أرضنا، استنكر العوام ذلك، وخاصتهم الأعداء ممن يدعى العلم، وقالوا: من قال:" لا إله إلا الله "لا يكفر ولو أنكروا البعث وأنكروا الشرائع كلها .ولما وقع ذلك من بعض القرى مع علمهم اليقين بكفر من آمن ببعض الكتاب وكفر ببعض، حتى أنهم يقولون: من أنكر فرعا مجمعا عليه كفر، فقلت لهم: إذا كان هذا عندكم فيمن أنكر فرعا مجمعا عليه، فكيف بمن أنكر الإيمان باليوم الآخر؟ وسب الحضر وسفه أحلامهم إذا صدقوا بالبعث .فلما أفتيت بكفر من تبر البوادى من أهل القرى، مع علمه بما أنزل الله وبما أجمع عليه العلماء، كثرت الفتنة وصدق الناس بما قيل فينا من الأكاذيب والبهتان.

وبالجملة: هذا ما نحن عليه .وأنتم تعلمون أن من هو أجل منا لو تبين فى هذه المسائل قامت عليه القيامة، وأنا أشهد الله وملائكته وأشهدكم على دين الله ورسوله، أنى متبع لأهل العلم، وما غاب عنى من الحق وأخطأت فيه، فبينوا لى، وأنا أشهد الله أنى أقبل على الرأس والعين؛ والرجوع إلى الحق خير من التمادى فى الباطل (الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص ٤٠ الیٰ ٤٣،القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم،الرسالة السادسة: رسالته إلى العلماء الأعلام فى بلد الله الحرام، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد بن عبدالوہاب کی طرف سے ”بلد اللّٰہ الحرام“ کے اجل علماء کی طرف ”نصر اللّٰہ بھم سید الأنام، وتابعی الأئمة الأعلام؛ السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہٗ“

اس کے بعد عرض ہے کہ ہمارے اوپر اُن باتوں کی وجہ سے فتنہ جاری ہو گیا، جو تم تک پہنچیں، اور تمہارے علاوہ کی طرف پہنچیں، اور اس کا سبب ہمارے علاقے میں نیک لوگوں کی قبروں پر بنی ہوئی عمارات کو منہدم کرنا ہے، پس یہ بات جب عام لوگوں کو ناگوار گزری، تو انہوں نے یہ گمان کیا کہ اس میں صالحین (یعنی اولیائے کرام و بزرگانِ دین) کی بے ادبی پائی جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ ہم نے ان کو صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) سے دعاء کرنے سے منع کیا، اور ہم نے ان کو خالص اللہ سے دعاء کرنے کا حکم دیا، پس جب ہم نے اس مسئلہ کا اظہار کیا، جس کا ہم نے ذکر کیا، یعنی قبروں پر بنی ہوئی عمارات کو منہدم کرنے کا، تو عام لوگوں پر یہ بہت ناگوار گزرا، اور بعض علم کے مدعی حضرات نے بھی ان کا ساتھ دیا، جس کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں، جو آپ جیسے حضرات سے مخفی نہیں رہ سکتے، جن میں سے بڑی چیز عوام کی خواہشات کی اتباع کرنا ہے، اور اس کے علاوہ دوسرے کئی اسباب بھی ہیں (مثلاً ہمارے مقابلے میں دوسروں کا اپنے سیاسی اثر ورسوخ کو بڑھانا) تو انہوں نے ہماری طرف سے یہ باتیں پھیلانی شروع کر دیں کہ ہم صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کو برا بھلا کہتے ہیں، اور ہم علماء کے طریقے سے ہٹے ہوئے ہیں، اور انہوں نے اس بات کو مشرق اور مغرب تک پہنچا دیا، اور انہوں نے ہمارے متعلق ایسی باتوں کا بھی ذکر کیا، جن کے ذکر کرنے سے عاقل شخص کو حیا آتی ہے، اور ہم آپ کو ان چیزوں کی خبر دیتے ہیں کہ جن پر ہم قائم ہیں، اور یہ خبر ایسی ہے کہ ہم اس

میں جھوٹ بولنے کی استطاعت نہیں رکھتے، کیونکہ آپ جیسے حضرات کے سامنے جھوٹ زیب نہیں دیتا، جو عوام وخواص کے سامنے اپنے مذہب پر غالب اور پیشوا ہیں، پس ہم الحمدللہ اتباع کرنے والے ہیں، امام احمد بن حنبل کے مذہب پر چلتے ہیں، بدعت کرنے والے نہیں ہیں، اور نہ ہی ہم ان بہتانوں کے حق دار ہیں، جو دشمنوں نے ہمارے متعلق پھیلا دیے ہیں کہ میں اجتہاد کا دعویٰ کرتا ہوں، اور میں ائمہ کی اتباع نہیں کرتا۔

پس اگر تمہارے لیے یہ بات واضح ہوگئی کہ قبروں پر بنی ہوئی عمارات کا منہدم کرنا اور نیک لوگوں سے دعاء کے ترک کا حکم کرنا، جس کا ہم نے اظہار کیا، اور تم یہ جان چکے اللہ آپ کو عزت عطاء فرمائے کہ اکثر شہروں میں جو طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے، اگر ان دو ہی مسئلوں پر عمل ظاہر ہوجائے (یعنی قبروں پر بنی پختہ عمارتوں کو منہدم کرنا اور غیر اللہ سے دعا کرنا) تو ان لوگوں پر بہت گراں گزرے گا، جنہوں نے اس کو اختیار کر رکھا ہے، اور اس کی وجہ ضد بازی ہوگی، پس اگر معاملہ اسی طرح سے ہے، تو تمہارے پاس مکہ مکرمہ میں حنابلہ کی یہ کتب ہیں، مثلاً ''الاقناع'' اور ''غایۃ المنتھیٰ'' اور ''الانصاف'' جن پر متاخرین کا اعتماد ہے، اور یہ کتابیں حنابلہ کے نزدیک اسی طرح کی حیثیت رکھتی ہیں، جس طرح شافعیہ کے نزدیک ''التحفۃ'' اور ''النھایۃ'' ہیں، اور ان حضرات نے ''باب الجنائز'' میں قبروں پر بنی ہوئی عمارت کو منہدم کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس پر صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اونچی قبروں کو منہدم کرنے کے لیے بھیجا، جنہوں نے ان کو منہدم کر دیا۔

اور ان فقہائے کرام نے خالص اللہ سے دعاء کے واجب ہونے اور ان کے

زمانے میں جو مُردوں سے دعاء کرنا مشہور ہوگیا تھا، اس سے منع کرنے پر بہت سے دلائل سے استدلال کیا ہے، اور بعض نے اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے، پس اگر یہ مسئلہ اجماعی ہو، تو کوئی کلام نہیں، اور اگر مسئلہ اجتہادی ہو، تو آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ اجتہادی مسائل میں نکیر نہیں کی جاتی، پس جو شخص اپنے محلِ ولایت میں اپنے مذہب کے مطابق عمل کرے، تو اس پر نکیر نہیں کی جائے گی۔

اور ہماری طرف سے جو مسلمانوں کو کافر قرار دینے کی بات پھیلائی گئی ہے، تو بے شک میں نے ان دیہاتیوں کے کفر کا فتویٰ دیا ہے، جو آخرت کا اور جنت اور جہنم کا انکار کرتے ہیں، اور عورتوں کی میراث کا انکار کرتے ہیں، باوجودیکہ انہیں علم ہے کہ اللہ کی کتاب موجود ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے، جن چیزوں کا یہ انکار کرتے ہیں، پس جب میں نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا، باوجودیکہ یہ ہمارے علاقے میں بہت زیادہ لوگ ہیں، تو عوام نے اس کو برا سمجھا، خاص طور پر دشمنوں نے، جن میں سے بعض علم کے بھی مدعی ہیں، اور انہوں نے کہا کہ جو ''لا الٰـــــہ الا اللہ'' کہے، تو اس کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا، اگرچہ وہ قیامت کا اور پوری شریعت کا انکار کردے، اور جب یہ بات بعض بستیوں کی طرف سے سامنے آئی، باوجودیکہ ان کو یقینی طور پر اس شخص کے کفر کا علم بھی تھا کہ جو قرآن کے بعض حصے پر ایمان لائے، اور بعض حصے کا انکار کرے، یہاں تک وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو ایسے فرعی مسئلے کا انکار کرے، جس پر اجماع ہوچکا ہو، تو وہ بھی کافر ہے، تو میں نے ان سے کہا کہ تمہارے نزدیک جب یہ اس شخص کا حکم ہے، جو اجماعی فرعی مسئلے کا انکار کرے، تو جو شخص آخرت کے دن پر ایمان کا انکار کرے، اس کا کیا حال ہوگا، اور ان کے وہ عقل مند لوگ جو قیامت کے دن کی تصدیق کریں، اس کو وہ بے وقوف قرار دے، پس جب میں نے بعض

بستیوں کے ایسے دیہاتیوں کے کفر کا فتویٰ دیا، اس علم کی روشنی میں جو اللہ نے نازل کیا ہے (یعنی قرآن کی واضح آیات کی روشنی میں) اور جس پر علماء کا اجماع ہے، تو فتنہ بہت زیادہ ہو گیا، اور لوگوں نے ہمارے متعلق کہی ہوئی جھوٹی باتوں اور بہتان کی تصدیق کر دی۔

بہر حال ہمارا تو یہ طرزِ عمل ہے، اور آپ لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ جو ہم سے بڑے حضرات ہیں، اگر ان مسائل کو وہ بیان کریں، تو ان پر بھی قیامت برپا ہو جائے گی، اور میں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو (جو میرے ساتھ حاضر ہیں) اور تمہیں، اللہ اور اس کے رسول کے دین پر گواہ بناتا ہوں، میں اہلِ علم کی اتباع کرنے والا ہوں، اور میرے سے جو حق بات رہ جائے، اور مجھ سے اس میں خطا ہو جائے، تو تم اس کو میرے سامنے بیان کرو، اور میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس بات کو سر اور آنکھوں پر قبول کروں گا، اور حق کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے، باطل میں سرکشی اختیار کرنے سے (عقیدۃ الشیخ)

مذکورہ عبارت میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے نہ صرف یہ کہ قرآن وسنت کے مطابق اپنے عقائد وافکار ہونے کی توضیح کر دی ہے، بلکہ اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے خلاف پھیلائے جانے والے الزامات کے اسباب کا بھی ذکر دیا ہے، اور ساتھ ہی اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد اس سے رجوع کرنے کا بھی اظہار کر دیا ہے، جو کہ اہلِ حق کا شعار ہے، جس سے ان کی للّٰہیت اور تقوے پر روشنی پڑتی ہے۔

اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے کلام میں کوئی بات قابلِ اصلاح معلوم ہو، تو ان کے متبعین بھی اس کی اصلاح میں کسی لیت ولعل سے کام نہ لیں اور ان کی ہر بات کو نبی کی طرح معصوم کا درجہ نہ دیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا پانچواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان نجدی رحمہ اللہ نے ایک مکتوب، مدینہ منورہ کے ایک عالم کو تحریر کیا، جس میں وہ فرماتے ہیں:

ثم بعد هذا، يذكر لنا: أن عدوان الإسلام الذين ينفرون الناس عنه، يزعمون أننا ننكر شفاعة الرسول صلى الله عليه وسلم، فنقول: سبحانك هذا بهتان عظيم! بل نشهد أن رسول الله صلى الله عليه وسلم الشافع المشفع، صاحب المقام المحمود .نسأل الله الكريم رب العرش العظيم أن يشفعه فينا، وأن يحشرنا تحت لوائه.

هذا اعتقادنا، وهذا الذى مشى عليه السلف الصالح، من المهاجرين والأنصار، والتابعين وتابع التابعين، والأئمة الأربعة، رضى الله عنهم أجمعين .وهم أحب الناس لنبيهم، وأعظمهم فى اتباعه وشرعه ;فإن كانوا يأتون عند قبره يطلبونه الشفاعة، فإن اجتماعهم حجة .والقائل: إنه يطلب الشفاعة بعد موته، يورد علينا الدليل من كتاب الله، أو من سنة رسول الله، أو من إجماع الأمة ;والحق أحق أن يتبع (الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص۴۸، ۴۹،القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم،الرسالة السابعة: رساته إلى عالم من أهل المدينة، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ: پھر اس کے بعد ہمارے بارے میں یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ اسلام کے دشمن

جو لوگوں کو ہم سے متنفر کرتے ہیں، وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار کرتے ہیں، تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ’’**سبحانک ھٰذا بھتان عظیم**‘‘ بلکہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ (آخرت میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت بھی فرمائیں گے، اور آپ کی شفاعت قبول بھی کی جائے گی، اور آپ کو مقامِ محمود پر فائز کیا جائے گا، ہم اللہ کریم، ربُّ العرش العظیم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری بھی شفاعت فرمائیں، اور ہم آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں۔

یہ ہمارا اعتقاد ہے، اور اسی پر سلفِ صالح یعنی مہاجرین وانصار اور تابعین اور تابع التابعین، اور ائمۂ اربعہ رضی اللہ عنہم اجمعین چلے ہیں، اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی اتباع میں سب سے بڑھے ہوئے تھے، پس اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس آ کر شفاعت کو طلب کرتے ہوں، تو ان کا اجماع حجت ہے، اور قائل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد (آپ کی قبر پر آپ سے) شفاعت کو طلب کرتا ہے، وہ ہمارے سامنے کتابُ اللہ یا سنتِ رسول اللہ یا اجماعِ امت سے کوئی دلیل لے کر آئے، اور حق بات، اتباع کیے جانے کی زیادہ حق دار ہے (عقیدۃ الشیخ)

اس سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ، آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے منکر نہیں، البتہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت طلب کرنے یعنی یہ کہنے کے جواز کے قائل نہیں کہ کوئی مثلاً قبر پر آ کر یہ کہے کہ ’’اے اللہ کے رسول! آپ آخرت میں ہماری شفاعت فرمادیجیے‘‘ کیونکہ وہ اس کو دعاء و نداءِ غیر اللہ کے مفہوم میں داخل مانتے ہیں، اور اس کو شرک کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اگرچہ حقیقی

شرک کا اس پر حکم نہ لگائیں۔

اور بعض متاخرینِ حنفیہ یا مشائخِ حنفیہ سے جو اس صورت کا جواز منقول ہے، اس میں وہ بھی یہ شرط لگاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاجت روا نہ سمجھا جائے، البتہ اس کو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر مبارک پر سماعت فرمانے کے مسئلے پر متفرع کرتے ہیں، جیسا کہ آگے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے حوالے سے آتا ہے۔

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جو حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں، وہ اس عمل کو فرض یا واجب وغیرہ قرار نہیں دیتے، اور اس قسم کے مسائل میں جہاں اختلاف کسی چیز کے مشروع ہونے نہ ہونے کا ہو، وہاں اگر کوئی اس فعل سے اجتناب کرے، تو اصولی اعتبار سے اس کے راجح ہونے کی بھی گنجائش ہے، بالخصوص جب کسی مفسدہ یا عوام کے فسادِ عقیدہ کی وجہ سے منع کیا جائے، اور آگے علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کے حوالے سے آتا ہے کہ:

”بعض اختلافات چنداں وقیع اور اہم نہیں، جیسا کہ مسئلۂ شفاعت میں“

اس لیے مجوزین کی طرف سے اس کے ثبوت اور جواز پر غیر ضروری اصرار مناسب نہیں، جس طرح کے اس پر شرک کا حکم لگانا بھی مناسب نہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا چھٹا مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کا ایک رسالہ وہ ہے، جس میں ابنِ صیاح نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ سے، ان کی طرف منسوب چند باتوں کے متعلق استفسار کیا تھا، اور اس کا شیخ موصوف نے جواب تحریر فرمایا تھا، اس کا شیخ موصوف نے درجِ ذیل جواب تحریر فرمایا:

الحمد لِلّٰهِ رب العالمين .أمـا بعد، فما ذكره المشركون على أنى أنهى عن الصلاة على النبى، أو أنى أقول: لو أن لى أمرا هدمت قبة

النبى صلى الله عليه وسلم، أو أنى أتكلم فى الصالحين، أو أنهى عن محبتهم، فكل هذا كذب وبهتان، افتراه على الشياطين الذين يريدون أن يأكلوا أموال الناس بالباطل، مثل أولاد شمسان، وأولاد إدريس، الذين يأمرون الناس ينذرون لهم، وينخونهم ويندبونهم، وكذلك فقراء الشيطان، الذين ينتسبون إلى الشيخ عبد القادر، رحمه الله، وهو منهم برىء كبرائة على بن أبى طالب من الرافضة.

فلما رأونى آمر الناس بما أمرهم به نبيهم صلى الله عليه وسلم: أن لا يعبدوا إلا الله، وأن من دعا عبد القادر فهو كافر وعبد القادر منه برىء، وكذلك من نخا الصالحين أو الأنبياء، أو ندبهم أو سجد لهم، أو نذر لهم أو قصدهم بشىء من أنواع العبادة التى هى حق الله على العبيد .وكل إنسان يعرف أمر الله ورسوله لا ينكر هذا الأمر، بل يقر به ويعرفه.

وأما الذى ينكره فهو بين أمرين: إن قال: إن دعوة الصالحين واستغاثتهم، والنذر لهم وصيرورة الإنسان فقيرا لهم، أمر حسن، ولو ذكر الله ورسوله، أنه كفر؛ فهو مصر بتكذيب الله ورسوله، ولا خفاء فى كفره؛ فليس لنا معه كلام .

وإنما كلامنا مع رجل يؤمن بالله واليوم الآخر، ويحب ما أحب الله ورسوله، ويبغض ما أبغض الله ورسوله؛ لكنه جاهل قد لبست عليه الشياطين دينه، ويظن أن الاعتقاد فى الصالحين حق؛ ولو يدرى أنه كفر يدخل صاحبه فى النار، ما فعله.

ونحن نبين لهذا ما يوضح له الأمر، فنقول: الذى يجب على المسلم: أن يتبع أمر الله ورسوله، ويسأل عنه .والله سبحانه أنزل القرآن، وذكر فيه ما يحبه ويبغضه، وبين لنا فيه ديننا؛ وكذلك محمد صلى الله عليه وسلم أفضل الأنبياء .فليس على وجه الأرض أحد أحب إلى أصحابه منه؛ وهم يحبونه على أنفسهم وأولادهم، ويعرفون قدره، ويعرفون أيضا الشرك والإيمان.

فإن كان أحد من المسلمين فى زمن النبى صلى الله عليه وسلم قد دعاه، أو نذر له أو ندبه، أو أحد من أصحابه جاء عند قبره بعد موته يسأله أو يندبه، أو يدخل عليه للالتجاء له عند القبر، فاعرف أن هذا الأمر صحيح حسن، ولا تطعنى ولا غيرى، وإن كان إذا سألت إذا أنه صلى الله عليه وسلم تبرأ ممن اعتقد فى الأنبياء والصالحين، وقتلهم وسباهم وأولادهم، وأخذ أموالهم، وحكم بكفرهم، فاعرف أن النبى صلى الله عليه وسلم لا يقول إلا الحق؛ والواجب على كل مؤمن اتباعه فيما جاء به.

وبالجملة، فالذى أنكره: الاعتقاد فى غير الله مما لا يجوز لغيره. فإن كنت قلته من عندى فارم به، أو من كتاب لقيته ليس عليه عمل فارم به كذلك، أو نقلته عن أهل مذهبى فارم به، وإن كنت قلته عن أمر الله ورسوله، وعما أجمع عليه العلماء فى كل مذهب، فلا ينبغى لرجل يؤمن بالله واليوم الآخر أن يعرض عنه لأجل أهل زمانه أو أهل بلده، وإن أكثر الناس فى زمانه أعرضوا عنه.

واعـلم أن الأدلة على هذا من كلام الله وكلام رسوله كثيرة، لكن أنــا أمثل لک بـدليـل واحـد، يـنبهک علـى غيـره: قــال الـلـه تـعالى: (قل ادعوا الذين زعمتم من دونه فلا يملكون كشف الضر عـنكم ولا تـحويلا أولئک الذين يدعون يبتغون إلى ربهم الوسيلة أيهم أقرب)الآية .ذكـر الـمفسرون فی تفسيرها أن جماعة كانوا يـعتـقـدون فـی عيسـی، عـليه السلام، وعزير، فقال تعالى: هؤلاء عبيـدی كـمـا أنتم عبيدی، ويرجون رحمتی كما ترجون رحمتی، ويخافون عذابی كما تخافون عذابی.

فيـا عباد الله، تفكروا فی كلام ربكم تبارک وتعالى! إذا كان ذكر عن الكفار الذين قاتلهم رسول الله صلى الله عليه وسلم أن دينهم الذی كفرهم به هو: الاعتقاد فی الصالحين، وإلا فالكفار يخافون الـله ويرجونه، ويحجون ويتصدقون، ولكنهم كفروا بالاعتقاد فی الـصـالحين، وهم يقولون: إنـمـا اعتـقـدنـا فيهم ليقربونا إلى الله زلـفـی، ويشـفـعوا لنا، كما قال تعالى: (والـذيـن اتخذوا من دونه أوليـاء مـا نـعبـدهـم إلا ليـقـربـونـا إلـى الـلـه زلفى)، وقال تعالى: (ويـعبـدون مـن دون الـله ما لا يضرهم ولا ينفعهم ويقولون هؤلاء شفعاؤنا عند الله)

فيـا عبـاد الـلـه، إذا كـان الـلـه ذكـر فـی كتابه أن دين الكفار هو: الاعتـقــاد فـی الـصــالـحيـن، وذكـر أنهم اعتقدوا فيهم ودعوهم ونـدبـوهـم لأجـل أنهم يقربوهم إلى الله زلفی، هل بعد هذا البيان بيـان؟ فـإذا كـان مـن اعتـقـد فـی عيسـی بـن مريم مع أنـه نبی من

الأنبياء، وندبه ونخاه، فقد كفر، فكيف بمن يعتقدون فى الشياطين كالكلب أبى حديدة، وعثمان الذى فى الوادى، والكلاب الأخر فى الخرج، وغيرهم فى سائر البلدان الذين يأكلون أموال الناس بالباطل، ويصدون عن سبيل الله؟

وأنت، يا من هداه الله، لا تظن أن هؤلاء يحبون الصالحين؛ بل هؤلاء أعداء الصالحين .وأنت، والله، الذى تحب الصالحين، لأن من أحب قوما أطاعهم .فمن أحب الصالحين وأطاعهم، لم يعتقد إلا فى الله، وأما من عصاهم ودعاهم يزعم أنه يحبهم، فهو مثل النصارى الذين يدعون عيسى ويزعمون محبته، وهو برىء منهم، ومثل الرافضة الذين يدعون على بن أبى طالب، وهو برىء منهم.

ونختم هذا الكتاب بكلمة واحدة، وهى أن أقول: يا عباد الله، لا تطيعونى ولا تفكروا ، واسألوا أهل العلم من كل مذهب عما قال الله ورسوله .وأنا أنصحكم: لا تظنوا أن الاعتقاد فى الصالحين مثل الزنى والسرقة، بل هو عبادة للأصنام، من فعله كفر، وتبرأ منه رسول الله صلى الله عليه وسلم .يا عباد الله، تفكروا وتذكروا.

والسلام(الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص ۵۲ الیٰ ۵۵،القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم،الرسالة الثامنة: رسالته إلى إبن صياح، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ: ''**الحمد لله رب العالمين** ''امابعد! پس جو مشرکین نے یہ بات ذکر کی ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود سے منع کرتا ہوں، یا میں یہ کہتا ہوں کہ

اگر مجھ کو اختیار حاصل ہو جائے، تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبے کو منہدم کر دوں گا، یا یہ کہ میں صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے متعلق زبان درازی کرتا ہوں، یا میں ان سے محبت کرنے سے منع کرتا ہوں، تو یہ تمام باتیں جھوٹ اور بہتان ہیں، جن کو میرے اوپر ان شیطانوں نے گھڑا ہے، جو لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھانے کا ارادہ رکھتے ہیں، مثلاً شمسان کی اولاد، اور ادریس کی اولاد، جو لوگوں کو ان کے نام کی نذریں دینے کا حکم کرتے ہیں، اور ان کی ضرورت سے زیادہ تعظیم کرتے ہیں، اور ان کو پکارتے ہیں، اور اسی طریقے سے ان بہتانوں کو میرے اوپر شیطان کے ان فقراء نے گھڑا ہے، جو شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، حالانکہ شیخ عبدالقادر جیلانی ان سے اسی طرح بریٔ ہیں، جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب، رافضیوں سے بریٔ ہیں۔

پس جب انہوں نے مجھے دیکھا کہ میں لوگوں کو ان چیزوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ کے علاوہ کی عبادت نہ کریں، اور جو عبدالقادر سے دعاء کرے گا، تو وہ کافر ہوگا، اور عبدالقادر اس سے بریٔ ہیں، اور اسی طریقے سے جو شخص صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) یا انبیائے کرام کی عظمت کو اپنے مقام سے بڑھائے گا، یا ان کو پکارے گا، یا ان کو سجدہ کرے گا، یا ان کے لیے نذر مانے گا، یا ان کے ساتھ عبادت کی انواع میں سے کسی چیز کا قصد کرے گا، جو کہ بندوں پر خالص اللہ کا حق ہے، اور ہر انسان جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی معرفت رکھتا ہے، اس حکم کا انکار نہیں کرتا، بلکہ اس کا اقرار واعتراف کرتا ہے۔

اور جو اس کا انکار کرے، تو وہ دو معاملوں کے درمیان ہے، یا تو وہ یہ کہے کہ صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) سے دعاء کرنا اور ان سے استغاثہ کرنا، اور

ان کی نذر ماننا، اور انسان کا نیک لوگوں کا فقیر ومحتاج ہونا، امرِ حسن ہے، اگر چہ اللہ اور اس کے رسول نے اس کے کفر ہونے کا ذکر کیا ہو، تو یہ شخص اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب پر مُصِر ہے، اور اس کے کفر میں کوئی ابہام نہیں، اور نہ ہمارا اس کے ساتھ کوئی کلام ہے۔

ہمارا کلام تو صرف اس آدمی کے ساتھ ہے، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اور اللہ اور اس کے رسول نے جس سے محبت کی، اسی سے وہ بھی محبت کرتا ہے، اور اللہ اور اس کے رسول نے جس سے بغض رکھا، یہ بھی اس سے بغض رکھتا ہے، لیکن یہ جاہل شخص ہے، جس کے دین پر شیطان نے تلبیس کردی ہے، اور وہ یہ گمان کرتا ہے کہ صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے متعلق مذکورہ اعتقاد (یعنی ان کو سجدہ کرنا، ان کی نذر ماننا ان سے دعا کرنا وغیرہ وغیرہ) حق ہے، اور اگر اسے یہ بات معلوم ہوجائے کہ یہ کفر ہے، اور اس کا مرتکب جہنم میں جائے گا، تو یہ شخص اس فعل کو ہرگز نہ کرے۔

اور ہم اس مسئلے کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں، پس ہم کہتے ہیں کہ مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اتباع کرے، اور اس کے متعلق سوال کرے، اور اللہ سبحانہٗ نے قرآن کو نازل کیا ہے، جس میں اللہ نے اپنی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کا ذکر کیا ہے، اور اس میں ہمارے دین کو بیان کردیا ہے، اور اسی طریقے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، افضلُ الانبیاء ہیں، پس روئے زمین پر کوئی بھی آپ کے صحابۂ کرام کے مقابلے میں آپ سے زیادہ محبت کرنے والا نہیں ہے، اور صحابۂ کرام، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اپنی جان اور اولاد سے بھی زیادہ کرتے ہیں، اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت کو پہچانتے ہیں، اور وہ شرک اور ایمان کو بھی پہچانتے ہیں۔

پس اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں میں سے کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دعاء کی ہو، یا آپ کے نام کی نذر مانی ہو، یا آپ کو اس طرح پکارا ہو، یا آپ کے صحابۂ کرام میں سے کوئی آپ کی وفات کے بعد آپ کی قبر پر آیا ہو، اور آپ سے سوال کیا ہو، یا آپ کو پکارا ہو، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر آپ سے التجاء کرنے کے لیے داخل ہوا ہو، تو یہ بات جان لینی چاہئے کہ یہ امر صحیح، حسن ہے، اور اس میں آپ نہ میری اطاعت کریں، اور نہ میرے علاوہ کسی اور کی اطاعت کریں، اور اگر وہ بات جس کا آپ نے سوال کیا ہے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برائت ظاہر کی ہے کہ انبیائے کرام اور صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے متعلق اس طرح کا اعتقاد رکھا جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال کے مرتکبین کو قتل کیا، اور ان کو قید کیا، اور ان کی اولاد کو بھی، اور ان کے اموال کو لے لیا، اور ان پر کفر کا حکم لگایا، تو تمہیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف حق بات ہی فرماتے ہیں، اور ہر مومن پر آپ کے لائے ہوئے احکام کی اتباع واجب ہے۔

اور خلاصہ یہ کہ میں جس چیز کا انکار کرتا ہوں، وہ اللہ کے علاوہ دوسرے کے متعلق ایسا اعتقاد رکھنا ہے، جو اللہ کے علاوہ کے لیے جائز نہیں، پس اگر میں نے یہ بات اپنے پاس سے کہی ہو، تو آپ اس کو پھینک دیں، یا میں نے یہ بات ایسی کتاب سے لی ہو، جس پر عمل نہ ہو، تو بھی آپ اس کو پھینک دیں، یا میں نے اس بات کو صرف اپنے مذہب والوں سے نقل کیا ہو، تو بھی آپ اس بات کو پھینک دیں، لیکن اگر یہ بات میں نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے کہی ہو، اور اس کے مطابق کہی ہو، جس پر ہر مذہب کے علماء کا اجماع ہے، تو کسی آدمی کے لیے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں کہ وہ اپنے زمانے والوں یا شہر

والوں کی وجہ سے اس سے اعراض کرے، اگرچہ اس زمانے کے اکثر لوگوں نے اس سے اعراض کیوں نہ کیا ہو۔

اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس دعوے پر اللہ کے کلام اور اس کے رسول کے کلام سے بہت سے دلائل ہیں، لیکن میں آپ کے سامنے ایک دلیل پیش کرتا ہوں، جو آپ کو اس دلیل کے علاوہ دوسری دلیلوں پر بھی متنبہ کردے گی، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے''قل ادعوا الذين زعمتم من دونه فلا يملكون كشف الضر عنكم ولا تحويلا أولئك الذين يدعون يبتغون إلى ربهم الوسيلة أيهم أقرب''مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ایک جماعت کا عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر کے بارے میں یہ عقیدہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے بندے ہیں، جس طرح سے تم میرے بندے ہو، اور یہ میری رحمت کے اسی طرح سے امیدوار ہیں، جس طرح تم میری رحمت کے امیدوار ہو، اور یہ میرے عذاب کا اسی طرح خوف رکھتے ہیں، جس طرح تم میرے عذاب کا خوف رکھتے ہو۔

پس اے اللہ کے بندو! اپنے رب تبارک وتعالیٰ کے کلام میں غور وفکر کرو، جب اللہ نے ان کفار کا ذکر کیا، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کیا کہ ان لوگوں کا دین، جنہوں نے کفر کیا، وہ صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا ہے، ورنہ کفار، اللہ کا خوف بھی رکھتے تھے، اور اللہ سے امید بھی رکھتے تھے، اور وہ حج بھی کرتے تھے، اور صدقہ بھی کرتے تھے، لیکن انہوں نے صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے بارے میں مخصوص اعتقاد کی وجہ سے کفر کیا، اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہمارا اعتقاد تو ان کے بارے میں اس لیے ہے کہ یہ ہمیں قدرومنزلت کے اعتبار سے، اللہ کے قریب

کردیں، اور ہمارے لیے شفاعت کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" **والذین اتخذوا من دونہ أولیاء ما نعبدھم إلا لیقربونا إلی اللہ زلفی** "اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ" **ویعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ**"

پس اے اللہ کے بندو! جب اللہ نے اپنی کتاب میں یہ بات ذکر کردی ہے کہ کفار کا دین، صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے متعلق مخصوص اعتقاد ہے، اور یہ بات ذکر کردی ہے کہ وہ صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے، اور ان سے دعاء کرتے تھے، اور ان کو پکارا کرتے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ انہیں قدر ومنزلت کے اعتبار سے، اللہ کے قریب کردیں، تو کیا اس بیان کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ پس جب عیسیٰ بن مریم کے متعلق جس نے مخصوص عقیدہ رکھا، جبکہ وہ نبیوں میں سے ایک نبی ہیں، اور ان کو پکارا، اور ان کی ضرورت سے زیادہ تعظیم کی، تو اس نے کفر کیا، پس جو شیاطین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے گا، جیسا کہ کلبِ ابی حدیدہ، اور وادی میں موجود عثمان، اور خرج میں دوسرے کلاب، اور ان کے علاوہ تمام شہروں میں وہ لوگ، جو لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں، اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اس شخص کا یہ حکم کیونکر نہیں ہوگا؟

اور آپ اے وہ شخص! جس کو اللہ نے ہدایت دی، یہ گمان نہیں کرسکتے کہ یہ لوگ صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) سے محبت رکھتے ہیں، بلکہ یہ لوگ صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے دشمن ہیں، اور آپ اللہ کی قسم! صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) سے محبت رکھتے ہیں، کیونکہ جو کسی قوم سے محبت رکھتا ہے، وہ ان کی اطاعت بھی کرتا ہے، پس جس نے

صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) سے محبت کی، اور ان کی اطاعت کی، تو وہ اللہ ہی کے متعلق یہ عقیدہ رکھے گا، اور جس نے ان کی نافرمانی کی، اور ان سے دعاء کی، وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ ان سے محبت رکھتا ہے، پس وہ ان نصاریٰ کے مثل ہے، جو عیسیٰ علیہ السلام سے دعاء کرتے ہیں، اور ان کی محبت کا گمان کرتے ہیں، حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام ان سے بری ہیں، نیز یہ ان رافضیوں کی طرح ہیں، جو حضرت علی بن ابی طالب سے دعاء کرتے ہیں، حالانکہ حضرت علی ان سے بری ہیں۔

اور ہم اس مکتوب کو ایک کلمے پر ختم کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ اے اللہ کے بندو! تم میری اطاعت مت کرو، اور خود سے بھی غور وفکر مت کرو، بلکہ ہر مذہب کے اہلِ علم سے ان چیزوں کے متعلق سوال کرو، جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا، اور میں تمہیں اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم یہ گمان مت کرنا کہ صالحین (یعنی اولیائے کرام اور بزرگانِ دین) کے متعلق (مذکورہ مخصوص) اعتقاد کا مسئلہ زنا اور چوری کے گناہ کی طرح ہے، بلکہ یہ بتوں کی عبادت ہے، جو اس فعل کو کرے گا، وہ کافر شمار ہوگا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، برائت ظاہر فرمادیں گے، اے اللہ کے بندو! غور وفکر کرو، اور نصیحت حاصل کرو۔ والسلام

(عقیدۃ الشیخ)

مذکورہ تفصیلی عبارت میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے انبیائے کرام واولیائے عظام کے ساتھ ایسا اعتقاد رکھنے اور طرزِ عمل اختیار کرنے کی نفی فرمادی، جو اللہ کے ساتھ خاص ہے۔

اور آگے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے حوالہ سے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی دعوت کی دفعات کے ضمن میں آتا ہے کہ:

’’خدا کی ذات وصفات کے متعلق قرآن اور حدیثِ صحیح میں جو نصوص ہیں، ان پر تاویل کے بغیر اسی طرح ایمان لانا چاہیے، جس طرح ان کے الفاظ اپنے لغوی معنوں کے لحاظ سے ظاہر کرتے ہیں، ان کی حقیقت طلبی کے ہم در پے نہ ہوں‘‘۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ساتواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ اپنے ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

من محمد بن عبد الوهاب، إلى من يصل إليه من المسلمين؛ السلام عليكم ورحمة اللّٰه وبركاته.

وبعد، ما ذكر لكم عنى: أنى أكفر بالعموم، فهذا من بهتان الأعداء .وكذلک قولهم: إنى أقول: من تبع دين الله ورسوله وهو ساكن فى بلده، أنه ما يكفيه حتى يجىء عندى، فهذا أيضا من البهتان.

إنما المراد: اتباع دين الله ورسوله فى أى أرض كانت .ولكن نكفر من أقر بدين الله ورسوله ثم عاداه وصد الناس عنه، وكذلک من عبد الأوثان بعد ما عرف أنها دين للمشركين وزينة للناس ;فهذا الذى أكفره .وكل عالم على وجه الأرض يكفر هؤلاء، إلا رجلا معاندا أو جاهلا؛ والله أعلم .والسلام(الرسائل الشخصية ”مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس“ ص٥٨،القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم،الرسالة التاسعة: رسالته إلى عامة المسلمين، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(یہ مکتوب) محمد بن عبدالوہاب کی طرف سے، ان حضرات کی طرف ہے، جنہیں بھی مسلمانوں میں سے یہ مکتوب پہنچے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

سلام ودعاء کے بعد! یہ بات یادرکھیے کہ تمہارے سامنے میرے متعلق یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ میں مطلقاً تمام لوگوں کو کافر قرار دیتا ہوں، پس یہ دشمنوں کی طرف سے بہتان ہے، اوراسی طریقے سے لوگوں کا یہ کہنا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی اتباع کرے گا، اور وہ اس کے شہر میں رہے گا، تو اس کو یہ چیز کافی نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ میرے پاس نہ آ جائے، تو یہ بھی سراسر بہتان ہے۔

اصل مقصود، اللہ اور اس کے رسول کی اتباع ہے، زمین کے جس حصے میں بھی کی جائے، البتہ ہم اس شخص کو کافر قرار دیتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول کے دین کا اقرار کرے، پھر وہ اس دین سے عداوت کرے، اور لوگوں کو اس دین سے روکے، اور اسی طریقے سے جو شخص بتوں کی عبادت کرے، اس کے بعد کہ وہ یہ بات جان چکا ہے کہ یہ مشرکین کا دین ہے، اور لوگوں کے لیے زینت کا باعث ہے، تو یہی وہ شخص ہے، جس کو میں کافر قرار دیتا ہوں، اور روئے زمین پر ہر عالم شخص، ان لوگوں کو کافر ہی قرار دے گا، سوائے اس شخص کے جو معاند ہو یا جاہل ہو، واللہ اعلم۔ والسلام۔ (عقیدۃ الشیخ)

مذکورہ عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کی طرف یہ نسبت جھوٹی تھی کہ وہ اپنے اور اپنے متبعین کے علاوہ سب کو کافر قرار دیتے تھے، کیونکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ اصل مقصود اللہ اور اس کے رسول کی اتباع ہے، البتہ جو شخص غیر اللہ کی عبادت کرے، اور

لوگوں کو اصل دین سے روکے، شیخ موصوف اپنی تحقیق کے مطابق اسی کو کافر قرار دیتے تھے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا آٹھواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے ایک مکتوب ''حمد تویجری '' کے نام تحریر کیا، جس کا مضمون درجِ ذیل ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

من محمد بن عبد الوهاب، إلى الأخ حمد التويجرى، ألهمه الله رشده؛ السلام عليكم ورحمة اللّٰه وبركاته.

وبعد، وصل الخط، أوصلك الله ما يرضيه .وأشرفنا على الرسالة المذكورة، وصاحبها ينتسب إلى مذهب الإمام أحمد، رحمه الله، وما تضمنته رسالته من الكلام فى الصفات مخالف لعقيدة الإمام أحمد، وما تضمنته من الشبه الباطلة فى تهوين أمر الشرك، بل فى إباحته؛ فمن أبين الأمور بطلانه لمن سلم من الهوى والتعصب، وكذلك تمويهه على الطغام بأن ابن عبد الوهاب يقول: الذى ما يدخل تحت طاعتى كافر، ونقول: سبحانك هذا بهتان عظيم! بل نشهد الله على ما يعلمه من قلوبنا، بأن من عمل بالتوحيد، وتبرأ من الشرك وأهله، فهو المسلم فى أى زمان وأى مكان .وإنما نكفر من أشرك بالله فى إلهيته، بعد ما نبين له الحجة على بطلان الشرك .وكذلك نكفر من حسنه للناس، أو أقام الشبه الباطلة على إباحته، وكذلك من قام بسيفه دون هذه المشاهد التى يشرك بالله

عنـدهـا، وقـاتـل مـن أنـكرها وسعى فى إزالتها؛ والله المستعان . والسلام(الرسـائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص ٦٠،القسم الأول: عـقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم،الرسالة العاشرة: رسالته إلى حمد التويجرى ، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد بن عبدالوہاب کی طرف سے اس کے بھائی حمد تویجری کی طرف، اللہ اس کو ہدایت مرحمت فرمائے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

اس کے بعد عرض ہے کہ جناب کا مکتوب گرامی پہنچا، اللہ آپ کو اپنی رضا والے کاموں کی توفیق عطا فرمائے، ہمیں مذکورہ رسالہ نظر نواز ہوا، اس رسالے کا تحریر کرنے والا امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے، لیکن میں نے اس رسالے میں اللہ کی صفات کے متعلق جو کلام ملاحظہ کیا ہے، وہ امام احمد رحمہ اللہ کے عقیدے کے خلاف ہے، اور میں نے اس میں جو باطل تشبیہ ملاحظہ کی ہے، جو شرک کے معاملے کو ہلکا قرار دینے ، بلکہ اس کو مباح قرار دینے کے متعلق ہے، تو یہ اس رسالے کے باطل ہونے کی سب سے واضح دلیل ہے، اس شخص کے لیے جو خواہشِ نفس اور تعصب سے محفوظ ہو، اور اسی طرح سے ، جو اس رسالے میں میرے خلاف یہ بات کی گئی ہے کہ ابن عبدالوہاب یہ کہتا ہے کہ جو میری اطاعت کے تحت داخل نہیں ہوگا، وہ کافر ہے، ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ''سبحانک ھٰذا بھتان عظیم '' بلکہ ہم اللہ کو اپنے دلوں میں موجود علم پر

گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ جس نے توحید پر عمل کیا، اور شرک اور مشرکین سے برائت ظاہر کی، تو وہ مسلم ہوگا، خواہ کسی زمانے میں اور کسی علاقے میں ہو، ہم تو صرف اس شخص کی تکفیر کرتے ہیں، جو اللہ کے ساتھ الوہیت میں شرک کرتا ہے، بعد اس کے کہ ہم اس کے سامنے شرک کے بطلان کو واضح کر دیتے ہیں، اور اسی طریقے سے ہم اس شخص کو بھی کافر قرار دیتے ہیں، جو اس چیز کو لوگوں کے لیے اچھا بنا کر پیش کرتا ہے، یا باطل کو مباح کی مشابہت بنا کر پیش کرتا ہے، اور اسی طریقے سے اس شخص کو بھی کافر قرار دیتے ہیں، جو اپنی تلوار سونت کر ان آستانوں پر کھڑا ہوتا ہے، جن کے سامنے اللہ کے ساتھ شرک کیا جاتا ہے، اور اس پر نکیر کرنے والے سے وہ قتال کرتا ہے، اور اس کے خلاف نکیر کے ازالے کی کوشش کرتا ہے۔ واللہ المستعان۔ والسلام (عقیدۃ الشیخ)

شیخ موصوف کی مذکورہ عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ ان کی طرف بہت سی باتوں کی نسبت جھوٹی تھی، جن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ جو محمد بن عبدالوہاب کی اطاعت نہیں کرے گا، وہ کافر ہے، اس کے بجائے ان کا نکتۂ نظر یہ تھا کہ جو توحید پر عمل پیرا اور شرک سے مبرا ہوگا، وہ مومن ہوگا، خواہ وہ کہیں بھی اور دنیا کے کسی حصے میں بھی ہو۔

لیکن جو اللہ کے ساتھ الوہیت میں شریک کرتا ہے، اور اس کو اس کا باطل ہونا بتلا بھی دیا جاتا ہے، لیکن وہ پھر بھی اصرار کرتا ہے، وہ کافر شمار ہوگا، اسی طرح جو شخص باطل کو حق یا جائز عمل بنا کر سادہ لوح لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اور قبر پرستی کرنے والوں کو پناہ فراہم کرتا ہے، اور اس سے منع کرنے والوں سے قتال کرتا ہے، تو اس کو بھی شیخ موصوف کافر قرار دیتے تھے، کیونکہ وہ شیخ کے نزدیک ضالّ و مضلّ اور شرک پرستی کو تحفظ فراہم کرنے اور اس کا مبلّغ ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج تھا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا نواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور شیخ موصوف کے تلمیذ اور داماد اور محمد بن سعود کے بیٹے عبدالعزیز بن محمد بن سعود، دونوں نے ایک مکتوب یمن کی ایک شخصیت ''احمد بن محمد عدیلی بکبلی'' کی طرف لکھا، جس کا ایک اہم اقتباس درجِ ذیل ہے۔

من عبد العزيز بن محمد بن سعود ومحمد بن عبد الوهاب، إلى الأخ في الله: أحمد بن محمد العديلي البكبلي، سلمه الله من جميع الآفات، واستعمله بالباقيات الصالحات، وحفظه من جميع البليات، وضاعف له الحسنات، ومحا عنه السيئات؛ سلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

أما بعد، لفانا كتابكم، وسر الخاطر بما ذكرتم فيه من سؤالكم، وما بلغنا على البعد من أخباركم، وسؤالكم عما نحن عليه، وما دعونا الناس إليه؛ فأردنا أن نكشف عنكم الشبهة بالتفصيل، ونوضح لكم القول الراجح بالدليل، ونسأل الله سبحانه وتعالى أن يسلك بنا وبكم أحسن منهج وسبيل ....وأما ما ذكرتم من حقيقة الاجتهاد، فنحن مقلدون الكتاب والسنة، وصالح سلف الأمة، وما عليه الاعتماد من أقوال الأئمة الأربعة: أبي حنيفة النعمان بن ثابت، ومالك بن أنس، ومحمد بن إدريس، وأحمد بن حنبل، رحمهم الله تعالى (الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص ۹۴ الیٰ ۹۶، ملخصاً، القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم، الرسالة الرابعة عشره: رسالته إلى البكبلي صاحب اليمن)

ترجمہ: عبدالعزیز بن محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب کی طرف سے ''الأخ فی اللہ ''احمد بن محمد عدیلی بکبلی کی طرف، جس کو اللہ تمام آفات سے محفوظ رکھے، اور باقیات الصالحات والے اعمال کی توفیق عطا فرمائے، اور اس کی بلیات سے حفاظت فرمائے، اور اس کے لیے حسنات میں اضافہ فرمائے، اور اس سے گناہوں کو درگزر فرمائے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

اس کے بعد عرض ہے کہ ہمیں تمہارا مکتوب پہنچا، اور راز داری کے جو حالات تم نے ذکر کیے ہیں، اور جو تم نے سوال کیا ہے، ہمیں دور سے ان کے متعلق تمہاری خبر پہنچی، اور ہمارے اس موقف کے متعلق تمہارا سوال پہنچا، جس کی ہم لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، تو ہم نے چاہا کہ ہم تفصیل کے ساتھ تمہارے سامنے شبہ کو دور کردیں، اور دلیل کے ذریعے سے جو قول راجح ہو، اس کی وضاحت کردیں، اور ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے اس کی دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور تمہیں اچھے اور عمدہ راستے اور طریقے پر چلائے .... (پھر کچھ تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں) اور جو تم نے اجتہاد کی حقیقت کے بارے میں ذکر کیا ہے، تو ہم کتاب وسنت اور صالحین سلفِ امت کے مقلد ہیں، اور ان چیزوں کے مقلد ہیں، جن پر ائمہ اربعہ کے اقوال کی روشنی میں اعتماد کیا گیا ہے، یعنی ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، اور مالک بن انس اور محمد بن ادریس اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ (عقیدۃ الشیخ)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، کتاب وسنت، ائمہ سلف اور بالخصوص ائمہ اربعہ کی تقلید کے قائل تھے، اور ان کی طرف اس کے برخلاف کی نسبت کرنا درست نہیں، تاہم وہ تقلید میں اس طرح کے جمود کے قائل نہ تھے کہ دلیل سے جو بات کسی امام کے خلاف واضح نظر آئے، اس کو کسی دوسرے کی تقلید کی وجہ سے ترک نہ کیا جائے، جیسا

کہ انہوں نے دوسرے مکتوبات میں وضاحت فرمائی ہے۔

اوراس بات میں اصولی اعتبار سے دوسرے فقہائے کرام کوبھی اختلاف نہیں، البتہ جامدین و متعصبین کا معاملہ الگ ہے، اوران کا قول وفعل حجت نہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا دسواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے ایک مکتوب عبداللہ بن عبداللہ صنعانی کوتحریر کیا، جس میں انہوں نے اس بات کی تصریح فرمائی کہ:

أما مذهبنا: فمذهب الإمام أحمد بن حنبل إمام أهل السنة، ولا ننكر على أهل المذاهب الأربعة إذا لم يخالف نص الكتاب والسنة وإجماع الأمة وقول جمهورها.

والمقصود: بيان ما نحن عليه من الدين، وأنه عبادة الله وحده لا شريک له فيها، بخلع جميع الشرک، ومتابعة الرسول فيها بخلع جميع البدع، إلا بدعة لها أصل فی الشرع، کجمع المصحف فی کتاب واحد، وجمع عمر رضی الله عنه الصحابة على التراويح جماعة، وجمع ابن مسعود أصحابه على القصص كل خميس، ونحو ذلک فهذا حسن .والله أعلم (الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص۱۰۷، القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم، الرسالة السادسة عشره: رسالته إلى عبد الله بن عبد الله الصنعانی، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ: جہاں تک ہمارے مذہب کا تعلق ہے، تو وہ امامِ اہلِ سنت امام احمد بن

حنبل کا مذہب ہے، اور ہم چاروں مذاہب والوں (یعنی حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ و حنابلہ) پر کوئی نکیر نہیں کرتے، جب تک کہ وہ کتاب اللہ کی تصریح اور سنت اور اجماعِ امت اور جمہور امت کے قول کے خلاف نہ ہو۔

اور اصل مقصود اس چیز کا بیان کرنا ہے، جس دین پر ہم ہیں، جو کہ اللہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت ہے، ہر طرح کے شرک سے بچ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا ہے، ہر طرح کی بدعات سے بچ کر، سوائے اس بدعت کے، جس کی شریعت میں کوئی اصل موجود ہے، جیسا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب میں جمع کرنا، اور عمر رضی اللہ عنہ کا صحابۂ کرام کو تراویح کی جماعت میں جمع کرنا، اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنے اصحاب کو ہر جمعرات میں قصص پر جمع کرنا، اور اس جیسی دوسری چیزیں، تو یہ حسن ہیں، و اللّٰہ اعلم (عقیدۃ الشیخ)

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ وہ خود، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب پر قائم تھے، لیکن اس سلسلہ میں اس طرح کے جمود کے قائل نہ تھے کہ دلیل سے وہ دوسرے امام کے کسی مسئلہ کو راجح سمجھنے کے باوجود، اس کو اپنے امام کی محض تقلید کی وجہ سے ترک کر دیں۔

اسی کے ساتھ وہ ائمہ اربعہ کے مقلدین پر نکیر بھی نہیں کرتے تھے، جیسا کہ آج کل بعض غیر مقلدین کا طرزِ عمل ہے۔

نیز شیخ موصوف، اللہ کی وحدانیت اور اتباعِ سنت کے داعی و مبلغ اور شرک و بدعت کے ماحی و مخالف تھے، سوائے ان امور کے، جن کی شریعت میں اصل پائی جاتی ہو، اور ان کو بدعتِ حسنہ وغیرہ قرار دیا گیا ہو۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ شیخ موصوف کا مندرجہ بالا موقف اصولی طور پر اہلُ السنۃ والجماعۃ کے موقف کے مطابق ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا گیارہواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے ایک مکتوب، ’’اہلِ مغرب‘‘ کی طرف روانہ کیا، جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ:

فالشفاعة حق، ولا تطلب فى دار الدنيا إلا من الله تعالى، كما قال تعالى:(وأن المساجد لله فلا تدعو مع الله أحدا)وقال:(ولا تدع من دون الله ما لا ينفعک ولا يضرک فإن فعلت فإنک إذا من الظالمين)

فإذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم، وهو سيد الشفعاء، وصاحب المقام المحمود، وآدم فمن دونه تحت لوائه، لا يشفع إلا بإذن الله، لا يشفع ابتداء، بل "يأتى فيخر ساجدا، فيحمده بمحامد يعلمه إياها، ثم يقال: ارفع رأسک، وقل يسمع، وسل تعط، واشفع تشفع .ثم يحد له حدا فيدخلهم الجنة "، فكيف بغيره من الأنبياء والأولياء؟ وهذا الذى ذكرناه لا يخالف فيه أحد من علماء المسلمين، بل قد أجمع عليه السلف الصالح من الصحابة والتابعين والأئمة الأربعة، وغيرهم ممن سلک سبيلهم ودرج على منهجهم.

وأما ما صدر من سؤال الأنبياء والأولياء الشفاعة بعد موتهم، وتعظيم قبورهم ببناء القباب عليها والسرج، والصلاة عندها، واتخاذها أعيادا، وجعل السدنة والنذور لها، فكل ذلک من حوادث الأمور التى أخبر بوقوعها النبى صلى الله عليه وسلم،

وحذر منها، كما في الحديث عنه صلى الله عليه وسلم أنه قال: " لا تقوم الساعة حتى يلحق حى من أمتى بالمشركين، وحتى تعبد فئام من أمتى الأوثان . "وهو صلى الله عليه وسلم حمى جناب التوحيد أعظم حماية، وسد كل طريق يوصل إلى الشرك، فنهى أن يجصص القبر، وأن يبنى عليه، كما ثبت فى صحيح مسلم من حديث جابر .وثبت فيه أيضا أنه بعث على بن أبى طالب رضى الله عنه، وأمره أن لا يدع قبرا مشرفا إلا سواه، ولا تمثالا إلا طمسه؛ ولهذا قال غير واحد من العلماء: يجب هدم القبب المبنية على القبور، لأنها أسست على معصية الرسول صلى الله عليه وسلم.

فهذا هو الذى أوجب الاختلاف بيننا وبين الناس، حتى آل بهم الأمر إلى أن كفرونا وقاتلونا، واستحلوا دمائنا وأموالنا، حتى نصرنا الله عليهم وظفرنا بهم .وهو الذى ندعو الناس إليه، ونقاتلهم عليه بعد ما نقيم عليهم الحجة من كتاب الله وسنة رسوله وإجماع السلف الصالح من الأئمة، ممتثلين لقوله سبحانه وتعالى:(وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله)فمن لم يجب الدعوة بالحجة والبيان، قاتلناه بالسيف والسنان (الرسائل الشخصية "مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس" ص١١٣، ١١٤،القسم الأول: عقيدة الشيخ وبيان حقيقة دعوته ورد ما ألصق به من التهم،الرسالة السابعة عشره: رسالته إلى أهل المغرب، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ: پس شفاعت حق ہے، اور دنیا کے اندر صرف اللہ تعالیٰ سے ہی اس کو طلب کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''**وأن المساجد للّٰه فلا تدعو مع اللّٰه أحدا**'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''**ولا تدع من دون اللّٰه ما لا ينفعک ولا يضرک فإن فعلت فإنک إذا من الظالمين**''

پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''**سید الشفعاء**'' ہیں، اور ''صاحبِ مقامِ محمود'' ہیں، اور آخرت میں حضرت آدم اور آپ کے علاوہ سب لوگ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، لیکن وہ بھی اللہ کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کرسکیں گے، اور شفاعت کی خود سے ابتدا بھی نہیں کریں گے، بلکہ اللہ رب العزت کے حضور آ کر سجدہ ریز ہوں گے، پھر اللہ کی شایانِ شان حمد بیان کریں گے، جس کی اللہ ان کو تعلیم دے گا، پھر کہا جائے گا کہ آپ اپنا سر اٹھایئے، اور کہیے، آپ کی بات سنی جائے گی، اور سوال کیجیے، آپ کو عطا کیا جائے گا، اور شفاعت کیجیے، آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی، پھر آپ کے لیے ایک حد بندی کردی جائے گی، جس کے مطابق آپ لوگوں کو جنت میں داخل کریں گے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے نبیوں اور اولیاء کی کیا حیثیت ہے، اور ہم نے جو بات ذکر کی، اس میں علمائے مسلمین میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس پر سلفِ صالحین کا اجماع ہے، خواہ وہ صحابۂ کرام ہوں، یا تابعین ہوں، اور ائمۂ اربعہ ہوں، اور ان کے علاوہ وہ حضرات ہوں، جو ان کے راستے پر چلے ہیں، اور جنہوں نے ان کے منہج کو اختیار کیا ہے۔

اور جہاں تک انبیاء اور اولیاء سے ان کی وفات کے بعد شفاعت کے سوال کے مسئلہ کا تعلق ہے، اور ان کی قبروں پر قبے اور عمارات بنا کر، اور ان پر چراغ جلا کر، اور ان کے قریب نماز پڑھ کر، اور وہاں میلے لگا کر، اور وہاں مجاوِر بن کر، اور

نذر ونیاز اختیار کر کے، ان کی تعظیم کرنے کے مسئلہ کا تعلق ہے، تو یہ تمام امور بدعت ہیں، جن کے واقع ہونے اور ان سے بچنے کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی خبر دے دی تھی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی، جب تک میری امت کا ایک گروہ مشرکین کے ساتھ ملحق نہیں ہوجائے گا، اور یہاں تک کہ میری امت کی ایک جماعت بتوں کی عبادت نہیں کرنے لگے گی'' (جیسا کہ سنن ابی داؤد کے ''کتاب الفتن'' میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کے باب کی پوری اور عظیم حفاظت فرمادی ہے، اور ہر ایسے راستے کو بند کردیا ہے، جو شرک کی طرف پہنچانے والا ہو، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ کرنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے، اور حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ کسی بھی بلند قبر کو نہ چھوڑیں، مگر اسے برابر کردیں، اور کسی بھی تصویر کو نہ چھوڑیں، مگر اسے مٹادیں، اسی وجہ سے بہت سے علماء نے فرمایا کہ قبروں پر بنے ہوئے گنبدوں کو منہدم کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر قائم کیے گئے ہیں۔

پس یہ وہ چیز ہے، جس نے ہمارے اور لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا کردیا، یہاں تک کہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا، کہ انہوں نے ہمیں کافر تک قرار دے دیا، اور ہمارے ساتھ قتال بھی کیا، اور ہمارے خون اور اموال کو حلال بھی سمجھا، یہاں تک کہ اللہ نے ہماری ان پر مدد فرمائی، اور ہمیں ان کے مقابلے میں کامیاب فرمایا، اور اسی چیز کی ہم لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، اور اسی چیز پر ہم ان سے قتال

کرتے ہیں، لیکن بعداس کے کہ ہم ان پر اللہ کی کتاب اوراس کے رسول کی سنت اور ائمہ سلفِ صالح کے اجماع کی حجت قائم کردیتے ہیں، جس کی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ قول ہے کہ ''**وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله**'' پس جو حجت قائم ہونے اور وضاحت کرنے کے باوجود بھی دعوت کو قبول نہیں کرتا، تو ہم اس سے تلوار اور نیزوں کے ذریعے قتال کرتے ہیں (عقیدۃ الشیخ)

شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ وہ آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے برحق ہونے کے قائل ہیں، لیکن وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یا کسی بھی ولی کی وفات کے بعد اس سے اپنے لیے شفاعت کا سوال کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے، جس پر کلام پہلے گزر چکا ہے، اسی طرح وہ قبروں کی بدعات ومنکرات کے بھی سخت مخالف ہیں، جن میں ایک اہم منکر قبروں پر قبے وعمارات بنانا ہے، اور ان کے نزدیک یہ طرزِ عمل ہی دراصل قبروں کے دیگر منکرات کا بڑا سبب ہے، اگر ان قبروں پر عمارات اور قبے نہ ہوں، تو شاید ان قبروں سے کوئی واقف بھی نہ ہو، اور نہ ہی وہاں نذر ونیاز، سجود لغیر اللہ وغیرہ جیسے منکرات واقع ہوں، اور ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' والا قصہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جن انبیائے کرام واولیائے عظام کی قبریں پختہ نہیں، یا ان کا لوگوں کو علم نہیں، وہ اس قسم کے منکرات سے پاک ہیں۔

اور غالباً اسی قسم کے مصالح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بیشتر نبیوں کی قبروں کو مخفی رکھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے مقام کو آپ کی نبوت کے آخری ہونے کی وجہ سے نمایاں رکھا، لیکن اس کو لوگوں کی نظروں سے مخفی فرمادیا، اور اردگرد مسجدِ نبوی قائم کردی گئی، تاکہ اگر اس کے دائیں بائیں عبادت ہو، تو اللہ ہی کی ہو۔

اور قبروں کی عمارات کے انہدام کے مسئلہ کی وجہ سے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کے

خلاف بہتان والزام تراشیوں کا طوفان برپا کیا گیا، اوراس کی بناء پر شیخ موصوف اوران کے متبعین سے قتل وقتال تک بھی کیا گیا، جس کا شیخ موصوف اوران کے متبعین کی طرف سے مقابلہ کیا گیا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا بارہواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ ’’عامةُ المسلمین ‘‘ کے لیے تحریر کیا، اس میں وہ فرماتے ہیں:

وأما التكفير، فأنا أكفر من عرف دين الرسول ثم بعد ما عرفه سبه ونهى الناس عنه وعادى من فعله، فهذا هو الذى أكفر .وأكثر الأمة، ولله الحمد، ليسوا كذلک.

وأما القتال، فلم نقاتل أحدا إلى اليوم إلا دون النفس والحرمة . وهم الذين أتونا فى ديارنا، ولا أبقوا ممكنا، ولكن قد نقاتل بعضهم على سبيل المقابلة،:(وجزاء سيئة سيئة مثلها)وكذلک من جاهر بسب دين الرسول بعد ما عرف .فإنا نبين لكم أن هذا هو الحق الذى لا ريب فيه، وأن الواجب إشاعته فى الناس وتعليمه النساء والرجال.

فرحم الله من أدى الواجب عليه وتاب إلى الله وأقر على نفسه، فإن التائب من الذنب كمن لا ذنب له، ونسأل الله أن يهدينا وإياكم لما يحبه ويرضاه (الرسائل الشخصية ”مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء السادس“ ص١٥٨ ،القسم الثانى:بيان أنواع التوحيد ،الرسالة الثانية والعشرون: رسالته إلى عامة المسلمين، الناشر: جامعة الإمام محمد بن

سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ: جہاں تک کافر قرار دینے کا تعلق ہے، تو میں اس کو کافر قرار دیتا ہوں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو پہچانتا ہو، پھر اس کو پہچاننے کے بعد میں اس کو برا کہتا ہو، اور لوگوں کو اس سے روکتا ہو، اور جو اس دین پر عمل کرے، اس سے عداوت رکھتا ہو، تو میں اسی شخص کو کافر قرار دیتا ہوں، اور الحمدللہ! امت کی اکثریت اس طرح کے لوگوں کی نہیں ہے۔

جہاں تک قتال کا تعلق ہے، تو ہم نے آج تک کسی سے بھی قتال نہیں کیا، سوائے نفس اور حرمت کے، اور وہ، وہ لوگ ہیں، جو ہمارے پاس، ہمارے علاقوں میں آتے ہیں، اور وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑتے، اور لیکن ہم ان میں سے بعض کے ساتھ مقابلے کی صورت میں ہی قتال کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وجزاء سيئة سيئة مثلها'' اور اسی طریقے سے جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو پہچاننے کے بعد اس کو کھلم کھلا برا بھلا کہتا ہے، تو ہم اس کے سامنے یہ چیز واضح کر دیتے ہیں کہ یہی حق ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں، اور اسی کی لوگوں میں اشاعت کرنا اور مرد اور عورتوں کو اسی کی تعلیم دینا واجب ہے۔

پس اللہ اس پر رحم فرمائے گا، جو اپنے واجب کو ادا کرے گا، اور اللہ کی طرف رجوع کرے گا، اور خود بھی اللہ کے دین پر قائم رہے گا، کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہوتا ہے، جیسا کہ اس نے گناہ نہیں کیا، اور ہم اللہ سے اس بات کا سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور آپ کو ان چیزوں کی ہدایت عطا فرمائے، جن کو وہ پسند کرتا ہے، اور ان سے راضی ہوتا ہے (بيان أنواع التوحيد)

اس سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ، امت کی اکثریت کو کافر نہیں سمجھتے تھے، البتہ وہ ان لوگوں کو کافر قرار دیتے تھے، جو دین کو پہچانتے ہوں، لیکن دوسروں کو اس دین

سے روکتے ہوں، یا دین سے عداوت رکھتے ہوں، اور وہ قتال کرنے کے بھی ان ہی لوگوں سے قائل تھے، جو کسی کو قتل کریں یا ایسا فعل کریں، جو قتال کا باعث ہو، یا خود ان سے قتال میں پہل کریں، اور اس کے باوجود جو مذکورہ فعل سے تائب ہو جائے، وہ اس سے بھی تعرض کے قائل نہیں تھے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا تیرہواں مکتوب

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے ’’شریف‘‘ کے سوال کے جواب میں ایک مکتوب میں درجِ ذیل مضمون تحریر فرمایا:

سألنی الشريف عما نقاتل عليه، وعما نكفّر الرجل به ، فأخبرته بالصدق، وبينت له الكذب الذی يبهت به الأعداء؛ فسألنی أن أكتب له.

فأقول: أركان الإسلام الخمسة، أولها: الشهادتان، ثم الأركان الأربعة .فالأربعة، إذا أقرّ بها وتركها تهاوناً، فنحن وإن قاتلناه علی فعلها – فلا نكفّره بتركها؛ والعلماء اختلفوا فی كفر التارك لها كسلاً من غير جحود.

ولا نقاتل إلا ما أجمع عليه العلماء كلهم، وهو: الشهادتان. وأيضاً، نكفّره بعد التعريف إذا عرف وأنكر (فتاوی ومسائل ”مطبوع ضمن مؤلفات الشيخ محمد بن عبد الوهاب، الجزء الرابع“ص ٩ ،المسألة الثانية، الناشر: جامعة الإمام محمد بن سعود، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ: مجھ سے ’’شریف‘‘ نے اس چیز کے بارے میں بھی سوال کیا، جس پر ہم قتال کرتے ہیں، اور جس چیز کی وجہ سے آدمی کو کافر قرار دیتے ہیں، تو میں نے ان

کو سچی بات کی خبر دی، اور جھوٹ کو واضح کر دیا، جس سے دشمن مبہوت ہو گئے، انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ میں ان کو اس چیز کے متعلق تحریر کروں۔

تو میں کہتا ہوں کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں، پہلا رکن اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت کی گواہی دینا ہے، پھر چار ارکان ہیں، پس چار ارکان کا جب کوئی اقرار کرے، لیکن ان کو سستی کی وجہ سے ترک کرے، تو اگر چہ ہم ان چار ارکان کے اختیار کرنے پر مسلمان سے قتال کرتے ہیں (یعنی اس کو ان چار ارکان کے بجالانے پر بزورِ طاقت مجبور کرتے ہیں) لیکن ان ارکان کے ترک کرنے پر اس کو کافر قرار نہیں دیتے، اور علماء کا ان چار ارکان کے سستی کی وجہ سے ترک کرنے پر، جبکہ انکار نہ کرے، کفر میں اختلاف ہے۔

اور ہم صرف اس ہی چیزوں پر قتال کرتے ہیں، جس پر تمام علماء کا اجماع ہے، اور وہ ''شہادتین'' (اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت کی گواہی دینا) ہے، نیز ہم اس شخص کو بھی کافر ''تعریف'' کے بعد ہی قرار دیتے ہیں، جب وہ اس (شہادتین) کو پہچان لے، اور اس کے باوجود اس کا انکار کرے (فتاوی ومسائل)

شیخ صالح بن عبداللہ عبود نے بھی، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے عقیدے کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اسی عبارت کو نقل کیا ہے۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، سستی کی وجہ سے نماز، ترک کرنے والے کو کافر قرار دینے کے قائل نہیں، اور اُن کا یہ قول جمہور کے مطابق ہے۔

---

[1] وقد أجاب الشيخ لما سأله الشريف عما يقاتلون عليه وعما يكفرون به الرجل؟ بجواب خلاصته: " أن أول الأركان الخمسة للإسلام الشهادتان، وقد أجمع العلماء على كفر تاركها ووجوب قتاله، أما الأربعة الباقية، فإذا أقر الإنسان بها وتركها تهاونا فالشيخ يقول: فنحن وإن قاتلناه على فعلها فلا نكفره بتركها، لأن العلماء اختلفوا في كفر التارك لها كسلا من غير جحود."(عقيدة محمد بن عبد الوهاب السلفية وأثرها في العالم الإسلامي، للشيخ صالح بن عبد الله العبود، ج ا ص ٣٣٠، الباب الأول: خلاصة كتاب عقيدة محمد بن عبد الوهاب السلفية،الفصل الأول: في بيان منهج الشيخ رحمه الله تعالى في عقيدته ودعوته)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ایک روایت بھی اس کے مطابق ہے۔
چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، نے اپنے شاگرد ''مسدد بن مسرہد'' کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

ولا یخرجه من الإسلام شیء إلا الشرک بالله العظیم أو یرد فریضة من فرائض الله عز وجل جاحدا بها فإن ترکها کسلا أو تهاونا کان فی مشیئة الله إن شاء عذبه وإن شاء عفا عنه (طبقات الحنابلة لابنِ ابی یعلیٰ، ج ا ص ۳۴۳، باب المیم، تحت ترجمة "مسدد بن مسرهد بن مسربل البصری")

ترجمہ: اور مسلمان کو اسلام سے کوئی چیز خارج نہیں کرتی، سوائے اللہ العظیم کے ساتھ شرک کرنے، یا اللہ عزوجل کے فرائض میں سے کسی فریضے کو، انکار کرتے ہوئے رَدکرنے کے، پس اگر وہ اللہ کے فرائض میں سے کسی فریضے کو سستی یا کاہلی کی وجہ سے ترک کرے، تو وہ اللہ کی مشیت میں داخل ہوگا، اگر چاہے تو اللہ اسے عذاب دے، اور اگر چاہے تو اسے معاف کرے (طبقات الحنابلۃ)

اس اصول میں ''تارکِ صلاۃ'' بھی داخل ہے، کیونکہ اس میں ''تارکِ صلاۃ'' کا کوئی استثناء مذکور نہیں۔

ہم بھی دلائل کی رو سے امام احمد رحمہ اللہ کی اسی روایت کو ترجیح دیتے ہیں، جس کی رو سے تارکِ صلاۃ کافر و مرتد نہیں ہوتا، جب تک اس کا عقیدے سے انکار نہ کرے، یا عقیدے سے انکار کی کوئی دلیل نہ پائی جائے۔

جس کی مزید تفصیل ہماری تالیف ''قضاء نماز کو ادا کرنے کا حکم'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کی اصل عبارات و مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بنیادی عقائد و افکار، اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق تھے، اور جن چیزوں میں ان کو

دیگر فقہائے کرام سے اختلاف تھا، وہ اجتہادی وفقہی نوعیت کا اختلاف تھا خواہ وہ عملی وفقہی مسائل ہوں، عقائد سے متعلق ہوں، جس کی وجہ سے کوئی اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج یا گمراہ نہیں ہوجاتا، اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف بے جا الزام تراشیوں اور بہتانوں کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہوگیا تھا، اور ان میں سے بیشتر الزامات و بہتانات کے جوابات خود شیخ موصوف نے اپنی زندگی میں ہی بیان فرمادیے تھے، جو شاید اس زمانے میں تو بہت سے اہلِ علم حضرات تک نہ پہنچ سکے ہوں، لیکن آج کے دور میں شیخ موصوف کے مضامین ورسائل شائع ہوکر دنیا بھر کے بہت سے عوام وخواص تک پہنچ چکے ہیں، اور بعض مضامین ورسائل کے عربی زبان کے علاوہ دوسری کئی زبانوں میں تراجم بھی ہوچکے ہیں۔

لہٰذا اب شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کی تصریحات کو نظرانداز کرکے، ان کی طرف کوئی ایسا الزام منسوب کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، جس کی ان سے تصدیق نہیں ہوتی، اور اس سے بڑھ کر اس کی نفی ثابت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اور افراط وتفریط سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.

(فصل نمبر 2)

چند دیگر حضرات کے حوالہ جات

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کے بعد ان کے چند متبعین اور بعض دیگر اہلِ علم حضرات، خاص کر چند مشائخِ دیوبند کے حوالہ جات وعبارات ذکر کی جاتی ہیں، جن کے ذیل میں ان شاءاللہ تعالیٰ ہماری طرف سے ساتھ ساتھ کچھ معروضات بھی ذکر کی جائیں گی۔

آنے والی عبارات وحوالہ جات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائدوافکار بنیادی طور پر اہلُ السنۃ والجماعۃ سے تعلق رکھتے تھے، اوران کا اہلُ السنۃ والجماعۃ سے اس طرح کا کوئی اختلاف نہ تھا کہ جس کی وجہ سے ان کی تکفیر وتضلیل اور تفسیق کی جائے۔

البتہ فروعی مسائل میں اختلاف، خواہ وہ عملی وفقہی نوعیت کا ہو، یا علمی واعتقادی نوعیت کا ہو، ان میں دوسرے فقہاء واہلِ علم حضرات سے اختلاف ہونا مُضر نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا مزاج دین کی وجہ سے دوسرے سے کچھ مختلف ہو، اور وہ اپنے مزاج کے مطابق شریعت پر عمل کرے، اور شریعت کے کسی حکم کی عمداً وقصداً خلاف ورزی نہ کرے، تو اس میں فی نفسہٖ برائی نہیں، البتہ دوسرے اصحابِ علم کو اجتہادی طور پر اس سے اختلاف کا حق حاصل ہے، اوراس کا اظہار بھی جائز ہے، کیونکہ انبیائے کرام کے علاوہ انسانوں میں کوئی بھی معصوم شمار نہیں ہوتا، البتہ اس اختلاف کے اظہار کی تعبیر اوراس کے الفاظ مختلف ہوسکتے ہیں، جن سے ممکن ہے کہ دوسرا دل آزاری محسوس کرے، لیکن ضروری نہیں کہ متکلم ومحرر کا مقصود دوسرے کی دل آزاری ہو، بلکہ ممکن ہے کہ اس کا مقصود اختلافِ رائے کو دوسرے کے سامنے ظاہر کرنا ہو۔

(1)......عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کا حوالہ

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ایک بیٹے کا نام ''عبداللہ'' تھا، جو کہ عالم تھے، اور ان کا شمار علمائے مصنفین میں ہوتا ہے، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بڑے بیٹے ''حسین'' کے بعد یہی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے جانشین مانے جاتے تھے، اور امیر سعود بن عبدالعزیز نے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد اپنی جماعت کے عقائد سے متعلق جو رسالہ تقسیم کرایا تھا، وہ انہی کے ہاتھ کا تحریر کردہ تھا۔

''شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب'' نے 1218 ہجری میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد ایک مکتوب تحریر کیا، جس میں اپنے والد اور ان کی فکر پر لگائے گئے الزامات کے جوابات بیان کیے، اس مکتوب میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

فألحينا عليهم فى مسألة طلب الحاجات من الأموات إن بقى لديهم شبهة .فذكر بعضهم شبهة، أو شبهتين فرددناها بالدلائل القاطعة من الكتاب والسنة حتى أذعنوا ولم يبق عند أحد منهم شك ولا ارتياب فيما قاتلنا الناس عليه أنه الحق الجلى الذى لا غبار عليه، وحلفوا لنا الأيمان المعقدة من دون استحلاف لهم على انشراح صدورهم ،وجزم ضمائرهم أنه لم يبق لديهم شك فى أن من قال :يا رسول الله ، أو يا ابن عباس، أو يا عبد القادر أو غيرهم من المخلوقين ،طالبا بذلك دفع شر أو جلب خير من كل ما لا يقدر عليه إلا الله تعالى من شفاء المريض والنصر على العدو والحفظ من المكروه ،ونحو ذلك إنه مشرك شركا أكبر، يهدر دمه ،ويبيح ماله، وإن كان يعتقد أن الفاعل المؤثر فى

تصريف الكون هو الله تعالى وحده ،لكنه قصد المخلوقين بالدعاء متشفعاً بهم ،ومتقربا بهم ،لقضاء حاجته من الله بسرهم، وبشفاعتهم له فيها أيام البرزخ.

وأن ما وضع من البناء على قبور الصالحين ،صارت فى هذه الأزمان أصناما، تقصد لطلب الحاجات ،ويتضرع عندها ،أويهتف بأهلها فى الشدائد ،كما كانت تفعله الجاهلية الأولى.

وكان من جملتهم مفتى الحنفية الشيخ عبد الملك القلعى ، وحسين المغربى مفتى المالكية، وعقيل بن يحيى العلوى ،فبعد ذلك أزلنا جميع ما كان يعبد بالتعظيم والاعتقاد فيه ،ويرجى النفع والضر بسببه من جميع البناء على القبور وغيرها ،حتى لم يبق فى تلك البقعة المطهرة طاغوت يعبد، فالحمد لله على ذلك .

ثم رفعت المكوس والرسوم، وكسرت آلات التنباک، ونودى بتحريمه ،وأحرقت أماكن الحشاشين ،والمشهورين بالفجور ، ونودى بالمواظبة على الصلاة فى الجماعات، وعدم التفرق فى ذلك ،بأن يجتمعوا فى كل صلاة على إمام واحد، ويكون ذلک الإمام من أحد المقلدين للأربعة رضوان الله عليهم، واجتمعت الكلمة حينئذ، وعبد الله وحده، وحصلت الألفة وسقطت الكلفة، وأمر عليهم، واستتب الأمر من دون سفک دم ،ولا هتک عرض ،ولا مشقة على أحد ،والحمد لله رب العالمين (الهدية السنية والتحفة الوهابية النجدية، ص ۴۲،۴۳، الرسالة الثالثة،

تالیف: سلیمان بن سحمان النجدی، طبعت بامر سلطان عبدالعزیز آلِ سعود، مطبعة المنار، بمصر، الطبعة الاولیٰ:1342ھ)

ترجمہ: پس ہم نے اُن لوگوں سے مرے ہوئے لوگوں سے حاجات طلب کرنے کے مسئلے میں جستجو کی کہ اگر اُن کو اس مسئلہ میں کوئی شبہ باقی ہو، تو وہ ذکر کریں، تاکہ ہم ان کے شبہے کا جواب دیں، پس بعض لوگوں نے ایک یا دو شبہے ظاہر کیے، تو ہم نے ان کے سامنے کتاب وسنت کے قطعی دلائل سے جواب دیا، یہاں تک کہ انہیں یقین ہو گیا، اوران میں سے کسی کو کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا، ان چیزوں میں، جن پر ہم نے لوگوں سے قتال کیا تھا کہ یہی واضح حق ہے، جس میں کوئی غبار نہیں ہے، اورانہوں نے ہمارے سامنے پختہ قسمیں اٹھائیں، حالانکہ ان سے قسم اٹھانے کا مطالبہ بھی نہیں کیا گیا تھا کہ ان کو شرح صدر ہو چکا ہے، اوران کے دلوں میں پختہ یقین ہو چکا ہے، اوران کو اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ جو یہ کہے کہ ''یارسول اللہ'' یا یہ کہے کہ ''یاابن عباس'' یا یہ کہے کہ ''یاعبدالقادر'' یا کسی اور مخلوق کو اس طریقے سے پکارے، اس سے کسی ایسے شر کو دفع کرنے یا ایسی خیر کو حاصل کرنے کو طلب کرتے ہوئے، جس پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور قادر نہیں، مثلاً مریض کو شفا دینا، اور دشمن کے خلاف مدد کرنا، اور ناپسندیدہ چیزوں سے حفاظت کا ہونا، یا اس جیسی کوئی چیز طلب کرنے کی نیت سے غیرُ اللہ کو پکارے، تو وہ مشرک ہوگا، شرکِ اکبر میں مبتلا ہوگا، جس کا خون حلال ہو جائے گا، اوراس کا مال مباح ہو جائے گا، اگرچہ اس کا اعتقاد یہ ہو کہ ان کاموں کے کرنے میں اصل فاعلِ مؤثر، اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، لیکن وہ مخلوق سے دعاء کے ذریعے سے شفاعت طلب کرے گا، اوران سے تقرب حاصل کرے گا، تاکہ عالمِ برزخ میں، اُن کے اللہ کی طرف سے رازدار ہونے کی وجہ سے اوران کی شفاعت کرنے کی وجہ سے،

اس کی حاجت پوری ہوجائے۔ [1]

اور نیک لوگوں کی قبروں پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں، تو اس زمانے میں وہ بت پرستی کا ذریعہ بن گئی ہیں، جن کے ذریعے سے اپنی حاجات کو طلب کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے، اوران کے پاس تضرع اختیار کیا جاتا ہے، یا ان قبروالوں کو مصائب ومشکلات کے وقت میں پکارا جاتا ہے، جیسا کہ جاہلیتِ اولیٰ میں کیا جاتا تھا۔

اوران لوگوں میں حنفیہ کے مفتی ''شیخ عبدالملک قلعی'' بھی موجود تھے، اور مالکیہ کے مفتی ''حسین مغربی'' بھی موجود تھے، اور ''عقیل بن یحییٰ علوی'' بھی موجود تھے، پس اس کے بعد ہم نے (مذکورہ اہلِ علم حضرات سے فتویٰ طلب کرکے) اُن تمام عمارتوں کو زائل کردیا، جن کی تعظیم کرکے اوران کے بارے میں مخصوص اعتقاد رکھ کر عبادت کی جاتی تھی، اوران کی وجہ سے نفع اور ضرَر کی امید کی جاتی تھی، خواہ وہ عمارتیں قبروں پر بنی ہوئی ہوں، یا ان کے علاوہ پر، یہاں تک کہ اس پاکیزہ بقعے میں کوئی طاغوت باقی نہیں رہا، جس کی عبادت کی جاتی ''**فالحمد لله علیٰ ذٰلک**''

پھر مختلف قسم کے ''مکوس'' (یعنی ٹیکس) اور رسموں کو ختم کیا گیا، اور تمبا کو کے آلات کو توڑ دیا گیا، اوران کے حرام ہونے کا اعلان کیا گیا، اور افیون (اور چرس) کے مقامات کو جلا دیا گیا، اور فسق وفجور (اور فحش وبے حیائی) کے مشہور مقامات کو بھی نیست ونابود کردیا گیا، اور باجماعت نماز پر پابندی کا اعلان کیا گیا، اور نمازوں کے درمیان فرق نہ کرنے کا اعلان کیا گیا (یعنی بلاتفریق تمام نمازوں کی ادائیگی کے اہتمام کا حکم دیا گیا) کہ سب لوگ ہر نماز میں ایک امام کی اقتداء میں جمع ہوکر نماز ادا کریں، اور وہ امام ائمۂ اربعہ رضوان اللہ علیہم کے مقلدین میں سے کوئی

---

[1] اس مسئلہ کے متعلق مشائخِ دیوبند کی طرف سے تاویل کا ذکر اگلے باب میں آتا ہے۔ محمد رضوان

ایک ہو، اوراس کے نتیجہ میں آج کے دن اجتماعیت واتحاد قائم ہوگیا، اورتنہا، اللہ کی عبادت کی جانے لگی، اور باہمی الفت ومحبت قائم ہوگئی، اور کلفت ساقط ہوگئی، اور ان پر امیر بنادیے گئے، اور خون بہائے بغیر اور ہتکِ عزت کیے بغیر توبہ کا حکم دیا گیا، اور کسی پر مشقت نہیں ڈالی گئی'' والحمد لله رب العالمين ''(الهدية السنية)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد کی طرف سے شرک وبدعات کے خلاف نہی عن المنکر کا قولی وفعلی اہتمام کیا گیا تھا، اور شرعی احکام کا نفاذ کیا گیا تھا، بالخصوص قبروں پر کی جانے والی بدعات کا قلع قمع کیا گیا تھا، اور یہ طرزِ عمل شرعی تقاضوں کے مطابق تھا، اگرچہ کسی دوسرے کے نزدیک بعض شرکیہ اقوال وافعال میں تاویل کی گنجائش ہو، لیکن اہلِ نجد نے جو کچھ کیا، وہ نیک نیتی واخلاص کے ساتھ جو کچھ حق وسچ سمجھا، اس کے مطابق عمل کیا۔

نیز اسی رسالے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بیٹے عبداللہ لکھتے ہیں:

ونحن أيضاً في الفروع على مذهب الإمام أحمد بن حنبل، ولا ننكر على من قلّد أحدٌ الأئمة الأربعة، دون غيرهم، لعدم ضبط مذاهب الغير، كالرافضة والزيدية والإمامية ونحوهم، لا نقرّهم ظاهراً على شيء من مذاهبهم الفاسدة، بل نجبرهم على تقليد أحد الأئمة الأربعة، ولا نستحق مرتبة الاجتهاد المطلق، ولا أحد منا يدعيه ،إلا أنا في بعض المسائل إذا صح لنا نص جلى من كتاب أو سنة غير منسوخ، ولا مخصص، ولا معارض بأقوى منه، وقال به أحد الأئمة الأربعة، أخذنا به، وتركنا المذهب كإرث الجد والإخوة ، فانا نقدم الجد بالارث ، وان خالفه مذهب الحنابلة ، ولا نفتش على احد في مذهبه، ولا نعترض عليه ، الا اذا

اطلعنا على نص جلى مخالف لمذهب احد الائمة الاربعة، وكانت المسئلة مما يحصل بها شعائر ظاهرة كإمام الصلاة،فنأمر الحنفى والمالكى مثلاً بالمحافظة على نحو الطمانينة فى الاعتدال، والجلوس بين السجدتين؛ لوضوح ذلک، بخلاف جهر الإمام الشافعي بالبسملة فلا نأمره بالإسرار، وشتان ما بين المسألتين.

فإذا قوى الدليل؛ أرشدناهم بالنص وإن خالف المذهب، وذلک يكون نادراً جداً.

ولا مانع من الاجتهاد، فى بعض المسائل دون بعض .ولا مناقضة لعدم دعوى الاجتهاد المطلق.

وقد سبق جمع من أئمة المذاهب الأربعة إلى اختيارات لهم فى بعض المسائل؛ مخالفة للمذهب الملتزمين تقليد صاحبه.

ثم إنا نستعين على فهم كتاب الله بالتفاسير المتداولة المعتبرة، ومن أجلها لدينا تفسير ابن جرير، ومختصره لابن كثير الشافعى، وكذلک البغوى، والبيضاوى، والخازن، والحداد، والجلالين، وغيرهم.

وعلى فهم الحديث بشروح الأئمة المبرزين، كالعسقلانى، والقسطلانى على البخارى، والنووى على "مسلم"، والمناوى على "الجامع الصغير."

ونحرص على كتب الحديث، خصوصاً الأمهات الست وشروحها، ونعتنى بسائر الكتب فى سائر الفنون، أصولاً وفروعاً

وقواعدَ وسيراً، ونحواً وصرفاً، وجميع علوم الأئمة.

ولا نأمر بإتلاف شيء من المؤلفات أصلاً؛ إلا ما اشتمل على ما يوقع الناس في الشرك، كروض الرياحين، وما يحصل بسببه خلل في العقائد، كعلم المنطق، فإنه قد حرمه جمع من العلماء [1] على أنا لا نفحص عن مثل ذلك، وكالدلائل إلا أن تظاهر به صاحبه معاندا؛ أتلف عليه.

وما اتفق لبعض البدو من إتلاف بعض كتب أهل الطائف، إنما صدر من بعض الجهلة، وقد زجروا وغيرهم عن مثل ذلك.

ومما نحن عليه :أنا لا نرى سبي العرب، ولن نفعله، ولم نقاتل غيرهم، ولا نرى قتل النساء والصبيان.

وأما ما يكذب علينا ستراً للحق، وتلبيساً على الخلق، بأنا نفسر القرآن برأينا، ونأخذ من الحديث ما وافق أفهامنا، من دون مراجعة شرح، ولا معوّل على شيخ، وأنا نضع من رتبة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم بقولنا" :النبي رمة في قبره، وعصا أحدنا أنفع له منه، وليس له شفاعة، وأن زيارته غير مندوبة، وأنه كان لا يعرف معنى :لا إله إلا الله، حتى نزل عليه :(فَاعْلَمْ أَنَّهُ لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ)" ، مع كون الآية مدنية.

وأنا لا نعتمد على أقوال العلماء ، فنتلف مؤلفات أهل المذاهب، لكون فيها الحق والباطل .وأنا مجسمة .وأنا نكفّر الناس على الإطلاق أهل زماننا ومن بعد الست مائة، إلا من هو على ما نحن عليه.

---

[1] انما حرموا بعض كتب المنطق القديمة الممزوجة بالفلسفة اليونانية الباطلة ، دون ما نقله المسلمون ، ولم يمزجوه بذلك .منه. محمد رضوان.

ومن فروع ذلک :أن لا نقبل بيعة أحد إلا بعد التقرر عليه ،بأنه كان مشركاً، وأن أبويه ماتا على الشرک بالله، وأنا ننهى عن الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم، ونحرّم زيارة القبور المشروعة مطلقاً.

وأن من دان بما نحن عليه،سقطت عنه جميع التبعات حتى الديون .وأنا لا نرى حق أهل البيت رضوان الله عليهم.

وأنا نجبرهم على تزويج غير الكفء لهم .وأنا نجبر بعض الشيوخ على فراق زوجته الشابة لتنكح شاباً، إذا ترافعوا إلينا .

فلا وجه لذلک .فجميع هذه الخرافات وأشباهها، لما استفهمنا عنها من ذكر أولا، وكان جوابنا في كل مسألة من ذلک : (سُبْحَانَکَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ).

فمن روى عنا شيئاً من ذلک أو نسبه إلينا، فقد كذب علينا وافترى.

ومن شاهد حالنا، وحضر مجالسنا، وتحقق ما عندنا؛ علم قطعياً أن جميع ذلک وضعه علينا وافتراه أعداء الدين، وإخوان الشياطين، تنفيراً للناس عن الإذعان بإخلاص التوحيد لله تعالى بالعبادة، وترک أنواع الشرک الذی نص الله عليه بأن الله لا يغفره (وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِکَ لِمَنْ يَشَاءُ).

فإنا نعتقد :أن من فعل أنواعاً من الكبائر، كقتل المسلم بغير حق، والزنا، والربا، وشرب الخمر، وتكرر منه ذلک، أنه لا يخرج بفعله ذلک عن دائرة الإسلام، ولا يخلد به في دار الانتقام إذا

مات موحداً، بجميع أنواع العبادة.

والذى نعتقده أن مرتبة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم أعلى مراتب المخلوقين على الإطلاق، وأنه حى فى قبره حياة برزخية أبلغ من حياة الشهداء المنصوص عليها فى التنزيل، إذا هو أفضل منه بلا ريب، وأنه يسمع سلام المسلم عليه.

وتسن زيارته إلا أنه لا يشد الرحل إلا لزيارة المسجد والصلاة فيه وإذا قصد مع ذلک فلا بأس، ومن أنفق أوقاته بالاشتغال بالصلاة عليه صلى الله عليه وسلم الواردة عنه فقد فاز بسعادة الدارين،وكفى به همه وغمه ، كما جاء فى الحديث عنه .

ولا ننكر كرامات الاولياء ، ونعترف لهم بالحق، وانهم على هدى من ربهم، مهما صاروا على الطريقة الشرعية، والقوانين المرعية، الا انهم لا يستحقون شيئا من انواع العبادات ، لا حال الحياة ولا بعد المماة (الهدية السنية والتحفة الوهابية النجدية، ص ۴۴،الیٰ،ص۴۷، الرسالة الثالثة، تاليف: سليمان بن سحمان النجدى، طبعت بامر سلطان عبدالعزيز آلِ سعود، مطبعة المنار، بمصر، الطبعة الاولىٰ:1342ھ)

ترجمہ: اور نیز ہم فروع میں امام احمد بن حنبل کے مذہب پر قائم ہیں، اور ہم کسی بھی ایسے شخص پر نکیر نہیں کرتے ، جوائمۂ اربعہ کی تقلید کرے، سوائے ان ائمۂ اربعہ کے علاوہ کے، کیونکہ ان چار مذاہب کے علاوہ کسی اور کا مذہب ضبط ومدون نہیں ہے، مثلاً رافضیہ اور زیدیہ اور امامیہ اوران کے علاوہ، ہم لوگوں کو ان (رافضیہ ، زیدیہ اور امامیہ) کے فاسد مذاہب میں سے کسی چیز کے ظاہر پر باقی نہیں چھوڑتے ، بلکہ ہم ان کو ائمۂ اربعہ میں سے کسی کی تقلید پر مجبور کرتے ہیں، اور ہم

اجتہادِ مطلق کے درجے کے مستحق نہیں، اور نہ ہم میں سے کوئی اس کا دعویٰ کرتا ہے، مگر جب ہمارے سامنے بعض مسائل میں کوئی نصِ جلی کتاب یا سنت کی صحیح رہنمائی ہوجاتی ہے، جو نہ تو منسوخ ہو، اور نہ مخصص ہو، اور نہ اپنے سے زیادہ قوی دلیل کے معارض ہو، اور ائمۂ اربعہ میں سے کسی نے اس کے مطابق قول کیا ہو، تو ہم اس کو لے لیتے ہیں، اور اپنے مذہبِ حنبلی کو ترک کردیتے ہیں، جیسے دادا اور بھائی کی میراث کا مسئلہ کہ ہم دادا کو وراثت میں مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ اس میں مذہبِ حنابلہ کی مخالفت ہے، اور ہم کسی کے مذہب کا تجسس نہیں کرتے، اور نہ ہم اس پر اپنے مذہب کو پیش کرتے، اِلّا یہ کہ ہم کسی ایسے نصِ جلی پر مطلع ہوجائیں، جو ائمۂ اربعہ میں سے کسی کے مذہب کے مخالف ہو، اور اس مسئلے کا ان چیزوں سے تعلق ہو، جن سے ظاہری شعائر حاصل ہوتے ہیں، جیسا کہ نماز کا امام، تو ایسی صورت میں مثلاً ہم حنفی اور مالکی کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اعتدالِ ارکان اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا اہتمام کرے، کیونکہ یہ زیادہ واضح ہے، بخلاف شافعی امام کے ''بسم اللہ'' جہراً پڑھنے کے کہ ہم اس کو آہستہ پڑھنے کا حکم نہیں دیتے، اور دونوں مسئلوں میں بہت فرق ہے۔

پس جب کوئی دلیل قوی ہوتی ہے، تو ہم نص کی وجہ سے اس کو اختیار کرلیتے ہیں، اگرچہ وہ مذہب کے مخالف ہو، اور ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔

اور بعض مسائل میں اجتہاد ہونے اور بعض میں اجتہاد نہ ہونے میں کوئی مانع نہیں، اور نہ اس کا اجتہادِ مطلق کے دعوے سے کوئی تناقض لازم آتا۔

اور چاروں ائمہ کے مذاہب میں ایسے بہت سے حضرات گزرے ہیں، جن کی بعض مسائل میں اپنی ترجیحات ہیں، جو کہ ان کے اپنے مخصوص مذہب کے مخالف ہیں، جس مذہب کے امام کی تقلید کا انہوں نے التزام کیا ہے۔

پھر ہم کتابُ اللہ کو سمجھنے کے لیے معتبر اور مفصل تفاسیر سے مدد حاصل کرتے ہیں، اوراس مقصد کے لیے ہمارے پاس تفسیر ابنِ جریر، اور ابنِ کثیر شافعی کی ''مختصر التفسیر'' موجود ہے، اوراسی طریقے سے بغوی اور بیضاوی اور خازن اور حداد اور جلالین وغیرہ کی تفاسیر بھی ہیں۔

اور ہم حدیث کو سمجھنے کے لیے جلیلُ القدر ائمہ کی شروح سے مدد حاصل کرتے ہیں، جیسا کہ ''بخاری'' پر عسقلانی اور قسطلانی کی شروح، اور ''مسلم'' پر نووی کی شرح، اور ''**الجامع الصغیر**'' پر مناوی کی شرح سے۔

اور ہم کتبِ حدیث کا شوق رکھتے ہیں، خاص طور پر صحاحِ ستہ اور ان کی شروح کا، اور ہم تمام فنون میں، تمام کتب سے استفادہ کرتے ہیں، خواہ وہ اصولی ہوں یا وہ فروعی ہوں، اور خواہ قواعد پر مشتمل ہوں، خواہ سیرت پر، اور خواہ نحو پر مشتمل ہوں یا صرف پر، اوران کے علاوہ دوسرے تمام بنیادی علوم پر مشتمل ہوں۔

اور ہم مصنفین میں سے کسی کی بھی کتابوں کو تلف کرنے کا حکم نہیں کرتے، سوائے اُن کتابوں کے، جو ایسی باتوں پر مشتمل ہوں، جن سے لوگ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں، جیسا کہ ''روض الریاحین'' یا وہ ایسی کتابیں ہوں، جن کی وجہ سے عقائد میں خلل واقع ہوتا ہو، جیسا کہ علمِ منطق کی بعض کتب، کیونکہ ان کو علماء کی ایک بڑی جماعت نے حرام قرار دیا ہے (جن میں یونانی باطل فلسفے کی آمیزش ہو)

لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ہم ان جیسی چیزوں کی ٹوہ میں نہیں لگتے، اسی طریقے سے ہم کسی کے دلائل کے بھی رَد کے درپے نہیں ہوتے، مگر یہ کہ جو معاندانہ دلائل ہوں، اُن کو تلف اور رَد کرتے ہیں۔

اور بعض دیہاتیوں کی طرف سے، جو بعض اہلِ طائف کی کتابوں کے تلف کرنے کے واقعات وجود میں آئے، تو وہ بعض جاہل لوگوں کی طرف سے وجود میں

آئے، جن کو اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو ہماری طرف سے زجر و تنبیہ کی گئی۔ [1]

اور ہماری رائے یہ ہے کہ ہم عرب کو قیدی نہیں بناتے، اور ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے، اور نہ ہم ان کے علاوہ سے قتال کرتے، اور نہ ہی ہم عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے کو جائز سمجھتے۔

اور ہمارے خلاف حق پر پردہ ڈالنے کے لیے، اور مخلوق کو دھوکا دینے کے لیے، جو یہ جھوٹ بولا جاتا ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں، اور ہم اس حدیث کو لیتے ہیں، جو ہماری فہم کے موافق ہو، شرح کی طرف مراجعت نہیں کرتے، اور نہ کسی شیخ کی پروا کرتے، اور ہم اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے رتبے سے یہ کہہ کر گراتے ہیں کہ ''نبی اپنی قبر میں بوسیدہ اور مٹی ہو گئے ہیں، اور ہم میں سے کسی کی لاٹھی اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نفع بخش ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کا استحقاق نہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (قبر کی) زیارت مستحب نہیں، اور آپ کو لا الٰہ الا اللہ کے معنیٰ کی معرفت حاصل نہیں تھی، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ ''**فَاعْلَمْ أَنَّهُ لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ**'' جبکہ یہ آیت مدنی ہے''

اور یہ کہ ہم علماء کے اقوال پر اعتماد نہیں کرتے، اور ہم اہلِ مذاہب کی کتابوں کو تلف کر دیتے ہیں، کیونکہ اس میں حق اور باطل موجود ہے، اور یہ کہ ہم ''مجسمہ'' (یعنی اللہ کے جسم ہونے کے قائل) ہیں، اور یہ کہ ہم اپنے زمانے کے تمام لوگوں کو مطلقاً کافر قرار دیتے ہیں، جو لوگ بھی چھٹی صدی کے بعد آئے، سوائے ان لوگوں کے، جو ہمارے طریقے پر ہوں۔

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد کی طرف منسوب بعض کم علم دیہاتیوں نے کچھ چیزوں میں غلو و تشدد سے کام لیا تھا، جس کی وجہ سے اہلِ نجد نے ان کو اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو تنبیہ کی تھی۔ محمد رضوان

اور اسی کے نتیجے میں ہم کسی کی بیعت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے، جب تک وہ اس بات کا اقرار نہ کرلے کہ وہ مشرک تھا، اور اس کے والدین، اللہ کے ساتھ شرک کرنے کی حالت میں فوت ہوگئے ہیں، اور یہ کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کا انکار کرتے ہیں، اور مشروع زیارتِ قبور کو مطلقاً حرام قرار دیتے ہیں۔

اور یہ کہ جو ہمارے طریقے کو جان لے، تو اس سے تمام ذمہ داریاں ساقط ہوجاتی ہیں، یہاں تک کہ قرض ودَین وغیرہ بھی، اور یہ کہ ہم اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حق کے قائل نہیں ہیں۔

اور یہ کہ ہم لوگوں کو اپنے کفو کے علاوہ میں نکاح کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور یہ کہ ہم بعض بوڑھے لوگوں کو اس کی جوان بیوی سے علیٰحدہ ہونے پر مجبور کرتے ہیں، تاکہ وہ عورت، جوان مرد سے نکاح کرلے، جب ہمارے پاس اس طرح کا کوئی قضیہ آتا ہے۔

تو اس طرح کے دعووں اور الزاموں کی کوئی وجہ نہیں، پس یہ تمام خرافات اور ان کے مثل، جن کا ہم نے ذکر سنا ہے، یا ہم نے ذکر نہیں سنا، تو ان میں سے ہر مسئلے کے بارے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ ''سُبُحَانَکَ هٰذَا بُهُتَانٌ عَظِيُمٌ''

پس جو شخص ہماری طرف سے اس طرح کی کوئی بات نقل کرے، یا ہماری طرف اس طرح کی بات کی نسبت کرے، تو اس نے ہم پر جھوٹ بولا، اور بہتان باندھا۔

اور جس نے ہماری حالت کا مشاہدہ کیا، اور ہماری مجلسوں میں حاضر ہوا، اور ہمارے پاس موجود چیزوں کی تحقیق کی، تو وہ قطعاً اس بات کو جان چکا کہ یہ تمام چیزیں ہمارے اوپر گھڑی گئی ہیں، جن کو دین کے دشمنوں اور شیطان کے بھائیوں نے گھڑا ہے، تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کے یقین سے متنفر کریں، اور اس شرک کی انواع کے ترک سے متنفر کریں، جس کے متعلق، اللہ تعالیٰ نے

واضح طور پر یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ مشرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا، اوراس کے علاوہ جس کی چاہے مغفرت فرمادے گا۔

پس ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو کبیرہ گناہوں میں کسی بھی نوعیت کا گناہ کرے گا، جیسا کہ ناحق مسلمان کوقتل کرنا، اورزنا کرنا، اورسود، اورشراب پینا، اوراس طرح کے گناہ کو بار بار کرے گا، تو وہ اس فعل کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا، اور وہ آخرت میں ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، اگر وہ موحد ہونے کی حالت میں فوت ہوجائے، جبکہ اس نے عبادت کی تمام انواع میں توحید کواختیار کیا ہو۔

اور ہم جو عقیدہ رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ تمام مخلوق میں مطلقاً سب سے اعلیٰ ہے، اور آپ اپنی قبر میں حیات ہیں، جو برزخی حیات ہے، اور آپ کی حیات اُن شہداء کی حیات سے زیادہ بلیغ ہے، جس کی قرآن مجید میں تصریح کی گئی ہے، اس لیے کہ آپ بلاشک وشبہ شہداء سے زیادہ افضل ہیں، اورآپ اپنے اوپر سلام کرنے والے کے سلام کو سنتے ہیں۔

اورآپ کی قبر مبارک کی زیارت سنت ہے، مگر ''شدِ رحال'' نہیں کیا جائے گا، سوائے مسجدِ نبوی کی زیارت اوراس میں نماز پڑھنے کے، اور جب اس کے ساتھ کوئی زیارت کا قصد کرے، تو کوئی حرج نہیں، اور جو شخص اپنے اوقات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس درود کے پڑھنے میں مشغول کرے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وارِد ہوا ہے، تو اس نے سعادتِ دارین کی کامیابی حاصل کرلی، اوراس کے رنج وغم کے لیے کفایت ہوگئی، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

اور ہم کراماتِ اولیاء کے بھی منکر نہیں، ہم اولیاء کے لیے کرامات کے حق ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، اوران اولیائے کرام کو رب تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر سمجھتے ہیں، بشرطیکہ وہ شریعت کے طریقے، اور شریعت کے قوانین پر چلے ہوں،

لیکن اس کے باوجود وہ کسی بھی قسم کی عبادت کے مستحق نہیں، نہ تو زندگی میں، اور نہ فوت ہونے کے بعد (الھدیۃ السنیۃ)

مذکورہ تفصیلی عبارت سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین فقہ حنبلی سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ ائمہ اربعہ کے مقلدین پر نکیر نہیں کرتے تھے، لیکن جو لوگ ان ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور مذہب پر عمل کرتے تھے، ان پر اس لیے نکیر کرتے تھے کہ دوسرے مذاہب مدوّن نہیں تھے، اور وہ علامہ ابنِ تیمیہ اور اور علامہ ابنِ قیم کی بھی اتباع کیا کرتے تھے، لیکن دلائل کی رُو سے اگر مذہبِ حنبلی یا علامہ ابنِ تیمیہ وابنِ قیم کے خلاف دوسرا قول راجح محسوس ہوتا، تو اسی کو اختیار کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے ایک مجلس کی بلفظِ واحد تین طلاقوں میں ائمہ اربعہ کے قول کو اختیار کرتے تھے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اور وہ اپنے متعلق مجتہدِ مطلق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تھے، بلکہ جزوی اجتہاد کے قائل اور اسی پر عامل تھے، اور دونوں میں تعارض نہیں، کیونکہ جمہور کے نزدیک جزوی اجتہاد مشروع ہے کہ ایک شخص پورے دین کا مجتہد نہ ہو، لیکن اس کے کچھ حصہ، کسی خاص باب، یا خاص مسئلہ کا مجتہد ہو، جس میں اسے اجتہاد کر کے دوسرے کی تقلید کا ترک کرنا جائز ہو۔

اور چاروں ائمہ کے متبعین ومقلدین میں اس طرح کے بکثرت مسائل ہیں، جن میں انہوں نے اپنے سے بڑوں کے خلاف اجتہاد سے اپنی رائے قائم کی ہے، خواہ تخریج وتفریع کی صورت میں ہو، اور خواہ ترجیح وغیرہ کی شکل میں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ محققین نے اجتہاد کو باقی رہنے کا حکم لگایا ہے، اور فرمایا کہ جو شخص بھی یہ گمان کرتا ہے کہ اس زمانے میں اجتہاد ممکن نہیں، تو اس نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا، اور اپنی جہالت کی وجہ سے دوسرے کے علم کی نفی کی، البتہ اجتہاد کے درجات مختلف ہیں۔ [1]

---

[1] قال العلامة محمد عبدالعزیز الفرھاری (المتوفیٰ: 1209ھ)

والاجتھاد باق الی آخر الدھر، ومن زعم انه لا یمکن فی ھذہ الازمنة، فقد تحکم، ونفی علم غیرہ، بجھل نفسه (النبراس شرح "شرح العقائد" ص ۷۲، تقلید المجتھد)

اوراہلِ نجد کے خلاف بہت سی باتیں مخالفین ومعاندین اوردشمنوں نے گھڑی تھیں، جن سے اہلِ نجد کا تعلق نہ تھا، جن میں عذابِ قبراور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا انکاراورانبیاء و اولیاء کی گستاخی وغیرہ کے الزامات بھی داخل تھے۔

اورآگے چل کر مذکورہ رسالے ہی میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بیٹے شیخ عبداللہ لکھتے ہیں:

وإنما هدمنا بيت السيدة خديجة، وقبة المولد، وبعض الزوايا المنسوبة لبعض الأولياء حسماً لتلك المادة، وتنفيراً من الإشراك بالله ما أمكن لعظم شأنه، فإنه لا يغفر (الهدية السنية والتحفة الوهابية النجدية، ص۴۸، ۴۹، الرسالة الثالثة، تاليف: سليمان بن سحمان النجدى، طبعت بامر سلطان عبدالعزيز آلِ سعود، مطبعة المنار، بمصر، الطبعة الاولىٰ: 1342ھ)

ترجمہ: اور بس ہم نے سیدہ خدیجہ کے مکان کو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت کے قبے کو، اور بعض ایسی زیارتوں وعمارتوں وغیرہ کو، جو بعض اولیائے کرام کی طرف منسوب تھیں، اس (شرک وبدعت) کے مادے کو ختم کرنے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے نفرت دلانے کے لیے منہدم کیا، جتنی بھی اللہ جل شانہٗ کی عظمت کو قائم رکھنا ممکن ہوا، کیونکہ اللہ، شرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا (الهدية السنية)

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد نے جو بعض متبرک مقامات وآثار کو ختم کیا تھا، وہ ایسے مقامات تھے، جن سے کوئی منصوص ضروری حکم وابستہ نہ تھا، نیز وہاں شرک وبدعات کا ارتکاب کیا جاتا تھا، اوراس طرح کے آثار کو ختم کرنے میں شرعاً حرج نہیں، جیسا کہ آگے علامہ عثمانی اور دیگر اہلِ علم حضرات کے حوالہ سے آتا ہے۔

نیز مذکورہ رسالے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بیٹے شیخ عبداللہ لکھتے ہیں:

"فإن قال قائل :منفر عن قبول الحق والاذعان له ، يلزم من تقريركم وقطعكم فى أن من قال :يا رسول الله أسألك الشفاعة أنه مشرک مهدر الدم -أن يقال بكفر غالب الأمة، ولا سيما المتأخرين، لتصريح علمائهم المعتبرين أن ذلک مندوب، وشنوا الغارة على من خالف فى ذلک."

"قلت :لا يلزم ذلک لأن لازم المذهب ليس بمذهب، كما هو مقرر، ومثل ذلک لا يلزم أن نكون مجسمة، وإن قلنا بجهة العلو، كما ورد الحديث بذلک"

"ونحن نقول فيمن مات :تلک أمة قد خلت، ولا نكفر إلا من بلغته دعوتنا للحق، ووضحت له الحجة، وقامت عليه الحجة ، وأصر مستكبراً معانداً كغالب من نقاتلهم اليوم يصرون على ذلک الإشراک، ويمتنعون من فعل الواجبات ، ويتظاهرون بأفعال الكبائر المحرمات ، وغير الغالب انما نقاتله لمناصرته لمن هذه حاله ورضاه به ولتكثير مواد من ذكر، والتغليب معه، فله حينئذ حكمه فى حل قتاله "

"ونعتذر عن من مضى بأنهم مخطئون معذورون لعدم عصمتهم من الخطأ، والإجماع فى ذلک ممنوع قطعياً."

ومن شن الغارة ، فقد غلط، ولا بدع أن يغلط ، فقد غلط، من هو خير منه ، كمثل عمر بن الخطاب رضى الله عنه ، فلما نبهته المرأة رجع فى مسئلة المهر، وفى غير ذلک ، يعرف ذلک فى سيرته، بل غلط الصحابة وهم جمع ، ونبينا صلى الله عليه وسلم

بيـن اظهـرهـم، صار فيهم نوره، فقالوا اجعل لنا ذات انواط ، كما لهم ذات انواط .

"فـإن قـلـت هـذا فيـمن ذهل ،فلما نبه انتبه ،فما القول فيمن حرر الأدلة ،واطلع على كلام الأئمة القدوة، واستمر مصراً على ذلک حتى مات.

"قلت :ولا مـانع أن نعتذر لمن ذكر، ولا نقول :إنه كافر، ولا لما تـقـدم أنـه مـخطئ وإن استمر على خطئه لعدم من يناضله فی هذه الـمسـألة ،فـی وقته بلسانه ،وسيفه ،وسنانه، فلم تقم عليه الحجة، ولا وضحت له المحجة."

بـل الـغـالـب عـلى زمن المؤلفين المذكورين ، التواطؤ على هجر كـلام ائمة السنة فی ذلک رأسا، ومن اطلع عليه اعرض عنه، قبل ان يتـمـكـن فـی قلبه، ولم يزل اكابرهم تنهی اصاغرهم عن مطلق الـنـظر فی ذلک ، وصولة الملوک قاهرة، لمن وقر فی قلبه شیئ من ذلک، الا من شاء الله منهم .

"هـذا وقد رأى معاوية وأصحابه منابذة أمير المؤمنين علی بن أبی طالب رضی الله عنه ،بل وقتاله ومناجزته الحرب، وهم فی ذلک مـخـطئون بالإجماع، واستمروا فی ذلک الخطأ حتى ماتوا، ولم يشتهـر عـن أحـد مـن السـلـف تـكـفيـر أحـد منهم إجماعاً بل ولا تـفسيـقـه، بـل أثبتـوا لهم أجر الاجتهاد، وإن كانوا مخطئين، كما ذلک مشهور عن أهل السنة.

ونـحـن كـذلک لا نـقول بكفر من صحت ديانته، وشهر صلاحه

وعلم وورعه وزهده، وحسنت سيرته، وبلغ من نصحه الأمة ببذل نفسه لتدريس العلوم النافعة والتأليف فيها، وإن كان مخطئاً في هذه المسئلة أو غيرها، كابن حجر الهيثمي (المتوفى 974هـ) فإنا نعرف كلامه في "الدر المنظم "ولا ننكر سعة علمه، ولهذا نعتني بكتبه كـ"شرح الأربعين "و "الزاجر "وغيرهما، ونعتمد على نقله إذا نقل، لأنه من جملة علماء المسلمين"

هذا ما نحن عليه، مخاطبين به من له عقل أو علم، وهو متصف بالإنصاف، خال عن الميل إلى التعصب والاعتساف، ينظر إلى ما يقال، لا إلى من قال .وأما من شأنه لزوم مألوفه وعادته، سواء كان حقًّا أو غير حق، فقلد من قال الله تعالى فيهم :(إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ)عادته وجبلته أن يعرف الحق بالرجال لا الرجال بالحق، فلا نخاطبه وأمثاله إلا بالسيف حتى يستقيم أوده، ويصح معوجه، وجنود التوحيد بحمد الله منصورة، وراياتهم بالسعد والإقبال منشورة (وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُوْنَ)(فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ)وقال تعالى :(وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ)(وَكَانَ حَقّاً عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ)(وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ) (الهدية السنية والتحفة الوهابية النجدية، ص ۴۹ الیٰ ۵۱، الرسالة الثالثة، تاليف: سليمان بن سحمان النجدى، طبعت بامر سلطان عبدالعزيز آلِ سعود، مطبعة المنار، بمصر، الطبعة الاولیٰ:1342هـ)

ترجمہ: پھر اگر کوئی کہنے والا کہے، جو حق کو قبول کرنے، اور اس پر یقین کرنے سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری تقریر اور تمہاری اس بات کے یقین سے کہ

جو شخص ''یا رسول اللہ أسألک الشفاعۃ '' کہے، وہ مشرک ہے، منہدرُالدم ہے، یہ لازم آتا ہے کہ غالب امت کو کفر میں مبتلا قرار دیا جائے، خاص طور سے متاخرین کو، کیونکہ متاخرین کے معتبر علماء نے ان الفاظ کے کہنے کو مندوب قرار دیا ہے، اور اس کی مخالفت کرنے والے کی مذمت کی ہے۔

میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ ہمارے قول سے مذکورہ اعتراض لازم نہیں آتا، کیونکہ مذہب سے لازم آنے والی چیز مذہب شمار نہیں ہوتی، جیسا کہ یہ بات طے شدہ ہے، اور اس جیسی بات کی وجہ سے ہمارا ''مجسمہ'' ہونا لازم نہیں آتا، اگرچہ ہم اوپر کی جہت کے قائل ہوں، جیسا کہ یہ بات حدیث میں آئی ہے (کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، اللہ کے اوپر کی جہت میں ہونے کا اقرار کرنے پر مومن ہونے کی تصدیق فرمائی)

اور فوت شدہ کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ''تلک أمۃ قد خلت '' (ہم ان کے ایمان وکفر یا گمراہی پر بلاوجہ بحث نہیں کرتے) اور ہم صرف اسی کو کافر قرار دیتے ہیں، جسے ہماری دعوتِ حق پہنچ گئی، اور اس کے سامنے دلیل سے وضاحت ہوگئی، اور اس پر حجت قائم ہوگئی، پھر اس کے باوجود اس نے تکبر اور عناد اختیار کرتے ہوئے اپنی غلطی پر اصرار کیا، جیسا کہ اکثر ان لوگوں کی حالت ہے، جن سے آج کے دور میں ہم قتال کرتے ہیں کہ وہ اس شرک کے کرنے پر اصرار کرتے ہیں، اور واجبات کی ادائیگی سے منع کرتے ہیں، اور کبیرہ محرمات کے افعال کو کھلم کھلا کرتے ہیں، اور جو اکثر نہیں ہیں، ان سے ہم صرف اس وجہ سے قتال کرتے ہیں کہ وہ پہلے لوگوں کی اس حالت میں مدد کرتے ہیں، اور ان سے راضی ہوتے ہیں، اور جن کا ہم نے ذکر کیا، ان کے مواد کی تکثیر کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ غلبہ حاصل کرتے ہیں، تو ایسے لوگوں سے قتال کے حلال ہونے کا حکم پہلے والوں

کی طرح ہے۔

اور جو حضرات گزر چکے (یعنی پہلے فوت ہو چکے) ہیں، ان کے بارے میں ہمارا عذر یہ ہے کہ وہ خاطی اور معذور تھے، کیونکہ وہ خطا سے معصوم نہیں تھے، اور اجماع سے اس کی قطعی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

اور جس نے ہمارے بیان کردہ اس موقف کی ہر طرح سے تردید فرمائی، تو اس نے غلط کیا، اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے کہ اس کو غلط قرار دیا جائے، کیونکہ اجتہادی غلطی کا صدور اس سے بہتر شخصیت سے بھی ہوا ہے، جیسا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مہر کے مسئلے میں جب ایک عورت نے آگاہ کیا، تو انہوں نے رجوع فرمالیا، اور اس کے علاوہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت میں کئی واقعات مشہور ہیں، بلکہ اس طرح کی اجتہادی غلطی کا صحابۂ کرام سے بھی صدور ہوا، جبکہ وہ بہت سے افراد تھے، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے، اور صحابۂ کرام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (وحی وہدایت پر مشتمل) روشنی جاری وساری تھی، صحابۂ کرام نے کہا کہ ہمارے لیے بھی اس طرح کا ''ذات انواط'' مقرر کردیجیے، جیسا کہ مشرکین کا ''ذات انواط'' تھا (یعنی جس درخت پر مشرکین اپنا اسلحہ لٹکاتے تھے، اور درخت کے متعلق مخصوص عقیدہ رکھتے تھے، جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تنبیہ فرمائی) [1]

پھر اگر آپ کہیں کہ یہ حکم تو اس کے بارے میں تھا، جس سے ذہول ہوگیا، پھر

---

[1] عن أبى واقد الليثى، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لما خرج إلى حنين مر بشجرة للمشركين يقال لها: ذات أنواط يعلقون عليها أسلحتهم، فقالوا: يا رسول الله، اجعل لنا ذات أنواط كما لهم ذات أنواط، فقال النبى صلى الله عليه وسلم: " سبحان الله هذا كما قال قوم موسى (اجعل لنا إلها كما لهم آلهة)والذى نفسى بيده لتركبن سنة من كان قبلكم :"هذا حديث حسن صحيح وأبو واقد الليثى اسمه الحارث بن عوف وفى الباب عن أبى سعيد، وأبى هريرة(سنن الترمذى، رقم الحديث ٢١٨٠)

جب اسے متنبہ کیا گیا، تو وہ متنبہ ہو گیا، لیکن اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا کہ جس نے (آپ کے بیان کردہ موقف کے خلاف، مثلاً نداء واستشفاع عند القبر وغیرہ کے) دلائل تحریر کیے، اور ائمۂ متبوعین کے کلام پر مطلع ہوا، اس کے باوجود تادمِ حیات اپنے موقف پر قائم رہا۔

تو میں جواب میں کہوں گا کہ اس مذکورہ شخص کو معذور قرار دینے میں بھی کوئی مانع نہیں، اور ہم اس کو کافر قرار نہیں دیں گے، کیونکہ یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ مخطی ہے، اگرچہ اپنی خطا پر اس نے اصرار کیا ہو، کیونکہ اس مسئلے میں اس کے سامنے کسی نے حجت قائم نہیں کی، اس زمانے میں، اس کی زبان میں، اور نہ ہی تلوار اور نیزوں سے، اس کا مقابلہ کیا، تو نہ اس پر حجت قائم ہوئی، اور نہ اس کے سامنے دلیل سے بات واضح ہوئی۔

بلکہ مذکورہ مؤلفین کے زمانے والوں پر غالب یہ ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں ائمۂ سنت کے کلام کو سِرے سے ہی نظر انداز کر دیا، اور جو اس پر مطلع بھی ہوا، اس نے اس سے اعراض کیا، اس سے پہلے کہ اس کے دل میں یہ مضبوط ہوتا، اور ان کے اکابر اپنے چھوٹوں کو ان مسائل میں غور وفکر کرنے سے منع کرتے رہے، اور بادشاہوں کی طاقت ان لوگوں پر غالب تھی، جن کے دل میں اس سلسلے میں کوئی توقیر پائی جاتی تھی، مگر جن کو اللہ نے چاہا، ان کو بچا لیا۔

اور حضرت معاویہ اور ان کے اصحاب نے امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مقابلے کی رائے قائم کی، بلکہ انہوں نے ان سے قتال اور جنگ بھی کی، دراں حالیکہ وہ لوگ اس میں بالاجماع مخطی تھے، اور وہ اپنی اس خطا پر تادمِ حیات قائم رہے، اور سلف میں سے کسی کی طرف سے، ان میں سے کسی کے کفر کا حکم بالاجماع صادر نہیں ہوا، بلکہ ان کے فسق کا حکم بھی صادر نہیں، ہوا، بلکہ انہوں نے،

ان کے لیے اجتہاد کے اجر کو ثابت کیا ہے، اگر چہ وہ مخطی تھے، جیسا کہ اہلِ سنت کی طرف سے یہ بات مشہور ہے۔

اور ہم اسی طریقے سے اس شخص کے کفر کے بھی قائل نہیں، جس کی دیانت صحیح ہو، اور اس کی اچھی شہرت ہو، اور اس کا تقویٰ اور زہد معلوم ہو، اور اس کی سیرت اچھی ہو، اور اس نے امت کی اصلاح اور تبلیغ کے لیے اپنی جان کو کھپایا ہو، علومِ نافعہ کی تدریس وتالیف میں مشغول ہو کر، اگر چہ وہ اس مسئلے میں یا اس کے علاوہ دوسرے مسئلے میں مخطی کیوں نہ ہو، جیسا کہ علامہ ابنِ حجر ہیثمی، جن کے کلام کو ہم ''الـــدر الـمنظم ''میں پہچانتے ہیں، لیکن ہم ان کی وسعتِ علم کا انکار نہیں کرتے، اور اسی وجہ سے ہم ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، جیسا کہ ''شـرح الاربـعین '' اور ''الـزاجـر ''اور ان کے علاوہ، اور جب وہ کوئی بات نقل کرتے ہیں، تو ہم ان کی نقل پر اعتماد کرتے ہیں، کیونکہ وہ علمائے مسلمین میں داخل ہیں۔

یہ ہمارا موقف ہے، جس پر ہم قائم ہیں، اور اسی کا ہم اس شخص کو خطاب کرتے ہیں، جس کو عقل یا علم ہو، اور وہ انصاف پسند ہو، تعصب اور تحزب کی طرف مائل ہونے سے محفوظ ہو، وہ کہی ہوئی بات کی طرف نظر کرتا ہو، کہنے والے کی طرف نظر نہ کرتا ہو، لیکن جس کی حالت یہ ہو کہ وہ اپنی پسندیدہ چیز اور اس کی عادت کو لازم پکڑتا ہو، خواہ وہ حق ہو یا غیر حق ہو، تو اس نے ان لوگوں کی تقلید کی، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''إِنَّـا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ ''اس کی عادت اور جبلت یہ ہے کہ وہ حق کو رجال کے ذریعے سے پہچانتا ہے، رجال کو حق کے ذریعے سے نہیں پہچانتا، تو ہم اس سے اور ان جیسوں سے خطاب تلوار ہی کے ذریعے سے کرتے ہیں، تاکہ ان کا ٹیڑھ پن درست ہو جائے، اور ان کی بگڑی ہوئی جبلت صحیح ہو جائے، اور الحمد للہ، اہلِ توحید

کے لشکروں کی مدد کی جاتی ہے، اوران کے جھنڈے کامیابی اوراستقبال کے ساتھ پھیلائے جاتے ہیں ''وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُوْنَ '''' فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ '' اوراللہ تعالیٰ کاارشاد ہے کہ ''وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ '''' وَكَانَ حَقّاً عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ '''' وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ''

(الهدية السنية)

مذکورہ تفصیلی عبارت سے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اوران کی جماعت کے متعلق کئی شکوک وشبہات دور ہوجاتے ہیں، اوراجتہادی واختلافی مسائل میں بھی صحیح سمت سامنے آجاتی ہے، جس سے ناواقفیت کی بناپر غلط فہمیاں لازم آتی ہیں۔

اگراہلِ نجد نے کسی قول یافعل کوکفروشرک قرار دیا ہو، تو اس سے یہ سمجھنا درست نہیں کہ دوسرے مجتہد جواس قول یافعل کوکفروشرک نہیں سمجھتے، یااس کے جواز ومندوب وغیرہ کے قائل ہیں، تووہ کافرومشرک شمار ہوں گے، کیونکہ اجتہادی خطاء پرزیادہ سے زیادہ مخطی قرار دیا جاتا ہے، کافرقرارنہیں دیاجاتا، علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے بھی اس کی تفصیل اگلے باب میں آتی ہے۔

نیز شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بیٹے شیخ عبداللہ نے جومذکورہ عبارت کے آخرمیں تعصب اورتقلید کی بات ذکر کی ہے، وہ نہایت عمدہ ہے، اورموجودہ زمانے کے ہمارے یہاں کے بہت سے اہلِ علم کے لیے بہت مفید ہے، کیونکہ ہمارے یہاں بہت سے اہلِ علم کے نزدیک حق کواپنے اپنے حلقہ کے رجال سے پہچاننے کے اصول پرعمل زیادہ ہے، اوراس کی اہم وجہ تعصب ہے، اللہ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

نیز مذکورہ رسالے میں ہی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بیٹے شیخ عبداللہ لکھتے ہیں:

ومنها :الاجتماع على رواتب المشايخ برفع الصوت وقراءة الفواتح والتوسل بهم في المهمات، كراتب السمان وراتب

الـحـداد ونـحـوهـمـا، بـل قـد يشتـمـل ما ذكر على شرک أكبر فيـقـاتـلـون عـلـى ذلک، فإن سلموا من أرشدوا إلى أنه على هذه الـصـورة المألوفة غير سنة، بل بدعة ،فإن أبوا عزرهم الحاكم بما يراه رادعاً.

وأما أحزاب العلماء المنتخبة من الكتاب والسنة فلا مانع من قراء تهـا والمواظبة عليها .فـإن الأذكـار والصلاة على النبى صلى الله عـليـه وسـلـم والاستـغـفـار وتـلاوة القرآن ونحو ذلک مطلوب شـرعاً، والمعتنى بها مثاب مأجور، فكلما أكثر منه العبد كان أوفر ثـوابـاً، لـكـن عـلـى الوجه المشروع من دون تقطيع ولا تغيير ولا تـحـريف، وقـد قـال تعالى :(ادْعُـوا رَبَّـكُـمْ تَـضَرُّعاً وَخُفْيَةً)وقال تعالى :(وَلِلَّـهِ الْأَسْـمَـاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا)ولله در النووى فى جـمعه كتاب الأذكار، فعلى الحريص على ذلک به، ففيه الكفاية للموفق.

ومنها :مـا أعتيـد فـى بـعض البلاد من قراء ة مولد النبى صلى الله عـليـه وسـلـم بـقـصـائـد بالحان وتخلط بالصلاة عليه،وبالأذكار والـقراء ة، ويكون بعد صلاة التراويح، ويعتقدونه على هذه الهيئة مـن الـقرب، بل تتوهم العامة أن ذلک من السنن المأثورة ،فينهى عن ذلک.

وأمـا صـلاة الـتـراويـح ،فسـنـة لا بـأس بالجماعة فيها، والمواظبة عليها.

ومنها :مـا أعتيـد فى بعض البلاد من صلاة الخمسة الفروض بعد

آخر جمعة من رمضان ، وهذه من البدع المنكرة إجماعاً، فيزجرون عن ذلك أشد الزجر.

ومنها :رفع الصوت بالذكر عند حمل الميت ،وعند رش القبر بالماء ،وغير ذلك مما لم يرد عمن سلف.

وقد ألف الشيخ الطرطوشى المغربى كتاباً نفيساً سماه "الباعث على إنكار البدع والحوادث "واختصره ابن شامة المغربى، فعلى المعتنى بدينة بتحصيله .

وإنما ننهى عن البدع المتخذة ديناً وقربة، وأما ما لا يتخذ ديناً ولا قربة كالقهوة ،وإنشاد قصائد الغزل ،ومدح الملوك ،فلا ننهى عنه ،ما لم يخلط بغيره.

وإما ذكر أو اعتكاف فى مسجد ويعتقد أنه قربة، لأن حسان رد على أمير المؤمنين عمر بن الخطاب وقال :قد أنشدته بين يدى من هو خير منك، فقبل عمر.

ويحل كل لعب مباح، لأن النبى صلى الله عليه وسلم أقر الحبشة على اللعب فى يوم العيد فى مسجده صلى الله عليه وسلم، ويحل الرجز والحداء فى نحو العمارة والتدريب على الحرب بأنواعه، وما يورث الحماسة فيه كطبل الحرب دون آلات الملاهى ،فإنها محرمة، والفرق ظاهر .

ولا بأس بدف العرس .وقد قال صلى الله عليه وسلم "بعثت بالحنيفية السمحة . . .لتعلم يهود أن فى ديننا فسحة."

هذا وعندنا أن الإمام ابن القيم وشيخه إماماَ حق من أهل السنة،

وكتبهم عندنا من أعز الكتب، إلا أنا غير مقلدين لهم فى كل مسألة، فإن كل أحد يؤخذ من قوله ويترك إلا نبينا محمداً صلى الله عليه وسلم .ومعلوم مخالفتنا لهما فى عدة مسائل.

منها :طلاق الثلاث بلفظ واحد فى مجلس، فإنا نقول به تبعاً للأئمة الأربعة .

ونرى الوقف صحيحاً والنذر جائزاً ويجب الوفاء به فى غير المعصية.

ومن البدع المنهى عنها :قراءة الفواتح للمشايخ بعد الصلوات الخمس ،والإطراء فى مدحهم ،والتوسل بهم على الوجه المعتاد فى كثير من البلاد، وبعد مجامع العبادات، معتقدين أن ذلك من أكمل القرب، وهو ربما جر إلى الشرك من حيث لا يشعر الإنسان، فإن الإنسان يحصل منه الشرك من دون شعور به لخفائه، ولولا ذلك لما استعاذ النبى صلى الله عليه وسلم منه بقوله" :اللهم إنى أعوذ بك أن أشرك بك شيئا وأنا أعلم، وأستغفرك لما لا أعلم إنك أنت علام الغيوب . . ."

وينبغى المحافظة على هذه الكلمات والتحرز عن الشرك ما أمكن فإن عمر بن الخطاب رضى الله عنه قال :إنما تنقض عرى الإسلام عروة عروة ،إذا دخل فى الإسلام من لا يعرف الجاهلية - أوكما قال،وذلك لأنه يفعل الشرك ،ويعتقد أنه قربة، نعوذ بالله من الخذلان، وزوال الإيمان (الهدية السنية والتحفة الوهابية النجدية، ص ۵۲،الی،ص ۵۴، الرسالة الثالثة، تاليف: سليمان بن سحمان النجدى، طبعت بامر سلطان عبدالعزيز آلِ سعود، مطبعة المنار، بمصر، الطبعة الاولیٰ:1342هـ)

ترجمہ: اوران بدعات میں سے ایک بدعت، مشائخ کے وظیفوں پر جمع ہوکر بلند آواز سے ذکر کرنا، اورفواتح کی قرائت کرنا، اور مصائب ومشکلات میں ان مشائخ کے ذریعے سے توسل حاصل کرنا ہے، جیسا کہ ''سمان'' کا وظیفہ، اور ''حداد'' کا وظیفہ، اوران کے علاوہ دوسرے لوگوں کا وظیفہ، بلکہ جووظائف ذکر کیے گئے، بعض اوقات وہ شرکِ اکبر پرمشتمل ہوتے ہیں، جس پران سے قتال کیا جاتا ہے، پس اگروہ اس بات کوتسلیم کرلیں کہ ان کوجو ہدایت دی گئی ہے کہ یہ مخصوص اوران کا پسندیدہ طریقہ سنت نہیں ہے، بلکہ بدعت ہے، تو وہ ہدایت پالیتے ہیں، اوراگروہ انکارکریں، توان کوحاکم اپنی حسبِ منشاء ڈرانے کے لیے تعزیر کرتا ہے۔

جہاں تک علماء کے ان ''احزاب'' واجزاء کا تعلق ہے، جوانہوں نے کتاب وسنت سے منتخب کیے ہیں، توان کی قرائت کرنے اوران کی پابندی کرنے میں کوئی مانع نہیں، کیونکہ یہ اذکاراور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور استغفاراور تلاوتِ قرآن وغیرہ شرعاً مطلوب ہیں، اوران کا اختیار کرنے والا اجروثواب کا مستحق ہے، پس جو بندہ بھی ان کوکثرت سے اختیار کرے گا، تووہ زیادہ ثواب پانے والاشمار ہوگا، بشرطیکہ شریعت کے طریقے پران کواختیار کرے، ان اذکاراوردعاؤں کوآپس میں کاٹے نہیں، اورنہ ان میں تغییر کرے، اورنہ تحریف کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً'' نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے''وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا'' اوراللہ ہی کے لیے نووی کی تعریف ہے کہ انہوں نے اپنی کتابُ الاذکار میں، ان کوجمع کیا ہے، پس جوشخص اس چیز پرحریص ہو، تو توفیق دیئے جانے والے کو یہ کافی ہے۔

اورانہی بدعات میں سے ایک بدعت وہ ہے، جس کی بعض شہروں میں عادت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میلادکوسریلی آوازوں کے ساتھ قصیدوں میں پڑھتے

ہیں، اوران کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے ساتھ اوراذ کاراور قرائت کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں، بعض اوقات یہ تراویح کی نماز کے بعد کرتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس ھیئت کے ساتھ یہ قرب وثواب میں داخل ہے، بلکہ عام لوگ تو اس وہم میں مبتلا ہیں کہ یہ عمل سننِ ماثورہ میں سے ہے، تو اس سے منع کیا جائے گا۔

جہاں تک نمازِ تراویح کا تعلق ہے، وہ چونکہ سنت ہے، تو اس کو باجماعت پڑھنے اوراس کی پابندی کرنے میں حرج نہیں۔

اورانہی بدعات میں سے ایک بدعت وہ ہے، جو بعض شہروں میں رواج پکڑ گئی ہے کہ پانچ فرض نمازوں کو ترک کر کے، رمضان کے آخری جمعہ میں مخصوص طریقے سے نماز پڑھی جاتی ہے (اور بعض جگہ اس کو قضائے عمری کے قائم مقام تصور کیا جاتا ہے) اور یہ بالا جماع انتہائی بری بدعت ہے، جس سے سخت تنبیہ کر کے روکا جائے گا۔

اورانہی بدعات میں سے ایک بدعت، میت کا جنازہ لے کر چلتے وقت بلند آواز سے ذکر کرنا، اور قبر پر پانی ڈالتے وقت بلند آواز سے ذکر کرنا وغیرہ ہے، جو سلف سے ثابت نہیں ہے۔

اور شیخ طرطوشی مغربی نے (بدعات کے قلع قمع پر) ایک نہایت عمدہ کتاب تالیف فرمائی ہے، جس کا نام ہے ''**الباعث علی إنکار البدع والحوادث**'' جس کا ابنِ شامۃ مغربی نے اختصار کیا ہے، تو جو شخص اپنے دین کی حفاظت چاہتا ہے، اس کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔

اور ہم صرف انہی بدعات سے منع کرتے ہیں، جن کو دین اور قربت بنالیا گیا ہے، لیکن جن کو نہ تو دین بنایا گیا، اور نہ قربت بنایا گیا، جیسا کہ قہوہ، اور غزل کے

قصیدوں کا پڑھنا، اور بادشاہوں کی تعریف کرنا، تو ہم اس سے منع نہیں کرتے، جب تک کہ ان کو کسی دوسری چیز کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے (اور کوئی دوسرا منکر بھی اس میں شامل نہ ہو)

اور یہ حکم مسجد میں ذکر یا اعتکاف اور اس کو قربت سمجھنے کا ہے، کیونکہ حضرت حسان نے امیر المومنین عمر بن خطاب پر یہ کہہ کر رَد کیا کہ میں نے یہ اشعار ان کے سامنے پڑھے ہیں، جو آپ سے بہتر تھے (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے) جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول کرلیا۔

اور ہر مباح ''لعِب'' (یعنی کھیل) حلال ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشیوں کو عید کے دن مسجدِ نبوی میں اس پر باقی رکھا، اور ''رجز'' اور ''حداء'' عمارت اور جنگ میں مشق کے وقت اور اس جیسی دوسری چیزوں کے وقت میں حلال ہے، اور جو چیز تنبیہ کرے، جیسا کہ جنگ کا طبل، وہ بھی حلال ہے (جیسا کہ آج کے دور میں سائرن ہوتے ہیں) لیکن آلاتِ ملاہی حرام ہیں، اور ان میں فرق ظاہر ہے۔

اور شادی کے موقع پر دَف میں حرج نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سیدھے اور آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے، تا کہ یہودی یہ بات جان لیں کہ ہمارے دین میں وسعت ہے۔

اور ہمارے نزدیک امام ابنِ قیم اور ان کے شیخ ابنِ تیمیہ، دونوں اہلِ سنت کے برحق امام ہیں، اور ان کی کتابیں ہمارے نزدیک انتہائی عزیز ہیں، لیکن ہم ہر مسئلے میں ان کے بھی مقلد نہیں، کیونکہ ہر ایک کے قول کو لیا بھی جاتا ہے، اور چھوڑا بھی جاتا ہے، سوائے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے، اور علامہ ابنِ تیمیہ اور علامہ ابنِ قیم سے چند مسائل میں ہماری مخالفت معلوم ہے۔

جن میں سے ایک مسئلہ، ایک مجلس میں لفظِ واحد کے ساتھ تین طلاق دینے کا ہے، ہم اس مسئلے میں ائمۂ اربعہ کی اتباع کرتے ہیں۔

اور ہم ''وقف'' کو صحیح سمجھتے ہیں، اور ''نذر'' کو جائز سمجھتے ہیں، اور اس کے پورا کرنے کو واجب سمجھتے ہیں، جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو۔

اور ممنوع بدعات میں سے ایک بدعت، مشائخ کے وظائف کو پانچوں نمازوں کے بعد پڑھنا، اور ان مشائخ کی شان کا وظیفہ (شجرہ وغیرہ) پڑھنا، اور ان کے ساتھ اکثر شہروں میں رائج طریقے پر توسل اختیار کرنا ہے، اور عبادات کے مجامع کے بعد ان اعمال کو اس عقیدے کے ساتھ کرنا ہے کہ یہ انتہائی قرب کا ذریعہ ہیں، جبکہ یہ طرزِ عمل، بعض اوقات اس طرح شرک کی طرف پہنچا دیتا ہے کہ انسان کو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا، کیونکہ انسان سے شرک اس طرح بھی صادر ہوجاتا ہے کہ جس کا اس کو شعور بھی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ شرک مخفی ہوتا ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما کر اس سے پناہ طلب نہ کرتے کہ ''**اللھم إنی أعوذ بک أن أشرک بک شیئا وأنا أعلم، وأستغفرک لما لا أعلم إنک أنت علام الغیوب**''

اور ان کلمات کو یاد رکھنا، اور ممکنہ حد تک شرک سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اسلام کی ایک ایک رسی کو چن چن کر توڑ دیا جائے گا، جب اسلام میں وہ لوگ داخل ہوجائیں گے، جو جاہلیت کو نہیں جانتے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شرک کا ارتکاب کرے گا، اور اس کو قربت سمجھے گا، ہم اللہ کے ذریعے رسوائی اور ایمان کے زوال سے پناہ طلب کرتے ہیں (الھدیۃ السنیۃ)

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بیٹے شیخ عبداللہ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد، بدعات کے سخت مخالف تھے، اور ان کے زمانے وعلاقے میں مختلف قسم کی بدعات رائج تھیں،

جن میں سے بعض بدعات تصوف اور مشائخِ طریقت کے عنوان سے بھی جاری تھیں۔

اور آج ہمارے بعض علاقوں میں بھی اس طرح کی بدعات پائی جاتی ہیں، اور افسوس یہ ہے کہ بعض اہلِ حق کی طرف نسبت کرنے والے لوگ بھی ان بدعات میں مبتلا ہیں، جبکہ ان میں سے بہت سی چیزوں کا تو قرآن وسنت اور محققین مشائخِ اہلِ حق سے ثبوت ہی نہیں ملتا، اور بعض چیزوں کا بعض اہلِ حق مشائخ سے ثبوت ملتا ہے، لیکن اولاً تو ہر شیخ یا تمام مشائخ کا قول وفعل حجت نہیں ہوتا، دوسرے اگر بعد کے لوگوں کی طرف سے ان چیزوں میں غلو اور منکرات کی آمیزش وغیرہ ہوجائے، تو ایسی صورت میں بعد والوں کے اس عمل کو بدعت ہی قرار دیا جائے گا، اگرچہ پہلے کے حضرات کے عمل کو بدعت قرار نہ دیا جائے۔

چنانچہ آج کل بعض غیر مسنون اذکار واشغال کا صوفیا کے مختلف حلقوں میں اتنا سخت اہتمام کا ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ اتنا اہتمام اور اہمیت مسنون اعمال واذکار اور دعاؤں کی تو درکنار، بعض لوگوں میں اتنی اہمیت فرائض و واجبات کی بھی نہیں، اور عوام میں جن عقائد کے ساتھ ان کا رواج ہورہا ہے، ان میں اعتدال کا لحاظ بہت کم ہے، اسی کا ذکر آگے بعض مشائخِ دیوبند وغیرہ کے حوالہ سے بھی آتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان منکرات کی تردید تو درکنار، یا تو ان پر سکوت اختیار کیا جاتا ہے، یا پھر سابق حضرات کے تعامل کو حجت بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اور جس اللہ کے بندہ کو ان منکرات کی اصلاح کی فکر لاحق ہوتی ہے، اور وہ ان پر کوئی نکیر کرتا ہے، تو اس کو سابق مشائخ واکابر کا مخالف اور گستاخ وغیرہ کہنا شروع کردیا جاتا ہے۔

(2)......عبدُ العزیز بن محمد بن سعود کا حوالہ

عبدالعزیز بن محمد بن سعود، جو کہ نجدی حکومت کے پہلے سربراہ محمد بن سعود کے بیٹے تھے، اور یہ محمد بن عبدالوہاب کے شاگرد اور داماد بھی تھے، انہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد 1179 ہجری (بمطابق 1765 عیسوی) سے 1218 ہجری (بمطابق 1803

عیسوی) تک حکومت کی، 1218 ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔

انہوں نے حرمین، شام، مصر، عراق اور مشرق اور مغرب کے تمام علماء کی طرف ایک تفصیلی مکتوب تحریر کیا، جو ایک مستقل رسالہ کی شکل میں ہے، اس مکتوب کے ذریعے سے محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین اور ساتھ ہی نجدی وسعودی حکمرانوں کے عقائد وافکار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ تفصیلی مکتوب سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن کی تقدیم کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

عبدالعزیز بن محمد بن سعود کے مذکورہ تفصیلی مکتوب کے چند اقتباسات ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں:

عبدالعزیز بن محمد بن سعود، اپنے مذکورہ مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:

فنحن لما علمنا وفهمنا من كلام الله وسنة رسوله وكلام الأئمة الأعلام رضى الله عنهم كأبى حنيفة، ومالك، والشافعى، وأحمد وغيرهم من أئمة السلف.

أن "لا إله إلا الله "معناها ترك كل معبود سوى الله واخلاص الالهية له تعالى وحده.

وأن توحيد العبادة هو افراد العباد ربهم بأفعالهم التى أمرهم بها فى كتابه، وعلى لسان رسوله فإذا جعلت لغيره تعالى صار ذلك تأليها للغير مع الله .وإن لم يعتقد الفاعل ذلك .فالمشرك مشرك شاء أم أبى وليس التوحيد خاصا بافراد الله بأفعاله تعالى وتقدس، كخلقه السموات والأرض والليل والنهار، ورزق العباد وتدبيره أمورهم، لأن هذا قد أقر به المشركون ولم يدخلهم فى

الإسلام ويسمى توحيد الربوبية.

"العبادة لغة وشرعا" معناها: لغة الذل والخضوع.

وشرعا: ما أمر به من غير اطراد عرفي، ولا اقتضاء عقلي من أفعال العباد وأقوالهم المختصة بجلال الله وعظمته، كدعائه تعالى بما لا يقدر عليه إلا هو من جلب نفع أو دفع ضر أو رجائه فيه والتوكل عليه، وذبح النسک والنذر والإنابة والخضوع كل ذلک مختص بجلال الله كالسجود والتسبيح والتهليل، فكل ذلک مما قدمناه هو معنى قول "لا إله إلا الله."

ولا يغني أحد التوحيدين عن الآخر، بل صحة احدهما مرتبطة بوجود الآخر.

لما فهمنا ذلک وعلمنا به قام علينا أهل الأهواء فخرجونا وبدعونا وجعلوا اليهود والنصارى أخف منا شرا ومن اتباعنا، ولم ننازع المخالف في سائر المعاصي بأنواعها ولا المسائل الاجتهادية، ولم يجر الاختلاف بيننا وبينهم في ذلک، بل في العبادة بأنواعها، والشرک بأنواعه (رسالة مهمة لعبد العزيز بن محمد بن سعود، صفحة ۱۵، ۱۶، فصل: فنحن نقول ليس للخلق من دون الله ولي ولا نصير، معنى لا إله إلا الله، الناشر: وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية بدولة قطر)

ترجمہ: پس ہم نے جو اللہ کے کلام اور اس کے رسول کی سنت اور ائمۂ اعلام رضی اللہ عنہم، جیسے امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد اور دوسرے ائمۂ سلف کے کلام سے، جو علم حاصل کیا، اور سمجھا، وہ یہ ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ:

''اللہ کے علاوہ ہر معبود کو ترک کر دینا اور الٰہیت کو اللہ وحدہٗ لاشریک کے

ساتھ خاص رکھنا‘‘

اور عبادت کی توحید، وہ بندوں کا اپنے رب کو اُن افعال کے ساتھ تنہا رکھنا اور سمجھنا ہے، جن افعال کا ان کے رب نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے ذریعے سے حکم دیا، پس جب اس عبادت کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کے لیے کر دیا جائے گا، تو یہ اللہ کے ساتھ غیرُ اللہ کو الٰہ بنا لینا ہوگا، اگرچہ فاعل اس کا ارادہ نہ کرے، پس مشرک، مشرک ہی ہے، خواہ وہ چاہے یا انکار کرے، اور توحید ،تنہا اللہ کے ساتھ، اس کے افعال میں مختص نہیں، جیسا کہ آسمانوں اور زمین اور دن اور رات کی پیدائش اور بندوں کو رزق دینا، اور ان کے امور کی تدبیر وانتظام کرنا، کیونکہ ان چیزوں کا تو مشرکین کو بھی اعتراف تھا، لیکن ان کو اسلام میں داخل نہیں کیا گیا، اور اس کا نام توحیدِ ربوبیت ہے۔

عبادت کے لغوی معنیٰ ’’تذلل اور خضوع‘‘ کے ہیں۔

اور عبادت کے شرعی معنیٰ وہ ہیں، جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، جس میں نہ تو عرف کو دخل ہے، اور نہ عقل کے تقاضے کو دخل ہے، خواہ وہ بندوں کے ایسے افعال ہوں یا ایسے اقوال ہوں، جو اللہ جل جلالہٗ اور اس کی عظمت کے ساتھ خاص ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز کی دعاء کرنا، جس پر اس کے علاوہ کوئی قادر نہیں، خواہ وہ کوئی نفع حاصل کرنے سے متعلق ہو، یا ضرر دور کرنے سے متعلق ہو، یا اس سے کوئی امید رکھنے سے متعلق ہو، اور اللہ پر توکل، اور جانور کو ذبح کرنا اور نذر ماننا اور انابۃ اور خضوع، یہ تمام چیزیں اللہ جل جلالہٗ کے ساتھ مختص ہیں، جیسا کہ سجدہ کرنا، اور تسبیح اور تہلیل، بھی اللہ کے ساتھ مختص ہیں، پس یہ تمام چیزیں ہماری طرف سے پہلے ’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ کے بیان کردہ معنیٰ ہیں۔

اور دونوں قسم کی توحیدوں میں سے کوئی ایک، دوسرے سے مستغنی نہیں کرتی، بلکہ

ان میں سے ایک کا صحیح ہونا، دوسرے کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔
جب ہم نے یہ معنیٰ سمجھائے، اور اس کی تعلیم دی، تو اہلِ ہواء ہمارے مقابلے میں کھڑے ہو گئے، انہوں نے ہمارے خلاف خروج کیا، اور ہمیں بدعتی قرار دیا، اور یہود و نصاریٰ کو ہمارے اور ہمارے متبعین کے مقابلے میں شر کے اعتبار سے ہلکا قرار دیا، اور ہمارا مخالف سے گناہوں میں اس کی تمام انواع سمیت کوئی نزاع نہیں ہے (یعنی ہم کسی گناہ پر دوسرے کو کافر قرار نہیں دیتے) اور نہ ہی ہمارا اجتہادی مسائل میں مخالفین سے کوئی نزاع ہے، اور نہ ہی ہمارے اور ان کے درمیان ان اجتہادی مسائل میں کوئی اختلاف جاری ہوا، بلکہ اصل اختلاف عبادت اور اس کی انواع، اور شرک اور اس کی انواع میں ہے (رسالة مهمة لعبد العزيز بن محمد بن سعود)

اس سے معلوم ہوا کہ محمد بن سعود کے بیٹے اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے داماد، عبدالعزیز بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائد وافکار کے متبع تھے، اور وہ بھی توحید کے داعی اور بدعات کے ماحی تھے، اور وہ جن مسائل کو توحیدِ الٰہی کے خلاف خیال کیا کرتے تھے، ان پر شرک کا حکم لگاتے تھے، لیکن جو مسائل فقہائے کرام کے درمیان اجتہادی واختلافی نوعیت کے تھے، ان سے تعرض نہیں کیا کرتے تھے، اور نہ ہی گناہ کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے کسی کی تکفیر کیا کرتے تھے۔

عبدالعزیز بن محمد سعود آگے چل کر مذکورہ مکتوب میں ہی فرماتے ہیں کہ:

وحق أنبيائه عليهم السلام الإيمان بهم وبما جاؤوا به، وموالاتهم، وتوقيرهم، واتباع النور الذى أنزل معهم، وتقديم محبتهم على النفس والمال والبنين والناس أجمعين.

وعلامة الصدق فى ذلك اتباع هديهم والإيمان بما جاؤوا به من

عند ربهم، قال تعالى :(قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰه)

والإيمان بمعجزاتهم، وأنهم بلغوا رسالات ربهم، وأدوا الأمانة، ونصحوا الأمة، وأن محمدا صلى الله خاتمهم وأفضلهم، واثبات شفاعتهم التى أثبتها الله فى كتابه، وهى من بعد اذنه لمن رضى عنه من أهل التوحيد.

وأما المقام المحمود الذى ذكر الله فى كتابه وعظم شأنه فهو لنبينا محمد صلى عليه وسلم.

وكذلك حق أوليائه محبتهم، والترضى عنهم، والإيمان بكراماتهم، لا دعاؤهم ليجلبوا لمن دعاهم خيرا لا يقدر على جلبه إلا الله تعالى، أو ليدفعوا عنهم سوء لا يقدر على دفعه إلا هو عز وجل، فإن ذلك عبادة مختصة بجلاله تعالى وتقدس.

هذا إذا تحققت الولاية رجيت لشخص معين كظهور اتباع سنة، وعمل بتقوى فى جميع أحواله، وإلا فقد صار الولى فى هذا الزمان من أطال سبحته، ووسع كمه، وأسبل ازاره، ومد يده للتقبيل، وليس شكلا مخصوصا، وجمع الطبول والبيارق، وأكل أموال عباد الله ظلما وادعاءا ورغب عن سنة المصطفى وأحكام شرعه (رسالة مهمة لعبد العزيز بن محمد بن سعود، صفحة ١٧، ١٨، فصل:"فالمتعين على كل مسلم صرف همته وعزائم أمره إلى ربه تبارك وتعالى"، الناشر:وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية بدولة قطر)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے انبیائے کرام علیہم السلام کا حق یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا

جائے، اور جو کچھ وہ لے کر آئے، ان پر ایمان لایا جائے، اوران سے محبت کی جائے، اوران کی عزت کی جائے، اوراس نور کی اتباع کی جائے، جو ان کے ساتھ نازل ہوا، اوران کی محبت کو اپنے نفس اور مال اوراولاد اور تمام لوگوں پر مقدم رکھا جائے۔

اوراس (یعنی نبیوں پر ایمان لانے کے) سلسلے میں سچا ہونے کی علامت یہ ہے کہ ان (انبیاء) کی ہدایت کی اتباع کی جائے، اوران چیزوں پر ایمان لایا جائے، جو وہ اپنے رب کی طرف سے لائے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ’’قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰه‘‘

اوران کے معجزات پر ایمان لایا جائے، اوراس بات پر ایمان لایا جائے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچادیا ہے، اورامانت کو ادا کردیا ہے، اورامت کو نصیحت کردی ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، خاتم النبیین ، اور افضل النبیین ہیں، اور نبیوں کی اس شفاعت کو ثابت مانا جائے، جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے، جو کہ اللہ کی اجازت کے بعد ان اہلِ توحید کے لیے ہے، جن سے اللہ راضی ہو۔

اور وہ ’’مقامِ محمود‘‘ جس کا اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، اوراس کی شان کو عظیم بتلایا ہے، وہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص ہے۔

اوراسی طریقے سے اللہ کے ولیوں کا حق یہ ہے کہ ان سے محبت کی جائے، اور اللہ کے ان سے راضی ہونے کی دعاء کی جائے، اوران کی کرامات پر ایمان لایا جائے، لیکن خود ان سے ایسی دعاء نہ کی جائے، وہ دعاء کرنے والے کے لیے کسی ایسی خیر کو حاصل کریں، جس کے حاصل کرنے پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور قادر نہیں، یا ان سے ایسی برائی کو دور کریں، جس کو دور کرنے پر اللہ عزوجل کے علاوہ کوئی قادر

نہیں، کیونکہ یہ عبادت، اللہ جل جلالہٗ کے ساتھ مختص ہے۔

یہ حکم اس وقت ہے، جبکہ ولایت اس شخص کے لیے ثابت بھی ہو، جس کی کسی معین شخص کے لیے امید کی گئی ہے، جیسا کہ سنت کی اتباع کا ظہور، اور تمام احوال میں تقویٰ پر عمل کرنا (کہ اصل کرامت یہی ہے) ورنہ اس زمانے میں ولی وہ شمار ہوتا ہے، جس کی تسبیح لمبی ہو، اور آستین وسیع ہو، اور اس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہو، اور وہ اپنے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لیے پھیلائے، جس کے لیے کوئی مخصوص شکل بھی انہوں نے ضروری نہیں سمجھی، اور وہ ڈھول باجے جمع کرے، اور اللہ کے بندوں کے مالوں کو ظلماً کھائے، اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور شریعت کے احکام سے اعراض کرے (رسالة مهمة)

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد حضرات، اللہ کی ذات وصفات، اور اس کے فرشتوں اور کتابوں، اور جنت وآخرت، سب پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی محبت وعظمت کے قائل ہیں، لیکن اسی طریقے سے، جس طریقے سے ان کی محبت وعظمت کو بجالانے کا اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حکم ہے، اور وہ اس سلسلہ میں غلو کے روادار نہیں ہیں، اور جو لوگ شریعت وسنت کے طریقوں کو چھوڑ کر اور چند رسمی چیزوں کو اختیار کر کے ولایت یا ولی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اور ظالمانہ طریقے پر لوگوں کے مالوں کو کھاتے تھے، اہلِ نجد ان کے مخالف ہیں، جس کی وجہ سے اہلِ نجد نے سرزمینِ عرب سے ان شرک وبدعات پر مشتمل چیزوں کا خاتمہ کیا، اور توحید وسنت کا علَم بلند کیا، اور اس کی وجہ سے باطلین کی طرف سے ان کے خلاف الزام تراشی کا طوفان برپا کیا گیا۔

آج بھی دنیا بھر میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو اپنے آپ کو بڑا ولی تصور کرتے ہیں، اور وہ کسی بزرگ کے مزار کے گدی نشین بنے بیٹھے ہیں، ان میں شریعت کے احکام، سنت کی پیروی کا کوئی اہتمام نہیں، اور جو ان کو ان چیزوں پر آگاہ کرے، اس سے عداوت و

مخالفت کرتے ہیں۔

عبدالعزیز بن محمد سعود، اپنے مذکورہ رسالے میں ہی فرماتے ہیں کہ:

وإذا كان السفر المشروع لقصد مسجد النبی صلی الله عليه وسلم للصلاة فيه دخلت زيارة القبر تبعا لأنها غير مقصودة استقلالا، وحينئذ فالزيارة مشروعة مجمع على استحبابها بشرط عدم فعل محذور عند القبر (رسالة مهمة لعبد العزيز بن محمد بن سعود، صفحة ، ۲۹ ،فصل: "وإذا كان السفر المشروع لقصد مسجد النبی صلی الله عليه وسلم للصلاة فيه دخلت زيارة القبر تبعاً لأنها غير مقصودة استقلالاً" ، الناشر:وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية بدولة قطر)

ترجمہ: اور جب سفر مشروع، مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کے قصد کے لیے ہوگا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت اس میں تبعاً وضمناً شامل ہوجائے گی، کیونکہ وہ مستقلاً مقصود نہیں ہے، اور اس وقت میں مشروع زیارت، جس کے مستحب ہونے پر اجماع ہے، اس کی شرط یہ ہوگی کہ قبر کے قریب کسی ممنوع فعل کا ارتکاب نہ کیا جائے (رسالة مهمة)

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے منکر نہیں، بلکہ اس مقصد کے لیے مستقلاً سفر کرنے کے بجائے، مسجدِ نبوی کے لیے سفر کے قائل ہیں، اور یہی قول علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔

البتہ قبرِ نبوی، چونکہ مسجدِ نبوی کے ساتھ بالکل متصل وملحق ہے، اس لیے جب کوئی مسجدِ نبوی کا قصد کرکے سفر کرتا ہے، تو قبرِ نبوی کی زیارت اس میں خود بخود ضمناً وتبعاً شامل ہوجاتی ہے، لہٰذا اس اختلاف کو بھی زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنا مناسب نہیں، جیسا کہ آگے بعض اہلِ علم حضرات کے کلام کے ذیل میں ذکر آتا ہے۔

(3)......ترکی بن عبداللہ کا حوالہ

ترکی بن عبداللہ بن محمد آل سعود، جو ''نجد'' میں دوسری مرتبہ نجد کی ریاست کے بانی شمار ہوتے ہیں، ان کا دورِ حکومت 1823 عیسوی سے 1834 عیسوی تک رہا۔

ترکی بن عبداللہ نے جو مکتوب مسلمانوں کو تحریر کیا، اس کے شروع میں انہوں نے یہ تحریر کیا کہ:

بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم

من تركى بن عبدالله الى من يراه من المسلمين.

السلام عليكم ورحمة اللّٰه وبركاته!

وبعد فموجب الخط ابلاغلكم السلام، والسؤال عن احوالكم، والنصيحة لكم، والشفقه عليكم ، والمعذرة من الله تعالىٰ، اذ ولّانى الله تعالىٰ امركم ، والله المسؤول المرجوّ ان يتولانا واياكم فى الدنيا والآخرة، ويجعلنا ممن اذا اعطى شكر، واذا ابتلى صبر، واذا أذنب استغفر، والله تعالىٰ منعم يحب الشاكرين ووعدهم على ذلک المزيد، قال الله تعالىٰ " لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ"

فالذى اوصيكم به تقوى الله تعالىٰ فى السر والعلانية. قال الله تعالىٰ:"وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ" وجماع التقوى اداء ما افترض الله سبحانه، وترک ما حرم الله ، واعظم فرائض الله تعالىٰ بعد التوحيد الصلاة، ولا يخفاكم ما وقع من الاخلال بها والاستخفاف بشانها، وهى عمود الاسلام الفارقة بين الكفر والإيمان، من اقامها فقد اقام دينه ، ومن

ضيعها فهو لما سواها اضيع. وهي آخر ما وصّى به النبي صلى الله عليه وسلم، وهي آخر وصية كل نبي لقومه، وهي آخر ما يذهب من الدين، وهي اول ما يحاسب عليه العبد يوم القيامة (تاريخ نجد، ص،١٣٥، ١٣٦ "مكاتبات امراء نجد من آل سعود" الناشر: شركة دار الوراق للنشر المحدودة، بغداد)

ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ترکی بن عبداللہ کی طرف سے اُن لوگوں کی طرف ہے، جن کو ترکی بن عبداللہ مسلمان سمجھتا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

سلام کے بعد عرض ہے کہ اس خط کا مقصود تم تک سلام پہنچانا، اور تمہارے حالات کا معلوم کرنا، اور تمہیں نصیحت کرنا، اور تم پر شفقت کا ہونا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معذرت کا پیش کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے امور کا ذمہ دار بنادیا، اور اللہ سے سوال کیا جاتا ہے، اور امید کی جاتی ہے اس بات کی کہ وہ ہمیں اور آپ کو دنیا اور آخرت میں محبوب رکھے، اور ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے کہ جب عطا کیا جائے، تو شکر کریں، اور جب آزمائش میں مبتلا کیا جائے، تو صبر کریں، اور جب گناہ کریں تو استغفار کریں، اور اللہ تعالیٰ حقیقی منعم ہے، شکر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، جس پر ان سے مزید انعام کا وعدہ فرمایا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "**لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ**"

پس میں تمہیں وصیت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرنے کی، خفیہ اور

علانیہ دونوں قسم کے حالات میں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ’’وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ‘‘ اور تقویٰ کو جمع کرنے والی چیز، ان چیزوں کی ادائیگی ہے، جن کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرض کیا ہے، اور ان چیزوں کو ترک کرنا ہے، جن کو اللہ نے حرام کیا ہے، اور توحید کے بعد، اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سب سے عظیم ترین چیز نماز ہے، اور تم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ نماز میں کتنا زیادہ خلل واقع ہو چکا ہے، اور اس کی شان ہلکی ہو چکی ہے، حالانکہ نماز اسلام کا رکن ہے، جو ایمان اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی ہے، جس نے نماز کو قائم کیا، تو اس نے دین کو قائم کیا، اور جس نے نماز کو ضائع کیا، تو وہ اس کے علاوہ کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی آخر میں وصیت فرمائی ہے، اور یہی ہر نبی کی اپنی قوم کو آخری وصیت ہے، اور یہی دین سے رخصت ہونے والی آخری چیز ہے، اور قیامت کے دن اسی کا بندے سے سب سے پہلے حساب کیا جائے گا (تاریخِ نجد)

ترکی بن عبداللہ نے اپنے مذکورہ مکتوب میں ’’امر بالمعروف اور نہی عن المنکر‘‘ کی اہمیت کو بیان کیا، اور اسی کے ساتھ زکاۃ وعشر وغیرہ کی فرضیت واہمیت وغیرہ کو بیان کیا، اور پھر ربا اور سود کی حرمت اور قباحت کو بیان کیا، اور پھر اس کے بعد ناپ تول کر فروخت کرنے والے پیمانوں کو درست رکھنے کا حکم دیا۔

اس مکتوب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آلِ سعود کے حکمرانوں میں دین کی کس قدر اہمیت اور کس قدر جذبہ تھا۔

(4)......فیصل بن ترکی کا حوالہ

ترکی بن عبداللہ بن محمد آل سعود، کے بعد ان کے بیٹے فیصل بن ترکی بن عبداللہ، آلِ سعود کی

تیسری نسل کے طور پر سامنے آئے، جنہوں نے 1834 عیسوی کے بعد سے 1838 عیسوی تک حکومت کی، درمیان میں ان کی حکومت ختم ہوگئی، پھر اس کے بعد انہوں نے دوسری مرتبہ 1843 عیسوی سے 1865 عیسوی تک تادمِ حیات حکومت کی۔

انہوں نے ایک مکتوب، جو مسلمانوں کو تحریر کیا، اس کا مضمون درجِ ذیل ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

من فیصل بن ترکی الیٰ من یراہ من المسلمین سلمهم اللہ تعالیٰ.

السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاته!

اما بعد! فموجب الخط ابلاغکم السلام، لا زلتم فی خیر وعافیة، والذی اوصیکم به تقوی اللہ فی الغیب والشهادة، والعمل بما یرضیه، وتجنب معاصیه، والمعاداة والموالاة فیه، قال اللہ تعالیٰ: "وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ"

واهم الامور تعلم ما فرض اللہ تعالیٰ من معرفة اصل دین الاسلام وارکانه وواجباته وجمیع شرائعه، ومعرفة ذلک بالکتاب والسنة، وقوام ذلک بالامر بالمعروف والنهی عن المنکر.

لابد فی کل ناحیة من طائفة متصدین لهذا الامر کما قال اللہ تعالیٰ: "کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" وقال تعالیٰ: " وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" وانا ملزم کل من یخاف اللہ تعالیٰ ویرغب فی الفلاح ان یامر بالمعروف وینهی عن المنکر وان یکون الآمر مراعیا

للشروط فی ذلک بان یکون علیما فیما یامر به، علیما فیما ینهی عنه، حلیما فیما یامر به، حلیما فیما ینهی عنه، رفیقا فیما یامر به، رفیقا فیما ینهی عنه.

والزم کل امیر ان یکون عونا لهم وهم خاصته فی الحقیقة، عون له علی ما حمله الله تعالیٰ من الامانة، ویکون لدیکم معلوما ان واضح الجوائز عن المسلمین الحادر والظاهر اذا کانوا معروفین باداء الزکاة من اموالهم الظاهرة والباطنة ، فهی راجعة الیهم علی الوجه المشروع ان شاء الله تعالی.

والمطلوب منکم الاستقامة علی هذا الدین والاجتماع علیه، وقد رأیتم ما فی الجماعة من المصالح العامة والخاصة، وما فی التفرق من الشر فی امر الدین والدنیا، اسأل الله تعالیٰ ان یمن علینا وعلیکم بالقبول، والعفو والعافیة فی الدنیا والآخرة (تاریخ نجد،ص،۱۴۰، ۱۴۱ ”مکاتبات امراء نجد من آل سعود“الناشر: شرکة دار الوراق للنشر المحدودة ، بغداد)

ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ فیصل بن ترکی کی طرف سے اُن لوگوں کی طرف ہے، جن کو فیصل بن ترکی مسلمان سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

سلام ودعا کے بعد عرض ہے کہ اس خط کا مقصود، تم پر سلام پہنچانا ہے، تم ہمیشہ خیر وعافیت کے ساتھ رہو، اور میں جس چیز کی تم کو وصیت کرتا ہوں، وہ اللہ تعالیٰ سے

تقویٰ اختیار کرنا ہے، چھپی ہوئی حالت میں اور لوگوں کے سامنے، اور اللہ کی مرضیات پر عمل کرنا ہے، اور اللہ کی نافرمانیوں سے بچنا ہے، اور اللہ ہی کے لیے دشمنی اور دوستی رکھنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ''۔

اور اہم امور، ان چیزوں کا علم حاصل کرنا ہے، جو اللہ نے فرض کی ہیں، یعنی دینِ اسلام کی بنیاد اور اس کے ارکان، اور اس کے واجبات، اور پوری شریعت کی معرفت حاصل کرنا، اور اس کی کتاب وسنت سے معرفت حاصل کرنا، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے سے اس کو قائم کرنا ہے۔

ہر علاقے میں اس حکم کو پورا کرنے والی جماعت کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' اور میں ہر اس شخص کو جو اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہو، اور کامیابی کی رغبت رکھتا ہو، یہ لازم قرار دیتا ہوں کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، اور امر بالمعروف کرنے والا، اس کی شرائط کی رعایت کرے، بایں طور کہ وہ جس چیز کا امر بالمعروف کر رہا ہے، اس کا علم رکھتا ہو، اور جس چیز سے نہی عن المنکر کر رہا ہے، اس چیز کا بھی علم رکھتا ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں نرمی اختیار کرنے والا ہو، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں آسانی اختیار کرنے والا ہو۔

اور میں ہر امیر کو یہ بات لازم کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کی مدد کرے، اور امیر کی

درحقیقت یہی خاصیت ہے کہ وہ اس چیز کی مدد کرے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو امانت حوالے کی ہے، اور آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ مسلمانوں سے ٹیکس ختم کردیے گئے ہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ جب وہ اپنے اموالِ ظاہرہ اور باطنہ کی زکاۃ کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں، تو وہ مشروع طریقے پر انہی کی طرف (یعنی ان کے غرباء کی طرف) ان شاء اللہ تعالیٰ ٹھیک ٹھیک پہنچ جائے گی۔

اور تم سے اس دین پر استقامت اور اجتماع مطلوب ہے، اور تم اجتماعیت میں عام اور خاص مصالح سے اچھی طرح واقف ہو، اور تفریق وانتشار میں دین ودنیا کا جو شر ہے، اس سے بھی واقف ہو، میں اللہ تعالیٰ سے اس بات کی دعاء کرتا ہوں کہ وہ ہمارے اوپر اور تمہارے اوپر قبولیت کے ساتھ احسان فرمائے، اور دنیا وآخرت میں درگزر اور عافیت والا معاملہ فرمائے (تاریخِ نجد)

اس قسم کے مکتوبات سے آلِ سعود کے حکمرانوں کے نیک صالح ہونے اور ان کے تقوے وطہارت پر روشنی پڑتی ہے۔

(5)......عبداللطیف بن عبدالرحمٰن آلِ شیخ کا حوالہ

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی دعوت وتحریک سے استفادہ کرنے اور ان کی تعلیمات کی تبلیغ کرنے اور ان پر ہونے والے اعتراضات کا دفاع کرنے والی ایک شخصیت کا نام ''عبد اللطیف بن عبدالرحمٰن آلِ شیخ'' ہے، جو کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پڑپوتے ہیں، اور'' شیخ سلیمان بن سحمان'' کا شمار ان کے مشہور تلامذہ میں ہوتا ہے، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن آلِ شیخ کا نسب اس طرح ہے:

''عبداللطیف بن عبدالرحمٰن بن حسن بن محمد بن عبدالوہاب''

شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن آلِ شیخ کی ولادت 1225 ہجری میں ہوئی، اور ان کی وفات

1293 ہجری میں ہوئی۔

انہوں نے کئی رسائل اور کتب تالیف کیں، جن میں سے مشہور تالیفات درج ذیل ہیں:

(1)...... مصباح الظلام فی الرد علی من کذب الشیخ الإمام ونسبه إلی تکفیر أهل الإیمان والإسلام.

(2)...... منهاج التأسیس.

(3)...... رد علی الشبهات الفارسیة.

(4)...... الرد علی الصحاف.

ان کے بعض رسائل کو ان کے تلمیذ سلیمان بن سحمان نے بھی جمع کیا۔

ان کے بعض رسائل ''**مجموعة الرسائل والمسائل النجدیة لبعض علماء نجد الأعلام**'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن آلِ شیخ اپنے رسالہ:

''**مصباح الظلام فی الرد علی من کذب الشیخ الإمام ونسبه إلی تکفیر أهل الإیمان والإسلام**''

میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

إنه من المعلوم عند کل عاقل خبر الناس وعرف أحوالهم، وسمع شیئا من أخبارهم وتواریخهم، أن أهل نجد وغیرهم ممن تبع الشیخ واستجاب لدعوته من سکان جزیرة العرب کانوا علی غایة من الجهال والضلالة، والفقر والعالة، لا یستریب فی ذلک عاقل، ولا یجادل فیه عارف، کانوا من أمر دینهم فی جاهلیة: یدعون الصالحین ویعتقدون فی الأشجار والأحجار والغیران یطوفون بقبور الأولیاء، ویرجون الخیر والنصر من جهتها، وفیهم

من كفر الاتحادية والحلولية وجهالة الصوفية، ما يرون أنه من الشعب الإيمانية، والطريقة المحمدية، وفيهم من إضاعة الصلوات، ومنع الزكاة وشرب المسكرات، ما هو معروف مشهور.

فمحا الله بدعوته شعار الشرك ومشاهده، وهدم بيوت الكفر والشرك ومعابده، وكبت الطواغيت والملحدين، وألزم من ظهر عليه من البوادى وسكان القرى، بما جاء به محمد صلى الله عليه وسلم من التوحيد والهدى، وكفر من أنكر البعث واستراب فيه من أهل الجهالة والجفاء، وأمر بإقامة الصلاة وإيتاء الزكاة، وترك المنكرات والمسكرات، ونهى عن الابتداع فى الدين، وأمر بمتابعة "سيد المرسلين "والسلف الماضين، فى الأصول والفروع من مسائل الدين، حتى ظهر دين الله واستعلن، واستبان بدعوته منهاج الشريعة والسنن، وقام قائم الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر، وحدت الحدود الشرعية، وعزرت التعازير الدينيه، وانتصب علم الجهاد، وقاتل لإعلاء كلمة الله أهل الشرك والفساد حتى سارت دعوته وثبت نصحه لله ولكتابه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم، وجمع الله به القلوب بعد شتاتها، وتألفت بعد عداوتها، وصاروا بنعمة الله إخوانا، فأعطاهم الله بذلك من النصر والعز والظهور، ما لا يعرف مثله لسكان تلك الفيافى والصخور وفتح عليهم الإحسان والقطيف، وقهروا سائر العرب من عمان إلى عقبة مصر، ومن اليمن إلى

العراق والشام(مصباح الظلام فی الرد علی من کذب الشیخ الإمام ونسبه إلی تکفیر أهل الإیمان والإسلام،ص ۴۴،۴۵، القسم الثانی النص المحقق،فصل فی الرد علی المعترض فی تنقصه للشیخ واتهامه بالجهل والتکفیر،الناشر: وزارة الشؤن الإسلامیة والأوقاف والدعوة والأرشاد)

ترجمہ: ہر عاقل کے سامنے ان (اہلِ نجد) لوگوں کی خبر اوران کے حالات واضح ہیں، جس نے ان لوگوں کی کچھ خبر سنی ہے، اوران کی تاریخوں کو سنا ہے کہ اہلِ نجد وغیرہ ان لوگوں میں سے ہیں، جنہوں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی اتباع کی، اوران کی دعوت پر لبیک کہا، جزیرہ عرب کے باشندوں میں سے، یہ لوگ انتہائی جہالت اور ضلالت میں مبتلا تھے، اور انتہائی فقر وفاقے اور تنگ دستی میں مبتلا تھے، جس میں کوئی عاقل شک نہیں کرسکتا، اوراس میں کوئی عارف جھگڑا نہیں کرسکتا، جاہلیت کے زمانے میں ان کے دین کا اصل کام یہ تھا کہ یہ نیک لوگوں کو پکارا کرتے تھے، اور وہ مختلف درختوں اور پتھروں وغیرہ کے بارے میں غلط عقائد رکھا کرتے تھے، اور وہ اولیاء کی قبروں کا طواف کیا کرتے تھے، اوراس کی بناء پر خیر اور نصرت کی امید رکھا کرتے تھے، اوران میں اتحادیہ اور حلولیہ اور جاہل صوفیہ کے وہ کافر بھی داخل تھے، جو ان چیزوں کو ایمان کے اہم شعبے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ سمجھا کرتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ وہ لوگ نمازوں کو ضائع کیا کرتے تھے، اور زکاۃ سے منع کیا کرتے تھے، اور نشہ آور چیزوں کو استعمال کیا کرتے تھے، جیسا کہ یہ بات معروف ومشہور ہے۔

پس اللہ نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی دعوت سے شرک کے شعار اوران کے اڈوں کو ختم کردیا، اور کفر وشرک کے گھروں اور عبادت خانوں کو منہدم کردیا، اور شیاطین اور ملحدین کو زَیر کردیا، اور دیہاتی اور گاؤں کے لوگوں پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی لائی ہوئی توحید اور ہدایت کو غالب کردیا، اور جس نے قیامت کا انکار کیا، انہوں نے اس کو کفر قرار دیا، اور ان کی دعوتِ توحید کے ذریعہ جہلاء اور ظالموں کے طور وطریقوں کو ختم کر دیا، اور نماز کو قائم کرنے اور زکاۃ کو ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور منکرات اور مسکرات کو ترک کرایا، اور دین میں بدعت سے منع فرمایا، اور سیدُ المرسلین اور سلفِ صالحین کی اصول اور فروع میں دین کے تمام مسائل میں اتباع کا حکم فرمایا، یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب آ گیا، اور اس کی شہرت ہوگئی، اور شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کی دعوت کے ذریعے سے، شریعت اور سنت کا طریقہ واضح ہوگیا، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شعبہ قائم ہوگیا، اور حدودِ شریعت کی حد بندی ہوگئی، اور تعزیراتِ دینیہ کو مقرر کردیا گیا، اور جہاد کا جھنڈا نصب کردیا گیا، اور اعلائے کلمۃُ اللہ کے لیے مشرکین اور مفسدین سے قتال کیا گیا، یہاں تک کہ ان کی دعوت چل پڑی، اور ان کی نصیحت، اللہ کے لیے اور اللہ کی کتاب کے لیے، اور اس کے رسول کے لیے، اور ائمۂ مسلمین کے لیے اور عامۃُ المسلمین کے لیے قائم ہوگئی، اور اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے منتشر دلوں کو جوڑ دیا، اور عداوت کے بعد الفت ومحبت قائم کردی، اور وہ اللہ کے فضل سے بھائی بھائی ہوگئے، پس ان کو اللہ نے اس کی برکت سے مدد اور عزت اور غلبہ عطا فرمایا، جس کا ان بیابان علاقوں کے باشندوں میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا، اور ان پر اللہ نے احسان اور انعامات کی فتوحات عطا فرمادیں، اور یہ تمام عرب پر غالب آ گئے، عمان سے لے کر مصر کی وادی تک، اور یمن سے لے کر عراق اور شام تک (مصباح الظلام)

شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن آلِ شیخ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی دعوت سے پہلے نجد کے باشندے سخت جہالت اور شرک وبدعات میں مبتلا تھے، جن

کو شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے توحید وسنت کی دعوت دی، اور ان کو شرک وبدعات اور جہالت کی تاریکیوں سے نکالا، جس کے نتیجے میں شرک وبدعات اور جہالت کا دور دورہ ختم ہوگیا، اور اسلام کے احکام وقوانین کا نفاذ ہوگیا۔

(6)......سلیمان بن سحمان نجدی کا حوالہ

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی آل میں سے شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، ان کے مشہور تلامذہ میں ایک علمی شخصیت ’’**سلیمان بن سحمان بن مصلح نجدی حنبلی**‘‘ کے نام سے گزری ہیں۔

شیخ سلیمان بن سحمان کی ولادت **1266** ہجری میں ہوئی، اور انہوں نے ’’فیصل بن ترکی‘‘ کے زمانے میں ’’ریاض‘‘ میں علمِ دین حاصل کیا، ان کی وفات **1349** ہجری، الموافق **1930** عیسوی میں ہوئی۔

شیخ سلیمان بن سحمان نے اپنے زمانے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی دعوت وتحریک اور ان کے عقائدوافکار پر علمی وتحقیقی کام کیا، اور مختلف رسائل تالیف کیے، جن میں انہوں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کی دعوت وتحریک پر وارِد کیے جانے والے مختلف اعتراضات وشبہات کے جوابات بیان فرمائے، شروع میں ’’**الهدية السنية**‘‘ نام کی کتاب بھی انہوں نے ترتیب دی تھی، یہی کتاب علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے بھی ملاحظہ کی تھی، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

شیخ سلیمان بن سحمان کی مختلف تالیفات ہیں، جن میں سے بعض درجِ ذیل ہیں:

(1)...... **تأييد مذهب السلف و كشف شبهات من حاد وانحرف.**

(2)...... **البيان المبدى لشناعة القول المجدى.**

(3)...... **منهاج أهل الحق والإتباع فى مخالفة أهل الجهل**

والإبتداع.

(4)...... كشف الأوهام والإلتباس عن تشبيه بعض الأغبياء من الناس.

(5)...... الصواعق المرسلة الشهابية على الشبه الداحضة الشامية.

(6)...... الجيوش الربانية فى كشف الشبه العمروية.

(7)...... إقامة الحجة والدليل وإيضاح المحجة والسبيل.

(8)...... تنبيه ذوى الألباب السليمة عن الوقوع فى الألفاظ المبتدعة الوخيمة.

شیخ سلیمان بن سحمان اپنی تالیف ''الصواعق المرسلة الشهابية على الشبه الداحضة الشامية'' میں نجدیہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ ہونے کے الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وله من المعجزات والفضائل والخصائص ما ليس لغيره من الأنبياء مما لا يحصى ولا يستقصى.

ومن أعظم ما خصه الله به من الفضائل المقام المحمود الذى يغبطه به النبيون، قال الإمام أبو جعفر بن جرير رحمه الله على قوله تعالى :(عَسٰى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا)قال :يقعده معه على العرش.

وله فى القيامة ثلاث شفاعات: أما الشفاعة الأولى فيشفع لأهل الموقف حتى يقضى بينهم، بعد أن يتراجع الأنبياء آدم ونوح وإبراهيم وموسى وعيسى بن مريم عن الشفاعة حتى تنتهى إليه.

وأما الشفاعة الثانية، فيشفع فى أهل الجنة أن يدخلوا الجنة، وهاتان الشفاعتان خاصتان له .وأما الشفاعة الثالثة فيشفع فيمن استحق النار، وهذه الشفاعة له ولسائر النبيين والصديقين وغيرهم، ويشفع فيمن استحق النار أن لا يدخلها، ويشفع فيمن دخلها أن يخرج منها (الصواعق المرسلة الشهابية على الشبه الداحضة الشامية،ص ٣٦ الیٰ ٣٨، فصل: ذكر الملحد حديث جابر وفيه "إن الله خلق قبل الأشياء نور نبيک ....الخ، الناشر: دار العاصمة، الرياض، المملكة العربية السعودية)

ترجمہ: اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور فضائل اور خصائص، دوسرے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے مقابلے میں اتنے زیادہ ہیں کہ جن کو حدوشمار میں نہیں لایا جاسکتا۔

اور اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خصوصی فضائل عطا فرمائے، ان میں سے عظیم ترین فضیلت ''مقامِ محمود'' کی ہے، جس پر دوسرے نبی بھی رشک کریں گے، امام ابوجعفر ابنِ جریر رحمہ اللہ نے (سورہ اسراء میں) اللہ تعالیٰ کے قول ''عَسٰى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا'' کے ذیل میں فرمایا کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے ساتھ عرش پر تشریف فرما ہوں گے'' (یعنی آپ کو اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل ہوگا، جس کی اصل کیفیت وحقیقت، اللہ ہی کو معلوم ہے)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت میں تین شفاعتیں حاصل ہوں گی، پہلی شفاعت تو اہلِ محشر کے لیے فرمائیں گے، تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے، بعد اس کے کہ دیگر انبیائے کرام یعنی حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم علیہم الصلاۃ والسلام اس سے معذرت کردیں گے، یہاں تک کہ بالآخر یہ شفاعت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاصل ہوگی، اور دوسری شفاعت ابتداء میں

اہلِ جنت کے جنت میں داخل ہونے کے لیے ہوگی، اور یہ دونوں شفاعتیں نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں، اور تیسری شفاعت وہ ہوگی، جو جہنم کے مستحق لوگوں کے لیے فرمائیں گے، اور یہ شفاعت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام نبیوں اور صدیقین وغیرہ کے لیے ہوگی، اور جہنم کے مستحق کے لیے یہ شفاعت فرمائیں گے کہ وہ جہنم میں داخل نہ ہو، اور جو جہنم میں داخل ہو چکا، اس کے جہنم سے نکلنے کی شفاعت فرمائیں گے (الصواعق المرسلة الشهابية)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین، انبیائے کرام اور بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومعجزات کے قائل ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مقامِ محمود کے اعلیٰ ترین مقام کے بھی قائل ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی شفاعت اور دوسرے انبیاء وصلحاء کی شفاعت کے بھی قائل ہیں، البتہ ان کا اختلاف ''استشفاع عند القبر'' کے متعلق ہے، لیکن اس کی وجہ سے ان کو شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر قرار دینا درست نہیں، جیسا کہ آگے آتا ہے اور پیچھے بھی گزرا۔

(7)......علامہ آلوسی کے پوتے محمود شکری کا حوالہ

محمود شہاب الدین ابوثناء بن عبداللہ بن محمود آلوسی (صاحبِ تفسیر روح المعانی) کے پوتے، ابوالمعالی محمود شکری بن سید عبداللہ بہاء الدین بن محمود شہاب الدین (المتوفی: 1342ھجری/ 1924عیسوی) نے ''تاریخِ نجد'' کے نام سے ایک مفصل ومدلل کتاب تالیف کی ہے، جس میں انہوں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اہلِ نجد کے لوگوں اور بعض نجدی حکمرانوں کے عقائد وافکار اور واقعات وحالات پر روشنی ڈالی ہے، اور ان پر وارِد ہونے والے کئی اعتراضات وشبہات کے جواب اس کتاب میں ذکر فرمائے ہیں۔

اس کتاب کے چند اقتباسات ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

محمود شکری اپنی مذکورہ کتاب میں ''اہلِ نجد کے دین اور ان کے عقائد واعمال'' کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

اعلم ان اهل نجد کلهم مسلمون موحدون، بل وجمیع سکنة جزیرة العرب، وقد دخلوا فی الاسلام فی العصر الاول عند ظهور انوار الشریعة الغراء.

وهم علی عقائد(السلف الصالح) فهم یعتقدون ان الله تعالیٰ قدیم واحد لا شریک له فی ملکه، ولا ندّ ولا ضدّ ولا وزیر ولا مشیر ولا ظهیر ولا شافع الا من بعد اذنه، وانه عز اسمه لا والد له ولا ولد ولو کفء ، ولا نسب بوجه من الوجوه، ولا زوجة، وانه غنی بذاته فلا یاکل ولا یشرب ولا یحتاج الی شیئ مما یحتاج الیه خلقه بوجه من الوجوه، وانه لا یتغیر ولا تعرض له الآفات من الهرم والمرض والسِنَة والنوم والنسیان والندم والخوف والهم والحزن ونحو ذلک، وانه لا یمثاله شیئ من مخلوقات ، بل لیس کمثله شیئ لا فی ذاته ولا فی صفاته ولا فی افعاله ، وانه لا یحل بشیئ من مخلوقات ولا یحل فی ذاته شیئ منها، بل هو بائن عن خلقه بذاته والخلق بائنون عنه، وانه اعظم من کل شیئ واکبر من کل شئ وفوق کل شیئ وعال علیٰ کل شیئ البتة، وانه قادر علی کل شیئ ،ولایعجزه شیئ یریده بل هو فعال لما یرید، وإنه عالم بکل شیئ یعلم السر واخفی ، ویعلم ما کان وما یکون وما لم یکن لو کان کیف کان یکون، وما تسقط من ورقة الا یعلمها ولا حبة فی ظلمات الارض ولارطب ولا یابس ولا متحرک ولا ساکن الا

وهو يعلمه على حقيقته، وانه سميع بصير: يسمع ضجيج الاصوات باختلاف اللغات ، على تفنن الحاجات، ويرى دبيب النملة السوداء، على الصخرة الصماء، فى الليلة الظلماء، قد احاط سمعه بجميع المسموعات ، وبصره بجميع المبصرات، وعلمه بجميع المعلومات ، وقدرته بجميع المقدورات، ونفذت مشيئته بجميع البريات، وعمت رحمته جميع المخلوقات، ووسع كرسيه الارض والسماوات.

وانه الشاهد الذى لايغيب، ولا يستخلف احدا على ملكه ولا يحتاج الى من يرفع اليه حوائج عباده او يعاونه او يستعطفه عليهم او يرحمه لهم، وانه الابدىّ الباقى الذى لايضمحل ولا يتلاشى ولايعدم ولا يموت، وانه المتكلم المكلم الآمر الناهى قائل الحق وهادى السبيل مرسل المرسل ومنزل الكتب، قائم على كل نفس بما كسبت من الخيروالشر ومجازى المحسن باحسانه والمسيئ باسائته ، وانه الصادق فى وعده وخبره فلا اصدق منه قيلا ولا اصدق منه حديثا، وهو لا يخلف الميعاد.

وانه تعالىٰ صمد بجميع معانى الصمدية يستحيل عليه ما يناقض صمديته وانه قدوس سلام فهو المبرأ عن كل عيب وآفة ونقص، وانه الكامل الذى له الكمال المطلق من جميع الوجوه، وانه العدل الذى لا يجور ولا يظلم ولا يخاف عباده منه ظلما.

وهذا مما اتفقت عليه جميع الكتب والرسل، وهو من المحكم الذى لايجوز أن تأتى شريعة بخلافه ولا يخبر بشيئ بخلافه.

ھذا اعتقادھم فی الإلٰہ عزوجل (تاریخ نجد، ص ۵۹ الیٰ ۶۱، دین اھل نجدو معتقداتھم واعمالھم، الناشر: شرکۃ دار الوراق للنشر المحدودۃ، بغداد)

ترجمہ: یہ بات جان لینی چاہیے کہ اہلِ نجد تمام کے تمام موحد مسلمان ہیں،، بلکہ جزیرہ عرب کے تمام باشندے موحد مسلمان ہیں، جو اسلام میں عصرِ اول کے اندر ہی شریعتِ غراء کے انوار ظاہر ہونے کے بعد داخل ہو گئے تھے۔

اور اہلِ نجد، سلفِ صالحین کے عقائد پر ہیں، پس وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ، قدیم، واحد ہے، نہ کوئی اس کے ملک میں شریک ہے، اور نہ کوئی اس کے مقابل ہے، اور نہ کوئی اس کا شریک ہے، اور نہ کوئی اس کا وزیر ہے، اور نہ مشیر ہے، اور نہ ظہیر ہے، اور نہ کوئی اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرنے والا ہے، اور اس کا نام عزت والا ہے، نہ اس کا کوئی والد ہے، اور نہ اولاد ہے، اور نہ اس کا کوئی کفو ہے، اور نہ اس کا کوئی نسب ہے، کسی بھی اعتبار سے، اور نہ اس کی زوجہ ہے، اور وہ اپنی ذات میں غنی ہے، نہ وہ کھاتا ہے، اور نہ وہ پیتا ہے، اور نہ ہی وہ کسی چیز کا محتاج ہے، جس چیز کی اس کی مخلوق محتاج ہے، کسی بھی اعتبار سے، اور نہ ہی اس میں تغیر پیدا ہوتا، اور نہ ہی اس کو آفات پیش آتیں، مثلاً بوڑھے ہونے کی، اور مرض کی، اور اونگھ کی، اور نیند کی، اور بھولنے کی، اور ندامت کی، اور خوف کی، اور رنج وغم کی، اور اس جیسی دوسری چیزوں کی، اور اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے، بلکہ کوئی چیز بھی اس جیسی نہیں، نہ اس کی ذات کے مثل ہے، اور نہ اس کی صفات کے مثل ہے، اور نہ اس کے افعال کے مثل ہے، اور وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز کے ساتھ حلول نہیں کرتا، اور نہ ہی اللہ کی ذات میں اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز حلول کرتی ہے، بلکہ وہ اپنی مخلوق سے ذاتی طور پر جدا ہے، اور اس کی مخلوق اس سے جدا چیز ہے، اور وہ ہر چیز سے عظیم تر ہے، اور وہ ہر

چیز سے بڑا ہے، اور ہر چیز کے اوپر ہے، اور ہر چیز سے یقیناً بلند وبالا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور جس چیز کا وہ ارادہ کرتا ہے، اس کو کوئی عاجز نہیں کرسکتا، وہ ''**فعال لما یرید**'' ہے، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، وہ راز داری اور مخفی چیز کو بھی جانتا ہے اور ظاہری چیز کو بھی، اور جو چیز واقع ہوچکی، اس کو بھی جانتا ہے، اور جو چیز ہورہی ہے، اس کو بھی جانتا ہے، اور جو چیز نہیں ہوئی، اس کو بھی جانتا ہے کہ وہ کیسے ہوئی، اور کیسے ہوگی؟ اور جو پتہ بھی گرتا ہے، وہ اس کے علم میں ہوتا ہے، اور جو دانہ بھی زمین کی اندھیریوں میں ہوتا ہے، یا تری اور خشکی میں ہوتا ہے، یا حرکت اور سکون میں ہوتا ہے، وہ اس کی حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے، اور وہ سمیع ہے بصیر ہے، جو ہر طرح کی آوازوں کو مختلف لغات اور لوگوں کی مختلف حاجات کے اعتبار سے سماعت فرماتا ہے، اور وہ اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر رینگنے والی سیاہ چیونٹی کو بھی دیکھتا ہے، اور اس کی سمع تمام مسموعات کو حاوی ہے، اور اس کی بصر تمام مبصرات کو حاوی ہے، اور اس کا علم تمام معلومات کو حاوی ہے، اور اس کی قدرت تمام مقدورات کو حاوی ہے، اور اس کی مشیئت تمام مخلوقات پر نافذ ہے، اور اس کی رحمت تمام مخلوقات کو عام ہے، اور اس کی کرسی آسمان وزمین سے وسیع تر ہے۔

اور وہ شاہد ہے، غائب نہیں ہے، اور اس کی ملکیت پر کسی کی خلافت نہیں ہے، اور وہ اپنے بندوں کی حاجات کے پورا کرنے اور اس کی مدد کرنے، اور اس پر رحم وکرم کرنے میں کسی کا محتاج نہیں ہے، اور وہ ابدی اور باقی ہے، جو مضمحل نہیں ہوتا، اور نہ گم ہوتا، اور نہ معدوم ہوتا، اور نہ فوت ہوتا، اور وہ متکلم ہے، امر ونہی کا کلام فرماتا ہے، حق کا قائل ہے، راستے کا ھادی ہے، رسولوں کو بھیجنے والا ہے، کتابوں کو نازل کرنے والا ہے، جس نفس نے بھی جو خیر اور شر کا عمل کیا، اس پر قائم ہے، اور

اچھے عمل کرنے والے کو اس کے اچھے عمل کی، اور برے عمل کرنے والے کو اس کے برے عمل کی جزا دینے والا ہے، اور وہ اپنے وعدے اور خبر میں سچا ہے، اور اس کے قول سے زیادہ سچا اور اس کی بات سے زیادہ سچا کوئی نہیں، اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

اور اللہ تعالیٰ صمد ہے ”صمدیت“ کے تمام معانی کا جامع ہے، اس کی صمدیت کے جو چیزیں مناقض ہیں، وہ اس پر لازم آنا محال ہیں، اور وہ قدوس ہے، سلام ہے، اور ہر عیب اور آفت اور نقص سے بریٔ ہے، اور وہ کامل ہے، اس کو تمام جہات سے مطلق کمال حاصل ہے، اور وہ کامل عدل کرنے والا ہے، ظلم وجور کا ارتکاب نہیں کرتا، اور اپنے بندوں کو ظلماً خوف نہیں دلاتا۔

اور یہ وہ چیزیں ہیں، جن پر تمام آسمانی کتابیں اور رسول متفق ہیں، اور یہ انتہائی محکم چیزیں ہیں، کوئی شریعت اس کے خلاف نہیں آئی، اور نہ کسی شریعت نے اس کے خلاف کسی بات کی خبر دی۔

اہلِ نجد کا یہ اللہ عزوجل کے بارے میں اعتقاد ہے (تاریخ نجد)

اس کے بعد محمود شکری، اہلِ نجد کے، عقائد کی مزید تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

واما اعتقادهم فی النبی صلی الله علیه وسلم فهم یعتقدون فیه انه: محمد بن عبدالله بن عبدالمطلب القرشی الهاشمی المکی عبدالله ورسوله الی الخلق اجمعین، نبی الرحمة وهادی الامة، ارسله الله تعالیٰ بالآیات الباهرة، والمعجزات الظاهرة، وکرّمه سبحانه بطهارة الاعراق، وشرفه بما جبله علیه من مکارم الأخلاق، التی نقض بها عوائد الفطر، وباین لها جمیع البشر، من فروسیته، وشجاعته وبأسه، ونجدته، وعزمه، وهمته، وعلمه،

وحلمة، وزهده،وعبادته ، واجابة مسألته، ورضاه ، وصبره، وحمده، وشكره ، وذكره، وتفكره، واعتباره، وتبصره، وخوفه، وخشوعه، وتواضعه، وخضوعه،وكرم آبائه وجدوده ، وسخائه، و جوده، و صمته، و فصاحته، و صدق لهجته، ورعايته للعهد، ووفائه بالوعد، وعدم تلونه، ودوام طريقته وسنته، وانصاف فى معاملته، وتقواه ، وأمانته، وشفقته، ورفقه، وحسن خلقه وخلقه، وجده، ووقاره، وضياء انواره، وحياء ه ولينه، وثقته ويقينه، وعفوه ورحمته، وصفحه ورأفته، وقناعته وتقلله ، وصدق توكله .

وحباه من الحوض المورود ، والمقام المحمود، واللواء والكوثر، والشفاعة فى المحشر (......وبعد اسطر......)

مما دل بمجموعه على اثبات نبوته، وصدق مقالته، وتفضيله على جميع الخلائق والآنام ،وتمييزه على سائر ولد آدم عليه السلام.

وذلك مع دلائله مفصل فى كتبهم ، واعتقده كل من صغيرهم وكبيرهم.

وكذلك يعتقدون ان ارسال الرسل حق، فهم يومنون بالله ، وملائكته، وكتبه، ورسله، لايفرقون بين احد منهم، ويؤمنون بالسؤال، والبعث ، والحشر ، والنشر، والجنة، والنار، وبجميع ما انزل الله على رسوله صلى الله عليه وسلم مجملا وتفصيلا، وتفصيل ذلك فى كتبهم ايضا .

وجميع اهل نجد على اختلافهم فى القبائل كما انهم يعتقدون ما سبق كذلك يعتقدون فى الآل والاصحاب، ما وردت به السنة

والكتاب، ويومنون بما ورد في شأنهم من الفضائل وما روى عنهم من الشمائل (......وبعد اسطر......) والحاصل ان مذهبهم في اصول الدين مذهب اهل السنة والجماعة وان طريقتهم طريقة السلف التي هي الطريق الاسلم، بل الاحكم، وهي انهم يقرون آيات الصفات والاحاديث على ظاهرها ويكلون معناها الى الله تعالىٰ كما قال الامام مالك في الاستواء، ويعتقدون ان الخير والشر كله بمشيئة الله تعالىٰ ولا يكون في ملكه الا ما اراد وان العبدا لايقدر على خلق افعال بل له كسب يترتب عليه الجزاء، وان الثواب فضل، والعقاب عدل، ولايجب على الله لعبده شيئ، وانه يراه المومنون في الآخره بلا كيف ولا احاطه (تاريخ نجد، ص ۶۱ الىٰ ۶۴، دين اهل نجد ومعتقداتهم واعمالهم، الناشر: شركة دار الوراق للنشر المحدودة، بغداد)

ترجمہ: جہاں تک اہلِ نجد کے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اعتقاد کا تعلق ہے، تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ''محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب قرشی ہاشمی مکی'' ہیں، جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا ہے، نبیِ رحمت اور ہادیِ امت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو واضح نشانیاں اور ظاہری معجزات کے ساتھ بھیجا ہے، اللہ سبحانہ نے آپ کو مجسم طہارت سے مکرم فرمایا، آپ کی جبلت کو مکارمِ اخلاق کے ساتھ مشرف فرمایا، جن کے ذریعے سے فطرتوں کا ٹیڑھ پن ٹوٹ گیا، اور آپ کو تمام انسانوں میں ممتاز فرمایا، فہم وفراست کے اعتبار سے، شجاعت اور طاقت کے اعتبار سے، کرامت وعزت کے اعتبار سے، ہمت اور علم کے اعتبار سے، حلم، زہد اور عبادت

کے اعتبار سے، اور سوال کے جواب کے اعتبار سے، اور رضا اور صبر اور حمد اور شکر اور ذکر اور فکر اور اعتبار اور بصیرت اور خوف اور خشوع اور تواضع اور خضوع کے اعتبار سے آپ کو امتیازی شرف بخشا، اور آپ کے آباء واجداد کے، جودوکرم کے اعتبار سے، اور آپ کی سخاوت، اور جودت، اور خاموشی اور فصاحت اور لہجے کی صداقت اور عہد ومعاہدے کی رعایت اور ایفائے وعدہ کے اعتبار سے، اور آپ کے عدمِ تلون کے اعتبار سے، اور آپ کے طریقے اور سنت کے دوام کے اعتبار سے، اور آپ کے معاملات میں انصاف کے اعتبار سے، اور آپ کے تقویٰ اور امانت اور شفقت اور نرمی اور سیرت وصورت کے حسن، اور آپ کی کوشش اور وقار، آپ کے انوارات کی روشنی، اور آپ کی حیاء اور نرمی، اور آپ کی ثقاہت اور یقین، اور درگزر اور رحمت، اور آپ کے معاف کرنے اور شفقت کرنے، اور آپ کی قناعت اور کم چیز پر اکتفاء کرنے، اور آپ کے توکل کے صدق کے اعتبار سے آپ کو امتیازی شرف بخشا۔

اور آپ کو حوضِ کوثر اور مقامِ محمود اور اس کے جھنڈے کا، اور قیامت میں شفاعت کا شرف بخشا (......مزید چند صفحات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ......)

یہ تمام صفات مجموعی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات پر اور آپ کی بات کے سچا ہونے پر، اور تمام مخلوقات اور انسانوں میں آپ کے افضل ہونے پر اور آدم علیہ السلام کی تمام اولاد میں ممتاز ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

اور یہ تمام باتیں دلائل کے ساتھ ان کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، اور ان کے چھوٹے اور بڑے ان سب چیزوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

اور اسی طریقہ سے اہلِ نجد اس بات کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ رسولوں کا بھیجنا حق ہے، اور وہ اللہ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں،

رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے، اور وہ قبر وآخرت کے سوال پر اور دوبارہ زندہ ہونے پر اور حشر ونشر پر اور جنت اور جہنم پر اور ان تمام چیزوں پر جو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مجملاً اور تفصیلاً نازل کی ہیں، ایمان رکھتے ہیں، ان چیزوں کی تفصیل بھی اہلِ نجد کی کتابوں میں موجود ہے۔

اور تمام اہلِ نجد اور ان کے مختلف قبائل جس طرح سے گزشتہ باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں، اسی طریقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آل اور آپ کے اصحاب پر بھی اسی کے مطابق ایمان رکھتے ہیں، جس کا قرآن اور سنت میں ذکر آیا ہے، اور وہ ان کی شان میں وارد شدہ فضائل اور ان کے شمائل پر بھی ایمان رکھتے ہیں (...... پھر چند سطور کے بعد فرماتے ہیں......)

اور خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ نجد کا مذہب دین کے اصول میں، اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مذہب کے مطابق ہے، اور ان کا طریقہ سلف کا وہی طریقہ ہے، جو کہ سب سے زیادہ سلامتی والا اور مضبوط طریقہ ہے، اور وہ آیاتِ صفات کا اقرار کرتے ہیں، اور احادیث کو ان کے ظاہر پر رکھتے ہیں، اور ان کی حقیقت کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں، جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ کا استواء علی العرش کے بارے میں قول ہے، اور وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہر طرح کا خیر اور شر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے، اور اللہ کے ارادے کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، اور بندہ افعال کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، بلکہ اس کو کسب کا اختیار ہے، جس پر جزا مرتب ہوتی ہے، اور اللہ کی طرف سے ثواب کا عطا کیا جانا، فضل وانعام ہے، اور سزا کا دیا جانا عدل وانصاف ہے، اور اللہ پر اس کے بندے کے لیے کوئی چیز واجب نہیں، اور آخرت میں مومنین اللہ کی زیارت کریں گے، جس کی کیفیت اور احاطہ نہیں کیا جاسکتا (تاریخِ نجد)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد کے عقائد وافکار اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہیں۔

اس کے بعد محمود شکری، اہلِ نجد کے، افکار کی مزید تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأنهم في الفروع على مذهب الامام أحمد بن حنبل نضر الله وجهه ولا ينكرون على من قلد أحدا من الأئمة الأربعة دون غيرهم لعدم ضبط مذهب الغير كالشيعة والزيدية والكرامية و نحوهم .

وأنهم لا يستحقون مرتبة الاجتهاد المطلق ، ولا أحد يدعيها عليهم غير أنهم في بعض المسائل اذا صح لهم نص جلي من كتاب أو سنة غير منسوخ ولا مخصص ولا معارض بأقوى منه ، وقال به أحد الأئمة الأربعة أخذوا به و تركوا المذهب كارث الجدة والأخوة فانهم يقدمون الجد بالارث وان خالف مذهب الحنابلة .

ولا يفتشون مذهب أحد ، ولا يعترضون الا اذا اطلعوا على نص جلي مخالف لمذهب أحد الأئمة وكانت المسألة مما يحصل بها شعار ظاهر كأمر الصلاة فانهم يأمرون الحنفية والمالكية مثلاً بالمحافظة على نحو الطمانينة بالاعتدال والجلوس بين السجدتين لوضوح دليل ذالک ، بخلاف جهر الامام الشافعي بالبسلمة فلا يأمرون بالاسرار ، و شتان بين مسألتين ! فاذا قوى الدليل أرشدوهم الى النص وان خالف المذهب و ذالک انما يكون نادرا .

ولا مانع عندهم من الاجتهاد في بعض المسائل دون بعض ، فلا مناقضة لعدم دعوى الاجتهاد المطلق . وقد سبق جمع من أئمة

المذاهب الأربعة الى اختيارات لهم فى بعض المسائل مخالفين للمذهب الملتزمين لتقليد صاحبه .

ثم انهم يستعينون على فهم كتاب الله بالتفاسير المتداولة المعتبرة . ومن أجلها لديهم (تفسير ابن جرير) و مختصره (لابن كثير) وكذا (البغوى) و (البيضاوى) و (الخازن) و (الحدادى) و (الجلالين) و غيرها .

وعلى فهم الحديث بشروح الأئمة المبرزين كالعسقلانى والقسطلانى على البخارى ، والنووى على مسلم ، والمناوى على الجامع الصغير . و يحرصون على كتب الحديث خصوصا الأمهات الست و شروحها . و يستعينون بسائر كتب المذاهب فى سائر الفنون أصولا و فروعا و قواعد و نحوا و صرفا ، و جميع علوم الآلة ولا يتلفون من المؤلفات شيئا أصلا ، الا ما اشتمل على ما يوقع الناس فى الشرک (كروض الرياحين) أو يحصل بسببه خلل فى العقائد ، على أنهم لا يفحصون عن مثل ذالک الا اذا تظاهر به صاحبه معانداً . وما اتفق عليه بعض البدو فى اتلاف بعض الكتب انما صدر منه لجهله . وقد زجر هو و غيره عن مثل ذالک .

ولا يرون سبى العرب ولم يفعلوه ولم يقاتلوا غيرهم ولم يروا قتل النساء والأطفال وأما ما يكذب عليهم سترا للحق ، و تلبيسا على الخلق ، بأنهم يفسرون القرآن برأيهم و يأخذون من الحديث ما وافق فهمهم من دون مراجعة شرح ولا معول على شيخ ، وأنهم

يضعون من رتبة النبى صلى الله عليه وسلم ، وأنه ليس له شفاعة وأن زيارته غير مندوبة ، و أنهم لا يعتمدون أقوال العلماء ، و أنهم يتلفون مؤلفات أهل المذاهب لكون الحق و الباطل فيها ، وأنهم مجسمة ، وأنهم يكفرون الناس على الاطلاق من بعد الستمائة الى هذا الزمان الا من كان على ما هم عليه ، و أنهم لا يقبلون بيعة أحد الا اذا أقر عليه أنه كان مشركا و أن أبويه ماتا على الشرک بالله و أنهم ينهون عن الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم ، و أنهم يحرمون زيارة القبور المشروعة مطلقاً ، و أنهم لا يرون حقا لأهل البيت ، و أنهم يجبرونهم على تزويج غير الكفء لهم الى غير ذالک من الافتراء ات ، فكل ذالک زور عليهم و بهتان و كذب محض من خصومهم أهل البدع و الضلال . بل أقوالهم و أفعالهم و كتبهم على خلاف ذالک كله .

فمن روى عنهم شيئا من ذالک أو نسبه اليهم فقد كذب عليهم و افترى ، ومن شاهد حالهم و حضر مجالسهم و تحقق ما عندهم علم قطعاً أن جميع ذالک و ضعه عليهم و افتراه أعداء الدين ، و اخوان الشياطين ، تنفيرا للناس عن الاذعان لاخلاص التوحيد لله تعالىٰ بالعبادة وترک أنواع الشرک الذى نص الله على أنه لا يغفره و أنه يغفر ما دون ذالک لمن يشاء . فانهم يعتقدون أن من فعل أنواعا من الكبائر : كالقتل للمسلم بغير حق والزنى والربا وشرب الخمر ، و تكرر منه ذالک لا يخرج بفعل ذالک عن دائرة الاسلام ، ولا يخلد فى دار الانتقام ، اذا مات موحدا لله

تعالیٰ فی جمیع أنواع العبادة ... والذی اعتقدوہ فی رتبة النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن رتبتہ أعلی مراتب المخلوقین علی الاطلاق ، و أنہ حی فی قبرہ حیاۃ مستقرۃ أبلغ من حیاۃ الشھداء المنصوص علیھا فی التنزیل ، اذ ھو صلی اللہ علیہ وسلم أفضل منھم بلا ریب . و أنہ یسمع سلام من یسلم علیہ ، و أنہ تسن زیارتہ غیر أنہ لا تشد الرحال الا لزیارۃ المسجد والصلاۃ فیہ ، واذا قصد مع ذالک الزیارۃ فلا بأس ، ومن أنفق أنفس أوقاتہ بالصلاۃ علیہ الواردۃ عنہ فقد فاز بسعادۃ الدارین وکفی ھمہ و غمہ کما جاء فی الحدیث (تاریخ نجد،ص۶۵ الیٰ ۶۸،دین اھل نجدومعتقداتھم واعمالھم،الناشر : شرکة دار الوراق للنشر المحدودۃ ، بغداد)

ترجمہ: اور اہلِ نجد فروع میں امام احمد حنبل رحمہ اللہ، اللہ ان کا چہرہ تروتازہ رکھے، کے مذہب پر قائم ہیں، اور وہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کرنے والے پر نکیر نہیں کرتے، ان کے علاوہ کسی اور کی تقلید کرنے والے پر نکیر کرتے ہیں، کیونکہ ان کے علاوہ کا مذہب مدون نہیں ہے، جیسے کہ شیعہ، زیدیہ اور کرامیہ وغیرہ۔

اور وہ اپنے آپ کو اجتہادِ مطلق کے مرتبہ کا مستحق نہیں سمجھتے، اور نہ ہی ان میں سے کسی نے اس کا دعویٰ کیا، البتہ بعض مسائل میں جب ان کے سامنے کتاب یا سنت کی کوئی نصِ جلی، صحیح آ جاتی ہے، جو منسوخ بھی نہیں ہوتی، اور مخصص بھی نہیں ہوتی، اور نہ اپنے سے زیادہ قوی دلیل کے معارض ہوتی، اور ائمہ اربعہ میں سے کسی نے اس کے مطابق قول کیا ہو، تو اس کو لے لیتے ہیں، اور اپنے مذہب کو چھوڑ دیتے ہیں، جیسا کہ دادی اور بھائیوں کی وراثت کا مسئلہ کہ وہ جد کو وراثت میں مقدم سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ حنابلہ کے مذہب کے مخالف ہے۔

اور وہ کسی کے مذہب کا تجسس اور تفتیش نہیں کرتے، اور نہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، الا یہ کہ جب وہ نصِ جلی پر مطلع ہو جاتے ہیں، جو ائمہ میں سے کسی کے مذہب کے مخالف ہو، اور اس مسئلے کا تعلق ان چیزوں سے ہو، جن سے شعارِ ظاہر حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ نماز کا حکم، تو وہ حنفیہ اور مالکیہ کو مثلاً اعتدالِ ارکان اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا حکم فرماتے ہیں، کیونکہ اس کی دلیل واضح ہے، بخلاف امام شافعی کے بسم اللہ جہراً پڑھنے کے، کہ وہ اس کو آہستہ پڑھنے کا حکم نہیں کرتے، اور دونوں مسئلوں میں بڑا فرق ہے، پس جب کوئی دلیل قوی ہوتی ہے، تو وہ نص کی طرف رجوع کرتے ہیں، اگرچہ وہ مذہب کے مخالف ہو، لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔

اور ان کے نزدیک اس بات میں کوئی مانع نہیں کہ بعض مسائل میں اجتہاد کیا جائے، اور بعض میں اجتہاد نہ کیا جائے، لہٰذا مطلق اجتہاد کا دعویٰ نہ ہونے کے ساتھ اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں، اور تمام مذاہبِ اربعہ کی ایک جماعت کے بعض مسائل میں اپنے اختیارات و ترجیحات ہیں، جو اس مذہب کے مخالف ہیں، جس کے مذہب کی تقلید کا انہوں نے التزام کیا ہے۔

پھر اہلِ نجد کتابُ اللہ کو سمجھنے کے لیے معتبر اور مفصل تفاسیر سے استفادہ کرتے ہیں، جو ان کے پاس ہیں، مثلاً تفسیر ابن جریر، اور مختصر تفسیر ابنِ کثیر، اور اسی طرح سے بغوی، اور بیضاوی اور خازن اور جلالین وغیرہ۔

اور وہ حدیث کو سمجھنے کے لیے واضح ائمہ شروح سے استفادہ کرتے ہیں، جیسا کہ بخاری پر عسقلانی اور قسطلانی کی شرح سے، اور مسلم پر نووی کی شرح سے، اور الجامع الصغیر پر مناوی کی شرح سے، اور وہ کتبِ حدیث کا بہت شوق رکھتے ہیں، خاص طور سے صحاحِ ستہ اور ان کی شروحات کا، اور تمام کتبِ مذاہب کے ذریعے

تمام فنون میں اصولی اور فروعی اور قواعد کے اعتبار سے استفادہ کرتے ہیں، اور نحو و صرف سے بھی استفادہ کرتے ہیں، اور تمام علومِ آلیہ سے استفادہ کرتے ہیں، اور وہ کتابوں میں سے کسی کو تلف نہیں کرتے، سوائے ان کتابوں کے، جو ایسی چیزوں پر مشتمل ہوں کہ وہ لوگوں کو شرک میں مبتلا کردیں، جیسا کہ ''روض الریاحین'' یا ان کی وجہ سے عقائد میں خلل واقع ہو جائے، لیکن وہ ان جیسی چیزوں کی ٹوہ نہیں کرتے، الّا یہ کہ اس طرح کی چیزوں میں مبتلا کوئی شخص عناد میں آ کر مقابلہ کرے، اور بعض دیہاتیوں کی طرف سے بعض کتابوں کے تلف کرنے کا جو واقعہ صادر ہوا، وہ ان کی جہالت کی وجہ سے صادر ہوا، جن کو زجر و تنبیہ کی گئی، اور ان کے علاوہ ان جیسے دوسرے لوگوں کو بھی تنبیہ کی گئی۔

اور اہلِ نجد، اہلِ عرب کو قیدی بنانے کی رائے نہیں رکھتے، اور نہ وہ اس فعل کو کرتے ہیں، اور نہ وہ ان کے علاوہ سے قتال کرتے ہیں، اور نہ وہ عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں، اور جو ان پر حق کو چھپانے کے لیے اور مخلوق پر تلبیس پیدا کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولا گیا ہے کہ وہ قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کرتے ہیں، اور وہ صرف اس حدیث کو لیتے ہیں، جو اِن کی فہم کے موافق ہو، اور شرح کی طرف مراجعت بھی نہیں کرتے، اور نہ کسی شیخ کی بات کی پرواہ کرتے ہیں، اور یہ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے رتبے سے گراتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کا استحقاق نہیں، اور آپ کی قبر مبارک کی زیارت مستحب نہیں، اور یہ کہ اہلِ نجد علماء کے اقوال پر اعتماد نہیں کرتے، اور اہلِ مذاہب کی تالیفات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ ان میں حق و باطل کی آمیزش ہے، اور یہ کہ وہ ''مجسمہ'' ہیں، اور یہ کہ وہ چھ سو سال سے لے کر موجودہ زمانے تک کے تمام لوگوں کو علی الاطلاق کافر قرار دیتے ہیں، سوائے ان لوگوں

کے جوان کے طریقے پر ہوں، اور یہ کہ وہ کسی کی بیعت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے، جب تک وہ اپنے متعلق مشرک ہونے کا اقرار نہ کرلے، اور اس بات کا بھی اقرار نہ کرلے کہ اس کے والدین اللہ سے شرک کرنے کی حالت میں فوت ہوگئے، اور یہ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے سے منع کرتے ہیں، اور یہ کہ وہ مشروع زیارتِ قبور کو مطلقاً حرام قرار دیتے ہیں، اور یہ کہ وہ اہلِ بیت کے لیے کسی حق کے قائل نہیں ہیں، اور یہ کہ وہ غیر کفو میں نکاح کرنے پر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ دوسرے افتراءات، سب کے سب محض جھوٹ اور بہتان ہیں، جو ان کے گمراہ اور بدعتی دشمنوں نے گھڑے ہیں، کیونکہ اہلِ نجد کے اقوال اور افعال اور ان کی کتابیں، ان چیزوں کے خلاف کی گواہی دیتی ہیں۔

پس جس نے اہلِ نجد کے بارے میں اس طرح کی کوئی بات بیان کی، یا ان کی طرف اس طرح کی کوئی بات منسوب کی، تو اس نے ان پر جھوٹ باندھا اور افتراء کیا، اور جس نے اہلِ نجد کی حالت کا مشاہدہ کیا ہو، اور ان کی مجالس میں حاضر ہوا ہو، اور ان کے قریبی حالات سے آگاہ ہو، تو وہ قطعی طور پر یہ بات جان لے گا کہ یہ تمام باتیں ان کے خلاف گھڑی گئی ہیں، جن کو دین کے دشمنوں اور شیاطین کے بھائیوں نے گھڑا ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مخلصانہ توحید کے یقین سے لوگوں میں نفرت پیدا کریں، اور شرک کی ان اقسام سے لوگوں کو متنفر کریں، جن کے بارے میں اللہ نے واضح فرمادیا ہے کہ وہ مشرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا، اور اس کے علاوہ جس کی چاہے، مغفرت فرمادے گا، پس اہلِ نجد کا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص کسی بھی قسم کے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے، جیسا کہ ناحق مسلمان کو قتل کرے، اور زنا کرے، اور سود کھائے، اور شراب پئے، اور اس طرح کا گناہ بار بار کرے، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، اور آخرت کے دائمی عذاب کا

مستحق نہیں ہوتا، بشرطیکہ وہ عبادت کی تمام اقسام میں اللہ کی توحید پر قائل ہونے کی حالت میں فوت ہو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ کا مرتبہ تمام مخلوق میں علی الاطلاق سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں حیاتِ مستقرہ کے ساتھ ہیں، اور آپ کی حیات شہداء کی اس حیات سے اعلیٰ ہے، جس کی قرآن مجید میں تصریح کی گئی ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بلا شک وشبہ شہداء سے افضل ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سلام کو سماعت فرماتے ہیں، جو آپ پر بھیجا جاتا ہے، اور آپ کی قبر مبارک کی زیارت سنت ہے، سوائے اس کے کہ مستقل رختِ سفر مسجدِ نبوی کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کی غرض سے باندھا جائے گا، اور جب اس کے ضمن میں زیارت کا بھی قصد کرلے، تو کوئی حرج نہیں، اور جو شخص اپنے قیمتی اوقات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس طرح درود پڑھنے میں خرچ کرے، جس طرح درود پڑھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، تو وہ فلاحِ دارین کی سعادت حاصل کرنے والا ہوگا، اور اس کے رنج وغم کی کفایت ہوگی، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے (تاریخ نجد)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب پر ہیں، لیکن وہ تقلید میں جمود نہیں رکھتے، اور ان کے اور بھی عقائد وافکار بنیادی طور پر اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہیں۔

مذکورہ کتاب ہی میں اس کے بعد محمود شکری، اہلِ نجد کے، افکار کی مزید تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اہلِ نجد کراماتِ اولیاء کا انکار نہیں کرتے، اور ان کے حق کا اعتراف کرتے ہیں، اور ان کو اپنے رب کی ہدایت پر مانتے ہیں، جب تک کہ وہ شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ اور قوانینِ شرعیہ کے مطابق چلیں“۔

اس کے بعد محمود شکری نے وہی تفصیل بیان کی ہے، جو ہم پیچھے ''محمد بن عبدالوہاب نجدی'' کے بیٹے عبداللہ کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں۔ [1]

---

[1] وانهم لا ينكرون كرامات الاولياء ويعترفون لهم بالحق، وأنهم على هدى من ربهم مهما ساروا على الطريقة الشرعية، والقوانين المرعية، غير انهم لا يستحقون شيئاً من أنواع العبادة لا حال الحياة ولا بعد الممات. بل يطلبون من أحدهم الدعاء فى حال الحياة، بل و من كل مسلم، فقد جاء فى الحديث "دعاء المرء مستجاب لأخيه" و يثبتون الشفاعة للنبى صلى الله عليه وسلم يوم القيامة حيثما ورد وكذا سائر الأنبياء والملائكة والأولياء والأطفال حيثما ورد أيضاً.
ويسألونها من الله تعالىٰ المسالك لها والآذن فيها لمن شاء من الموحدين الذين هم أسعد الناس بها كما ورد، فإنهم يقولون متضرعين إلى الله تعالىٰ: اللهم شفّع نبينا محمداً صلى الله عليه وسلم فينا يوم القيامة أو عبادك الصالحين أو ملائكتك ونحو ذلك.
ولا يلزم أن يكونوا مجسمة وإن قالو بالجهة كما ورد الحديث بها، ويقولون فيمن مات "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (134)".
ولا يقولون بكفر من صحت ديانته واشتهر صلاحه وعلمه وورعه وزهده، وحسنت سيرته وبالغ فى نصح الأمة و إن كان مخطئاً فى هذه المسألة أو غيرها (كابن حجر الهيتمى المكى) رحمه الله، فإنهم يعلمون كلامه فى (الدر المنظم) ولا ينكرون سعة علمه، ولهذا يعتبرون ما بقى من كتبه كشرح الأربعين والزواجر و غيرها، ويعتمدون على نقله.
هذا ما هم عليه، وقد كتبوا فى ذلك عدة رسائل خاطبوا بها من له عقل و علم وهو متصفٌ بالإنصاف، خالٍ من الميل إلى التعصب والاعتساف، ينظر ما يقال، لا إلى من قال.
وأما من شأنه لزوم مألوفه وعادته سواء كان حقاً أو غير حق مقلداً فهو ممن قال "إنا وجدنا آبائنا على أمة وإنا على آثارهم مقتدون" عادته و جبلته أن يعرف الحق بالرجال، لا الرجال بالحق، فلا يخاطب هذا و أمثاله، فجنود التوحيد بحمد الله منصورة، وراياتهم بالسعد والإقبال منشورة.
وما كتبناه فى هذا الحاصل هو مضمون رسالة كتبها أحد فضلاء علماء نجد وهو الشيخ (عبدالله ابن العلامة الشيخ محمد بن عبدالوهاب) عليهم الرحمة، وقد قرئت بعد دخول الأمير (سعود) فى (الحرمين) الشريفين بمحضر علماء المذاهب الأربعة وبمسمع منهم.
فمن الواجب على طالب معرفة الحق وإدراك الحقائق أن لا يبادر بالإنكار قبل التبصّر، ولا يحكم على شيء قبل الوقوف على حقيقة الحال، فالخطاء فى ذلك عظيم.

فلا تحكم بأول ما تراه　　　فأول طالع فجر كذوبُ

والقصد بما ذكرناه التنبيه على خطأ من نسب إلى القوم ما هم بريئون منه مما يخل بالديانة حتى أساء الظن بقسم عظيم من الأمة العربية وانطوى على بغضهم الذى هو من أعظم أسباب النفاق.
وغالب من أشاع ذلك هم أهل البدع والأهواء الذين اتخذوا دينهم لهواً و لعباً وكذبوا بأقوالهم وأفعالهم على الدين المبين الذى هو بعيد عنهم بمراحل، وهم الدجالون الجالبون على الإسلام كل عار، وإلا فأهل الإيمان هم الذين يستمعون القول فيتّبعون أحسنه (تاريخ نجد،ص ٦٨ الىٰ ٧٠،دين اهل نجدومعتقداتهم واعمالهم،الناشر: شركة دار الوراق للنشر المحدودة ، بغداد)

اسی ''تاریخِ نجد'' نامی کتاب میں محمود شکری نے اہلِ نجد پر وارد ہونے والے مختلف اعتراضات وشبہات کے جوابات بیان فرمائے ہیں، جن کو طوالت کے باعث نقل نہیں کیا جا رہا۔ [1]

---

[1] ونذكر لك طرفاً من معتقد هؤلاء، وحقيقة ما هم عليه من الدين، ليعلم الواقف عليه أيُّ الفريقين أحق بالأمن، إن كان الواقف ممن اختصه الله بالفضل والمنّ، ولئلا يلتبس الأمر بتسميتهم لكفرهم ومحالهم تشفعاً وتوسلاً واستظهاراً، مع ما فی التسمية من الهلاک المتناهی عند من عقل الحقائق.

من ذلک محبتهم مع الله محبة تألّه و خضوع و رجاء، ودعاؤهم مع الله فی المهمات والملمات، والحوادث التی لا يکشفها ولا يجيب الدعاء فيها إلا فاطر الأرض والسموات.

والعکوف حول أجداثهم، وتقبيل أعتابهم والتمسّح بآثارهم طلباً للغوث واستجابة الدعوات، وإظهار الفاقة، وإبداء الفقر والضراعة واستنزال الغيوث والامطار وطلب السلامة من شدائد البراری والبحار، وسؤالهم تزويجهم الأرامل والأيامی، واللطف بالضعفاء واليتامی، والاعتماد عليهم فی المطالب العالية، وتأهيلم لمغفرة الذنوب والنجاة من الهاوية، وإعطاء تلک المراتب السامية، وجماهيرهم لما ـــ ألفت ذلک طباعهم، وفسدت به فطرهم و عزّ عنه امتناعهم ـــ لا يکاد يخطر ببال أحدهم ما يخطر ببال آحاد المسلمين من قصد الله تعالیٰ، والإنابة إليه، بل ليس ذلک عندهم الا الولی الفلانی، ومشهد الشيخ فلان، حتی جعلوا الذهاب الی المشاهد عوضاً عن الخروج للاستسقاء، والانابة الی الله تعالیٰ فی کشف الشدائد والبلوی. وکل هذا رأيناه وسمعناه عنهم، فهل سمعت عن جاهلية العرب، مثل هذه الغرائب التی ينتهی عندها العجب؟

والکلام مع ذکیّ القلب، يقظ الذهن، قوی الهمّة، العارف بالحقائق ومن لا ترضیٰ نفسه بحضيض التقليد، فی اصول الديانات والتوحيد.

واما ميت القلب، بليد الذهن، وضيع النفس، جامد القريحة، ومن لا تفارق همته التشبت بأذيال التقليد، والتعلق بما يحکی عن فلان وفلان فی معتقد أهل المقابر والتنديد، فذاک فاسد الفطرة معتلّ المزاج، وخطا به محض عناء ولجاج.

ومن وقف علی کتبه المتصوفة، ومناقب مشايخهم، وقف علی ساحل بحر من ظلالهم، وفی حاشية الشيخ البيجوری علی السنوسية نقلاً عن الدردير عن الشعرانی: ''أن الله وکل بقبر کل ولی ملکاً يقضی حاجة من سأل ذلک الولیُ'' فقف هنا وانظر ما آل اليه إفکهم! فأين هذا من قوله تعالیٰ: ''وَإِذَا سَأَلَکَ عِبَادِی عَنِّی فَإِنِّی قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ''؟ قولوه: ''ادْعُوا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً''؟ وقوله: '' فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۷) وَإِلَی رَبِّکَ فَارْغَبْ (۸)'' وقوله: ''أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ'' و قولهٗ: ''وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُونِی أَسْتَجِبْ لَکُمْ''؟

وأی حجة فی هذا الذی قاله الشعرانی لو کانوا يعلمون؟ ولکن القوم أصابهم داء الأمم قبلهم فنبذوا کتاب الله وراء ظهورهم کأنهم لا يعلمون!. ومن هذا الجنس ما ذکره الشعرانی فی ترجمة شمس

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس کے بعد پھر محمود شکری نے ''تاریخِ نجد'' میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی سیرت پر روشنی ڈالی

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الدين الحنفى أنه قال فى مرض موته "من كانت له حاجة فليأت قبرى و يطلب أن أقضيها فله فانما بينى و بينه ذراع من تراب، وكل رجل يحجبه عن أصحابه ذراع من تراب فليس برجل" !!!

وباب تصرف المشايخ والاولياء قد اتّسع حتى سلكه جمهور من يدعى الاسلام من اهل البسيطة، وخرقه قد هلك فى بحاره أكثر من سكن الغبراء وأظلته المحيطة، حتى نسى القصد الاول من التشفع والوساطة، فلا يعرج عليه عندهم الا من نسى عهود الحمى، فعاد الامر الى الشرك فى توحيد الربوبية والتدبير والتاثير، ولم يبلغ شرك الجاهلية الاولىٰ الى هذه الغاية بل ذكر الله عز و جل أنهم يعترفون له بتوحيد الربوبية ويقرون به، ولذلك احتج عليهم فى غير موضع من كتابه بما أقروا به من الربوبية، والتدبير على ما أنكروه من الإلٰهية.

ومن ذلك ـــ وهو من عجيب أمرهم ـ ما ذكره حسين بن محمد النعيمى اليمنى فى بعض رسائله "إن امرأة كف بصرها فنادت وليها: أما الله فقد صنع ما ترىٰ، ولم يبق إلا حبك" انتهىٰ.

وروى أن بعض المغاربة قدموا مصر يريدون الحج فذهبوا إلى الضريح المنسوب الى الحسين رضى الله عنه بالقاهرة، فاستقبلوا القبر، وأحرموا، ووقفوا وركعوا، وسجدوا لصاحب القبر، حتى أنكر عليهم سدنة المشهد وبعض الحاضرين، فقالوا: هذا محبة فى سيدنا الحسين، وكثير من علماء مصر يقول: لا يدق وتد فى القاهرة إلا بإذن السيد أحمد البدوى !!

وقد اشتهر ما يقع من السجود على أعتاب المشهد، وقصد التبرك مع ما فيه لا يمنع حقيقة العبادة الصورية.

ومن المعروف عنهم شراء الولدان من الولى بشئ معين يبقى رسماً جارياً يؤدى كل عام، وإن كانت امرأة فمهرها أو نصف مهرها لأنها مشتراة منه ولا يمانع هذا إلا مكابر فى الحسيات، وإن فقد بعض أنواعه فى بعض البلاد فكم له من نظائر.

وهذا أشد وأشنع مما ذكر ـ جل ذكره ـ عن جاهلية العرب بقوله: "وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا " الآية.

وكذلك جعل السوائب باسم الولى: لا يحمل عليها، ولا تذبح، سوق الهدايا والقرابين إلى مشاهد الاولياء، وذبحها حباً للشيخ وتقرباً إليه، وهذا وإن ذكر اسم الله عليه، فهو أشد تحريماً مما ذبح للحم وذكر عليه اسم غير الله فإن الشرك فى العبادة أكبر من الشرك بالاستعانة و من ذلك ترك الاشجار والكلأ والعشب إذا كان بقرب المشهد، وجعله من ماله.

ومنها الحج إلى المشاهد فى أوقات مخصوصة مضاهاة لبيت الله فيطوفون حول الضريح ويستغيثون، ويهدون لصاحب القبر ويذبحون، وبعض مشايخهم يأمر الزائر بحلق راسه اذا فرغ من الزيارة، وقد صنف بعض غلّاتهم كتاباً سماه "حج المشاهد".

ومنها التعريف فى بعض البلاد عند من يعقدونه من أهل القبور فيصلون عشية عرفة عند القبر خاضعين سائلين، والعراق فيه من ذلك الحظ الأكبر والنصيب الأوفىٰ، بل فيه البحر الذى لا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

ہے، اوران کے عقائدوافکار کے درست ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ۱؎

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ساحل له، والمهابة التى لا ينجو سالكها ولا يكاد، ومن نحوه عرف الكفر، وظهر الشرك والفساد، كما يعرف ذلك من له إلمام بالتواريخ، ومبدأ الحوادث فى الدين، ومن شاهد مايقع منهم عند مشهد علىّ و الحسين وموسىٰ الكاظم ومحمد الجواد (رضى الله عنهم) عند رافضتهم، والشيخ عبدالقادر والحسن البصرى والزبير وأمثالهم (رضى الله عنهم) عند سنّتهم: من العبادات وطلب العطايا والمواهب والتصرفات، وأنواع الموبقات، علم أنهم من أجهل الخلق وأضلّهم وأنهم فى غاية من الكفر والشرك ما وصل اليها من قبلهم ممن ينتسب الى الاسلام، والله المسؤول أن ينصر دينه، ويعلى كلمته، بمحو هذه الضلالات حتى يعبد وحدهٔ، فتسلم الوجوه له، وتعود البيضاء كما كانت ليلها كنهارها.

ومن ذلك ــ وإن كان يعلم مما تقدم ــ اتخاذها أعياداً أو مواسم مضاهاة لما شرعه الله ورسوله من الأعياد المكانية والزمانية، ومنها ما يقع ويجرى فى هذه الاجتماعات من الفجور والفواحش، وترك الصلوات، وفعل الخلاعات التى هى فى الحقيقة خلع لربقة الدين والتكليف، ومشابهة لما يقع فى أعياد النصارىٰ والصابئة والإفرنج ببلاد فرنسا وغيرها من الفجور والطبول والزمور والخمور، وبالجملة فما أحدثهٔ عباد القبور يعزّ حصره واسيفاؤه (تاريخ نجد، ص ١٠١ الىٰ ١٠٦، ذكر طرف من معتقد المغالين، فى القبور والصالحين الناشر: شركة دار الوراق للنشر المحدودة، بغداد)

۱؎ ﴿سيرة الشيخ محمد بن عبدالوهاب﴾

ونقص عليك شيئاً من سيرة الشيخ محمد بن عبدالوهاب، ونذكر طرفاً من أخباره وأحواله، ليعلم الناظر فيه حقيقة أمره، فلا يروج عليه تشنيع من استحوذ عليه الشيطان وأغواه، وبالغ فى كفره واستهواء، فنقول:

قد عرف واشتهر واستفاض من تقارير الشيخ ومراسلته ومصنفاته المسموعة المقروءة عليه، وما ثبت بخطه، وعرف واشتهر من أمر دعوته، وما عليه الفضلاء والنبلاء من أصحابه وتلامذته، أنه على ما كان عليه السلف الصالح، وأئمة الدين أهل الفقه والفتوىٰ فى باب معرفة الله، وإثبات صفات كماله، ونعوت جلاله، التى نطق بها الكتاب العزيز، وصحّت بها الأخبار النبوية، وتلقّتها أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بالقبول والتسليم: يثبتونها، ويؤمنون بها، يمرونها كما جائت من غير تحريف ولا تعطيل، ومن غير تكييف ولا تمثيل، وقد درج على هذا من بعدهم من التابعين وتابعيهم من أهل العلم والايمان، وسلف الأئمة وأئمتها: كسعيد بن المسيب، وعروة بن الزبير، والقاسم بن محمد، وسالم بن عبدالله، وطلحة بن عبيد الله، وسليمان بن يسار وأمثالهم.

ومن الطبقة الثانية كمجاهد بن جبر، وعطاء بن ابى رباح، والحسن البصرى، وابن سيرين، وعامر الشعبى، وجنادة بن أبى امية، وحسان بن عطية وامثالهم، ومن الطبقة الثالثة: على بن الحسين، وعمر بن عبدالعزيز، ومحمد بن مسلم الزهرى، ومالك بن انس، وابن ابى ذئب، وابن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس کے ساتھ ہی محمود شکری نے سعود بن عبدالعزیز کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

بَیْـدَ أنه منع الناس عن الحج ، و خرج علی السلطان ، و غالی فی

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الـمـاجشون، و کحماد بن سلمة، وحماد بن زید، والفضیل بن عیاض، وعبدالله بن المبارک، وأبی حنـیـفة الـنـعـمان بن ثابت، ومحمد بن ادریس، واسحاق بن ابراهیم، واحمد بن حنبل، ومحمد بن اسـمـاعـیـل البـخـاری، ومسـلـم بن الحجاج القشیری، وإخوانهم وأمثالهم ونظرائهم من أهل الفقة والأثر فی کل عصر و عصر.

وأمـا توحید العبادة والإلٰهیة فلا خلاف بین أهل الاسلام فیما قاله الشیخ وثبت عنه من المعتقد الذی دعـا إلیـه، یـوضـح ذلک أن أصل الاسلام وقاعدته شهادة أن لا إلٰه إلا الله، وهی أصل الایمان بالله وحـده، وهـی أفـضـل شـعـب الایـمـان، وهـذا الأصـل لا بـد فیه من العلم والعمل والإقرار بإجماع المسلمین، ومدلوله وجوب عبادة الله وحدهٗ لا شریک لهٗ، والبرائة من عبادة سواه کائناً من کان.

وهـذا هـو الـحـکـمـة التی خلقت لها الإنس والجن، وأرسلت لها الرسل، وأنزلت بها الکتب، وهی تتضمن کمال الذل والحب، وتتضمن کمال الطاعة والتعظیم.

وهـذا هـو دین الاسلام الذی لا یقبل الله دینا غیره لا من الأولین ولا من الآخرین ، فان جمیع الأنبیاء عـلـی دین الاسلام وهو یتضمن الاستسلام لله وحده ، فمن استسلم له و لغیره کان مشرکا ، ومن لم یستسـلـم لـه کـان مستـکـبـرا عـن عبادته . قال تعالیٰ : (ولقد بعثنا فی کل أمة رسولا أن اعبدوا الله واجتـنـبـوا الـطـاغوت) و قال تعالیٰ : (وما أرسلنا من قبلک من رسول إلا نوحی إلیه أنه لا إله إلا أنا فـاعـبـدون) وقـال تـعـالـیٰ عن الخلیل (علیه السلام) : (وإذ قال إبراهیم لأبیه وقومه إننی براء مما تعبدون ، إلا الـذی فـطـرنـی فإنه سیهدین ، وجعلها کلمة باقیة فی عقبه لعلهم یرجعون) وقال تعالیٰ عـنـه :(قال أفرأیتم ما کنتم تعبدون ، أنتـم وآباؤکم الأقدمون ، فـإنهـم عدو لی إلا رب العالمین) وقـال : (قـد کـانـت لـکـم أسـوـة حسنة فی إبراهیم والذین معه إذ قالوا لقومهم إنا برآء منکم ومما تـعـبـدون مـن دون الـلـه کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوة والبغضاء أبدا حتی تؤمنوا بالله وحده) وقـال تـعـالیٰ : (واسأل من أرسلنا من قبلک من رسلنا أجعلنا من دون الرحمن آلهة یعبدون) وذکر عـن رسـله : نوح ، وهود ، و صالح ، و شعیب ، و غیرهم أنهم قالوا لقومهم : (أعبدوا الله مالکم من الٰه غیـره) وقـال أهل الکهف : (...إنهم فتیة آمنوا بربهم وزدناهم هدی ، وربـطـنا علی قلوبهم إذ قـامـوا فـقـالـوا ربـنا رب السماوات والأرض لن ندعو من دونه إلها لقد قلنا إذا شططا ، هؤلاء قومنا اتـخـذوا مـن دونـه آلهة لـولا یـأتون علیهم بسلطان بین فمن أظلم ممن افتری علی الله کذبا) وقال تـعـالی : (ان الله لا یغفر أن یشرک به) فی موضعین من کتابه . وقال تعالی : (إنه من یشرک بالله فقد حرم الله علیه الجنة ومأواه النار) .

قـال رحـمـه الـلـه : والشـرک الـمراد بهذه الآیات و نحوها یدخل فیه شرک عباد القبور ، و عباد الأنبیاء والملائکة والصالحین (تاریخ نجد،ص ۱۰۶ الیٰ ۱۰۹ ، ذکر طرف من معتقد المغالین، فی القبور والصالحین الناشر: شرکة دار الوراق للنشر المحدودة ، بغداد)

تكفير من خالفهم وشدد فى بعض الأحكام ، و حملوا (أى النجديون) أكثر الأمور على ظواهرها كما غالى الناس فى قدحهم .

والانصاف الطريقة الوسطى لا التشديد الذى ذهب اليه علماء نجد و عامتهم من تسمية غاراتهم على المسلمين بالجهاد فى سبيل الله ، ومنعهم الحج . ولا التساهل الذى عليه عامة أهل العراق والشامات و غيرهما من الحلف بغير الله و بناء الأبنية المزخرفة بالذهب والفضة والألوان المختلفة على قبور الصالحين والنذر لهم و غير ذالك من الأمور التى نهى عنها الشارع .

والحاصل أن الافراط والتفريط فى الدين ليس مما يليق بشأن المسلمين بل الأحرى بهم اتباع ما عليه السلف الصالح ، وتكفير بعضهم لبعض مستوجب للمقت والغضب . (تاريخ نجد، ص، ۱۳۰ و ۱۳۱ ، امراء نجد وذكر نسبهم وسائر احوالهم ، الناشر: شركة دار الوراق للنشر المحدودة ، بغداد)

ترجمہ: البتہ اتنی بات ہے کہ سعود بن عبدالعزیز نے لوگوں کو حج سے روکا اور سلطان کے خلاف خروج کیا، اور جنہوں نے ان کی مخالفت کی، ان کی تکفیر میں غلو سے کام لیا، اور بعض احکام میں تشدد اختیار کیا، اور نجدیوں کو اکثر امور کے ظاہر پر ابھارا، جیسا کہ لوگوں نے ان پر عیب جوئی میں بھی غلو سے کام لیا۔

اور انصاف، درمیانی راستہ ہے، جو نہ اس تشدید پر مبنی ہے، جس کی طرف علمائے نجد اور ان کے وہ اکثر لوگ گئے ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کے مقابلے کا نام جہاد

فی سبیل اللہ رکھ دیا، اوران کو حج سے روکا، اور نہ ہی وہ تساہل ہے، جس پر عراق اور شام وغیرہ کے اکثر لوگ ہیں، جو اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھاتے ہیں، اور سونے، چاندی اور مختلف الوان کی چیزوں سے نیک صالح لوگوں کی قبروں کی عمارتوں کو مزین کرتے ہیں، اوران کے لیے نذر مانتے ہیں، اوراس کے علاوہ ان امور کا ارتکاب کرتے ہیں، جن سے شارع علیہ الصلاۃ والسلام نے منع کیا ہے۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ دین کے اندر افراط اور تفریط، مسلمانوں کی شان کے لائق نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی شایانِ شان یہ ہے کہ وہ سلفِ صالحین کی اتباع کریں، اور بعض مسلمانوں کا بعض کی تکفیر کرنا (اللہ کی) ناراضگی اور غصہ کا باعث ہے (تاریخِ نجد)

مذکورہ عبارت کے حاشیہ میں سلیمان بن سحمان لکھتے ہیں:

الغلو أو التعصب الذی التزمه بعض عامة نجد فی بعض الأعمال هو ما لا یسلم من مثله خواص الناس فی کل عصر و مصر أبدا :

یقولون فی هذی البلاد تعصب　　　وأی بلاد لیس فیها تعصب

ولکن علمائهم لا یسکتون لهم علی منکر ارتکبوه و حاشا لله أن یکون علماء نجد الأعلام غلاة متشددین یلتزمون العزائم واجتناب الرخص ولا یفقهون أسرار التشریع (حاشية تاريخ نجد، ص، ۱۳۰ و ۱۳۱ مع ملحق بقلم الشيخ سليمان بن سحمان ، الناشر: شركة دار الوراق للنشر المحدودة ، بغداد)

ترجمہ: غلو یا تعصب، جس کا نجد کے بعض عام لوگوں نے بعض اعمال میں التزام کیا، یہ ایسی چیز ہے کہ اس کے مثل سے لوگوں کے خواص بھی ہر زمانے اور شہر میں محفوظ نہیں رہے، اسی لیے کہا جاتا ہے: ؎

لوگ کہتے ہیں کہ ان شہروں میں تعصب ہے۔ مگر کون سا شہر تعصب سے خالی ہے لیکن نجد کے علماء ان کے ساتھ اس منکر پر سکوت اختیار نہیں کرتے، جس کا وہ لوگ ارتکاب کرتے ہیں، اور اللہ نہ کرے ایسا تو بالکل نہیں کہ نجد کے مستند اور اہم علماء متشدد ہوں، جو عزیمتوں کا التزام کرتے ہوں، اور رخصتوں سے اجتناب کرتے ہوں، اور اسرارِ شریعت کو نہ سمجھتے ہوں (حاشیہ تاریخِ نجد)

اس سے معلوم ہوا کہ غلو یا تعصب کسی بھی زمانے اور علاقے کے لوگوں میں ہوسکتا ہے، اور آج بھی مختلف جماعتوں اور سلسلوں میں غلو اور تعصب کا بہت سے لوگوں میں انکار نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا اہلِ نجد اور وہابیہ کے سلسلے میں بھی غالی یا متعصب لوگوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم ہر سلسلے اور جماعت میں معتدل حضرات بھی ہوا کرتے ہیں، اسی طرح وہابیہ کے سلسلے میں، جو مستند اہلِ علم اور مشائخ ہوئے ہیں، وہ معتدل ہوئے۔

اور سلیمان بن سحمان کا جو مضمون تاریخِ نجد کے ساتھ ملحق ہو کر شائع ہوا ہے، اس میں سلیمان بن سحمان، محمود شکری کی مذکورہ عبارت سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فانظر رحمک اللہ الی ھذا الکلام بعد ذکرہ لمعتقدھم وحسن سیرتھم فی الاسلام والمسلمین حیث نقض ماأبرمہ ھناک بما حکاہ ھاھنا عن أھل الاسلام مما ھم بریئون منہ . وھذا یخالف ما بلغنا عنہ و تحققناہ . فلعلہ وقع فی حال ذھول و غفلۃ واللہ یغفر لہ .

وقد ذکر قبل ذالک رسالۃ الشیخ عبد اللہ بن الشیخ محمد بن عبد الوھاب بعد دخولھم مکۃ المشرفۃ . فذکر فیھا ما یناقض ما ذکرہ فی ھذا الکلام و یبطلہ ویعود علیہ بالھدم والرد . و أما قولہ

: (و غالی فی تکفیر من خالفهم) فاعلم رحمک الله أن هذا القول مما افتراه علينا أعداء الله ورسوله الذين يصدون عن سبيل الله من آمن به ويبغونها عوجا. فانا و علمائنا وأئمتنا المتقدمين والمتأخرين لا نكفر الا من كفر الله و رسوله ممن أشرک بالله فی عبادته عند ضرائح الأولياء والصالحين وصرف لهم خالص حق الله الذی لا ينبغی لأحد سواه لا ملک مقرب ولا نبی مرسل فضلا عن غيرهما . فهؤلاء هم الذين نكفرهم بعد قيام الحجة عليهم و نقاتلهم ونسمی قتالهم الجهاد فی سبيل الله شاء الشيطان ذالک أم أبی (تاريخ نجد، ص، ۱۸۳ و ۱۸۴ مع ملحق بقلم الشيخ سليمان بن سحمان، فصل فی ذكر المنازل والقرى التی حدثت فی نجد، الناشر: شركة دار الوراق للنشر المحدودة ، بغداد)

ترجمہ: پس اللہ آپ پر رحم کرے، آپ اس کلام کی طرف دیکھیے، محمود شکری نے یہ بات اہلِ نجد کے اسلامی اور مسلمانوں والے عقائد اور ان کی اچھی سیرت بیان کرنے کے بعد ذکر کی ہے، اور پہلے اہلِ اسلام کی طرف سے وہاں جو کچھ ذکر کیا ہے، یہاں اس کے برعکس بات کی، جس سے یہ اہلِ نجد بری ہیں، اور محمود شکری کی یہ بات اس کے مخالف ہے، جو ہمیں ''سعود بن عبدالعزیز'' کی طرف سے پہنچی ہے، اور جس کی ہمیں تحقیق ہوئی ہے، شاید کہ یہ بات محمود شکری سے ذہول اور غفلت کی حالت میں سرزد ہوگئی ہو، اور اللہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔

اور محمود شکری نے اس سے پہلے شیخ عبداللہ بن شیخ محمد بن عبدالوہاب کے رسالے کا ذکر کیا ہے، ان کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد، جس میں انہوں نے اس کے خلاف موقف کا ذکر کیا ہے، جو انہوں نے یہاں ذکر کیا، جس میں انہوں نے

ان پر وارِد ہونے والے اعتراضات کا رَد کیا ہے، جہاں تک محمود شکری کے یہ کہنے کا تعلق ہے کہ انہوں نے اپنی مخالفت کرنے والوں کی تکفیر میں غلو سے کام لیا، تو اللہ آپ پر رحم کرے، یہ بات جان لیجیے کہ ہم پر یہ بات اللہ اور اس کے رسول کے ان دشمنوں نے گھڑی ہے، جو اُن لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، جو ایمان لائے، اور اس میں کجی کو تلاش کرتے ہیں، پس ہم اور ہمارے علماء، اور ہمارے متقدمین ومتاخرین ائمہ، صرف ان ہی لوگوں کی تکفیر کرتے ہیں، جن کی اللہ اور اس کے رسول نے تکفیر کی، جنھوں نے اولیاء اور صالحین کی قبروں کے قریب، اللہ کے ساتھ عبادت میں شرک کیا، اور اُن کے لیے وہ حق ثابت کیا، جو خالص، اللہ کا حق ہے، اور اس کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں، نہ کسی مقرب فرشتے کے لیے، اور نہ کسی نبی ورسول کے لیے، چہ جائیکہ ان کے علاوہ کے لیے ہو، پس یہی لوگ ہیں، جن پر حجت قائم کرنے کے بعد ہم ان کی تکفیر کرتے ہیں، اور ان سے قتال کرنے کو ہم اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کا نام دیتے ہیں، شیطان، اس کو چاہے یا انکار کرے (ملحق تاریخ نجد)

اگر سلیمان بن سحمان کو محمود شکری کی رائے سے اختلاف ہوسکتا ہے، تو کسی دوسرے کو سلیمان بن سحمان سے بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔

اور ہم سلطانِ ترکی کے خلاف خروج اور حجاجِ کرام کو حج سے روکنے کے مسئلہ پر تو بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے، کیونکہ اس میں مختلف احتمالات ہوسکتے ہیں، لیکن ہمیں اس بات میں شبہ نہیں کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے ثقہ متبعین کا جو تکفیرِ مسلم کے متعلق سخت موقف ہے۔

اور جن اقوال وافعالِ مسلم میں تاویل ہوسکتی ہے، جمہور اور ائمہ متبوعین کی طرف سے مختلف فرقوں کو تاویل کرکے ہی بدعتی قرار دیا جاتا رہا ہے (نہ کہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج) اور

وہ تاویلات ان کے ایسے اقوال وافعال اور عقائد میں ہی ہوتی رہی ہیں، جو باعثِ کفر تھے، اور جمہور اہلِ علم کے اس مبنی بر تاویل مؤقف کے علامہ ابنِ تیمیہ بھی قائل ہیں، جیسا کہ اگلے باب میں آتا ہے۔

تو ہم اس سلسلہ میں وھابیہ کو اگر چہ عاصی تو نہیں سمجھتے، لیکن خاطی ضروری سمجھتے ہیں، وھابیہ کو آج بھی اپنے اس موقف پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے، جو ان کے لیے پہلے بھی سخت نفرت کا باعث بنا تھا، اور آج بھی بہت سے مسلمانوں کی طرف سے سخت توحش کا باعث ہے۔

(8)......سید احمد بن زینی دحلان مکی شافعی کا حوالہ

حرمین پر پہلی مرتبہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے پیروکار آلِ سعود کے اقتدار میں آنے اور درمیان میں ان کا اقتدار ختم ہونے کے بعد شیخ سید احمد بن زینی دحلان مکی شافعی حسنی (المتوفی: 1304ہجری) نے وہابیت کے رَد پر درجِ ذیل تین رسائل تالیف کیے۔

(1)......رسالة فی الرد علی الوهابية.

(2)......فتنة الوهابية.

(3)......الدرر السنيه فی الرد علی الوهابية.

ان رسائل میں وہابیہ کے ایسے عقائد وافکار اور افعال کا ذکر کیا گیا تھا، جو عامۃ الناس اور جمہور اہلِ علم حضرات کے نزدیک قابلِ نکیر یا سخت قابلِ اختلاف وقابلِ ملامت تھے۔

اور شیخ سید احمد بن زینی دحلان کی تحریرات میں واقعتاً بعض الفاظ محمد بن عبدالوھاب نجدی یا ان کے متبعین کے متعلق بڑے سخت آ گئے ہیں، جو سننے اور پڑھنے والوں کے لیے وہابیہ سے سخت منافرت کا باعث ہیں۔

شیخ سید احمد دحلان کے یہ رسائل اُس زمانے میں کافی شائع ہوئے اور پھیلے، اور ان کی بناء پر بعد کے کئی مصنفین نے اپنی بعض کتب میں وہابیہ کا اسی انداز میں ذکر کیا۔

شیخ سید احمد بن زینی دحلان مکی حسنی دراصل شافعی المسلک مفتی اور اس زمانے میں امام الحرمین تھے۔

شیخ موصوف 1232 ہجری بمطابق 1817 عیسوی میں مکہ مکرمہ کے قریب پیدا ہوئے تھے۔

1288 ہجری 1871 عیسوی سے اپنے آبائی شہر میں مذہب شافعی کے مفتی اور شیخ العلماء کے منصب پر فائز رہے۔

اور 1304 ہجری بمطابق 1886 عیسوی میں فوت ہوئے۔

جب شریف مکہ عونُ الرفیق، ترکی کے نائب پاشا سے کسی مخالفت کی بنا پر مکہ معظّمہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ چلے گئے، تو احمد بن زین دحلان بھی شریفِ مکہ کے پیچھے مدینہ منورہ چلے گئے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں احمد بن زینی نے مصنف ہونے کی حیثیت سے سرگرمی دکھائی، انہوں نے نہ صرف روایتی اسلامی علوم کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا، جن کا مطالعہ ان کے زمانہ میں مکہ معظّمہ میں کیا جاتا تھا، بلکہ بعض وقتی طور پر زیر بحث مسائل پر بھی متعدد رسائل و مضامین لکھے اور یہ مکہ معظّمہ میں انیسویں صدی میں تاریخ نویسی کے امتیازی نمائندہ شمار ہوئے۔

جس طرح شیخ احمد بن زینی دحلان کی اتباع میں بعض اہلِ علم حضرات نے وہابیہ کا حکم بیان کیا، یا اس موضوع پر مضامین تحریر کیے، اسی کے ساتھ بعض اہلِ علم حضرات نے شیخ احمد بن زینی دحلان کے رَد میں بھی مضامین اور رسائل تحریر کیے۔

ہندوستان کے ایک عالم محمد بشیر بن محمد بدرالدین سہسوانی (المتوفی: 1326 ہجری) نے بھی شیخ احمد بن زینی دحلان کے رَد میں ''صيانة الإنسان عن وسوسة الشيخ دحلان'' کے نام سے ایک تالیف کی، جس میں شیخ احمد بن زینی دحلان کی طرف سے وہابیہ پر عائد کیے گئے الزامات کے جوابات تحریر کیے، اور ان جوابات کے لیے محمد بن عبدالوہاب نجدی وغیرہ

کے بعض رسائل کی عبارات کو پیش کیا۔

شیخ احمد بن زینی دحلان نے وہابیہ کے جن افکار وافعال کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے کہ وہ اُن افراد کے متعلق ہوں، جن کا شیخ موصوف نے مشاہدہ کیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیخ موصوف کے سامنے کچھ لوگوں کی طرف سے بعض افکار وافعال میں غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا ہو، لیکن خود شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے وہ افکار نہ ہوں، اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی وغیرہ کے رسائل اُن تک نہ پہنچے ہوں۔

اور یہ بات ایسی ہے کہ ایک انصاف پسند کی طرف سے، اس کا انکار کیا جانا مشکل ہے، کیونکہ شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے زمانے میں ہی دنیا بھر میں ان کے متعلق مختلف قسم کی افواہیں پھیلادی گئی تھیں، جن کا اعتراف خود شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی نے بھی کیا ہے اور اپنے مختلف مکتوبات میں اس قسم کی افتراء پردازیوں کو بہتان قرار دیا ہے، شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے زمانے میں ہی ان کے خلاف تحریری وتقریری طور پر کام شروع ہو گیا تھا، اسی کے ساتھ شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کی تحریک اور ان کے نام سے بعض غالی قسم کے لوگ بھی پائے گئے تھے، جن کے طرزِ عمل وطرزِ فکر میں ایسی کئی چیزیں پائی جاتی تھیں، جو شرعاً قابلِ نکیر وقابلِ ملامت تھیں۔

اس لیے بجائے اس کے کہ حرمین کے امام اور مفتی شیخ سعید احمد زینی دحلان پر بے جا طعن و تشنیع کی جائے اور ان کی طرف مختلف قسم کی بدگمانیوں کی نسبت کی جائے، ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلہ میں مذکورہ بالا تاویلات کر کے حسنِ ظن سے کام لیا جائے اور محمد بن عبد الوھاب نجدی اور ان کے متبعین کی طہارت و پاکیزگی ثابت کرنے کے لیے ایک دوسری شخصیت کی پگڑی نہ اچھالی جائے، کیونکہ ہر مسلمان کی عزتِ نفس کا ایک درجہ ومقام ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں کئی لوگوں کی طرف سے افراط یا تفریط سے کام لیا گیا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے، اور اس کی وجہ سے جانبین سے ایک دوسرے کے خلاف قلم و

زبان کا استعمال تیز ہوتا رہا اور باہمی خوشگوار تعلقات اور اتحاد و اتفاق قائم ہونے کی راہ ہموار نہ ہو سکی۔

ابھی بھی وقت ہے کہ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے والے افراد اپنی افراط و تفریط پر مبنی روش کو ترک کر کے اعتدال پیدا کریں اور امتِ مسلمہ کو مزید انتشار و افتراق سے بچائیں۔

(9)......علامہ ابنِ عابدین شامی کا حوالہ

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1252 ہجری) کی فقہی فکر کا متاخرین اور قریبی زمانے کے حنفیہ اور بالخصوص ہندوستان و پاکستان کے حنفی علماء میں خاص اثر و دخل رہا ہے، اور آج کل کے حنفی دینی مدارس میں علامہ ابنِ عابدین شامی کی تالیفات سے استفادہ کو خاص اہمیت حاصل ہے، یہاں تک کہ ہندوستان و پاکستان کے موجودہ اور ماضی قریب کے زمانے کے فتاویٰ میں عموماً علامہ ابنِ عابدین شامی کی رائے پر کثرت سے انحصار کیا جاتا رہا ہے۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق بھی علامہ ابنِ عابدین شامی کی طرف سے بیان کردہ رائے کو بہت سے اردو فتاویٰ میں اختیار کیا گیا ہے۔

علامہ ابنِ عابدین شامی ''ردُّالمحتار'' میں فرماتے ہیں کہ:

وقع فی زماننا فی أتباع عبد الوهاب الذین خرجوا من نجد وتغلبوا علی الحرمین وکانوا ینتحلون مذهب الحنابلة، لکنهم اعتقدوا أنهم هم المسلمون وأن من خالف اعتقادهم مشرکون، واستباحوا بذلک قتل أهل السنة وقتل علمائهم حتی کسر الله تعالی شوکتهم وخرب بلادهم وظفر بهم عساکر المسلمین عام ثلاث وثلاثین ومائتین وألف (رد المحتار، ج۴ص ۲۶۲، کتاب الجهاد، باب البغاة، مطلب فی أتباع عبد الوهاب الخوارج فی زماننا)

ترجمہ: ہمارے زمانہ میں عبدالوہاب کی اتباع میں کچھ لوگ نجد سے نکلے، اور

انہوں نے حرمین پر غلبہ حاصل کیا، اور وہ مذہبِ حنابلہ کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، لیکن ان کا اعتقاد یہ تھا کہ بس وہی لوگ مسلمان ہیں، اور جو ان کے اعتقاد کی مخالفت کریں، وہ مشرک ہیں، اور اسی وجہ سے انہوں نے اہلِ سنت کے قتل کو اور ان کے علماء کے قتل کو مباح سمجھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طاقت کو توڑ دیا، اور ان کے شہروں کو ویران کردیا، اور ان کے مقابلہ میں دیگر مسلمانوں کے لشکروں کو غلبہ عطا فرمایا بارہ سو تینتیس (1233 ہجری) میں (ردالمحتار)

ملحوظ رہے کہ مذکورہ عبارت میں علامہ ابنِ عابدین شامی نے خاص محمد بن عبدالوھاب نجدی کی ذات کے متعلق کوئی حکم بیان نہیں فرمایا، بلکہ ان کی مذکورہ عبارت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابنِ عابدین شامی کے زمانہ میں ان کی معلومات کے مطابق عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں میں بعض لوگ بہت متشدد تھے، جو اپنی شدت میں یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ اپنے خلاف نظریات وافکار اختیار کرنے والوں کو قتل کرنا بھی جائز سمجھتے تھے۔

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ کے مذکورہ موقف کی تاویل وتوجیہ بھی اس سے مختلف نہیں ہو گی، جو پیچھے ذکر کی گئی، یعنی ممکن ہے کہ بعض اہلِ نجد اور محمد بن عبدالوھاب نجدی کی طرف اپنی نسبت کرنے والے لوگ اس طرح کے غلو کا شکار ہوں، جن کے طرزِ عمل سے غلو ظاہر ہوا ہو، اور پھر ان کی وجہ سے محمد بن عبدالوھاب نجدی کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوئی ہو، یا یہ کہ بعض باتیں علامہ ابنِ عابدین شامی تک درست نہ پہنچ سکی ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال علامہ ابنِ عابدین شامی کی مذکورہ عبارت سے خود ان پر جھوٹ وافترا بازی کا الزام عائد کرنا درست نہیں۔

کیونکہ یہ بات خود شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے معتبر متبعین کی تحریرات سے واضح ہے کہ ان کے زمانے میں ہی ان کے متعلق مشرق سے مغرب تک بہت سی غلط اور جھوٹی باتیں پھیلادی گئی تھیں، جن کی خود محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے مخصوص حلقہ کی طرف

سے توضیح وتردید کرنی پڑی تھی اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بیٹے کے حوالہ سے یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ بعض بدوی لوگوں کی طرف سے کچھ ایسی قابلِ نکیر باتوں کا صدور ہوا تھا، جس پران کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی تھی۔

نیز محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین کا دوسرے اہلِ علم حضرات کی نظر میں تکفیر کے متعلق کچھ عاجلانہ موقف تھا اور وہ سجدہ علی القبور اور نداءِ غیراللہ وغیرہ کے مسائل میں تکفیر کے متعلق اس طرح کی تاویلات کے قائل نہیں تھے، جن کے دوسرے بعض فقہاء وعلمائے کرام روادار تھے، اس لیے تاویلات کے حامل اہلِ علم حضرات کی طرف سے تکفیر کے معاملہ میں ان پر گرفت ونکیر اور ردِ عمل ایک طبعی اور فطری امر تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(10)......مولانا سید سلیمان ندوی کا حوالہ

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب (المتوفیٰ: 1953 عیسوی) کا شمار، ان اصحابِ علم میں ہوتا ہے، جو اپنے وسیع علم، معتدل مزاج اور تقویٰ وطہارت کے اعتبار سے انتہائی معتبر شخصیت شمار ہوتے ہیں، اور بندہ محمد رضوان نے جہاں تک ان کی تالیفات وتصنیفات اور معارف و مضامین کا مطالعہ کیا، تو ان کو ایک خاص شان اور جامع صفات وکمالات کا مرقع پایا، جس کی واضح جھلک قارئین کو ان کے آنے والے مضمون سے بھی محسوس ہوگی۔ [1]

---

[1] جناب عبدالرشید عراقی صاحب لکھتے ہیں کہ:

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ، علومِ اسلامیہ کا بحرِ زخار تھے، وہ اپنے علمی تبحر، ذوقِ مطالعہ اور وسعتِ معلومات کے ساتھ جامع الصفات والکمالات شخصیت کے حامل تھے، وہ بیک وقت مفسر بھی تھے، اور محدث بھی۔ مؤرخ بھی تھے، اور محقق بھی۔ فقیہ بھی تھے، اور مجتہد بھی۔ معلم بھی تھے، اور متکلم بھی۔ ادیب بھی تھے، اور نقاد بھی۔ دانش ور بھی تھے، اور فلسفی بھی۔ شاعر بھی تھے، اور صوفی بھی۔ مصنف بھی تھے، اور صحافی بھی۔ مفکر بھی تھے، اور مدبر بھی۔ ماہرِ تعلیم بھی تھے، اور سیاست دان بھی۔ عظیم المرتبت عالمِ دین بھی تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک اعلیٰ اور ارفع سیرت نگار بھی تھے۔ ان کی شخصیت بڑی متنوع، کثیر الجہت اور ہمہ گیر تھی (ماہنامہ ''البلاغ'' جامعہ دارالعلوم، کراچی، جمادی الاخریٰ/رجب ۱۴۴۰ھ، مارچ 2019ء، ص ۸۷، جلد ۵۴، شمارہ ۶، ۷)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

غالباً 25 عیسوی کے ''معارف'' میں تحریکِ نجد پر میرا ایک مضمون ہے، جس میں میں نے یہ دکھایا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب اور محمد بن عبدالوہاب کو ایک ہی درسگاہ سے یہ فیض پہنچا ہے (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، صفحہ 92، مکتوب نمبر: 57، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی)

جس مضمون کا مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے مندرجہ بالا مکتوب میں حوالہ دیا ہے، وہ غالباً ماہنامہ ''معارف'' نومبر 1924 عیسوی، میں شائع ہونے والا مضمون تھا، جو ''سلاطینِ نجد اور ان کا مذہب'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کا یہ مکمل مضمون ماہنامہ معارف سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، سلاطینِ نجد کا مکمل اجمالی تعارف چونکہ ہم مقدمہ میں تحریر کر چکے ہیں، اس لیے شروع میں خیال ہوا کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے مضمون کا وہ حصہ طوالت کے باعث نقل نہ کیا جائے، لیکن مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے ایک خاص مقصد وجذبہ کے تحت یہ مضمون لکھا ہے، اور ان کے اس مضمون میں چند نئی باتیں بھی ہیں، اس لیے چند صفحات کے اس حصہ کو خارج کرنا مناسب نہ سمجھا۔ [1]

اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کا وہ مکمل مضمون ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

''دنیا کے انقلابات کی حدّ و پایان نہیں، کس کس طرح زمانہ اپنے پہلو الٹتا پلٹتا ہے، اور بازیگرِ فلک اپنے رنگارنگ کے پردے کس طرح ہر آن بدلتا رہتا ہے، **تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ** ''یہ زمانہ ہم لوگوں کے درمیان اس کو دست بدست پھراتے رہتے ہیں''۔

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے اس مضمون میں ''سلاطینِ نجد کے حکمرانوں کے دورِ حکومت'' کی تواریخ میں کچھ فرق ہے، ہم نے سلاطینِ نجد کے حکمرانوں کے دورِ حکومت کی تواریخ پیچھے مقدمے میں ذکر کردی ہیں، اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے مضمون کو بغیر کسی ترمیم کے بعینہٖ باقی رکھا گیا ہے۔ محمد رضوان۔

عرب کے ریگستانوں نے گو لیل و نہار کے ہزاروں تماشے دیکھے ہیں، مگر شاید اس تماشے سے بڑھ کر کوئی تماشا نہ ہوگا، کہ تاریک ذروں نے ایک چمکتے سورج (وجودِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) کے پرتَو سے روشن ہو کر ساری دنیا کی آنکھوں کو اپنی چمک دمک سے روشن کر دیا، اور خود ان کے گوشہ گوشہ کو مطلعِ انوار بنا دیا، اور عین اس وقت جب وہ دشت و جبل، اور بحر و بر کو منور کر چکے، خود ایسے ماند پڑ گئے کہ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قوموں نے جو اس نور سے منور ہوئیں، یہ سمجھا کہ ان ریگستانی ذروں کی تابانی کے مقابلہ میں ان کی چمک اور تابانی نگاہوں کو خیرہ نہ بنا سکیں گی، اس لیے ان کا تاریک اور ماند ہی رہنا اچھا ہے۔

اول تو ابو مسلم خراسانی (اور اسکے گروہ) کی تلواروں نے عربوں کی سیاسی قسمت کا 132 ہجری میں خاتمہ کر دیا، اور گو جونئی سلطنت عباسیہ اس کے بل بوتے پر قائم ہوئی، وہ عربی حکومت کے بجائے عجمی شہنشاہی بن گئی، اور رفتہ رفتہ سازش پسند عجمیوں نے سادہ مزاج، لیکن اکھڑ عربوں کو سیاستِ اسلامی کے دائرہ سے خارج ہی کر دیا، اس کے بعد معتصم نے ترکوں کو بر روئے کار لا کر عربوں کے آزادی پسند، سادہ دل، حریت طلب قبیلوں کو ہمیشہ کے لیے، پھر عراق و شام و مصر کے زرخیز علاقوں سے نکال کر عرب کے صحرا اور یگستان میں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

اس عرصہ میں دنیا کی اسلامی قوموں نے بڑے بڑے انقلابات پیدا کیے، بادشاہیاں بنائیں، قصر و ایوان تیار کیے، مدرسے اور دار العلوم تعمیر کیے، کرۂ ارض کے طبقے الٹ پلٹ کیے، سمندروں کے سینے چیرے، پہاڑوں کی چٹانیں گرائیں، توڑیں، یہ سب شور و غل، اور زور و شور، جوش و خروش جزیرہ نمائے عرب کے ارد گرد ہوتے رہے، لیکن عرب کا بادیہ نشین، اور شتربان بدستور اپنے صحرا اور

نخلستان میں بے پرواسوتا رہا۔

بالآخر جب دنیا کی دوسری مسلمان قومیں اپنی ان تابانیوں کو جو چاند کی طرح عرب کے سورج سے حاصل کی گئی تھیں، کھوچکیں، اور توحید وسنت کا سر رشتہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور وہ ہر بلند قبہ اور ستون کی طرف جھکنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے پھرانہیں ذروں میں ان کی ان روشنیوں کو جو زیرِ پردہ ہوگئی تھیں، بے نقاب ہو جانے کا حکم دیا۔

مدینہ منورہ کی مسجدِ نبوی جو معلمِ نبوت کے عہد سے آج تک، حق کے پکارنے والوں اور وحیِ الٰہی کے پیغاموں کے دہرانے والوں کے شور وصدا سے معمور رہی ہے، یہیں سے عرب کی نشأۃِ ثانیہ، یا دوبارہ زندگی کا سرچشمۂ فیض اُبلا، اور یہیں کی ایک شاخ دلی کے کنارۂ جمنا میں آکر شامل ہوگئی، اور شاہ ولی اللہ کے خانوادہ نے ہندوستان کے ظلمت کدہ کو دوبارہ مطلعِ توحید سے منور کیا، اور دوسری شاخ آبِ زمزم سے مل کر عرب کے صحراؤں اور ریگستانوں میں پھیلی۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی کا نام، مذہبی وجوہ سے زیادہ، سیاسی اسباب سے کم، اسلامی قوموں میں بدنام رہا، یہ شخص حنبلی مذہب کا ایک عالم، نجد کا رہنے والا، اور مدینہ منورہ کا ایک طالبِ علم تھا، **1703** عیسوی میں پیدا ہوا، اور **1791** عیسوی میں وفات پائی۔

حجاز ہمیشہ مصر کے تحت رہا ہے، مصر کے ترکی، چرکسی، کردی اور غلام بادشاہوں کے رسوم ورواجات، اور اثرات سے بدترین قسم کے بدعات میں مبتلا ہو گیا تھا، اور بوجہ اسلام کی مرکزیتِ عامہ کے جو "بلا" یہاں پیدا ہوتی ہے، وہ چند ہی سالوں کے بعد تمام دنیائے اسلام کو لپیٹ جاتی ہے، سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ اس خطۂ اقدس کو آلائشوں سے پاک اور آمیزشوں سے مبرا کیا جائے، محمد بن عبد

الوہاب نے جودعوت شروع کی اس کی دفعات صرف یہ ہیں:

(1)......خدا کی تمام صفات، صرف اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، اوران میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

(2)......خدا کی ذات وصفات کے متعلق قرآن اورحدیثِ صحیح میں جونصوص ہیں ،ان پرتاویل کے بغیراسی طرح ایمان لانا چاہیے، جس طرح ان کے الفاظ اپنے لغوی معنوں کے لحاظ سے ظاہر کرتے ہیں، ان کی حقیقتِ طلبی کے ہم درپے نہ ہوں۔

(3)......تمام پیغمبر بشر ہیں، اورصفاتِ ربانی سے خالی ہیں۔

(4)......اولیائے الٰہی کی ایسی تعظیم اوران کے متعلق ایسی عقیدت نہ رکھنی چاہیے، جوصرف پیغمبروں کے لیے یاخاص خدا کے لیے مخصوص ہے۔

(5)......مقابراورمزارات کی ایسی تعظیم نہ کی جائے، جوبت پرستانہ ہو۔

(6)......ان چیزوں کوجوخدا کی قدرت میں ہیں، غیرِ خدا سے طلب نہ کیا جائے، اورنہ مُردوں سے دعائے استعانت مانگی جائے۔

(7)......قبروں پرقبے، گنبد وغیرہ عمارتیں یاپختہ چبوترے نہ بنوائے جائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمایا ہے، اوران کے ذریعہ سے قبر پرستی پیدا ہوتی ہے۔

غرض یہ اوراسی قسم کے چند امور ہیں، جن کی دعوت وتبلیغ میں اس حنبلی عالم نے اپنی عمر صرف کی۔ [1]

اس کی دعوت وتبلیغ پرلبیک کہنے والوں میں نجد کے ایک مقام ''درعیة'' کے ایک

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے بڑے جامع اورمختصر انداز میں شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی رحمہ اللہ کی دعوت کی دفعات کوپیش فرمادیا ہے، واقعی شیخ موصوف کی دعوت کی دفعات مذکورہ بالا امور پرہی مبنی ہیں، جیسا کہ پیچھے باحوالہ گزرا اور آگے بھی آتا ہے۔محمد رضوان۔

شیخ قبیلہ محمد بن سعود تھے، اور جن کی نسبت سے ابنِ سعود کا یہ خاندان پیدا ہوا ہے، ابنِ سعود کے علَم کے نیچے نجد کے تمام قبائل جمع ہو گئے، اور ترکوں، انگریزوں اور شریفِ مکہ تینوں کے لیے یہ خطرۂ عظیم بن گئے، ترکوں کے لیے اس طرح کہ یہ عراق پر حملہ آور ہوئے، اور انگریزوں کے لیے یوں کہ انہوں نے بحرِ عرب اور خلیجِ فارس کے سواحل اور شہروں پر جو انگریزوں کی فوجی اور تجارتی ضرورتوں کے لیے مفید تھے، قبضہ کرلیا، اور شریفِ مکہ کے مقابلہ میں تو انہوں نے اس لیے کہ حرمین محترمین کو اپنے قبضہ میں لاسکیں، خونریز حملہ کیا اور کامیابیاں حاصل کیں، ترکی کی طرف سے مصر کے خدیو محمد علی پاشا اس ہنگامہ کو فرو کرنے کے لیے نامزد ہوئے، خدیو محمد علی پاشا کی فوج کے ساتھ ساتھ انگریز اور فرانسیسی افسرانِ فوج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد افسر شامل ہو گئے۔

اور اس طرح نجدی وہابیوں کی سیاسی اور فوجی قوت کا قلع قمع کیا گیا۔

اور یہی وہ اسباب ہیں، جن کی بنا پر وہابیوں کو ہندوستان، مصر، عرب اور ترکی میں ہر طرح بدنام کرنے کے لیے پرزور پروپیگنڈا کیا گیا۔

ہندوستان میں اسی کے کچھ عرصہ کے بعد مولانا شاہ اسماعیل شہید کی سپہ سالاری میں مجاہدین کی فوج قائم ہوئی، جس نے سکھوں سے جنگ کی، چونکہ مولانا شہید کی دعوت بھی اسی قسم کی تھی، اور وہی جذبات کام کر رہے تھے، اس لیے انگریزوں کو خاص طور سے وہابیوں کو بدنام اور رسوا کرنے کی حاجت تھی، چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ غدر کے بعد ہندوستان میں وہابی اور باغی دونوں برابر کے لفظ تھے۔

اللہ اکبر! کیا انقلابِ عظیم ہے کہ وہی ''وہابی'' جن کے خلاف کل ''ترک'' سربکف، ''مصری'' لشکر آرا، ''عرب'' ہنگامہ خیز اور ''انگریز'' اپنے جال بچھا رہے تھے، آج ''ترک'' ان کی فتح کے لیے دعا خواں، ''عرب'' مسرور، ''ہندوستان''

تبرک وتہنیت کے غلغلوں سے پرشور، اور ''انگریز'' ناطرفداری کے ساتھ ان کے خلاف لب کشائی سے پرہیز کر رہے ہیں۔

کل تک نجد اور اس کا سلطان ایک گمنام لفظ تھے، مگر ان دومہینوں کے کارناموں نے اس کے نام کو مشرق سے مغرب اور یورپ سے ایشیا تک بچہ بچہ کی زبان پر کر دیا، لیکن اس شہرت کے باوجود اس سلطنت کی تاریخ، اور اس کے سوانح اب تک نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

اسلامی ہندوستان کی نئی پود جو یونان وروم کے مردہ ناموں کو رٹتے رٹتے تھک گئی ہے، اور جس کو نئے اور پرانے یورپ کی تاریخ کا حرف حرف یاد ہو، کیا اس کے لیے یہ شرم کا باعث نہیں کہ وہ اس اسلامی سلطنت کے واقعات سے قطعاً ناآشنا ہو۔

ذیل میں ہم سلاطینِ نجد کے حالات وسوانح کا خلاصۂ ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، جس سے بہ ترتیب اس سلطنت کے امراء اور فرمانرواؤں کے واقعات ''روشنی'' میں آجائیں گے۔

اس حکومت کے بانی محمد بن سعود خاندان ''مقرِن'' سے تعلق رکھتے ہیں، یہ خاندان ''ولد علی'' کے قبیلہ ''مسالخ'' کی ایک شاخ ہے، اس قبیلہ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ عربوں کے بڑے خاندان ''عنزہ'' سے پیدا ہوا ہے، ان کے والد سعود نے گیارہویں صدی ہجری کی ابتداء یعنی 1727ء کے درمیان انتقال کیا، اور سعود نے محمد کے علاوہ تین اور لڑکے اپنے بعد چھوڑے:

(1) ثنیان (2) مشاری (3) اور فرحان۔

''درعیۃ'' اور ''ریاض'' کی حکومت آج تک محمد بن سعود کے خاندان میں چلی آتی ہے، البتہ ثنیان اور مشاری کے خاندانوں کے دو ارکان نے کچھ دنوں تک

غاصبانہ قبضہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) کرلیا تھا، لیکن ان کو کوئی حکومتی اہمیت حاصل نہ ہوئی، فرحان کا خاندان صرف نسب نامہ کے ذریعہ اب تک اپنے وجود کا ثبوت مہیا کررہا ہے۔

اس حکومت کے عہدِ سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ایک ابتدائے حکومت سے مصری فتح (1820ء) تک۔

دوسرا ترکی اور فیصل کے ذریعہ دوبارہ قیام کے بعد سے ابنِ رشید ''والئ حائل'' کی فتح تک (1820ء تا 1896ء)

تیسرا ''ریاض'' کے 1902ء میں دوبارہ فتح ہونے کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔

(1)......محمد بن سعود (بن مقرن) (1735ء تا 1766ء)

تقریباً 1740ء میں اس نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک میں شرکت کی، اطراف کے اضلاع اور شہروں سے 1159ھ (24 جون 1746ء) میں جنگ شروع ہوگئی، اور بہت جلد ''الحسا'' کے مشہور قبیلہ ''بنی خالد'' اور ''بحزان'' کے قبیلہ ''مکرمی'' کو مداخلت کرنی پڑی، لیکن وہ بھی اس سیلاب کو نہ روک سکے، شرفائے مکہ نے ان کو ایک خاص و جدید فرقہ سمجھ کر ان کو حج سے روک دیا، اس واقعہ کی سب سے پہلی اطلاع جو شرفاء نے قسطنطنیہ بھیجی تھی، وہ 1162ھ (25 دسمبر 1749ء) میں وہاں پہنچی، محمد بن سعود نے 1179ھ (1765-66ء) میں تیس سال کی حکومت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔

(2)......عبدالعزیز بن محمد بن سعود (1179ھ تا 1218ھ ''1766ء تا 1803ء'')

ان کی حکومت کے دس سال پہلے مشہور ہمسایہ قبائل بنی خالد، مکرمی اور منتفق سے

لڑنے میں گزرے، 1795ء میں عبدالعزیز نے ''الحسا'' اور ''قطیف'' پر قبضہ کر کے خلیج فارس کے ساحل پر اقتدار قائم کرلیا، بصرہ اور بغداد کے ترکی والیوں اوران کے اتحادی منتفقیون کی مسلسل کوششیں ناکامیاب ثابت ہوئیں، اور 1799ء میں پاشائے بغداد اور عبدالعزیز میں چھ سال کی عارضی صلح ہوگئی، 1186ھ (73-1772ء) میں شریفِ مکہ ''سرور'' نے ان کو ایک خاص محصول کی ادائیگی پر زیارت مقاماتِ مقدسہ کی اجازت دے دی، لیکن اس کے جانشین غالب نے 1203ھ سے اس رعایت کو موقوف کر کے 1790ء، 1795ء اور 1798ء میں حجاز میں ان کی پیش قدمی کو روکنے کی سعیِ لاحاصل کی، بالآخر 1798ء میں صلح ہوئی، شریف نے حج کی عام اجازت دے دی، اور سلطان عبد العزیز نے وعدہ کیا کہ وہ شریف کے زیرِ اثر علاقہ پر تاخت وتاراج نہ کریں گے۔ بغداد اور شرفائے مکہ سے صلح دیر تک قائم نہ رہ سکی، شیخ خزعل نے اس جماعت کے ایک کاروان پر حملہ کر دیا تھا، اور سعود بن سلطان عبدالعزیز نے انتقاماً 18 ذی الحجہ 1316ھ (21 اپریل 1802ء) کو کربلا پر قبضہ کر کے وہاں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی، اور اکثر باشندوں کو تہِ تیغ کر ڈالا، 1214ھ اور 1215ھ (اپریل 1800ء اور 1801ء) میں سعود نے حج کیے، اور اسی وقت ''عسیر، تھامۃ'' اور ''بنی حرب'' کے قبائل جو اَب تک شریف ''غالب'' کے ماتحت تھے، سعود سے آملے، اور ایک مرتبہ پھر شعلۂ جنگ بلند ہوگیا۔

25 شوال 1217ھ (18 فروری 1803ء) کو انہوں نے ''طائف'' پر قبضہ کیا، اور 8 محرم 1218ھ (30 اپریل 1803ء) کو سعود فاتحانہ مکہ معظّمہ میں داخل ہوا، سعود کی واپسی کے بعد شریف غالب نے اس کی فوج کو 22 ربیع الثانی 1218ھ میں نکال دیا، لیکن اس جماعت کے لیے مزید مراعات منظور کیں، اسی

کے ساتھ 1800ء سے ان لوگوں نے خلیج فارس کے ساحل پر اپنا اقتدار جمانا شروع کیا، اور چند ہی سالوں میں ''بحرین'' پر قابض ہو گئے، اس کے ساتھ ہی ''رأس الخیمة'' کے قبائل ''بنو جواسم'' بھی ان کے تحت میں آ گئے۔

(3)......سعود بن عبدالعزیز: (1218ھ تا 1229ھ ''1803ء تا 1814ء'')

بغداد، اور عمان پر متعدد خفیف حملوں کے بعد سعود نے ارادہ کرلیا کہ اس کے لیے بہتر صورت یہ ہے کہ شریف غالب کا خاتمہ کردے، چنانچہ 1220ھ (1805ء) میں اس نے مدینہ منورہ اور ذی الحجہ میں مکہ معظّمہ پر قبضہ کرلیا، اپنی بقیہ حکومت کے استحفاظ کے لیے غالب نے اطاعت قبول کرلی، اور یہ تحریک تمام حجاز میں پھیلنی شروع ہوگئی، حاجیوں کے کاروان جو ترکی حکومت کے ماتحت یہاں آرہے تھے، روک دیے گئے، خطبہ سے سلطان کا نام نکال دیا گیا، اور سعود نے ایک خط میں مطالبہ کیا کہ نہ صرف والیٔ دمشق بلکہ خود خلیفہ اس تحریک کو قبول کرے، والیٔ دمشق کے جواب صاف کا سعود نے یہ جواب دیا کہ جولائی 1810ء میں ''حوران'' کو لوٹ لیا، اب سعود نے خلیج فارس میں بھی تاخت وتاراج شروع کی، اور اس طرح انگریزوں کو 1809ء میں ایک بیڑا روانہ کرنا پڑا، جس نے 13 نومبر کو ''رأس الخیمة'' پر قبضہ کر کے سعود کے بیڑے کو برباد کردیا۔

سلطان نے محمد علی پاشا کو جو موجودہ خدیوی خاندان کے مصر میں بانی ہیں، اور جنہوں نے بزورِ آزادی کا فرمان حاصل کیا تھا، حکم دیا کہ وہ مصر کی فوج لے کر ابنِ سعود کے مقابلہ میں جائیں، مصریوں کے پہلے حملہ کا آغاز جو طوسون پاشا کے زیرِ کمان کیا گیا تھا، اکتوبر یا نومبر 1811ء میں ''ینبع البحر'' اور ''ینبع البر'' کی فتح کے ساتھ ہوا، لیکن مدینہ کی طرف پیش قدمی کرتے وقت ان کو سعود کے بیٹوں عبداللہ اور فیصل نے ''درۂ جدید'' میں شکست دی، اور ان کو ''ینبع''

لوٹ آنا پڑا، ان کا دوسرا حملہ 1812ء کی خزاں میں شروع ہوا، نومبر میں مدینہ پر قبضہ ہوگیا، جنوری 1813ء میں مکہ میں بھی داخلہ ہوا، اس کے چند دنوں بعد ہی مصری فوجیں طائف میں بھی فاتحانہ داخل ہو رہی تھیں۔

دوسری طرف سعود نے مصریوں کو ''تربو'' کی طرف پیش قدمی کرنے سے روک دیا، اگست 1813ء میں محمد علی خود ''جدہ'' آئے، اور سعود کی سی صلح بالکل ناکام رہی، اواخر 1813ء میں طوسون پاشا نے ''تربۃ'' پر دوسرا حملہ کیا، لیکن وہ بھی ناکامیاب رہا، اب مصریوں کی فوجی کارروائی ختم ہوگئی۔

اسی اثناء میں 8 جمادی الاولیٰ 1229ھ (27 اپریل 1814ء) کو سلطان سعود کا 68 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

(4)...... عبداللہ بن سعود (1229ھ تا 1233ھ ''27 اپریل 1814ء تا 9 ستمبر 1818ء'')

1815ء کی ابتداء میں محمد علی نے ''تربۃ'' کی طرف پیش قدمی کی، دشمن کو شکست دے کر 15 جنوری کو شہر پر قبضہ کرلیا، بعد میں ''عسیر'' کی طرف بڑھے، اور ''قنفدۃ'' ہوتے ہوئے مکہ آئے، مارچ میں طوسون پاشا ''حناکیۃ'' کی سمت سے ''نجد'' میں داخل ہوا، اور ''الرأس'' کے قلعہ بند شہر پر قبضہ کرلیا، یہاں عبداللہ بن سعود اس سے دوچار ہوا۔

اب طویل عارضی صلح ہوئی، اور وسط 1816ء تک گفتگو ہوتی رہی، ستمبر 1816ء میں ابراہیم پاشا بن محمد علی نے مصری فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی، اور 18 مہینوں کی خوفناک خونی جنگوں کے بعد ''درعیۃ'' کے دروازوں تک پہنچ گیا، دارالسلطنت کا محاصرہ اپریل 1818ء ستمبر تک رہا، لیکن 6 ستمبر کو شہر فتح ہوگیا، اور سلطان عبداللہ نے 3 دنوں تک ''قصر الدرعیۃ'' میں محصور رہ کر ہتھیار ڈال

دیے، ابراہیم پاشا نے سلطان عبداللہ اور محمد بن عبدالوہاب کے خاندانوں کو قاہرہ بھیج دیا، محمد علی پاشا نے قاہرہ سے سلطان عبداللہ اور اس کے رفقاء کو قسطنطنیہ روانہ کر دیا، یہاں 17 دسمبر 1818ء کو ان کو قتل کر دیا گیا۔

(5)......طوسون پاشا نے وسط 1819ء میں ''نجد'' چھوڑا۔

اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد مقتول سلطان عبداللہ کے بھائی مشاری بن سعود نے ''درعیة'' میں پھر حکومت قائم کر لی، لیکن محمد علی نے اس کے استیصال کے لیے حسین بے کو روانہ کیا، جس نے اسے گرفتار کر کے قاہرہ روانہ کر دیا، لیکن وہ راہ ہی میں ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا، تاہم راشد الحنبلی نے اس کی وفات 1230ھ تا 1235ھ (1818ء تا 1820ء) کے درمیان بتائی ہے۔

(6)......ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود: (1235ھ تا 1249ھ ''1823ء تا 1834ء'') [1]

ترکی مصری حملوں کے وقت ''سدیر'' بھاگ گیا تھا، اور مشاری بن سعود کی وفات کے بعد اس نے اپنے کو ''ریاض'' میں خود مختار بنانے کی کوشش کی، لیکن مصریوں نے اسے شکست دے کر نکال دیا، 1822ء میں اس نے ''ریاض'' کے کمزور مصری دستہ کو اچانک حملہ کر کے متحیر کر دیا، اور حجاز کے والیوں سے لڑنے کے بعد وہ محمد علی کو سالانہ رقم دینے پر راضی ہو گیا۔

1830ء میں اس نے ضلع ''الحسا'' پر، جس پر 1813ء سے ترک قابض تھے، فتح کر لیا، اور ''بحرین'' پر بھی اپنا تسلط جما لیا، اب اس جماعت کی حکومت کا دارالسلطنت ''درعیة'' کی جگہ ''ریاض'' مقرر ہوا، لیکن 1249ء (1834ء) میں مشاری بن عبدالرحمٰن نے اسے قتل کر دیا۔

---

[1] ترکی بن عبداللہ بن محمد آل سعود نجد میں دوسری سعودی ریاست، امارت نجد کا بانی تھا، اس کا دور حکومت 1823 عیسوی سے 1834 عیسوی تک رہا۔ محمد رضوان۔

(7)......مشاری بن عبدالرحمٰن، بن مشاری، بن حسن بن مشاری بن سعود:
اس شخص نے قتل کے بعد کوئی حکومت نہ کی، اور 40 دنوں کے بعد ہی خود بھی ''ھفھوف''میں فیصل بن ترکی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ [1]

(8)......فیصل بن ترکی: (1249ھ تا 1255ھ''1834ء تا 1838ء'')
1837ء میں فرمانروائے سوم سعود کے لڑکے خالد نے مصری فوج کی مدد سے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، اور فیصل کو''ریاض''میں شکست دی، مصری فوج کے سپہ سالار خورشید پاشا نے بھی فیصل کو''الدیلم''میں 25 رمضان 1254ء ''10 دسمبر 1838ء''میں شکست دی اور قید کر کے مصر بھیج دیا۔

(9)......خالد بن سعود: (1255ھ تا 1257ھ''1839ء تا 1841ء'')
مصری فوج کے 1840ء میں واپسی کے بعد عبداللہ بن ثنیان نے دسمبر 1841ء میں اسے''ریاض''سے نکال دیا، اس نے جدہ میں جا کر سکونت اختیار کی، اور وہیں 1861ء میں سپردِ خاک ہوا۔

(10)......عبداللہ بن ثنیان بن ابراہیم بن ثنیان بن سعود: (1257ھ تا 1259ھ''از ابتداء 1842 تا ابتداء 1843ء'')
یہ مشکل سے سال ہی بھر حکومت کر سکا تھا کہ فرمانروائے ہشتم فیصل نے جو 1841ء میں رہا ہو چکا تھا، اس کا''ریاض''میں محاصرہ کر لیا، اور اسے گرفتار کر کے قید کر دیا، اور اسی حالت میں مرا۔

(11)......فیصل بن ترکی''حکومت ثانی'': (1259ھ تا 1282ھ''1843ء کی ابتدا سے دسمبر 1865ء تک'')
اس شخص نے عاقلانہ اور مصلحانہ کوششوں سے''نـــجـــد''میں اپنی حکومت قائم

---

[1] ملحوظ رہے کہ یہ''مشاری بن عبدالرحمٰن''بعد کی شخصیت ہیں، اور ان''مشاری بن سعود''سے الگ ہیں، جو''سعود بن مقرن''کے بیٹے محمد بن سعود''کے لڑکے تھے، جیسا کہ اوپر کے نسب سے معلوم ہوا۔ محمد رضوان۔

کرنے میں کامیابی حاصل کی، اسی کے عہد میں ''جبلِ ثمر '' کے قبیلہ کے ابنِ رشید نے جواس کا دوست تھا، بغاوت شروع کی، اس نے ہیضہ میں 13 رجب 1282ھ (دسمبر 1865ء) کووفات پائی۔

(12)......عبداللہ بن فیصل بن ترکی ''حکومت اول'': (1282ھ تا 1287ھ تک ''ابتدا دسمبر 1865، ابتدا 1871ء'')

عبداللہ کواس کے بھائی نے 1287ء میں تخت سے اتار دیا۔

(13)...... سعود بن فیصل بن ترکی : (1287ھ تا 1291ھ ''1871ء تا 1874ء'')

سعود کے ابتداءِ عہدِ حکومت میں، جلاوطن عبداللہ کی درخواست پر ترکوں نے ''الحسا'' اور ''قطیف'' پر قبضہ کرلیا، اور سعود کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہ اُن ہی کے قبضہ میں رہے۔

(14)......عبداللہ بن فیصل بن ترکی ''حکومتِ ثانیہ'': (1291ھ تا 1301ھ ''1874ء تا 1884ء'')

سعود کی موت کے بعد اس نے پھر تخت حاصل کرلیا، اور اپنے بھائی محمدؔ اور سعوؔد کے لڑکوں کی مخالفت کے باوجود اس پر قابض رہا، 1883ء میں اس کو محمد بن رشید حائلی کی جنگ میں شرکت کرنی پڑی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعود کے بیٹوں نے ابتداء 1884ء میں اسے جلاوطن کردیا۔ [1]

(15)......محمد بن سعود: اس کا عہدِ حکومت بہت ہی مختصر اور غیر اہم ہے، اس کے بعد اس کا چچا تخت حکومت پر بیٹھا۔

(16)......عبدالرحمٰن بن فیصل (1886ء) اس کو محمد رشید نے تخت سے اتار دیا،

[1] عبداللہ بن فیصل کے تین بھائی تھے (۱) عبدالرحمٰن بن فیصل (۲) محمد بن فیصل (۳) سعود بن فیصل۔ محمد رضوان۔

اوراس کی جگہ پر عبداللہ کو ''نجد'' کی حکومت ملی۔

(17)......عبداللہ بن فیصل حکومتِ ثالثہ (1886ء تا 1888ء)

عبداللہ کا 1888ء میں انتقال ہو گیا، اور عبداللہ کی حصولِ تخت وتاج کے سعی کے باوجود ''ریاض''، ''حائل'' کا محکوم ہی رہا، 1891ء محمد بن رشید نے ''ریاض'' کو فتح کیا، اور وہاں کا تخت فیصل کے تیسرے بیٹے محمد کو دیا۔

(18)......محمد بن فیصل: یہ فیصل کا تیسرا بیٹا ہے، محمد کی وفات کے بعد جس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ''ریاض'' پر ابنِ رشید کے عمالِ حکومت کرتے رہے۔

(19)......عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل (1902ء سے)

سلطان عبدالعزیز نے ''کویت'' کے شیخ مبارک کی مدد سے جن کے یہاں ان کے والد نے بھی پناہ لی تھی، مارچ 1902ء میں ''ریاض'' پر قبضہ کرلیا، اور ابنِ رشید ''والیٔ حائل'' کے حملوں کو کامیابی کے ساتھ روکتے رہے، ابنِ رشید نے ترکوں کی مدد بھی حاصل کی، لیکن چونکہ خود ''حائل'' میں بدامنی پھیل گئی تھی، اس لیے کچھ نہ ہوسکا، اور سلطان عبدالعزیز نے باشندوں کی مدد سے ایک مرتبہ پھر ''ریاض'' کی آزاد حکومت قائم کرلی (ماہنامہ معارف، ص: ۳۲۹ تا ۳۳۸، بعنوان: سلاطینِ نجد اوران کا مذہب، مجلد چہاردہم، ماہِ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ مطابق ماہِ نومبر ۱۹۲۴ء، مطبوعہ: اعظم گڑھ)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمہ اللہ، نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں جامعیت، اعتدال، صفائی اور سلیقہ کے ساتھ شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور سلاطینِ نجد کے مذہب اوران کی اجمالی تاریخ کو رقم کردیا ہے، اس بناء پر مولانا موصوف کے مضمون کو ہم نے دیگر آنے والے حضرات سے پہلے درج کیا ہے۔

لیکن مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، وہابیت یا حنفیت، کسی بھی سلسلے میں غلو وتشدد اور تعصب کے خلاف ہیں، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:

''وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہئے، تصلب اور تعصب حکمِ دین میں چاہئے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں، خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت۔ **بل ملة ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین**'' (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، صفحہ 114، مکتوب نمبر: 73، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی)

اور ہمیں وہابیہ میں تکفیرِ مسلم کے سلسلے میں تشدد محسوس ہوا، جس کی تفصیل اگلے باب میں آتی ہے۔

(11)......شاہ عبدُ العزیز محدث دہلوی کا حوالہ

یہ بات معلوم ہے کہ مشائخِ دیوبند کا علمی سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اور ان کی اولاد سے ملتا ہے، اور دیوبند کی فکر میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی فکر کو خاص دخل ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے فرزند، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1239 ہجری، بمطابق 1823 عیسوی) کے ایک واقعے میں بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ذکر پایا جاتا ہے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا زمانہ شیخ محمد بن عبد الوھاب نجدی کے زمانے کے قریب قریب ہے۔

چنانچہ مولانا اشرف علی شاہ صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے خان صاحب (یعنی امیر شاہ خان صاحب) کے واسطے سے، اور انہوں نے اپنے استاد میاں جی محمدی صاحب کے واسطے سے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ:

شاہ عبدالعزیز صاحب ایک مرتبہ کھانا کھانے کے لیے زنانہ مکان میں تشریف لے گئے تھے، اور کچھ لوگ آپ کے انتظار میں مدرسہ میں بیٹھے ہوئے تھے، اتفاق سے (محمد بن) عبدالوہاب نجدی کا ذکر چھڑ گیا، ان میں سے دو آدمیوں میں اس

کے متعلق مناظرہ ہونے لگا، ایک نے (محمد بن) عبدالوہاب کی مذمت اور تفسیق وتکفیر شروع کی، دوسرے نے اس کی تعریف وتحسین۔

اور (ان دونوں کی آپس میں) خوب گفتگو ہوئی، ان میں سے ایک مذمت کرنے والے نے یہ بھی کہا کہ (محمد بن) عبدالوہاب بد دین تھا، اور اس نے ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم، مَردودوں اور بد دینوں کے دین کو چمکانا چاہا، اتنے میں اتفاق سے شاہ (عبدالعزیز محدث دہلوی) صاحب بھی مکان سے تشریف لے آئے، شاہ صاحب ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اس شخص نے جو (محمد بن) عبدالوہاب کا مخالف تھا، شاہ صاحب سے کہا کہ حضرت میں تو کہتا ہوں کہ (محمد بن) عبدالوہاب کافر تھا، اور ایسا تھا، ویسا تھا، اور اس نے ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم جیسے بد دینوں کے دین کو رواج دینا چاہا، شاہ صاحب نے اس کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی منہ پر انگلی رکھی، اور فرمایا ''ہاہا'' اور دیر تک ایسا ہی کیا (مطلب یہ تھا کہ یہ بات نہایت بری ہے، تم ایسا نہ کہو) اس کے بعد بیٹھ کر فرمایا کہ (محمد بن) عبدالوہاب بھی نہایت سچا اور پکا مسلمان اور متبعِ سنت تھا، مگر بدعقل۔

اور ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم بھی نہایت سچے اور پکے مسلمان تھے، مگر بشر تھے، ان سے غلطی ممکن ہے، اور اس غلطی کی بنا پر ان کو برا بھلا کہنا ہر گز نہیں چاہیے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ حجۃ الوداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا تھا، جس سے مقصود، تعلیم افعالِ طواف کی تھی، اور اس حالت میں (بحکمِ الٰہی) آپ کی اونٹنی نے نہ جگالا، نہ مینگنیاں کیں، اور نہ پیشاب کیا، پس حرمتِ مسجد بھی محفوظ رہی، اور مقصودِ تعلیم بھی حاصل ہو گیا (لیکن محمد بن) عبدالوہاب اپنی غلطی سے اونٹنی پر طواف کو سنت سمجھ گیا، اور اس نے اپنے اَتباع (یعنی متبعین) سمیت اونٹوں پر طواف کیا، جس سے تمام مسجد

مینگنیوں اور پیشاب سے بھرگئی، سوگویہ اس کی غلطی تھی، مگر اس کا منشاء اتباعِ سنت تھا، اس لیے اس کو برا کہنا نہ چاہیے (منقول از ''امیر الروایات'') (ارواحِ ثلاثہ یعنی حکایاتِ اولیاء، صفحہ ۳۸، ۳۹، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی حکایات، حکایت نمبر ۳۰، مطبوعہ: مکتبہ عمر فاروق، کراچی، اشاعتِ اول: نومبر 2009ء)

مذکورہ واقعہ کے آخر میں ''اتباعِ سنت تھا'' کے الفاظ پر حاشیہ میں، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

یہی فرق ہے، اہلِ صورت واہلِ معانی میں کہ وہ افعال کو دیکھتے ہیں، اور یہ افعال کے مناشی کو، اس لیے (یہ اہلِ معانی) کبھی ایسے امر پر مواخذہ کرتے ہیں، جو ظاہراً موجبِ مواخذہ نہیں ہوتا، اور کبھی ایسے امر پر تسامح کرتے ہیں، جو ظاہراً قابلِ تسامح نہیں ہوتا (لیکن معانی کے اعتبار سے اس کے برعکس ہوتا ہے) اشرف علی (حوالہ بالا)

مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ''ملفوظات'' میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے مذکورہ واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ہمارے حضرت (علامہ انور) شاہ صاحب علامہ کشمیری، اس (محمد بن عبد الوھاب) کی مثال، تکفیرِ مسلمین میں جلد بازی بتلایا کرتے تھے۔

معلوم ہوا کہ اتباعِ سنت کے لیے بھی عقل کی رہنمائی ضروری ہے، اور اس کے بغیر بڑوں سے بھی بڑی غلطیاں سرزَد ہوسکتی ہیں (ملفوظات محدث کشمیری، صفحہ ۱۷۲ ''حضرت شاہ عبدالعزیز کی طرف سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کا دفاع''، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ربیع الاول 1431ھ)

مذکورہ واقعہ اور عبارات سے معلوم ہوا کہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کو شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی سے بعض مسائل میں اختلاف تھا، اور وہ شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کو

عقلی اعتبار سے کمزور سمجھتے تھے، جس کی انہوں نے اونٹنی پر طواف کرنے کی مثال ذکر فرمائی، اور اتباعِ سنت کے انطباق میں عقل کی رہنمائی کی ضرورت اوراس کے بغیر بڑوں سے بھی غلطیاں ہونے اور اہلِ صورت کے محض افعال کو دیکھنے اور اہلِ معانی کے افعال کے مناشی کو دیکھنے کا ذکر کیا گیا، لیکن اس کے باوجود، محمد بن عبدالوھاب نجدی کی نیت کے درست ہونے اور اتباعِ سنت کے مقصود ہونے کی وجہ سے سچے اور پکے اور متبعِ سنت مسلمان ہونے کا حکم لگایا گیا اوران کو برا بھلا کہنے اوران کی تضلیل وتفسیق سے منع کیا گیا۔

ملاحظہ فرمایئے کہ مذکورہ تحقیق میں کتنا اعتدال ہے کہ ہر چیز کواس کے مقام پر رکھا گیا ہے، جو کہ محققین ہی کی شان ہوتی ہے کہ وہ جامع بین الاضداد ہوتے ہیں۔

اوراس کے برعکس غیر محققین یا متعصبین ومعاندین کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض محاسن کی وجہ سے دوسرے کی کمزوریوں کو نظر انداز کردیتے ہیں، یا بعض کمزوریوں کی وجہ سے اس کے محاسن کو نظر انداز کردیتے ہیں۔

مگر آج کل المیہ ہے کہ کوئی بآسانی اپنے آپ کو، یا اپنے عقیدہ کے مطابق کسی بزرگ کو اجتہادی خطا پر ماننے کے لیے تیار نہیں، بلکہ اپنے یا اپنے بزرگ کے موقف میں اجتہادی خطا کے احتمال کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

چنانچہ جو حضرات محمد بن عبدالوھاب نجدی کے مخالف ہیں، وہ محمد بن عبدالوھاب نجدی اوران کے متبعین کی تکفیر وتضلیل اور تفسیق تک پہنچ جاتے ہیں، اور جو محمد بن عبدالوھاب نجدی کے حامی ہیں، وہ ان کو ہر طرح سے پاکیزہ ومعصوم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علامہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبان کی طرح ہمیں بھی سخت اختلاف محمد بن عبد الوھاب نجدی یا ان کے متبعین کی طرف سے ''تکفیرِ مسلمین میں جلد بازی'' سے ہے، اور یہ اختلاف بھی اگرچہ اجتہادی نوعیت کا ہے، لیکن ہمیں یہ دوسرے اجتہادی اختلافات سے زیادہ سخت محسوس ہوا اور مسلم معاشرہ میں شدید فتنہ وفساد اور تشویش کا باعث معلوم ہوا، اور

ہمارے نزدیک وھابیہ کے خلاف منافرت پھیلنے کا یہ بہت اہم سبب ہے، جس پر کھلے دل اور وسعتِ ظرفی کے ساتھ موجودہ دور کے وھابیہ کو نظرِ ثانی اور غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ملحوظ رہنا بھی ضروری ہے کہ مذکورہ واقعہ میں ''عبدالوہاب نجدی'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جبکہ وھابی تحریک کے اصل ''عبدالوہاب نجدی'' کے بیٹے ''محمد بن عبدالوہاب'' تھے، ممکن ہے کہ بعض حضرات تک ان کا پورا نام نہ پہنچ سکا ہو۔

لیکن اس لفظ کی وجہ سے یہ بحث کرنا کہ مذکورہ حضرات کو محمد بن عبدالوہاب نجدی کا اصل نام بھی معلوم نہ تھا، یا یہ کہ انہوں نے محمد بن عبدالوہاب کے کارناموں کی نسبت ان کے والد کی طرف کردی، یہ بحث زیادہ اہمیت کی حامل معلوم نہ ہوسکی۔

(12)......مولانا رشید احمد گنگوہی کا حوالہ

مشائخِ دیوبند کی ایک مشہور ومستند شخصیت، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی اپنے مختلف فتاویٰ میں اس موضوع پر کلام کیا ہے، ان کے چند حوالہ جات وعبارات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب کے فتاویٰ میں ایک مقام پر ہے کہ:

''اس وقت اور ان اطراف میں وہابی متبعِ سنت اور دیندار کو کہتے ہیں'' (فتاویٰ رشیدیہ مشمولہ ''تالیفاتِ رشیدیہ'' صفحہ ۱۰۹۔ مطبوعہ: ادارۂ اسلامیات، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت گنگوہی کے زمانے اور علاقے میں وہابی دراصل متبعِ سنت اور دین دار شخص کو کہا جاتا تھا، یعنی جو شخص سنت پر عمل کرتا تھا، اور دین پر چلتا تھا، اس کو ''وہابی'' کہا جاتا تھا۔

''فتاویٰ رشیدیہ'' ہی میں ایک اور مقام پر ہے کہ:

''محمد بن عبدالوہاب کو لوگ وہابی کہتے ہیں، وہ اچھا آدمی تھا، سُنا ہے کہ مذہبِ حنبلی

رکھتا تھا اور عامل بالحدیث تھا، بدعت وشرک سے روکتا تھا، مگر تشدید اس کے مزاج میں تھی (فتاویٰ رشیدیہ مشمولہ ''تالیفاتِ رشیدیہ'' صفحہ ۲۴۱و۲۴۲۔ مطبوعہ: ادارۂ اسلامیات، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ محمد بن عبدالوہاب کو ''وہابی'' کہا جاتا ہے، اور یہ اچھے شخص تھے، اور مولانا گنگوہی صاحب نے جو کچھ ان کے متعلق سنا تھا، اس کے مطابق شیخ محمد بن عبدالوہاب، فقہ حنبلی سے تعلق رکھتے تھے، حدیث پر عمل کیا کرتے تھے، اور شرک وبدعت سے روکتے تھے، لیکن ان کے مزاج میں شدت اور سختی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شرک وبدعات سے روکنے میں شدت اور سختی سے کام لیا کرتے تھے، اور یہ بات واقع کے مطابق ہے کہ وہ دوسرے اہلِ علم کے مقابلے میں شرک وبدعات سے روکنے میں شدت وسختی سے کام لیا کرتے تھے، جس کی وجہ دین کی سچی محبت اور دین کا جذبہ ہی تھا، لیکن کسی کے مزاج سے دوسرے کا نہ تو متفق ہونا ضروری ہے، اور نہ ہی اس کا فی نفسہٖ خلافِ شریعت ہونا ضروری ہے، بعض اوقات ایک شخص نہی عن المنکر میں شدت عین مصلحت سمجھ کر کرتا ہے، اور اس پر عنداللہ اجروثواب کا مستحق ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ دوسرے کی نظر میں، بلکہ فی الواقع وہ سختی مصلحت کے موافق نہ ہو، جیسا کہ بعض فقہی واجتہادی اختلاف کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔

''فتاویٰ رشیدیہ'' ہی میں ایک اور موقع پر ہے کہ:

''محمد بن عبدالوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں، ان کے عقائد عمدہ تھے اور مذہب ان کا حنبلی تھا۔ البتہ اُن کے مزاج میں شدت تھی، مگر وہ اور ان کے مقتدی اچھے ہیں، مگر ہاں جو حد سے بڑھ گئے ہیں، اُن میں فساد آ گیا ہے اور عقائد سب کے متحد ہیں، اعمال میں فرق حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کا ہے (فتاویٰ رشیدیہ مشمولہ ''تالیفاتِ رشیدیہ'' صفحہ ۲۴۲۔ مطبوعہ: ادارۂ اسلامیات، لاہور)

مطلب یہ ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین کے مزاج میں شدت تھی، مگر مجموعی طور پر اُن کے عقائد ایسے غلط نہ تھے کہ ان کو کافر یا علی العموم سب کو گمراہ قرار دیا جائے، البتہ

بعض لوگ ان میں حد سے آگے بڑھ گئے تھے اور ان میں فساد آ گیا تھا، تو ان لوگوں کے طرزِ فکر یا طرزِ عمل کو قابلِ نکیر و قابلِ ملامت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اور عقائد سب اہل السنۃ والجماعۃ کے متحد ہیں، اعمال میں فرق حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی ہونے کے اعتبار سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ فتاویٰ جات وعبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے متبعین کے عقائد ومسلک کو عمدہ اور اچھا سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود، محمد بن عبدالوھاب نجدی کے مزاج میں شدت وسختی کے قائل ہیں، نیز محمد بن عبدالوھاب نجدی کے متبعین میں جو لوگ حد سے آگے بڑھ گئے تھے ان میں مولانا گنگوہی فساد کے وجود کے قائل ہیں، اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی کے متبعین میں غالی اور حدود سے متجاوز لوگوں کا موجود ہونا بالکل ممکن ہے، جیسا کہ آج کل حنفیہ کے سلسلہ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے بہت سے لوگ شرک وبدعات کا ارتکاب کرتے ہیں ، لیکن اس کے باجود، وہ اپنے آپ کو پکا حنفی قرار دیتے ہیں، اسی طرح دوسرے سلسلوں میں بھی اس طرح کے لوگوں کا پایا جانا ممکن ہے۔

اس موقعہ پر طرفین سے اسی قسم کی افراط وتفریط سامنے آئی کہ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے متبعین نے تمام وھابیہ کے طرزِ عمل وطرزِ فکر کو ہر طرح سے پاک وصاف اور شریعت کے مطابق ہونے پر زور لگایا اور مخالفین کی طرف سے سامنے آنے والے ہر طرح کے شکوک و شبہات اور اعتراضات والزامات کی تردید کی اور ان کو خلافِ واقعہ قرار دیا۔

اور اس کے برعکس محمد بن عبدالوھاب اور ان کے متبعین کے مخالفوں نے تمام وھابیہ کو ایک لکڑی ہانک کر سب کے خلاف ہر طرح کے الزامات واعتراضات کی نسبت کو روا رکھا، اور یہ سلسلہ بہت سے لوگوں کی طرف سے اب تک جاری ہے، جس پر ان کے مضامین ورسائل اور تحریرات گواہ ہیں۔

ہم اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے مندرجہ بالا موقف کو افراط وتفریط سے ہٹ کر اعتدال پر مبنی سمجھتے ہیں، جس میں طرفین کی افراط وتفریط کی اصلاح کا سامان بھی ہے اور راہِ اعتدال کی نشاندہی بھی، **فجزاھم اللّٰہ تعالیٰ خیر الجزاء۔**

(13)......مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی کا حوالہ

مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دھلوی رحمہ اللہ اور اُن کے فتاویٰ کو بھی غیر منقسم ہندوستان میں خاص اہمیت حاصل تھی، اور ان کو مشائخِ دیوبند کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے، آپ کے بعض فتاویٰ میں بھی اس مسئلہ کے متعلق کلام ملتا ہے۔

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دھلوی رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

> فرقۂ وہابیہ کی ابتداء محمد بن عبدالوہاب نجدی سے ہوئی۔ یہ شخص حنبلی مذہب رکھتے تھے، مزاج میں سختی تھی۔ ان کے خیالات اور اعتقادات کے متعلق مختلف روایات سنی جاتی ہیں، حقیقتِ حال خدا تعالیٰ کو معلوم ہے۔
>
> مگر ہندوستان کے بعض مبتدعین (یعنی اہلِ بدعت) نے تو آج کل متبعِ سنت کا نام وہابی رکھ دیا ہے۔ یہ ان مبتدعین کی اصطلاحِ جدید (یعنی نئی اصطلاح) ہے۔
>
> علمائے دیوبند، یا ان کے ہم خیال علما کو جو شخص وہابی یعنی متبعِ نجدی کہے، وہ خود وہابی یعنی سخت گیری میں متبعِ نجدی ہے، علمائے دیوبند نہایت عمدہ اور پاکیزہ عقیدے والے حضرات ہیں، ان کا مذہب اور عقیدہ وہی ہے جو سلفِ صالحین وتابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کا تھا، ان کو وہابی کہنا گویا صحابہ وتابعین کو وہابی کہنا ہے (کفایۃ المفتی مدلّل، مکمل مع عنوانات، جلد ا صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: جولائی ۲۰۰۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ، شیخ محمد بن عبدالوہاب

نجدی کو حنبلی مذہب کا متبع اور مزاج کا سخت سمجھتے تھے، اوران کو شیخ موصوف کے عقائد وافکار کے متعلق مختلف قسم کی روایات پہنچی تھیں، جس کی بناء پر انہوں نے شیخ موصوف کے عقائد وافکار کے متعلق حتمی فیصلہ نہیں فرمایا، البتہ علمائے دیوبند کے عقائد وافکار سے وہ چونکہ اچھی طرح واقف تھے، اس لیے ان کے متعلق انہوں نے اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہونے کا حتمی فیصلہ فرمایا۔

ایک فتوے میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

آج کل مبتدعین (یعنی اہلِ بدعت) کی اصطلاح (وزبان) میں متبعینِ سنت کو (عداوتاً) وہابی کہا جاتا ہے (ایضاً صفحہ ۲۰۵)

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب موصوف کے زمانے میں اہلِ بدعت کی طرف سے عداوت کے طور پر متبع سنت کو ''وہابی'' کہا جاتا تھا۔

ایک اور فتوے میں مفتی صاحب موصوف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

وہابی اصل میں وہ لوگ تھے، جو محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو تھے، مگر ہندوستان میں یہ لفظ غلط معنیٰ میں استعمال کیا جانے لگا، جو لوگ محمد بن عبدُ الوہاب نجدی کے پیرو (کار) نہیں ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہیں اور بدعتوں سے منع کرتے ہیں، ان کو وہابی کہہ دیا جاتا ہے، اورلوگوں کو ان سے متنفر کرنے کے لئے یہ ایک چلتا ہوا جادو ہے۔ جہاں وہابی کہا بس پھر کیا تھا۔ وہ مردُود وملعون وہابڑا، لہابڑا، سب کچھ ہوگیا ''نعوذ باللہ من ذٰلک'' (ایضاً ص ۲۰۹و۲۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ ''وہابی'' کا لفظ بنیادی طور پر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں کے لیے تھا، لیکن ہندوستان میں یہ لفظ غلط معنیٰ میں استعمال ہونے لگا، اور سنت پر عمل کرنے اور بدعات سے منع کرنے والوں کے لیے، اس لفظ کا نفرت دلانے کے لیے استعمال ہونے لگا۔

نیز کفایۃ المفتی ہی میں سلطان عبدالعزیز کے زمانے میں رونما ہونے والے حالات کے سلسلہ میں ایک سوال وجواب درجِ ذیل طریقہ پر ہے:

سوال......: آج کل سلطان عبدالعزیز ابن سعود سلمہ اللہ نے مکہ مکرمہ کے قبے وغیرہ گرادیئے ہیں، کیا یہ درست ہے؟ اور حدیث میں جو آیا ہے کہ نجد میں زلزلے اور فتنے ہوں گے، اور وہاں ''قرن الشیطان'' ہوگا، وہ کون سا نجد ہے؟

جواب ہوالموفق......: اونچی اونچی قبریں بنانا، قبروں کو پختہ بنانا، قبروں پر گنبد اور قبے اور عمارتیں بنانا، غلاف ڈالنا، چادریں چڑھانا، نذریں ماننا، طواف کرنا، سجدہ کرنا، یہ تمام امور منکراتِ شرعیہ میں داخل ہیں، شریعتِ مقدسہ اسلامیہ نے ان امور سے صراحتاً منع فرمایا ہے، احادیثِ صحیحہ میں اس قسم کے امور کی ممانعت وارد ہے، جو شرک یا مفضی الی الشرک ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارواحنا فداہ نے مرضِ وفات میں آخری وصایا میں نہایت اہتمام سے یہ ارشاد فرمایا:

''لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدًا''

یعنی ''خدا لعنت کرے یہود ونصاریٰ پر، جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا''

اور کتبِ حدیث میں وہ حدیثیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر عمارت (گنبد وقبہ) بنانے اور چراغ جلانے سے منع فرمایا، بکثرت موجود ہیں، فقہ حنفی میں صراحتاً یہ مسئلہ مذکور ہے کہ قبر کو پختہ نہ بنایا جائے، نہ اس پر کوئی عمارت بنائی جائے، اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ مجتہدین سلف صالحین کا طرزِ عمل اسی کے موافق تھا، قرونِ اولیٰ میں اس کی کوئی سند موجود نہیں کہ قبروں پر قبے بنائے جاتے تھے، یا قبروں کی کوئی ایسی تعظیم کی جاتی تھی، جو اَب کچھ زمانے سے

مروج ہے، نذر اور طواف اور سجدہ تو عبادات ہیں، اور غیرُ اللہ کے لیے عبادت کی نیت سے ان افعال کو کرنا تو یقیناً شرک ہے، اور نیتِ عبادت نہ بھی ہو، تاہم حرام ہونے میں کوئی تردد نہیں۔

سلطان ابنِ سعود نے قبے ڈھا دیئے، تو ان کے نزدیک چونکہ قبے بنانا، ناجائز اور منکرِ شرعی تھا، اس لیے انہوں نے بموجبِ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ''**من رأى منكم منكرا** (الحدیث) ''اس کا ازالہ کیا۔

معترضین اگر زیادہ سے زیادہ زور لگا کر بعض متاخرین کے قول سے اس کی اباحت پیش کر دیں، تاہم حدیثِ صریح اور تصریحاتِ سلف کے مقابلے میں اول تو یہ اقوال قابلِ التفات نہ ہوں گے، دوسرے پھر بھی ابنِ سعود کو سب وشتم کرنا اور ہدفِ ملامت بنانا جائز نہیں ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح فرمانا ہے ''**سباب المسلم فسق** (بخاری) ''

نجد یا اس کا کوئی حصہ اگر موضعِ زلازل وفتن ہو، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ''**قرن الشیطان** '' کے نکلنے کی خبر بھی دی تھی، تاہم اس سے یہ استدلال کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ تمام نجدی اس کے مصداق ہیں، تو کیا نجد میں آج تک کوئی صالح، دین دار نہیں ہوا، سب اسی حدیث کے موافق ''**قرن الشیطان** '' میں داخل ہیں؟ معاذ اللہ! جبکہ ایسا نہیں، تو لامحالہ اہلِ نجد کے اعمال واقوال ہی اس امر کے لیے معیار ہوں گے کہ وہ اس حدیث کے اندر داخل ہیں یا نہیں؟ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا نہیں چاہیے کہ ابنِ سعود نجدی ہیں یا یمنی، حجازی ہیں یا شامی، بلکہ ان کے اعمال واقوال وعقائد کو دیکھنا چاہیے، اور اس کے موافق ان کے بارے میں رائے قائم کرنی چاہیے۔

ہمیں جہاں تک معلوم ہوا ہے، ابنِ سعود کے عقائد واعمال میں کوئی ایسی بات نہیں

ہے، جو اِن کو قابلِ مذمت قرار دے، صرف نجدی ہونے سے ان پر ملامت کی بوچھاڑ کرنا اہلِ دین کا کام نہیں۔

واللہ اعلم

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ، مدرسہ امینیہ، دہلی

الجواب صحیح

بندہ احمد سعید واعظ دہلوی

محمد میاں عفی عنہ (مدرس: مدرسہ حسین بخش، دہلی)

شفاعت اللہ عفی عنہ (مدرس: مدرسہ حسین بخش، دہلی)

(کفایت المفتی، ج ۴ص ۸۲، ۸۳، کتاب الجنائز، فصل ہفتم: بناء علی القبور، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے اس تفصیلی فتوے سے معلوم ہوا کہ وہ سلطان عبدالعزیز بن سعود کے عقائد واعمال کو قابلِ مذمت نہیں سمجھتے تھے، اور وہ اہلِ نجد کے قبروں کی بدعات اور ان پر مبنی عمارات کے انہدام کے فعل کو موافقِ شریعت قرار دیتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ سے بھی محمد بن عبدالوھاب نجدی کی تضلیل وتفسیق ثابت نہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب رحمہ اللہ کا مذکورہ آخری فتویٰ، موتمر الاسلامی کے اجلاس میں شرکت کے بعد کا ہے، جب انہوں نے اہلِ نجد سے مذاکرات وملاقات فرمائی، اور اس دورے میں ان کے ساتھ، علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ بھی شریک تھے، جنہوں نے اہلِ نجد کی براہِ راست بعض کتب ملاحظہ کرنے کے بعد اس سے پہلے کے مختلف سنے ہوئے خیالات کے غلط فہمی پر مبنی اور خلافِ واقعہ ہونے کا اظہار فرمایا تھا، اور قابلِ تاویل افعال و اقوال پر تکفیر کے سلسلہ میں اپنے سخت اختلاف کے ہونے کا ذکر فرمایا تھا، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا موقف بھی مبحوث فیہ مسئلہ میں افراط و تفریط سے پاک اور معتدل ہے، جو ان کی مذکورہ تحریرات سے واضح ہے۔

(14)......مولانا خلیل احمد سہارن پوری کا حوالہ

مشائخِ دیوبند کی ایک اور اہم علمی شخصیت، مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ نے بھی ''وہابی'' اور محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے پیروکاروں کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف آراء قائم کی ہیں، اور یہ اختلاف بظاہر ان کی مختلف اوقات میں معلومات کے اختلاف پر مبنی معلوم ہوتا ہے، جس کی ذیل میں کچھ تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

مولانا خلیل احمد سہارن پوری رحمہ اللہ کی مرتب کردہ تالیف ''**المهند على المفند**'' میں ایک سوال کے جواب میں ہے کہ:

> جاننا چاہیے کہ ہم اور ہمارے مشائخ اور ہماری ساری جماعت بحمداللہ، فروعات میں مقلد ہیں، مقتدائے خلق حضرت امام ہمام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ کے، اور اصول واعتقادیات میں پیرو ہیں، امام ابوالحسن اشعری اور امام ابومنصور ماتریدی رحمہما اللہ کے، اور طریقہائے صوفیاء میں ہم کو انتساب حاصل ہے، سلسلۂ عالیہ حضراتِ نقشبندیہ، اور طریقۂ زکیہ مشائخِ چشت، اور سلسلۂ بہیۃ حضرات قادریہ، اور طریقۂ مرضیہ مشائخِ سہروردیہ رحمہم اللہ کے ساتھ۔
>
> دوسری بات یہ کہ ہم دین کے بارے میں کوئی بات ایسی نہیں کہتے، جس پر کوئی دلیل نہ ہو، قرآن مجید کی، یا سنت کی، یا اجماعِ امت، یا قول کسی امام کا، اور بایں ہمہ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ قلم کی غلطی یا زبان کی لغزش میں سہو وخطا سے مبرا ہیں، پس اگر ہمیں ظاہر ہوجاوے کہ فلاں قول میں ہم سے خطا ہوئی، عام ہے کہ اصول میں ہو یا فروع میں، اپنی غلطی سے رجوع کر لینے میں حیا ہم کو مانع نہیں ہوتی، اور

ہم رجوع کا اعلان کردیتے ہیں، چنانچہ ہمارے ائمہ رحمہم اللہ سے ان کے بہتیرے اقوال میں رجوع ثابت ہے، حتّٰی کہ امامِ حرم محترم امام شافعی رحمہ اللہ سے کوئی مسئلہ ایسا منقول نہیں، جس میں دوقول جدید وقدیم نہ ہوں، اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اکثر مسائل میں دوسروں کے قول کے جانب رجوع فرمایا، چنانچہ حدیث کے تتبع کرنے والے پر ظاہر ہے۔

پس اگر کسی عالم کا دعویٰ ہے کہ ہم نے کسی حکمِ شرعی میں غلطی کی ہے، سو اگر وہ مسئلہ اعتقادی ہے، تو اس پر لازم ہے کہ اپنا دعویٰ ثابت کرے، علمائے کلام کی تصریح سے، اور اگر مسئلہ فرعی ہے، تو اپنی بنیاد تعمیر کرے، ائمہٴ مذہب کے راجح قول پر، جب ایسا کرے گا، تو ان شاء اللہ ہماری طرف سے خوبی ہی ظاہر ہوگی، یعنی دل وزبان سے غلطی قبول کریں گے، اور قلب واعضاء سے شکریہ ادا کریں گے۔

تیسری بات یہ کہ ہندوستان میں لفظِ وہابی کا استعمال اس شخص کے لئے تھا، جو ائمہ رحمہم اللہ کی تقلید چھوڑ بیٹھے، پھر ایسی وسعت ہوئی کہ یہ لفظ ان پر بولا جانے لگا، جو سنتِ محمدیہ پر عمل کریں اور بدعاتِ سیئہ ورسومِ قبیحہ کو چھوڑ دیں، یہاں تک ہوا کہ بمبئی اوراس کے نواح میں یہ مشہور ہے کہ جو مولوی ، اولیاء کی قبروں کو سجدہ اور طواف کرنے سے منع کرے، وہ وہابی ہے، بلکہ جو سود کی حرمت ظاہر کرے، وہ بھی وہابی ہے، گو کتنا ہی بڑا مسلمان کیوں نہ ہو، اس کے بعد لفظِ وہابی ایک گالی کا لفظ بن گیا، سو اگر کوئی ہندی شخص کسی کو وہابی کہتا ہے، تو یہ مطلب نہیں کہ اس کا عقیدہ فاسد ہے، بلکہ یہ مقصود ہوتا ہے کہ وہ سنی حنفی ہے، سنت پر عمل کرتا ہے، بدعت سے بچتا ہے، اور معصیت (گناہ) کے ارتکاب میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اور چونکہ ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ احیاءِ سنت میں سعی (یعنی سنت کو زندہ کرنے کی کوشش) کرتے اور بدعت کی آگ بجھانے میں مستعد (وتیار) رہتے تھے، اس لئے

شیطانی لشکر کو ان پر غصہ آیا، اور ان کے کلام میں تحریف کر ڈالی اور ان پر بہتان باندھے، طرح طرح کے افتراء اور خطابِ وہابیت کے ساتھ متہم کیا، مگر حاشا کہ وہ ایسے ہوں، بلکہ بات یہ ہے کہ یہ سنۃُ اللہ ہے کہ جو خواص اولیاء میں ہمیشہ جاری رہی ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں خود ارشاد فرمایا ہے ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنادیے ہیں، جن وانس کے شیاطین، ایک دوسرے کی طرف جھوٹی باتیں ڈالتا رہتا ہے، دھوکے کے لیے، اور (اے محمد) اگر تمہارا رب چاہتا، تو یہ لوگ ایسا کام نہ کرتے، سو چھوڑو! ان کو ان کے افتراء کو'' [1]

پس جب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ معاملہ رہا، تو ضرور ہے کہ ان کے جانشینوں اور ان کے قائم مقاموں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم انبیاء کا گروہ، سب سے زیادہ موردِ بلا ہے، پھر کامل اشباہ، پھر کم اشباہ، تا کہ ان کا حظِ وافر اور اجرِ کامل ہو جائے، پس مبتدعین جو اختراعِ بدعات میں منہمک اور شہوات کی جانب مائل ہیں، اور جنہوں نے خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنایا ہے، اور اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ [2]

ہم پر جھوٹے بہتان باندھے، اور ہمارے جانب گمراہی کی نسبت کرتے رہے

(المہند علی المفند، ص۲۹ تا ۳۳، السوال الاول والثانی، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات، لاہور، تاریخ طبع: اپریل 1984ء)

مولانا خلیل احمد سہارن پوری رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

---

[1] وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ (سورة الانعام، رقم الآية ١١٢)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ وَكَفَى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا (سورة الفرقان، رقم الآية ٣١)

[2] إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ (سورة فاطر، رقم الآية ٦)

پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ مشائخِ دیوبند، فروعات میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے، اور اصول واعتقادات میں ابوالحسن اشعری اور ابومنصور ماتریدی رحمہما اللہ کے پیروکار ہیں، اور صوفیاء میں اُن کو چاروں مشہور سلسلوں سے انتساب حاصل ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جس بات کی، کتابُ اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ امت یا کسی امام کے قول سے تائید ہو، مشائخِ دیوبند وہی بات کہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ قلم کی غلطی یا زبان کی لغزش اور سہو وخطا سے اپنے آپ کو مبرا نہیں سمجھتے، اور اگر اپنے بیان کردہ کسی قول میں ان کو خطا ہونا ظاہر ہو جائے، خواہ وہ قول اصول میں ہو یا فروع میں ہو، تو وہ اس سے رجوع کرنے میں شرم نہیں کرتے، اور اس کے رجوع کا اعلان کر دیتے ہیں، اور اگر ان کی خطا پر کوئی دوسرا شخص ان کو مطلع کرے، تو وہ اس سے ناراض نہیں ہوتے، بلکہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر جب محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق صحیح تحقیق ہوئی، تو اس سلسلے میں ان حضرات نے اپنے سابق موقف سے رجوع فرما لیا، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ہندوستان میں ''وہابی'' کا لفظ بنیادی طور پر غیر مقلد کے لئے وضع تھا، بعد میں اس میں بگاڑ آ گیا، اور شرک وبدعات سے منع کرنے والے اور توحید وسنت پر عمل کرنے والے کو ضد میں ''وہابی'' کہا جانے لگا، لیکن یہ اللہ کی سنت ہے، جو اس کے خاص بندوں میں ہمیشہ جاری رہی ہے کہ شیطان، اُن سے عداوت ودشمنی کی خاطر جھوٹی باتوں کا افتراء کراتا ہے، جھوٹی باتوں کا افتراء کرنے والوں کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈلواتا ہے۔

اور یہ سلسلہ آج بھی شیطان کی طرف سے جاری ہے کہ وہ انبیائے کرام کے اصل پیروکاروں پر جھوٹ وافترا پردازی اور بدگمانی وبدزبانی کا ارتکاب کرا کر ہلاکت کے گڑھے میں پہنچاتا ہے۔

مذکورہ کتاب ہی میں بارہواں سوال محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق ہے، جس میں محمد بن

عبدالوہاب نجدی کے متعلق مذکور ہے کہ وہ مسلمانوں کے خون اوران کے مال اورآبروکو حلال سمجھتا تھا، اورتمام لوگوں کوشرک کی طرف منسوب کیا کرتا تھا، اور سلف کی شان میں گستاخی کیا کرتا تھا، اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟

جس کے جواب میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق، علامہ ابنِ عابدین شامی کی عبارت کی بنا پر حکم بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو: المھند علی المفند، ص۴۵ تا ۴۷، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات، لاہور، تاریخ طبع: اپریل 1984ء)

مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ نے ’’**المھند علی المفند**‘‘ کی تالیف 18 شوال 1325 ہجری میں فرمائی۔

اور اس وقت تک نجدی علماء اور آلِ سعود سے براہِ راست آپ کی ملاقات اوران کی تصانیف سے تعارف نہ ہوا تھا، اور آپ نے مذکورہ حکم محمد بن عبدالوہاب نجدی اوران کے متبعین کے متعلق ایک سائل کے سوال کے جواب میں تحریرفرمایا تھا، اور یہ بات معلوم ہے کہ سائل سوال میں جو کچھ معلوم کرتا ہے، اسی کے مطابق جواب دیا جایا کرتا ہے۔

1319 ہجری، بمطابق 1902 عیسوی، میں دوبارہ آلِ سعود کی نجدی حکومت قائم ہوئی، اور 1345 ہجری بمطابق 1926 عیسوی میں انہوں نے حجاز فتح کیا۔

حجاز میں اہلِ نجد اور آلِ سعود کی دوبارہ حکومت قائم ہونے کے بعد 1345 ہجری میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ نے مدینہ منورہ میں قیام فرمایا، اوراس دوران سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آلِ سعود، اورنجدی عالم اور حنبلی مذہب کے فقیہ، قاضی القضاۃ عبداللہ بن سلیمان بن بلیہد سے براہِ راست تعارف وملاقات ہوئی، اوران کے عقائدوافکار کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع ملا، توپھر مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے سابق سخت رائے سے رجوع فرمایا۔

اس ضمن میں مولانا محمد ثانی حسنی ندوی مظاہری صاحب ’’حیاتِ خلیل‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

حضرت مولانا (خلیل احمد سہارن پوری صاحب) کا جب مدینہ منورہ میں آخری قیام تھا، اس وقت ابنِ سعود (یعنی عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن) کی حکومت تھی، اور حجاز کے قاضیُ القضاۃ ابنِ بلیہد تھے، آپ سے ان کے خاصے تعلقات ہو گئے تھے، اور وہ آپ کا بڑا احترام کرتے تھے، باوجود اختلافِ مسلک کے وہ آپ کے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور تعلق مع اللہ کے بڑے قائل اور معترف تھے، آپ کا قاضی صاحب سے ابتدائی تعلق ایک ایسے مسئلہ سے ہوا، جو مدینہ منورہ میں بڑا اختلافی بنا ہوا تھا، اور حنبلی وحنفی مسلکوں میں ایسا اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ دونوں طبقوں میں بڑی خلیج پیدا ہوگئی تھی، یہ سلطان ابنِ سعود کا ابتدائی زمانہ تھا، وہ جب بھی مدینہ منورہ آتے، تو قاضی ابنِ بلیہد کے ساتھ حرمِ نبوی میں بیٹھتے، ایک مرتبہ حضرت مولانا (خلیل احمد سہارن پوری صاحب) بھی ان دونوں کے قریب بیٹھے تھے، اس زمانے میں نجدی اپنے مسلک میں بہت سخت تھے، جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک کے ساتھ ’’سیدنا‘‘ کہہ دیتا، اس کو نجدی ’’شرک‘‘ کہتے تھے، اس کی وجہ سے بڑا انتشار پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت مولانا نے ابنِ بلیہد اور سلطان کو قریب دیکھا، تو موقع غنیمت جان کر کہا:

آپ لفظ ’’سیدنا‘‘ کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟

قاضی صاحب نے کچھ سکوت کیا، اور پھر بولے کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ ہاں حدیث میں آیا ہے۔

قاضی صاحب نے حیرت سے پوچھا کہاں آیا ہے؟

آپ نے فرمایا ’’أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ‘‘

قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ہاں اس طرح تو آیا ہے، مگر نام مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا۔

حضرت مولانا بولے، اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو ''تعالیٰ'' لگاتے ہیں، کہیں قرآن شریف میں آیا ہے؟

قاضی صاحب نے کہا نہیں، قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا۔

حضرت مولانا نے جواب دیا، کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ استعمال کیا کرو، ایک جگہ حدیث میں آ گیا، کافی ہے۔

سلطان اس مکالمہ کو بغور سن رہے تھے، اب انہوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا، کہیں اس لفظ کی ممانعت آئی ہے؟

قاضی صاحب نے جواب دیا، ممانعت نہیں آئی۔

سلطان نے کہا کہ ایک جگہ آ گیا، اور ممانعت کہیں نہیں آئی، تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے۔

اس سوال وجواب اور سلطان ابنِ سعود کے دخل دینے سے یہ اختلافی مسئلہ حل ہوگیا، اور انتشار وپراگندگی کا ماحول ختم ہوگیا، اور پھر کسی نے کسی کو پریشان نہیں کیا۔ [1]

---

[1] ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو ''سید'' کہنے سے منع فرمایا، اور فرمایا کہ ''سید'' اللہ کا نام ہے۔ اس کے متعلق محدثین نے فرمایا کہ ''سیدِ حقیقی'' تو اللہ ہے، لیکن مجازاً غیرُ اللہ کو بھی بطور سردار کے ''سید'' کہہ دیا جاتا ہے، اور اس کا استعمال شائع ذائع ہے۔ محمد رضوان۔

عن مطرف قال: قال أبي: انطلقت في وفد بني عامر إلى رسول الله –صلى الله عليه وسلم–، فقلنا: أنت سيدنا، فقال: " السيد الله "قلنا: وأفضلنا فضلا، وأعظمنا طولا، فقال: " قولوا بقولكم، أو بعض قولكم، ولا يستجرينكم الشيطان"(سنن ابی داوٗد، رقم الحديث ۴۸۰۶)

قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح(حاشية مسند احمد)

عن محمد بن المنكدر، أخبرنا جابر بن عبد الله رضى الله عنهما، قال: كان عمر يقول: أبو بكر سيدنا، وأعتق سيدنا يعنى بلالا (بخارى، رقم الحديث ۳۷۵۴)

(السيد) حقيقة هو (الله) لا غيره أى هو الذى يحق له السيادة المطلقة فحقيقة السؤدد ليست إلا له إذ الخلق كلهم عبيده .قال الزمخشرى :والسيد فيعل من ساد يسود قلبت واوه ياء لمجامعتها الياء

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس گفتگو کے بعد سلطان ابنِ سعود کے دل میں آپ کی صاف گوئی اور علم وعمل کا نقش بیٹھ گیا، اور عقیدت پیدا ہوگئی۔

ایک بار سلطان نے اپنی قیام گاہ پر تشریف لانے کی دعوت دی، پہلے تو آپ نے عذر کیا، مگر سلطان نے اصرار کیا، تو منظور فرمالیا، اور تشریف لے گئے، اثنائے گفتگو میں سلطان سے فرمایا، مجھے کچھ عرض کرنا ہے، اور وہ یہ کہ:

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ''جمرک'' کے محصول کا جواز آپ کے یہاں کس دلیل سے ہے کہ شریعت تو تمام ''مکوس'' کو ظلم بتاتی ہے''

سلطان نے سکوت کیا، اور پھر جواب دیا کہ:

''حضرت! جواز تو کسی طرح نہیں، مگر مصارفِ سلطنت آخر کس طرح نکلیں، اور حجاز میں تو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں''

حضرت مولانا نے فرمایا:

''بس میرا مطلب حل ہوگیا، اب ملکی معاملات سے مجھے بحث نہیں، نہ میں ان کے سمجھنے کا اہل ہوں''۔

حضرت مولانا کے طویل قیام سے مقامی علماء، حکام اور عام باشندوں کے دلوں میں آپ کی عزت اور علمی مقام کا اعتراف پیدا ہوگیا، سلطان سے لے کر ائمۂ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وسبقها إياها بالسكون اه وقال الراغب :سيد الشيء هو الذى يملك سواده أى شخصه جميعه وقال الدماميني :السيد عند أهل اللغة من أهل للسؤدد وهو التقديم يقال ساد قومه إذا تقدمهم وهذا قاله لما خوطب بما يخاطب به رؤساء القبائل من قولهم أنت سيدنا ومولانا فذكره إذ كان حقه أن يخاطب بالرسول أو النبى فإنها منزلة ليس وراء ها منزلة لأحد من البشر فقال السيد الله حول الأمر فيه إلى الحقيقة أى الذى يملك النواصى ويتولى أمرهم ويسوسهم إنما هو الله ولا يناقضه أنا سيد ولد آدم لأنه إخبار عما أعطى من الشرف على النوع الإنسانى واستعمال السيد فى غير الله شائع ذائع فى الكتاب والسنة قال النووى :والمنهى عنه استعماله على جهة التعاظم لا التعريف واستدل بعضهم بهذا الخبر أن السيد اسما من أسماء الله تعالى(فيض القدير شرح الجامع الصغير،تحت رقم الحديث ۴۸۴۹)

حرم، حکامِ مدینہ، قاضی اور امراء تک سب ہی آپ کی وقعت اور اکرام کرتے تھے، آپ نے اس اکرام واحترام سے فائدہ اٹھا کر بعض ایسے احکام ومعمول بہ مسائل میں تبدیلی کرائی، جن کی وجہ سے غیر حنبلیُ المسلک رکھنے والے خصوصاً حنفی مسلک کے حامل حضرات کو تنگی اور دشواری محسوس ہوتی تھی (حیاتِ خلیل، صفحہ ۲۹۹ تا ۳۰۲، نواں باب ''مدینہ منورہ کا قیام، ہجرت کی نیت'' ناشر: کتب خانہ یحیوی، مظاہر علوم، سہارن پور، انڈیا)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب رحمہ اللہ کو بعد میں اہلِ نجد علماء وحکمرانوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے افکار کو سمجھنے کا موقع حاصل ہو گیا تھا، اور کئی دینی علمی وفقہی مسائل میں ان سے گفتگو بھی ہوئی تھی، اور وہ اہلِ نجد کی طرف سے بعض اقوال وافعال میں تکفیر اور شرک کا حکم لگانے سے اختلاف رکھتے تھے، اور اس زمانے میں حجاج کرام سے لیے جانے والے مخصوص ٹیکس کے متعلق بھی مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ نے براہِ راست، سلطان عبدالعزیز سے استفسار فرمایا تھا، اور اس کے جواب پر بظاہر ان کو اطمینان بھی ہو گیا تھا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ نے ''صفر 1345 ہجری'' میں مدینہ منورہ سے شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی کو جو خط تحریر فرمایا، اس میں انہوں نے درجِ ذیل مضمون تحریر فرمایا:

مکرم! مدفیوضکم۔ السلام علیکم

کل 10 / اگست، یومِ شنبہ کو آپ کا مسرت نامہ (مرقومہ) مورخہ 18 ذیقعدہ ،6 جولائی، پہنچ کر موجبِ طمانیت ہوا، آپ کے اور آپ کے متعلقین کی مژدہ عافیت، موجبِ کمالِ مسرت ہے، جس وقت میں نے آپ کو خط لکھا ہے، اس وقت تک میرے پاس آپ کا کوئی خط نہیں پہنچا تھا، البتہ مدینہ منورہ پہنچ کر آپ کے دو خط پہنچے، ایک خط جس کا جواب لکھ رہا ہوں، دوسرا اس سے پہلے پہنچا تھا،

جس کا جواب لکھ چکا ہوں۔

فی الواقع ہندوستان میں یہاں کے حالات کے متعلق بہت کچھ متضاد خبریں پہنچی ہوں گی، اکثر خبروں کا دارومدار اپنی ذاتی اغراض یا ذاتی خیالات کے اوپر ہے، بعض لوگوں کو بوجہ فسادِ عقیدہ نجدی حکومت سے ناراضگی ہے کہ حکومت کی کتنی بھی بھلائی ہو، مگر ان کی فاسد نظر میں برائی سمجھی جاتی ہے، شیخ فرماتے ہیں:

ہنر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیبے ست

اور بعض لوگ اپنی قلتِ فہم سے اور مسائلِ متعلقہ کی ناواقفیت کی وجہ سے شاکی ہیں، میرے نزدیک کوئی حکومت ایسی نہیں ہوسکتی کہ جس سے تمام خلق راضی ہو، اور سب کی مرضی کے موافق اس کی رفتار ہو، اسی طرح نجدی حکومت کو بھی ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں کسی طرح کا نقصان یا فروگزاشت نہیں، مگر اکثر حالات پر نظر ہونا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ مقابر کے قبہ جات کو، نیز پختہ مقابر ''معلٰی'' اور ''بقیع'' کے منہدم کردیے، مگر میرے خیال میں شرعی حیثیت سے یہ امر امام کے اختیار سے باہر نہیں، اگر وہ کوئی دینی مصلحت سمجھ کر ایسا کرے، تو اس پر کوئی شرعی الزام نہیں، البتہ بعض مشاہد کا انہدام موجبِ اعتراض ہوسکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی کسی نیک نیتی پر مبنی یا کسی شرعی مصلحت کا تقاضا ہو، یا یہ سمجھا جاوے کہ کسی نے اپنی جلبِ منفعت کی وجہ سے اس کو بنایا ہے، تو پھر اس کا بھی بار ہلکا ہوجاتا ہے۔

البتہ بعض ''مکوس وضرائب'' جو حجاج سے لیے جاتے ہیں، وہ شرعی نقطۂ نظر سے حدِ جواز سے خارج ہیں۔

مگر بمقابلہ اس کے جو امن کی حالت، تمام حجاز میں دیکھی جارہی ہے، وہ اس قدر طمانیت بخش ہے کہ جس کو اس سلطنت کا تمغۂ امتیاز کہا جاسکتا ہے، حرمین شریفین کا

راستہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ اس قدر مامون ہے کہ تنہا آدمی ایک اونٹ پر سفر کرسکتا ہے، اور کوئی اس سے تعرض نہیں کرسکتا، امن کی حالت سننے سے متعلق نہیں، بلکہ دیکھنے سے متعلق ہے۔

متعدد جماعات، حرمین میں ہوتی تھیں، حرمِ مکہ میں اس قدر تغیر ہوا ہے کہ اوقاتِ خمسہ میں اول جماعت، نجدی امام کے پیچھے ہوتی ہے، اور دوسرے تین اوقات میں تینوں اماموں کی ایک ایک وقت نماز ہوتی ہے، اور باقی متروک کرادی گئیں۔

مدینہ طیبہ میں متعدد جماعات کی حالت ابھی تک بدستور ہے۔

بہر کیف جہاں تک بلا رورعایت خیال کیا جاتا ہے ''خیر'' غالب ہے۔

میں ابتدائے سفر سے اس وقت تک بحمداللہ نہایت راحت اور آرام سے ہوں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے اس بے انتہا انعام پر کہ مجھ جیسے ناکارہ کو یہاں پہنچا دیا تھا، نہایت شاداں وفرحاں ہوں۔ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل　　　نسیمِ صبح تیری مہربانی

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ وبارک وسلم.

خلیل احمد۔ از مدینہ طیبہ

2/صفر/1345 ہجری۔ چہارشنبہ

(ماہنامہ ''النور'' تھانہ بھون، ص ۲۱ تا ۲۳، ماہ رجب المرجب 1345 ہجری، خط چہارم: از مولانا خلیل احمد صاحب)

مولانا خلیل احمد سہارن پوری رحمہ اللہ کے مذکورہ مکتوب سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد اور آلِ سعود کی آخری مرتبہ قیامِ حکومت کے بعد ہندوستان وغیرہ میں جو متضاد خبریں پہنچتی تھیں، ان میں سے اکثر کا مدار لوگوں کی اپنی ذاتی اغراض یا ذاتی خیالات پر ہوتا تھا، اور بعض لوگوں کے عقیدہ

کے فساد کی وجہ سے بھی نجدی حکومت سے ناراضگی وخفگی پیدا ہوتی تھی، جس کی وجہ سے ان کی نظر نجدی حکومت کی بھلائیوں اور خوبیوں پر نہیں جاتی تھی، کیونکہ کسی سے بغض کا ہونا اس کے محاسن پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

اور بعض لوگوں کی شکایت ان کی قلتِ فہم کی وجہ سے ہوتی تھی، اور قبروں کی عمارات وقبہ جات کا انہدام بھی حکومتِ وقت کے لیے جائز ہے، اور مکوس یا ٹیکس کا حکم پہلے گزر چکا ہے، جس کے متعلق خود سلطان عبدالعزیز سے مولانا سہارن پوری نے سوال کیا تھا۔

بہرحال مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے حکومتِ نجد میں خیر کے غلبہ کو محسوس کیا تھا۔

مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ نے ''12 ربیع الثانی 1345 ہجری'' میں مدینہ منورہ سے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کے نواسے حافظ محمد یعقوب صاحب کو جو خط تحریر فرمایا، اس کے ذیل میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ:

> مولوی...... صاحب کے خط کے ذریعے نجدی حکومت کے متعلق، جو آپ نے دریافت کیا ہے، تو میں جس قدر پہلے سے معتقد تھا، اور اس کی خوبی اور دین داری میری ذہن نشین تھی، اس وقت اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے، کمی نہیں ہوئی۔
>
> میرے خیال میں یہ حکومت اس زمانے کے اعتبار سے نہایت دین دار واقع ہوئی ہے، اور نیک نیتی کے ساتھ کام کررہی ہے، جس قدر بڑے بڑے کام ہوئے ہیں، کوئی بھی میرے نزدیک ایسا نہیں، جس میں دین کا پہلو نہ ہو، اور بعضے امورِ صغار جس میں کچھ فروگزاشت ہورہی ہے، جہاں تک میں غور کرتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے پاس لائق، منتظم، دین دار آدمی نہیں، اسی وجہ سے بعض انتظامات میں کوتاہی ہورہی ہے، اپنی ذات سے سلطان ابنِ سعود، نہایت دین دار، حکیم، متحمل مزاج واقع ہوا ہے، مگر ایک آدمی جب تک کہ اس کے ہاتھ پیر نہ ہوں، کیا کرسکتا ہے۔

امن کی حالت تو یہ ہے کہ ایک ایک دو دو اونٹ، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ اور ینبوع اور جدہ کے درمیان آ جا رہے ہیں، کسی کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، جہاں تک شکایت کا خیال کیا جا رہا ہے، اس کا مبنیٰ ''قبّہ شکنی'' ہے، جس کو جہال نے روافض کے ساتھ مل کر اپنا دین وایمان قرار دے رکھا ہے، میرے نزدیک ان کا انہدام یقیناً واجب ہے، اور حکومت نے بھی علمائے مدینہ سے استفتاء کر کے جب یہاں کے علماء نے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے، اُس وقت انہدام کی جرأت کی ہے۔

مولوی............ صاحب نے جو آپ کو یہ لکھا کہ حکومت سے جو توقعات تھیں، ویسی نہ نکلیں، معلوم نہیں کہ ان کے کانوں میں کیا باتیں پہنچائی گئیں، میری طرف سے مولوی صاحب کو لکھ دیجئے...... کہ میرا جو وہاں خیال تھا، وہ یہاں پہنچ کر اور حالات دیکھ کر میں کچھ زیادہ احسان کی نظر سے حکومت کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ رہا ہوں۔ فقط۔ (ماہنامہ ''النور'' تھانہ بھون، ص۲۳ تا ۲۵، ماہ رجب المرجب 1345 ہجری، خط پنجم: از مولانا خلیل احمد صاحب)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد سہارن پوری رحمہ اللہ نے خود سے جب اہلِ نجد ونجدی حکومت کا مشاہدہ ومعائنہ کیا، اس سے بہت سی سنی سنائی غلط خبروں کی تردید ہوئی اور خوبیوں کا مشاہدہ کیا، اور اس حکومت کا نہایت دِین دار ہونا محسوس کیا، لیکن اس کی وجہ سے جزوی و اجتہادی مسائل میں اختلاف کی نفی لازم نہیں آتی۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، محمد بن عبدالوھاب نجدی سے متعلق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''التصدیقات'' (یعنی المھند علی المفند) کی اس تحریر کے قریباً بیس سال بعد جب آپ (یعنی مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب) نے 1344 ہجری میں حجازِ مقدس کا آخری سفر فرمایا، اور پھر ہجرت کی نیت کر کے مدینہ منورہ ہی میں قیام

فرمالیا، توحسنِ اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا، جبکہ حرمین شریفین پر سلطانِ نجد عبدالعزیز بن سعود کا (گویا شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت کا) قبضہ ہو چکا تھا، اسی زمانہ میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے سلسلہ کے مشہور عالم شیخ عبداللہ بن بلیہد بھی (جو سعودی حکومت کی طرف سے حجازِ مقدس کے قاضی القضاۃ تھے) مدینہ طیبہ میں مقیم تھے، اوران کا مکان اتفاق سے حضرت مولانا کی قیام گاہ سے قریب ہی تھا، ان سے مسلسل ملاقاتوں، گفتگوؤں اوران کے احوال کے مشاہدہ کے بعد شیخ محمد بن عبدالوہاب کی طرف منسوب اس نجدی جماعت کے بارے میں مولانا کی جو رائے قائم ہوئی، وہ انہوں نے اسی زمانہ میں لاہور کے مشہور روز نامہ ''زمیندار'' کے اڈیٹر مولانا ظفرعلی خان کے نام ایک مکتوب میں لکھی تھی، یہ مکتوب اسی زمانہ میں ''زمیندار'' میں شائع ہوا تھا، اوراس کے بعد ''اکابر کے خطوط'' نامی کتاب میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

مولانا (خلیل احمد سہارن پوری) اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''قاضی القضاۃ شیخ عبداللہ بن بلیہد جن کا مکان میرے مکان کے قریب ہی ہے، ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے، اور دینی مسائل میں گفتگو بھی ہوتی ہے، بڑے عالم ہیں، مذہب اہلِ سنت و جماعت رکھتے ہیں، ظاہر حدیث پر جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا طریق ہے، عمل کرتے ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ الاسلام ابن قیم کی کتابوں کو زیادہ محبوب اور پیشِ نظر رکھتے ہیں، ہمارے علماء کے نزدیک بھی یہ دونوں بزرگ بڑے مرتبہ کے عالم ہیں، بدعات اور محدثات سے نہایت متنفر ہیں، توحید و رسالت کو اپنے ایمان کی جڑ قرار دے رکھا ہے، الغرض میں نے جہاں تک خیال کیا، اہلِ سنت کے عقائد سے ذرا بھی انحراف نہیں، اوراکثر اہلِ نجد قرآن شریف پڑھے ہوئے ہیں، کثرت سے حفاظ

ہیں، صلوٰۃ باجماعت کے نہایت پابند ہیں، آج کل مدینہ منورہ میں سخت سردی کا زمانہ ہے، مگر اہلِ نجد صبح کی نماز میں پابندی کے ساتھ آتے ہیں، بہر حال اس قوم کی حالتِ دینی نہایت اطمینان بخش دیکھی ہے۔

(اکابر کے خطوط، ص۱۱،۱۲)

(شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص۴۴ تا ۴۴ ''مقدمہ'' مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب کے مذکورہ مکتوب سے معلوم ہوا کہ وہ اہلِ نجد کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن بلیہد کو مذہبِ اہل السنۃ والجماعۃ کا پیروکار سمجھتے تھے اوران کو امام احمد بن حنبل کی طرح ظاہرِ احادیث پرعمل کرنے والا قرار دیتے تھے اوران کو اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد سے ذرا بھی منحرف نہیں سمجھتے تھے۔

شیخ عبداللہ بن بلیہد سے موتمر اسلامی کے موقع پر علامہ شبیر احمد عثانی رحمہ اللہ کی بھی ملاقات ہوئی تھی، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی طرف سے اہلِ نجد کے عقائدوافکاراوران کے مسلک کے صحیح ہونے کی یہ بہت بڑی شہادت ہے، جو اِن کے مشاہدہ ومعائنہ پرمبنی ہے، ''**ولیس الخبر کالمعاینۃ**''[1]

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ (مسند الإمام أحمد، رقم الحديث ۱۸۴۲)[2]

---

[1] (ليس الخبر كالمعاينة) أى المشاهدة إذ هى تحصيل العلم القطعى وقد جعل الله لعباده أذانا واعية وأبصارا ناظرة ولم يجعل الخبر فى القوة كالنظر بالعيان (فيض القدير شرح الجامع الصغير، تحت رقم الحديث ۷۵۷۴)

[2] قال شعيب الارنوؤط: حديث صحيح، رجاله ثقات رجال الشيخين (حاشية مسند احمد)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی حقیقت کے برابر نہیں ہوسکتی "شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ" (مسند احمد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ:

الشَّاهِدُ يَرٰى مَا لَا يَرَى الْغَائِبُ (مسند الإمام أحمد ، رقم الحديث ٦٢٨) [1]

ترجمہ: موقع پر موجود شخص کی رائے جو حیثیت رکھتی ہے، وہ حیثیت غائب شخص کی رائے نہیں رکھتی (مسند احمد)

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، مولانا خلیل احمد سہارن پوری کے مذکورہ مکتوبات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

حضرت مولانا (خلیل احمد سہارن پوری) کے ان دونوں مکتوبوں کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے 1325 ہجری میں کسی مدنی عالم کے سوال کے جواب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اوران کی جماعت کے بارے میں جو لکھا تھا (جو "التصدیقات" میں شائع ہوا ہے) اس کی بنیاد ذاتی علم وواقفیت پر نہیں تھی، بلکہ سائل کے بیان اور عام شہرت کی بنا پر (جس کی ایک حد تک تائید علامہ شامی کے بیان سے بھی ہوتی ہے) مولانا نے جواب لکھا تھا۔

لیکن اس کے بعد اس جماعت کے خواص علماء اور عوام کو دیکھا، اوران کے عقائد اوراعمال واحوال کا براہِ راست علم اور مشاہدہ ہوا، تو مولانا کی رائے وہ قائم ہوئی، جو مندرجہ بالا دونوں مکتوبوں میں قلم بند فرمائی گئی ہے (شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص ۴۶، ۴۷ "مقدمہ" مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

بہر حال مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ مکتوبات سے معلوم ہوا کہ

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: حسن لغيره (حاشية مسند احمد)

قریب سے مشاہدہ کرنے اور اہلِ نجد اور محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین کے عقائد وافکار کا علم ہو جانے کے بعد ان کو ان سے کوئی ایسا اختلاف نہیں رہا تھا کہ جس کی بناء پر ان کی تکفیر یا تضلیل و تفسیق کی جاسکے، البتہ بعض جزوی وفروعی نوعیت کے مسائل میں اختلاف موجود تھا، لیکن وہ اختلاف اجتہادی وفروعی نوعیت کے مسائل میں تھا، جن میں کسی فریق کی تکفیر یا تضلیل نہیں کی جاتی، اور انہوں نے اپنے زمانے میں اہلِ نجد کی حکومت پر خیر کا غلبہ محسوس کیا تھا۔

مذکورہ عبارات سے مشائخِ دیوبند کے اخلاص واعتدال کی جھلک بھی محسوس کی جاسکتی ہے کہ ان کا کسی سے اختلاف یا اتفاق شریعت کے تابع تھا، اور ان کو کسی سے ذاتی تعصب نہ تھا، اسی وجہ سے وہ دوسروں کے محاسن اور خوبیوں کا اعتراف بھی کرتے تھے، اور جن مسائل میں اختلاف ہو، ان کا اظہار بھی کیا کرتے تھے، اور اسی کے ساتھ وہ اپنی کسی سابق رائے کے خطاء یا مرجوح ظاہر ہونے کے بعد اس سے رجوع میں عار بھی محسوس نہیں فرمایا کرتے تھے، اسی بات کا ذکر مولانا خلیل احمد سہارن پوری رحمہ اللہ نے ''**المهند على المفند**'' کے پہلے سوال کے جواب میں بھی فرمایا ہے، اپنی اسی کتاب میں مذکور اپنی ایک مسئلہ میں رائے سے رجوع کے بعد اس کا عملی نمونہ بھی پیش فرمادیا۔ **فللّٰه الحمد و الشكر**۔

اللہ تعالیٰ ان اسلاف کی اتباع کے مدعی حضرات کو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(15)...... مولانا اشرف علی تھانوی کا حوالہ

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا شمار بھی مشائخِ دیوبند کے چوٹی کے حضرات میں ہوتا ہے، آپ کے فتاویٰ میں ایک سوال وجواب درجِ ذیل طریقے پر ہے:

سوال: جو لوگ اہلِ حدیث ومحمدی کہلاتے ہیں، ان کو جو وہابی کہا جاتا ہے، کیا یہ

لقب، خدا اور سول نے دیا ہے، یا لوگوں نے، اگر خدا اور سول نے نہیں دیا، تو پھر اس لقب کے ساتھ ملقب کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اس لقب کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو شخص مسلک میں ابنِ عبدالوہاب کا تابع یا موافق ہو۔

پس اگر یہ اتباع یا توافق مطابق واقع کے ہو، تو یہ لقب درست ہے، ورنہ کذب اور ''وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ'' کی مخالفت ہے، جیسے وہ لوگ مقلدین کو بدعتی اور مشرک کہتے ہیں (امداد الفتاویٰ مبوب، ج۴، ص۴۹۵، ۴۹۶، مسائلِ شتی، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

مذکورہ سوال وجواب سے معلوم ہوا کہ ''وہابی'' دراصل اس شخص پر صادق آتا ہے، جو محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مسلک کا تابع یا موافق ہو، اور جو ایسا نہ ہو، اس کے لیے اس لقب کا استعمال کذب اور جھوٹ میں داخل ہے، جس کے متعلق آخرت میں باز پرس ہوگی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ مجھ سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ نجدی مقلد ہیں یا غیر مقلد؟ میں نے کہا کہ نہ یہاں کے مقلدوں کی طرح، مقلد ہیں، اور نہ یہاں کے غیر مقلدوں کی طرح، غیر مقلد ہیں، بین بین حالت ہے (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۵، اسعدالابرار، ص۱۳۰، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 1424 ہجری)

اس سے معلوم ہوا کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متبعین، جن کو نجدی کہا جاتا ہے، وہ نہ تو ہندوستان و پاکستان کے مقلدوں کی طرح ہیں، اور نہ یہاں کے غیر مقلدوں کی طرح ہیں، بلکہ ان کے بین بین ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو وہ ائمہ وفقہاء کی تقلید کو شرک وحرام کہتے، اور نہ ہی وہ تقلیدِ شخصی میں سختی کرتے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں کہ:

ایک جماعت، بدعتیوں میں سے ایسی ہے، جو ہم لوگوں کو ''وہابی'' کہتی ہے، لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا، کیونکہ وہابی وہ لوگ ہیں، جو کہ ابنِ عبدالوہاب کی اولاد میں ہیں، اس کے مذہب پر چلتے ہیں، ابنِ عبدالوہاب کے حالات، کتابوں میں لکھے ہیں، ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے کہ وہ نہ مذہب کے اعتبار سے ہمارے بزرگوں میں ہیں، نہ نسبت کے اعتبار سے۔

البتہ آج کل جو لوگ چاروں اماموں میں سے کسی کو نہیں مانتے، ان کو ایک اعتبار سے ''وہابی'' کہنا درست ہوسکتا ہے، کیونکہ ان کے اکثر خیالات ابنِ عبدالوہاب سے ملتے جلتے ہیں، البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہئے، کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ چار امام ہیں، یعنی:

(۱) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۲) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (۳) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (۴) امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ۔

ان اماموں کے مذہب سے باہر ہونا جائز نہیں، بلکہ اپنے ملک میں ان چاروں اماموں میں سے جن کے مذہب کا رواج ہو، اسی کا تابع رہنا واجب ہے، تو چونکہ ہندوستان میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کا رواج ہے، اس لئے ہم اِن ہی کے مذہب پر چلتے ہیں، تو پھر ہم وہابی کیسے ہوسکتے ہیں؟

اور اگر اس پر بھی ہمیں وہابی کہا جائے، تو ہم لوگ اس سے برا نہیں مانتے، لیکن اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان لگانے کی تم کو سزا ملے گی۔

آج کل کے فقیروں نے جو بدعتیں کر رکھی ہیں، میں ایک ایک کر کے تمہیں بتلاتا، مگر وقت میں گنجائش نہیں، اور عالموں نے پوری طرح کتابوں میں لکھ دیں، انہیں پڑھوا کر سن لینا۔

البتہ ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن، حدیث، فقہ میں سے، کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو، اس کو ثواب کا کام سمجھ کر کیا جاوے، وہ بدعت ہے۔

اس کی پہچان کے بعد دیکھ لیجیے کہ ہمارے بھائیوں کے جو کام ہیں، جیسے عرس کرنا، فاتحہ دلانا اور مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے دن مقرر کرنا، یہ قرآن، حدیث، فقہ کسی سے ثابت نہیں، لیکن پھر بھی ان کو دین کی بات سمجھ کر کرتے ہیں، اگرچہ سمجھدار آدمیوں کا عقیدہ، ان مسئلوں میں خراب نہیں، لیکن ان کے کرنے سے عوام کا عقیدہ تو خراب ہوجاتا ہے (تسہیل المواعظ، جلد اول، صفحہ ۲۶۴، ۲۶۵، نام وعظ ''کجی کی درستگی'' مطبوعہ: وقار پبلشرز، اردو بازار، لاہور)

مذکورہ عبارت میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی نہ تو تکفیر کی، اور نہ ہی تفسیق و تضلیل کی، البتہ یہ بتلا دیا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، نسب اور اتباع کی رُو سے ان کے بزرگوں میں داخل نہیں۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی سے مشائخِ دیوبند و بزرگوں کا نسبی تعلق نہیں، اور اسی طرح مشائخِ دیوبند کا تعلق فقہاء وصوفیاء کے جس طبقے سے ہے، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ان سے تعلق نہیں، کیونکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا تعلق فقہ حنبلی سے ہے، اور وہ صوفیائے کرام کے اشغال واذکار کے مقابلے میں مسنون اشغال واذکار کو ترجیح دیتے ہیں، اور شدِ رحال، توسل بالانبیاء والصلحاء وغیرہ کے مسائل میں علامہ ابنِ تیمیہ اور علامہ ابنِ قیم کے پیروکار ہیں۔

البتہ اس زمانے میں ہندوستان میں ترکِ تقلید کے حامل حضرات کے متعدد خیالات مثلاً شدِ رحال اور توسل بالانبیاء وغیرہ کے مسائل میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی سے ملتے تھے، اس بنا پر ان کو ایک اعتبار سے ''وہابی'' کہنا درست ہوسکتا ہے، لیکن ہر اعتبار سے وہ بھی ''وہابی''

نہیں، کیونکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب کے پیروکار ہیں، جبکہ غیر مقلدین حضرات، نہ تو امام احمد کے مقلد ہیں، اور نہ ہی امام ابوحنیفہ یا امام شافعی یا امام مالک کے مقلد ہیں، بلکہ وہ عام طور پر ائمہ وفقہاء کی تقلید کے مخالف ہیں، اور محمد بن عبد الوھاب نجدی کے مکتوبات کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ وہ ائمہ وفقہاء کے مقلدین کی تقلید کی حیثیت سے مخالفت نہیں کرتے۔

اس تفصیل کی روشنی میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت انصاف پسندوں کے لیے بالکل واضح ہے، لیکن متعصبین یا معاندین بلاوجہ اور دور دراز کی تاویلات کر کے افراط یا تفریط پیدا کرتے اور اس سے اپنا غلط مطلب نکالنے کی بے جا کوشش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ افراط وتفریط اور تعصب وتحزّب سے بچ کر اعتدال کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(16)......علامہ ظفر احمد عثمانی کا حوالہ

اہلِ نجد اور نجدی حکومت کے جس طرزِ عمل پر زیادہ شورش برپا کی گئی، وہ عماراتِ مقابر اور قبروں پر بنائے گئے قبوں اور گنبدوں کا انہدام تھا۔

مشائخِ دیوبند کے سلسلہ کی ایک علمی اور عظیم شخصیت علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کا ایک رسالہ ''النفع البرزۃ فی تحقیق قطع الشجرۃ'' کے نام سے ہے، جو امداد الاحکام کی چوتھی جلد میں شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب نے اہلِ نجد کے غیر ضروری مآثر ومزارات اور قبوں کو منہدم کرنے پر اہلِ نجد کے موقف کو درست اور اہلُ السنۃ والجماعۃ کے موافق قرار دیا ہے، اور اس کے خلاف موقف کی تردید کی ہے۔

چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب اپنے رسالے میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

نافع کے اس اثر کو (جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مخصوص درخت کی تعظیم

کرنے کی وجہ سے اس کے کٹوا دینے کا ذکر ہے) محض نجدیہ اور سردارانِ نجدیہ ہی نہیں پیش کرتے، بلکہ جملہ مذاہبِ اربعہ کے علماء اور محدثین نے اس کو پیش کیا، اور نقل کیا ہے، اور صحیح مانا ہے.............پس اگر اس اثر کو بیان کرنا اور اس کو صحیح ماننا اور اس کو استدلال میں پیش کرنا الحاد اور جہل ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناپاک اتہام لگانا اور ان کے دامنِ عدل پر دھبہ لگانا ہے، تو اس کے مجرم صرف جماعتِ نجدیہ یا سردارانِ نجدیہ ہی نہیں، بلکہ ایک طرف سے تمام اہلِ سنت والجماعت اور جملہ مذاہبِ اربعہ اس جرم کے مرتکب ہوں گے، نعوذ باللہ منہ (امداد الاحکام، ج۴، ص۵۳۹، ۵۴۰، ملخصاً، کتاب الحظر والاباحة، متفرقات، رسالہ "النفع البرزة فی تحقیق قطع الشجرة" مطبوعہ: دارالعلوم کراچی، طبع اول ۱۴۲۱ھ)

علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب، آگے چل کر اسی رسالے میں فرماتے ہیں کہ:

اہلِ نجد اپنے کو حنبلی کہتے ہیں، اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی حنفیہ کی طرح منقطع حجت ہے، ملاحظہ ہو "اعلام الموقعین لابن القیم ج ۱ ص ۸۱"۔

اور پاسدارانِ نجدیہ کے نزدیک منقطع ضعیف ہے، تو مطلقاً ضعیف نہیں، بلکہ وہ منقطع ضعیف ہے، جس کا ارسال کرنے والا ثقہ وغیر ثقہ ہر ایک سے ارسال کرتا ہو، اور اگر ارسال کرنے والا صرف ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہو، یا وہ امام متفق علیہ ہو، تو اس کا ارسال وانقطاع محدثین کے یہاں مقبول ہے، یہی وجہ ہے کہ "بلاغات مالک" ان کے نزدیک صحیح ہیں، اور بخاری کی تعلیقاتِ مجزومہ بھی بحکمِ موصول صحیح ہیں، اور اصولِ حدیث میں پاسدارانِ نجدیہ محدثین ہی کے متبع ہیں، اب دیکھنا چاہیے کہ نافع کا ارسال کس قسم میں داخل ہے؟ تو ظاہر ہے کہ نافع متفق امام وثقہ ہیں، جب کوئی وجہ نہیں کہ مالک کا بلاغ حجت ہو، اور نافع کا بلاغ وارسال حجت نہ ہو، حالانکہ امام مالک نے جس سند کو اصح الاسانید کہا ہے، وہ نافع

کے واسطہ سے ہے، اور دوسرے نافع کا صحیح الروایۃ ہونا اور ان کی روایت میں خطا نہ ہونا بھی ایک مسلم امر ہے" ملاحظہ ہو: تہذیب التہذیب، ج ۱۰ ص ۴۱۴"

وقال الخليلي نافع من ائمة التابعين بالمدينة، امام فى العلم، متفق عليه، صحيح الرواية ، ولايعرف له الخطاء فى جميع ما رواه . اهـ، ملخصاً.

اس تصریح کے بعد نافع کے ارسال وانقطاع کے مقبول ہونے میں کیا کلام ہے، حیرت ہے کہ احمد بن حنبل اور بخاری اور مالک وغیرہ کسی بات کو جزم کے ساتھ بلاغاً یا تعلیقاً بلاسند بیان کریں، تو ان کا نام جزم وحجت ہو اور نافع جیسے امام التابعین متفق علیہ، ثقہ، صحیح الروایۃ کا جزم حجت نہ ہو، اس کو کوئی محدث تسلیم نہ کرے گا، علاوہ ازیں جن پاسدارانِ نجدیہ نے مقابر وقبب کے قابلِ انہدام ہونے کی تائید میں نافع کا یہ اثر پیش کیا ہے، ان کا مدعیٰ صرف اسی پر موقوف نہیں، بلکہ اس کو تو محض تائید کے درجہ میں وہ پیش کرتے ہیں، اور منقطع سے تائید کرنا اتفاقاً سب کے نزدیک درست ہے، اور ان کا اصل مدعا احادیثِ مرفوعہ صحیحہ سے ثابت ہے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف قبروں کے پختہ کرنے اور ان پر عمارت بنانے اور چراغاں کرنے سے منع فرمایا ہے، پس اگر مضمون نگار کو ہمت ہے، تو ان احادیث کا جواب دے کر اپنی مبتدع جماعت کی دستگیری کرے، محض اثرِ نافع کی تردید میں اتنا زور کیوں دکھلایا جاتا ہے، جس سے پاسدارانِ نجدیہ اتنا کہہ سکتے ہیں، اور پھر سبکدوش ہوسکتے ہیں کہ اس کو تو ہم نے محض تائید میں بیان کیا ہے، اور ہمارا اصل اعتماد احادیثِ مرفوعہ صحیحہ پر ہے (امداد الاحکام، ج ۴، ص ۵۵۰، ۵۵۱، کتاب المتفرقات، رسالہ "النفع البرزۃ فی تحقیق قطع الشجرۃ" مطبوعہ: دارالعلوم کراچی، طبعِ اول ۱۴۲۱ھ)

اور اپنے اسی رسالے میں علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

اس کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ ضروری آثار کا باقی رکھنا بھی جائز نہیں، یا ان کی زیارت ممنوع ہے، اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرقۂ نجدیہ یا پاسدارانِ نجدیہ کا یہ گمان ہے کہ وہ تمام آثارِ نبویہ کو مٹایا کرتے تھے، بلکہ ان کا دعویٰ (ملاحظہ ہو، اقتضاء الصراط المستقیم، لابن تیمیہ، ص ۱۸۵، ۱۸۶، جس میں بہت تفصیل کے ساتھ اس بحث کو بیان کیا گیا ہے) صرف اس قدر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضروری آثار کو باقی رکھتے تھے، اور غیر ضروری کو مٹا دیا کرتے تھے، جبکہ ان کے ساتھ ضروری آثار جیسا معاملہ کیا جاتا (امدادالاحکام، ج ۴، ص ۵۵۴، کتاب المتفرقات، رسالہ "النفع البرزة فی تحقیق قطع الشجرة" مطبوعہ: دارالعلوم کراچی، طبع اول ۱۴۲۱ھ)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کو اگرچہ بعض دوسرے فروعی و فقہی مسائل میں اہلِ نجد سے اختلاف ہو، لیکن انہدامِ قبب اور غیر ضروری آثار کے محو کرنے سے ان کو اہلِ نجد سے اختلاف نہ تھا۔

اس سے مشائخِ دیوبند کی للّٰہیت، اخلاص اور اعتدال کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا کسی سے اختلاف یا اتفاق، شریعت کے تابع تھا، اور ان کو کسی کی ذات سے بغض وعناد نہ تھا، جیسا کہ آج کل بہت سے لوگوں کا وطیرہ ہوگیا ہے کہ دوسرے سے کسی مسئلہ میں اختلاف ہونے کے بعد اس کی دیگر صحیح باتوں کی بھی تردید شروع کردیتے ہیں، اور بے جا تعصب وتحزّب کا شکار ہوکر اپنے آپ اور اپنے سلسلہ کی ہر فکر کو دوسرے کے مقابلہ میں صحیح سمجھنے اور دوسرے کی فکر کو غلط قرار دینے اور دوسرے کو اس کا مکلّف قرار دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس تعصب وتحزّب اور ضد وعناد سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

(17)......علامہ شبیر احمد عثمانی کا حوالہ

مشائخِ دیوبند میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا نام اور مقام واضح ہے، جس کو بیان کرنے کی

ضرورت نہیں۔

سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمان کے زمانے میں جب مؤتمر عالمِ اسلامی کا مکہ مکرمہ میں اجلاس ہوا، اس میں وہ بھی شریک ہوئے، اور انہوں نے اہلِ نجد کے سامنے اپنے موقف کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے ''مؤتمر عالمِ اسلامی، مکہ مکرمہ'' میں جو تقریریں اور گفتگوئیں کی ہیں، ان کو اپنے ہاتھ سے ایک ڈائری (روزنامچے) میں درج کیا ہے، یہ ڈائری علامہ عثمانی کے چھوٹے بھائی بابو فضلِ حق فضلی کے واسطہ سے کراچی میں 19 نومبر 1951 عیسوی کو پروفیسر محمد انوار الحسن صاحب شیر کوٹی کو حاصل ہوئی، جس کے اندراجات کو پروفیسر موصوف نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''انوارِ عثمانی، مکتوبات: شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی'' میں نقل کیا ہے۔

اس میں 25 ذوالقعدۃ 1344 ہجری کی تقریر کے حوالہ سے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ہمارے اور آپ (یعنی اہلِ نجد) کے درمیان اگر نزاع ہو، تو خدا کے فضل سے ایک مسلّم حکم (جج) موجود ہے، اور وہ کتابُ اللہ اور سنتِ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، تعاملِ سلف صالحین، اقوالِ ائمۂ مجتہدین ہیں۔
>
> آپ (یعنی سلطان ابنِ سعود) کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے آپ کی نسبت یعنی شعبِ نجدیین کے متعلق ہندوستان میں بہت سے خیالات تھے، اگرچہ ہم ہمیشہ سے حافظ ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، ان سے مستفید بھی ہوئے ہیں، اور بعض تفردات وغیرہ میں ان پر انتقاد بھی کرتے رہے ہیں، لیکن خاص طائفۂ نجدیہ کے معتقدات کا حال ہم کو محقق نہ تھا، چند روز ہوئے ہم نے دو کتابیں آپ کی پڑھیں ''الھدیۃ السنیۃ'' اور ''مجموعۃ

التوحید ''ان کے مطالعہ سے بہت چیزیں جو آپ کی طرف منسوب ہو رہی تھیں، ان کا افتراء ہونا ثابت ہوا۔ [1]

پھر بھی چند مسائل میں اختلاف رہا، بعض اختلافات چنداں وقیع اور اہم نہیں، جیسا کہ مسئلۂ شفاعت میں۔

بعض میں قریب اختلاف لفظی کے ہے، ہاں سخت اختلاف ان لوگوں کی تکفیر میں ہے، جو قبر کو سجدہ کرتے ہیں، یا چراغ جلاتے ہیں، یا غلاف چڑھاتے ہیں، ہم ان امور کو بدعت اور منکر سمجھتے ہیں، اور ہمیشہ مبتدعین سے جہاد بالقلم واللسان کرتے ہیں، لیکن عبادُ الاوثان اور یہود ونصاریٰ کی طرح مباحُ الدم والمال نہیں سمجھتے، جس کا ذکر میں پہلی ملاقات میں آپ سے تفصیلاً کر چکا ہوں، اور آئندہ اگر وقت نے مساعدت کی، اور خدا نے توفیق بخشی، تو شیخ عبداللہ بن بلیہد وغیرہ سے اس پر مفصل کلام کیا جائے گا (انوارِ عثمانی، ص۹۳، ۹۴، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435 ہجری، بمطابق اکتوبر 2013 عیسوی)

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ اہلِ نجد کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے ہندوستان میں ان کے متعلق بہت سے خیالات تھے، جس کی وجہ سے ان کے اصل معتقدات کا حال ان حضرات پر محقق نہ ہوا تھا، لیکن شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین کی چند کتب ملاحظہ کرنے کے بعد ثابت ہوا کہ اہلِ نجد کی طرف جو بہت سی باتیں منسوب تھیں، وہ جھوٹ اور بہتان پر مبنی تھیں۔

اور جن مسائل میں ان سے اختلاف رہا، وہ زیادہ اہم نہیں تھے، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] ملحوظ رہے کہ ''الهدية السنية ''کتاب کا پورا نام ''الهدية السنية والتحفة الوهابية النجدية'' ہے، جس کے مؤلف سلیمان بن سحمان النجدی ہیں، یہ کتاب سلطان عبدالعزیز آلِ سعود کے حکم سے پہلی مرتبہ 1342 ہجری میں شائع ہوئی تھی، اس کتاب کے چند حوالہ جات پیچھے گزر چکے ہیں، 1344 ہجری میں مؤتمر عالمِ اسلامی کا مندرجہ بالا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اور ''مجموعة التوحيد ''دراصل ''محمد بن عبدالوہاب نجدی'' کے چند رسائل کا مجموعہ ہے، جو ''مجموعة رسائل في التوحيد والإيمان'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ محمد رضوان۔

قبر پر شفاعت کے سوال کا مسئلہ بھی ہے، اور بعض مسائل میں صرف لفظی اختلاف ثابت ہوا۔
البتہ قبر پر کی جانے والی چند ایسی چیزیں، جن میں تاویل ہوسکتی ہے، اور وہ تاویل کے بعد سخت بدعات ومنکرات میں داخل ہیں، اہلِ نجد کی طرف سے ان کی بناء پر مسلمانوں کی تکفیر میں سخت اختلاف رہا، جو اگرچہ اجتہادی نوعیت کا ہو، اور اہلِ نجد ظاہری وصوری شرک میں تاویل کے قائل نہ ہوں، لیکن اس قسم کے امور میں مسلمان کی تکفیر سے متعلق تاویل کی گنجائش ہونے کے باوجود، تاویل نہ کرنے اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کے اعتبار سے بہرحال یہ سخت اختلاف تھا، جو دلائل کے علاوہ معاشرے میں عظیم فتنے کا بھی باعث تھا۔

مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ''ملفوظات'' میں علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> تقلید پر جب گفتگو ہوئی، تو میں نے کہا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہم امام احمد کے مقلد ہیں، الَّا یہ کہ کوئی حدیث صریح، صحیح، غیر منسوخ، غیر مخصص اور غیر معارض لاقوی منہ، قولِ امام کے خلاف ہو، تو اس کی وجہ سے قولِ امام کو ترک کردیں گے، لیکن پھر بھی ائمہ اربعہ کے دائرے میں اس سے نہ نکلیں گے، اس لیے ہم نے ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم کے تفردات کو اختیار نہیں کیا، متعدد مسائل میں، مثلاً ''طلاقِ ثلاث مجلسِ واحد'' وغیرہ میں، میں نے کہا کہ بالکل یہی طریقِ تقلید ہم احنافِ ہندوستان کا بھی ہے، پھر ہم کو مشرک کیوں سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے مقابلے میں ہندوستان کے غیر مقلدوں کو کیوں اچھا سمجھا جاتا ہے (ملفوظات محدث کشمیری، صفحہ۱۶۲، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ربیع الاول 1431ھ)

ائمہ کرام کی تقلید اور شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے امام احمد بن حنبل کا مقلد ہونے اور دیگر ائمہ کی تقلید پر نکیر نہ کرنے کے حوالہ سے خود شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کی تصریحات پہلے گزر چکی ہیں، لہٰذا جو وھابیہ، ائمہ کرام کی تقلید پر نکیر کرتے تھے، وہ اس مسئلہ میں خود ہی شیخ محمد

بن عبدالوھاب نجدی کے مخالف ہوئے۔

جہاں تک ائمہ مجتہدین کی تقلید کا معاملہ ہے، تو اس میں بھی افراط وتفریط مذموم ہے، نہ تو اس میں اتنی آزادی ہونی چاہئے کہ کسی طرح کی کوئی پابندی ہی نہ رہے، اور نہ اتنا جمود ہونا چاہئے کہ دوسرے قول کے دلیل کے ذریعہ راجح وصواب ظاہر ہوجانے، یا دوسرے قول پر عمل کی ضرورت پیش آجانے کے بعد اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا جائے، مشائخِ دیوبند کا بنیادی ذوق یہی تھا، اگرچہ بعد کے بعض حضرات اس سلسلہ میں غیر ضروری جمود کی روش پر کاربند رہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ، تقلید واجتہاد کے معاملہ میں مسلکِ دیوبند کے اعتدال اور وسعت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> پس نہ وہ (یعنی علمائے دیوبند) کورانہ اور غیر محققانہ تقلید کا شکار ہیں، اور نہ برخود غلط ادّعائے اجتہاد کے وہم میں گرفتار، اس لیے ایک طرف تو وہ خود رائی اور آزادئ نفس سے بچنے کی خاطر نصوصِ کتاب وسنت تو بجائے خود ہیں، اقوالِ سلف اور ذوقِ سلف تک کا پابند رہنا ضروری سمجھتے ہیں، اور دوسری طرف بے بصیرتی اور کور ذہنی سے بچنے کی خاطر افتاء اور فتاویٰ کو ان کے اصل ماخذوں سے نکلتا ہوا دیکھنے اور حسبِ ضرورت کسی متماثل جزئی پر پیش آمدہ جزئیات کو قیاس کرکے فقہی حکم لگانے سے بھی بے تعلق رہنا نہیں چاہتے۔
>
> غرض نہ تو وہ مجتہدین فی الدین کے بعد اجتہادِ مطلق کے قائل ہیں، جبکہ عملاً اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا ہے، اور نہ ہی جنسِ اجتہاد کی کلی نفی کرکے فتاویٰ کے حقائق و علل کے استخراج اور ان کے مؤیدات کے استنباط یا متماثل جزئیات سے جزئیاتِ وقت کے استخراج سے گریزاں ہیں، بلکہ تقلید کے ساتھ تحقیق کا ملا جلا رنگ لیے ہوئے ہیں (علمائے دیوبند کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج، ص۱۴۳و۱۴۴، بعنوان: فقہ

اورفقہاء، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، باراول، ذوالقعدہ 1408ھ، جولائی 1988ء)

نیز حضرت قاری صاحب موصوف رحمہ اللہ آگے اس سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس مسلک پر ائمہ اجتہاد کی محبت وعظمت کے حقوق کی ادائیگی یہ نہیں ہے کہ اپنے اجتہادی مذہب کی فوقیت ظاہر کر کے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اس کی تبلیغ و اشاعت کی فکر کی جائے، یا اپنے مذہب کی تائید کے لیے دوسرے مذاہب فقہیہ کے ردّ وابطال میں زور صرف کیا جائے، یا دوسرے ائمہ اجتہاد اور سلفِ صالحین کی شان میں گستاخی، سوءِ ادب اوران کی فرعیات کے ساتھ تمسخر واستہزاء سے دنیا وآخرت تباہ کی جائے، جبکہ ان میں سے ایک صورت بھی ترجیح یا تقویتِ مذہب کی نہیں، ابطالِ مذہب کی ہے، اور یا پھر غرورِ علم کی ہے کہ بزعمِ خود اپنے ہی مذہب میں حق کو منحصر سمجھ لیا جائے، جو بلا شبہ افراط وتفریط ہے، جس سے مسلک علماء دیوبند بالکل الگ ہے (علمائے دیوبند کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج، ص ۱۴۵، بعنوان: فقہ اور فقہاء، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، باراول، ذوالقعدہ 1408ھ، جولائی 1988ء)

اس کی مزید تفصیل آگے مولانا حسین احمد مدنی صاحب کے حوالے کے ذیل میں آتی ہے۔

بہر حال علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا مکتوبات وحوالہ جات سے بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے بھی اہلِ نجد کے متعلق معتدل موقف اختیار فرمایا ہے، اور انہوں نے اس سلسلہ میں پہلے سنی ہوئی باتوں سے رجوع کیا، اور ساتھ ہی بہت سے فروعی وفقہی مسائل میں اختلاف کو غیر اہم قرار دیا، لیکن تکفیر مسلمین کے معاملہ میں آپ نے سخت اختلاف کا اظہار فرمایا، جو اس زمانے میں دوسرے لوگوں کے اہلِ نجد سے سخت تنفر اور تشویش کا باعث بنا تھا۔

(18)......علامہ انور شاہ کشمیری کا حوالہ

مشائخِ دیوبند میں علمی اعتبار سے علامہ انور شاہ کشمیری کا نام ومقام بھی انتہائی نمایاں ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے فیض الباری میں شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے طرزِ فکر پر کچھ تنقید فرمائی ہے، جس پر بعض لوگوں کی طرف سے طرح طرح کے شکوک وشبہات کیے جاتے ہیں، اس لیے اس سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے موقف کی تشریح وتوضیح ضروری ہے، جس کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری (المتوفیٰ: 1353 ہجری، بمطابق 1934 عیسوی) نے ''صحیح البخاری'' کی شرح ''فیضُ الباری'' میں فرمایا کہ:

والبدعة عندى ما لا تكون مستندة إلى الشرع، وتكون ملتبسة بالدين، ولذا يقال إن الرسوم التى جرت فى المصائب بدعة دون التى فى مواضع السرور، كالأنكحة وغيرها فإن الأولى تعد كأنها من الدين فتلتبس به بخلاف الثانية .والسر فيه أن رسوم المسرات أكثرها تكون من باب اللهو واللعب فلا تلتبس بالدين عند سليم الفطرة، بخلاف رسوم نحو الموت فإن غالبها يكون من جنس العبادات فيتحقق فيها الالتباس.

فائدة :وفى محق الرسومات كتاب للشاه إسماعيل رحمه الله تعالى سماه :إيضاح الحق الصريح وهو أجود من كتابه تقوية الإيمان فإنه يحتوى على مضامين علمية، وكتابه تقوية الإيمان فيه شدة فقل نفعه، حتى إن بعض الجهلة رموه بالكفر من أجل هذا الكتاب .

قلت وجميع ما فيه موجود فى كتاب الاعتصام للشاطبى رحمه الله تعالى .والله الهادى إلى الصواب.

أما محمد بن عبد الوهاب النجدى فإنه كان رجلا بليدا قليل

العلم، فكان يتسارع إلى الحكم بالكفر ولا ينبغي أن يقتحم فى هذا الوادى إلا من يكون متيقظا متقنا عارفا بوجوه الكفر وأسبابه(فيض البارى على صحيح البخارى، ج ١، ص ٢٥٢، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة)

ترجمہ: اور میرے نزدیک بدعت وہ ہے، جس کی شریعت سے کوئی دلیل نہ پائی جائے، اور وہ دین کے ساتھ ملتبس ہو، اور اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ مصائب کے وقت جو رسوم جاری ہیں، وہ بدعت ہیں، اور خوشی کے مواقع پر جو رسوم جاری ہیں، وہ بدعت نہیں، جیسا کہ نکاح وغیرہ کے موقع پر، کیونکہ پہلی قسم کی رسوم کو دین کا حصہ شمار کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ دین کے ساتھ ملتبس ہو جاتی ہیں، برخلاف دوسری قسم کی رسوم کے (کہ ان کو دین کا حصہ شمار نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے وہ دین کے ساتھ ملتبس نہیں ہوتیں) اور اس میں راز یہ ہے کہ خوشی کے مواقع کی اکثر رسوم لہو ولعب کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ سلیم الفطرت کے نزدیک، دین کے ساتھ ملتبس نہیں ہوتیں، بخلاف موت وغیرہ کی رسوم کے، کیونکہ ان میں غالب عبادات کی جنس سے تعلق رکھتی ہیں، جس کی وجہ سے ان میں (دین کے ساتھ) التباس متحقق ہو جاتا ہے۔

فائدہ: اور رسومات کے ابطال میں حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک کتاب ہے، جس کا نام انہوں نے ''ایضاحُ الحق الصریح'' رکھا ہے، اور یہ کتاب ان کی دوسری کتاب، جس کا نام ''تقویۃُ الایمان'' ہے، اس کتاب سے زیادہ عمدہ ہے، کیونکہ ''ایضاحُ الحق الصریح'' علمی مضامین پر محیط ہے، اور ''تقویۃُ الایمان'' میں کچھ شدت ہے، جس کی وجہ سے اس کا (علمی اعتبار سے) نفع کم ہوا، یہاں تک کہ بعض جہلاء نے تو حضرت شاہ اسماعیل شہید پر اس ''

تقوية الایمان ‘‘کتاب کی وجہ سے کفر کا فتویٰ لگا دیا۔

میں کہتا ہوں کہ اس قسم کی تمام چیزیں، علامہ شاطبی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ’’کتاب الاعتصام‘‘ میں موجود ہیں، واللہ الھادی الی الصواب۔

جہاں تک محمد بن عبدالوہاب نجدی کا تعلق ہے، تو وہ کچھ کم فہم اور قلیل العلم شخص تھے، جس کی بنا پر وہ کفر کا حکم لگانے میں جلد بازی اختیار کرتے تھے، اور اس وادی میں قدم رکھنا اسی شخص کے لیے مناسب ہے، جو نہایت بیدار مغز اور متقن اور کفر کی صورتوں اور اس کے اسباب کو اچھی طرح پہچانتا ہو (فیض الباری)

فائدہ: فیض الباری کی مذکورہ عبارت میں سب سے پہلے تو علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے بدعت اور رسم کے درمیان جو فرق بیان فرمایا، وہ نہایت محققانہ اور فقیہانہ فرق ہے، جس سے حقیقی بدعت اور رسم میں فرق کا بنیادی معیار معلوم ہوتا ہے۔

مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ ’’فیض الباری‘‘ کے حاشیہ میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

المبتدع هو المتقرب بأمر لا يكون ثابتا من الأدلة الأربعة، وكان بحيث يلتبس بالشروع، يختلط معه، فإن لم ينو به التقرب إلى الله تعالى، فليس بمبتدع كما يفعله الجهلاء فى أيام النكاح بعض الرسوم القبيحة، فإنهم يرونها لهوا، لا أنها مسائل وعبادات، بخلافها فى الموت، فإنهم يفعلون ما يفعلون كأنه مسألة من الدين.

وقد صنف الشاطبى فى رد البدع كتابا، وكذلك الشاه إسماعيل رحمه الله تعالى أيضا .وزعم بعض الناس أن رسالة الشاه إسماعيل رحمه الله تعالى مأخوذة من رسالة عبد الوهاب النجدى، فراجعت رسالته، فعلمت أنه باطل، فإن رسالته لا

تحتوی إلا علی أمور واضحة سهلة مطروقة، بخلاف رسالة الشاه إسماعیل رحمه الله تعالی .نعم، فیها مشارکة مع رسالة الشاطبی کثیرا .انتهی.تعریب ما فی تقریر الفاضل عبد العزیز (حاشية فيض الباری ، لمحمد بدر عالم المیرتهی، ج۲ص ۲۷۹، ۲۸۰، کتاب الأذان، باب إذا لم یتم الإمام وأتم من خلفه)

ترجمہ: بدعتی وہ ہے، جو ایسے کام سے تقرب حاصل کرے، جو ادلۂ اربعہ سے ثابت نہ ہو، اور وہ اس نوعیت کا ہو کہ شرعی احکام کے ساتھ ملتبس اور اس کے ساتھ مختلط ہوجائے، پس اگر اس ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے تقرب کی نیت نہ کرے، تو وہ بدعتی نہیں ہوگا، جیسا کہ جاہل لوگ، نکاح کے ایام میں بعض قبیح رسوم کوانجام دیتے ہیں، کیونکہ وہ ان کولہو شمار کرتے ہیں، ان کو شرعی مسائل اور عبادات نہیں سمجھتے، بخلاف موت کی رسومات کے کہ وہ لوگ ان کو دین کے مسئلے کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں۔

اور شاطبی نے بدعات کے رَد میں ایک کتاب تصنیف کی ہے، اور اسی طریقے سے شاہ اسماعیل رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی بدعات کے رَد میں ایک کتاب تصنیف کی ہے (جس کا نام ''ایضاح الحق الصریح'' ہے) اور بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ تعالیٰ کا رسالہ (محمد بن) عبدالوہاب کے رسالے سے ماخوذ ہے، جس کے بعد میں نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے رسالے کی مراجعت کی، تو مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ گمان باطل ہے، کیونکہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا رسالہ صرف واضح، سہل اور ڈھیلے امور پر مبنی ہے، بخلاف شاہ اسماعیل رحمہ اللہ تعالیٰ کے رسالے کے (کہ وہ علمی اصول وقواعد پر مبنی ہے) البتہ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ تعالیٰ کے رسالہ میں شاطبی کے رسالے کے ساتھ کثرت سے

مشارکت ہے (علامہ کشمیری کے تلمیذ) فاضل عبدالعزیز کامل پوری کی (علامہ کشمیری کے امالی پر مشتمل) تقریر میں جو کچھ مذکور ہے، اس کا عربی شدہ کلام مکمل ہوا (حاشیہ فیض الباری)

اس کے بعد علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے ''فیضُ الباری'' میں مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی کتاب ''ایضاح الحق الصریح'' کے علمی مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کو ان کی دوسری کتاب ''تقویۃُ الایمان'' سے زیادہ عمدہ قرار دیا۔

علامہ کشمیری رحمہ اللہ کا علمی لحاظ سے یہ فیصلہ بھی نہایت عمدہ ہے، کیونکہ ''ایضاح الحق الصریح'' سے بدعات ورسومات کے اصول وقواعد معلوم ہوتے ہیں، جبکہ علامہ کشمیری نے ''ایضاح الحق الصریح'' کے مقابلے میں ''تقویۃُ الایمان'' کے فائدہ کے کم ہونے کا حکم لگایا، لیکن ''تقویۃُ الایمان'' کی افادیت سے انکار نہیں فرمایا، نہ ہی ''فیض الباری'' کی اس عبارت کو ''تقویۃُ الایمان'' کی افادیت کے انکار پر محمول کرنا درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ علامہ کشمیری نے مولانا اسماعیل شہید کی مذکورہ دو کتابوں میں تقابل کر کے ایک کو زیادہ عمدہ ونافع قرار دیا۔

اور ہمیں راجح یہ معلوم ہوا کہ اس سے علمی فائدہ مراد ہے، کیونکہ جس کتاب سے کسی فن کے بنیادی اصول وقواعد کا علم ہو، وہ ایسی کتاب سے زیادہ فائدہ مند ہوگی، جس میں جزئیات کا ذکر ہو، جیسا کہ طب اور فقہ وغیرہ دیگر فنون وعلوم کا معاملہ ہے۔

اسی کے ساتھ علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے ''تقویۃُ الایمان'' میں کچھ شدت محسوس ہونے اور اس کی وجہ سے جہلاء کی طرف سے مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے خلاف فتنہ برپا ہونے کا حکم لگایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''تقویۃُ الایمان'' میں کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جو صوری یا ظاہری یا خفی شرک ہیں، یا ان میں عوام کی طرف سے مختلف مفاسد پائے جاتے ہیں، اور مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے جب ان کی تردید فرمائی، اور ان پر نکیر فرمائی، تو بعض

نے ان سے حقیقی شرک اور شرکِ اکبر وغیرہ سمجھا، یا ان کے دوسرے جائز پہلوؤں کے عدمِ جواز کو سمجھا، جیسا کہ آگے مختلف حوالہ جات کے ذیل میں آتا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری کی یہ بات بھی قابلِ اعتراض نہیں، خود مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ سے بھی اپنی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے متعلق اس بات کا ذکر منقول ہے۔

چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کی مرتب کردہ کتاب ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ہے کہ:

> خان صاحب نے فرمایا کہ مولوی اسماعیل صاحب نے ''تقویۃ الایمان'' اول، عربی میں لکھی تھی، چنانچہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس، اور ایک نسخہ مولانا گنگوہی کے پاس، اور ایک نسخہ مولوی نصر اللہ خاں خورجوی کے کتب خانہ میں بھی تھا، اس کے بعد مولانا نے اس کو اردو میں لکھا، اور لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا، جن میں سید صاحب، مولوی عبدالحئ صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فرید الدین صاحب مراد آبادی، مومن خاں، عبداللہ خاں علوی (استاذ: امام بخش صہبائی و مولانا مملوک علی صاحب) بھی تھے، اور ان کے سامنے ''تقویۃ الایمان'' پیش کی، اور فرمایا کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے، اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں، اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے، مثلاً ان امور کو جو شرکِ خفی تھے، جلی لکھ دیا گیا ہے، ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہوگی، اگر میں یہاں رہتا، تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا، لیکن اس وقت میرا ارادہ حج کا ہے، اور وہاں سے واپسی کے بعد عزمِ جہاد ہے، اس لیے میں اس کام سے معذور ہو گیا، اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا اس بار کو اٹھائے گا نہیں، اس لیے میں نے یہ کتاب لکھ دی ہے، گو اس سے شورش ہوگی، مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک

ہو جائیں گے، یہ میرا خیال ہے، اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو، تو اشاعت کی جاوے، ورنہ اسے چاک کردیا جاوے۔

اس پر ایک شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہیے، مگر فلاں فلاں مقام پر ترمیم ہونی چاہیے، اس پر مولوی عبدالحیؒ صاحب، شاہ اسحاق صاحب اور عبداللہ خاں علوی اور مومن خاں نے مخالفت کی، اور کہا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں، اس پر آپس میں گفتگو ہوئی، اور گفتگو کے بعد بالاتفاق یہ طے پایا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں، اور اسی طرح شائع ہونی چاہیے، چنانچہ اسی طرح اس کی اشاعت ہوگئی (ارواحِ ثلاثہ یعنی حکایاتِ اولیاء، صفحہ ۶۷، ۶۸، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی حکایات، حکایت نمبر ۳۰، مطبوعہ: مکتبہ عمر فاروق، کراچی، اشاعتِ اول: نومبر 2009ء)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اپنی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے متعلق، خود مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو بھی یہ اعتراف تھا کہ اس میں بعض جگہ کچھ تیز الفاظ ہیں اور بعض جگہ تشدد ہو گیا ہے، مثلاً شرکِ خفی یا صوری وغیرہ کو مطلق شرک لکھ دیا گیا، جس سے ان کو شورش کا اندیشہ تھا، اور اس کی وجہ سے مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے خود مصروف ہونے کی وجہ سے دوسروں سے اس کی اشاعت ہونے نہ ہونے پر مشورہ کیا تھا۔

مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ''ملفوظات'' میں لکھتے ہیں کہ:

حضرت (علامہ انور شاہ کشمیری) رحمہ اللہ نے فرمایا: حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید کا رسالہ ''ردِ بدعت'' میں ''ایضاحُ الحق الصریح'' بہت اچھا ہے، اور میں ''تقویۃُ الایمان'' سے زیادہ راضی نہیں ہوں، غالباً ضرورتِ وقت کے ماتحت لکھی تھی، حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب، حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب، مومن خاں شاعر (جامع عالم تھے، اور اسی خاندان کے شاگرد تھے) مولوی رشید الدین خاں

صاحب (یہ بھی جامع عالم تھے، اور اسی خاندان کے شاگرد تھے) پانچواں نام احقر کو یاد نہیں رہا (''ارواحِ ثلاثہ'' ص ۶۱ میں بھی یہ قصہ ہے، اور نام زیادہ ہیں) ان پانچ اشخاص کو یہ کام سپرد ہوا تھا کہ ''تقویۃُ الایمان'' کے الفاظ ومضامین پر غور کریں، اور بدلنے کا بھی اختیار دیا گیا تھا، ان میں سے تین کی ایک جماعت ہوگئی، اور دو کی ایک جماعت ہوگئی، ایک نے کہا کہ ایسے الفاظ مناسب نہیں ہیں، دوسرے نے کہا کہ بات سچی اور صاف صاف کہنی چاہیے، اور بغیر تیز کلامی کے نکھار نہیں ہوتا، حضرت رحمہ اللہ کے سامنے اس رسالہ کی محد ثانہ نقطۂ نظر سے بھی خامیاں ضرور رہی ہوں گی۔

پھر حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں اس لیے راضی نہیں ہوں کہ محض ان عبارات کی وجہ سے بہت سے جھگڑے ہوگئے ہیں، اس کے علاوہ ''منصبِ امامت'' اور ''اصولِ فقہ'' کا رسالہ بھی بہت اچھا لکھا ہے، اور یہی بات کہ ''میں راضی نہیں ہوں، اس رسالہ سے'' مجھے مرحوم حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ سے بھی پہنچی ہے، حالانکہ وہ ہالک تھے مولانا اسماعیل رحمہ اللہ کی محبت میں، اور مجھے سب سے زیادہ محبت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ اور پھر شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ سے ہے، اسی خاندان میں سے مذکورہ بالا قصہ مجھ کو نہایت موثق ذرائع سے پہنچا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں (ملفوظات محدث کشمیری، صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸ ''حضرت شاہ عبدالعزیز کی طرف سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کا دفاع''، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ربیع الاول 1431ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو اپنی کتاب ''تقویۃ الایمان'' میں بعض الفاظ کی تیزی اور شدت کا خود بھی احساس ہوگیا تھا، جس میں خود اپنی مصروفیت کا عذر ہونے کی وجہ سے حذف واصلاح کا اپنے بعض احباب کو اختیار بھی دیا تھا، اور مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' سے متعلق یہ شکایت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کو بھی تھی، لہٰذا

اگر علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی یہ چیز اس میں محسوس کی تو یہ قابلِ اعتراض کیوں کر ہوسکتی ہے۔

اور ہم باوجودیکہ تقویۃ الایمان کتاب کے ذریعہ سے خلقِ خدا کو عظیم نفع پہنچنے کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اس میں بعض سخت الفاظ سے انتشار وتشویش ہونے کو بھی واقعہ کے مطابق سمجھتے ہیں، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے، اور اس پر طرفین سے مناظرے ومباحثے ہوئے، رسائل ومضامین لکھے گئے، کفر کے فتوے لگائے گئے، جبکہ اس طرح کی شورش کا مردِ مجاہد مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے پہلے ہی خدشہ کو محسوس فرما لیا تھا، اور اس میں حذف واصلاح کا اپنے بعض احباب کو اختیار دیا تھا، اور خود مصروفیت کا عذر کیا تھا۔

اگر مصنف موصوف کی منشا کے مطابق اسی وقت اس کے الفاظ میں حذف واضافہ ہوجاتا، یا مصنف کی اس منشاء کی بنیاد پر بعد کے بعض اہلِ علم واہلِ فہم حضرات حذف واصلاح فرما دیتے اور الفاظ کے اوپرا تناز ورنہ دیتے، تو شاید اس شورش کا کبھی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

اس کے علاوہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمہ اللہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں ''تقویۃ الایمان'' کے مسائل صحیح ہونے اور اس کی افادیت کے مسلم ہونے کے باوجود بعض مسائل میں تشدد کا ذکر فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ، ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> بندہ کے نزدیک سب مسائل اس (تقویۃ الایمان) کے صحیح ہیں، اگرچہ بعض مسائل میں بظاہر تشدد ہے (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص۲۲۶، کتاب الایمان: ایمان اور کفر کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اور حضرت گنگوہی اپنے ایک اور فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> مولوی محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ، عالم، متقی اور بدعت کے اکھاڑنے والے اور سنت کے جاری کرنے والے، اور قرآن وحدیث پر پورا عمل کرنے والے، اور

خلقُ اللہ کو ہدایت کرنے والے تھے، اور تمام عمر اسی حالت میں رہے، آخر کار فی سبیل اللہ جہاد میں کفار کے ہاتھ سے شہید ہوئے، پس جس کا ظاہرِ حال ایسا ہو، وہ ولی اللہ اور شہید ہے، حق تعالیٰ فرماتا ہے ''ان اولیاء ہ الا المتقون ''اور کتاب ''تقویۃُ الایمان'' نہایت عمدہ کتاب ہے، اور ردِ شرک وبدعت میں لاجواب، استدلال اس کے بالکل کتابُ اللہ اور احادیث سے ہیں، اس کا رکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام اور موجب اجر کا ہے (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص ۲۱۹، کتاب الایمان: ایمان اور کفر کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ:

''تقویۃُ الایمان'' میں بعض الفاظ جو سخت واقع ہوگئے، تو اس زمانہ کی جہالت کا علاج تھا، جس طرح قرآن مجید میں عیسیٰ علیہ السلام کو ''الٰہ '' ماننے والوں کے مقابلہ میں ''قل فمن یملک من اللہ شیئا ، ان اراد ان یھلک المسیح بن مریم... الخ ''فرمایا ہے، لیکن مطلب ان الفاظ کا برا نہیں ہے، جو غور سے یا سمجھانے سے سمجھ میں آ سکتا ہے (امداد الفتاویٰ مبوب، ج۵، ص۳۸۹، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

تقویۃُ الایمان، بہشتی زیور، حفظ الایمان وغیرہ کتابیں، نہایت متبع بزرگ اور متقی حنفیُ المذہب عالموں کی تصانیف ہیں، ان کو حق سمجھ کر پڑھنا یا پڑھانا، باعثِ برکات اور اصلاحِ ظاہر وباطن ہے، کیونکہ ان میں جو مسائل لکھے ہیں، وہ سب قرآن وحدیث اور فقہ کی معتبر کتابوں سے لکھے ہیں (امداد المفتین، ص۱۶۲، کتاب السنۃ والبدعۃ، مطبوعہ: دارالاشاعت کراچی، مئی 2001ء)

اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

’’تقویۃ الایمان‘‘ درحقیقت ’’تقویۃُ الایمان‘‘ ہی ہے، جن لوگوں کے قلوب میں امراض ہیں، وہ اس نسخۂ تقویت سے بجائے قوت کے امراض پیدا کر لیتے ہیں، اورصاحبِ تقویۃ پرکفر کےفتوے لگاتے ہیں،تقویۃُ الایمان میں کوئی ایسا مضمون نہیں، جوحدودِشرعیہ سے متجاوز ہو، بلکہ وہ خالص ردِ بدعات اور رسومِ شرکیہ کے لیے نسخۂ شفا وقوتِ ایمان ہے، مسلمانوں کوحرزِ جان بنانا چاہیے، مبتدعین جن عبارتوں پراعتراض کرتے ہیں، محض کم فہمی اور بغض وعناد کا نتیجہ ہے، ورنہ اہلِ فہم ذرا سے غور کے ساتھ بشرطِ انصاف حقیقت پر مطلع ہوسکتے ہیں (امداد المفتین ،ص۲۱۳، کتاب السنۃ والبدعۃ ،مطبوعہ: دارالاشاعت کراچی، مئی 2001ء)

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی طرف سے ’’تقویۃُ الایمان‘‘ کے متعلق ’’فیض الباری‘‘ میں مذکورہ عبارت قابلِ اعتراض نہیں ہے اوراس مقصود ومفہوم کی تائید خود صاحبِ کتاب اور حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی وغیرہ سے بھی ہوتی ہے، جواس کتاب کو نافع اورانتہائی نافع قرار دینے کے ساتھ اس میں بعض جگہ سختی وتشدد کے قائل ہیں، پھراس عبارت کی وجہ سے علامہ کشمیری پر ملامت کرنا، یااس میں دور دراز کی تاویلات کرنا، کیونکر روا ہوسکتا ہے۔

جہاں تک علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی طرف سے مذکورہ عبارت کے آخر میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق تبصرہ کا تعلق ہے، تو علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کو کم فہم اور قلیلُ العلم فرمانے کی وجہ ساتھ ہی خود بیان فرمادی ہے کہ وہ کفر کا حکم لگانے میں جلد بازی اختیار کیا کرتے تھے، جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ دیگر فقہائے کرام نے مسلمان کے قول وفعل میں تاویل وتوجیہ کے جس احتیاطی پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، یا فقہائے کرام نے جن صورتوں کو شرکِ جلی، شرکِ حقیقی یا شرکِ اکبر کے بجائے شکرِ خفی یا شرکِ اصغر یا شرکِ مجازی وغیرہ قرار دیا ہے، محمد بن عبدالوہاب نجدی عام طور پر اس قسم کی تاویلات وتوجیہات اور تقسیمات کو

اختیار نہیں کرتے تھے، اور وہ قرآن وسنت کے ظاہر پر عمل کیا کرتے تھے، ظاہری مومن پر کفر کا حکم لگانے کے جو نتائج رونما ہوتے ہیں، ان پر پوری طرح نظر نہ ہونے کی وجہ سے انتشار وتشویش پیدا ہوئی، جس طرح انہوں نے اتباعِ سنت کی نیت سے اونٹنی پر بیٹھ کر طواف کیا، جو تشویش کا باعث بنا۔

اس اعتبار سے ''بلید الفہم'' یا ''قلیل العلم'' دراصل ایک سادہ علمی تعبیر ہوگی، جس کو محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحقیر یا تفسیق وتضلیل پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

جس کی تائید شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے، جو ''ارواحِ ثلاثہ'' کے حوالے سے پیچھے گزر چکا ہے، جس میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ایک طرف تو محمد بن عبدالوہاب نجدی کو نہایت سچا اور پکا مسلمان اور متبعِ سنت قرار دیا، مگر اسی کے ساتھ بشر ہونے کی وجہ سے غلطی کے امکان اور بدعقل ہونے کا حکم لگایا، لیکن غلطی کی بنا پر ان کو برا بھلا کہنے سے بھی منع فرمایا۔

اور اس واقعہ کے حاشیے میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے اہلِ صورت واہلِ معانی میں فرق کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

نیز مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ کے حوالے سے علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ''ملفوظات'' میں یہ بھی گزر چکا ہے کہ:

> علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ، اس کی مثال، تکفیرِ مسلمین میں جلد بازی بتلایا کرتے تھے۔
>
> معلوم ہوا کہ اتباعِ سنت کے لیے بھی عقل کی رہنمائی ضروری ہے، اور اس کے بغیر بڑوں سے بھی بڑی غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں۔

مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ''ملفوظات'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

احقر نے حضرت شاہ صاحب سے سوال کیا کہ مکہ معظّمہ میں جو مؤتمر عالمِ اسلامی، ملک عبدالعزیز بن سعود نے 1344ہجری، بمطابق 1926عیسوی میں طلب کی تھی، وہ کیوں نا کام ہوئی؟

جواب میں فرمایا کہ ''ملِک'' میں ذوق کی کمی تھی، اور علماء میں علم کی (ملفوظات محدث کشمیری، صفحہ ۱۵۵، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ربیع الاول 1431ھ)

اور اگر کوئی علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی ''فیضُ البــاری'' کی عبارت کے متعلق اس سابق تقریر سے اتفاق نہ کرے، بلکہ وہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی فیض الباری میں محمد بن عبدالوھاب نجدی کے متعلق رائے کو ان کی تفسیق وغیرہ پر محمول کرنے پر اصرار کرے، تو پھر علامہ کشمیری کی رائے کا مدار ان تصنیفات و اطلاعات پر قرار دیا جاسکتا ہے، جو اس زمانے میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق خاص وعام میں معروف تھیں، جس کا ذکر کئی اہلِ علم حضرات نے بھی کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس دور میں موجودہ دور کے ذرائع ابلاغ اور نشرواشاعت کے تیز وسائل میسر نہ ہونے کی وجہ سے کسی شخصیت کے افکار کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ یا تو کتابیں تھیں، یا پھر دوسروں کی اطلاعات تھیں۔

بہر حال جو کچھ بھی مراد لیا جائے، ''فیض الباری'' کی اس عبارت کی وجہ سے علامہ کشمیری کو موردِ الزام ٹھہرانا، یا ''فیــض البــاری'' کی عبارت کو مولانا بدر عالم صاحب کا تأثر یا غلطی قرار دینا، اور اس سے بڑھ کر ایسا حکم لگانا کہ جس کی وجہ سے پوری ''فیض الباری'' ہی کے معتمد ہونے پر حرف آئے، ہمیں راجح معلوم نہ ہوا، جیسا کہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی کتاب ''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق'' میں علامہ کشمیری رحمہ اللہ کے مذکورہ موقف کے ضمن میں مذکور کلام سے بظاہر تأثر ملتا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ، علامہ کشمیری اور ان کی تصانیف کے تعارف کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

"فیض الباری بشرح صحیح البخاری"

یہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے درسِ صحیح بخاری کی املائی شرح ہے، جس کو حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدینہ رحمہ اللہ نے کئی سال کی محنت وعرق ریزی کے بعد فصیح وبلیغ عربی زبان میں مرتب کیا ہے۔ یہ حضرت امام العصر رحمہ اللہ کے علوم وکمالات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے، جہاں حافظ شیخ الاسلام بدر الدین عینی اور قاضی القضاۃ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ، جیسے بلند پایہ محقق شارحین عاجز آ گئے ہیں، وہاں شیخ کے خصائص وکمالات جلوہ آراء نظر آئیں گے ۔زیادہ تر اعتناء انہی معارفِ حدیث کا کیا گیا، جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں۔حضرت شیخ کے آخری عمر کے مجرب علوم واذواق، خصوصی احساسات وعلمی خصوصیات، دقتِ نظر وتحقیقی معیار کے نمونے 'اہل علم ویارانِ نکتہ داں کے لیے صدائے عام دے رہے ہیں۔ یہ چار ضخیم جلد کا بحرِ بے کراں مصر میں آب وتاب سے شائع ہوا ہے۔قرآن وحدیث، فلسفہ وکلام ومعانی وبلاغت وغیرہ کے نہایت بیش بہا ابحاث سے مالا مال ہے۔اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع ومرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں۔۸۰؍صفحات پر مشتمل ہیں، عام عبارت نہایت شگفتہ وسلیس ہے۔بعض بعض مقامات میں خاصی ادبی لطافت ہے۔

"العرف الشذی بشرح جامع الترمذی"

یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی درسِ جامع ترمذی کی املائی شرح ہے، جس کو جناب مولانا محمد چراغ صاحبؒ ساکن ضلع گجرات نے بوقتِ درس قلم بند کیا ہے اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ جامع ترمذی کے مشکلاتِ احادیثِ احکام پر محققانہ کلام، ہر موضوع پر عمدہ ترین کبارِ اُمت کے نقول اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے ۔ طلبۂ حدیث اور اساتذۂ

حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے (ماہنامہ بینات، صفحہ۲۲، ربیع الثانی، 1439ہجری، مضمون: ''حضرت امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اور اُن کی تصانیف'')

پس فیض الباری یا العرف الشذی میں کوئی رائے کسی عالم کو اپنی تحقیق کی رُو سے مرجوح یا خطاء محسوس ہو، اور وہ اس سے اتفاق نہ کرے، تو وہ ایک الگ معاملہ ہے، لیکن اس کی وجہ سے علامہ کشمیری یا کسی بھی بزرگ کی معتمد وموثق ذریعہ سے پہنچی ہوئی رائے کے متعلق ان بزرگ کی طرف نسبت کی نفی کرنا اور اس بزرگ کو خطا وغیرہ سے معصوم قرار دینے کے درپے ہونا درست نہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام کی بے شمار آراء ایک دوسرے کے مخالف ہیں، جن میں انہوں نے اپنی اپنی آراء اور ان کے دلائل ذکر کیے، لیکن محض کسی رائے سے اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اس رائے کے دوسرے سے ثبوت کی نفی کے درپے نہیں ہوئے۔

ورنہ اس کے نتیجہ میں فقہائے کرام اور محدثینِ عظام کی طرف منسوب بہت سی کتب اور املائی تقریرات کو مشکوک قرار دیا جاسکتا ہے، جس کی بناء پر تمام صحیح آراء کا بھی مشکوک ہونا ٹھہرتا ہے، کیونکہ وہ بھی اسی ذریعہ وطریقہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔

جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ کی آراء کو بھی ان کے تلامذہ نے ہی جمع کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے فیض الباری میں محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کی تضلیل وتفسیق نہیں فرمائی، بلکہ اپنے نزدیک ان کے علمی واجتہادی ذوق ومزاج کی خطا کی نشاندہی فرمائی ہے، جس کی تعبیر انہوں نے جن الفاظ میں فرمائی ہے، ان سے بعض اوقات بادی النظر میں غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان پایا جاتا ہے، جس طرح سے ''تقویۃُ الایمان'' کے بعض الفاظ سے بھی بعض اوقات بادی النظر میں غلط فہمی کا امکان ہوتا ہے، اور بعض لوگوں کو ہوا بھی ہے، لیکن اس کے باوجود شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی تضلیل وتفسیق نہیں کی جاسکتی، اور نہ ہی اس کتاب میں مذکور الفاظ کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا کہ یہ صاحبِ

کتاب کے نہیں ہیں، نیز اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگرچہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی بعض عبارات سے بعض اوقات تشدد کا اظہار ہوتا ہے، لیکن ان کے طرزِ عمل سے تکفیر کے معاملے میں اس طرح کی جلد بازی یا تشدد کا ظہور نہیں ہوا، جس طرح کا ظہور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے طرزِ عمل سے ہوا، اور نہ ہی مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی طرف سے متأولین سے قتل وقتال کی نوبت آئی۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا مذکورہ طرزِ عمل فقہائے کرام کی اس تصریح کے مطابق ہے، جس میں انہوں نے لزومِ کفر اور التزامِ کفر میں فرق کیا ہے، جس کی بحث آگے آتی ہے۔

جبکہ ہمیں محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کے طرزِ عمل میں لزومِ کفر اور التزامِ کفر کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے میں کسی قدر کمزوری محسوس ہوئی، جو اگرچہ اجتہادی امر ہے، لیکن اس کے نتیجے میں کئی قسم کی تشویشات پیدا ہوئیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(19)......مولانا حسین احمد مدنی کا حوالہ

مشائخِ دیوبند میں ایک عظیم نام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1957 عیسوی) نے پہلے اپنی تالیف ''الشہاب الثاقب'' وغیرہ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بارے میں سخت موقف اختیار کیا تھا، بعد میں اپنے ایک مکتوب میں اس سخت موقف سے رجوع کیا، لیکن اہلِ نجد یا وہابیہ سے چند مسائل میں اختلاف ہونے کے موقف پر پھر بھی قائم رہے، جس کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی صاحب ''الشہاب الثاقب'' میں فرماتے ہیں:

الحاصل! وہ (یعنی محمد بن عبدالوہاب نجدی) ایک ظالم وباغی، خونخوار، فاسق شخص تھا (الشہاب الثاقب، صفحہ ۲۲۱، چھٹا بہتان، مطبوعہ: دار الکتاب، لاہور، طبع ثانی: 2004ء)

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے اپنے ایک خط کے ذریعے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق اپنے مذکورہ سخت موقف سے رجوع معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، لیکن اس کے باوجود مولانا مدنی، محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین کے ساتھ اپنے اور اکابرِ دیوبند کے مابین چند مسائل میں اختلاف موجود ہونے کے موقف پر قائم رہے، اگرچہ وہ مسائل چند جزوی واجتہادی نوعیت کے کیوں نہ ہوں۔

مولانا حسین احمد مدنی ''نقشِ حیات'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

سلطان عبدالمجید خان مرحوم کے اوائلِ زمانہ حکومت میں نجدیوں کا حجاز پر غلبہ ہو چکا تھا، اور انہوں نے دس برس مکہ معظّمہ میں اور تین برس اخیر کے مدینہ منورہ میں حکومت کی تھی، یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو تھے، اور اپنے عقائد واعمال میں نہایت سخت غالی تھی، انہوں نے اہالیِ حرمین پر بہت زیادہ تشددات کیے تھے، اور اپنے مخالف، عقائد واعمال والوں کو بہت زیادہ ستایا تھا۔

اس لیے اہلِ حرمین کو ان سے بہت زیادہ بغض اور تنفر تھا۔

بالآخر سلطان عبدالمجید خان مرحوم نے خدیوی محمد علی پاشا مرحوم والیِ مصر سے بوقت صلح شرط کی کہ وہ اہلِ نجد کو حجاز سے نکالے، چنانچہ خدیوی مرحوم نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو جرار فوج کے ساتھ بھیجا، اور اس نے نجدیوں کے قبضے سے حجاز کو واگزاشت کیا۔

اس زمانے سے حجاز میں یہ طریقہ جاری ہو گیا تھا کہ جس شخص سے تنفر پھیلانا منظور ہوا، اس کو وہابیت کی طرف منسوب کر دیا۔

اہلِ حجاز کو وہابیت سے اس قدر نفرت، مظالمِ مذکورہ کی وجہ سے ہو گئی تھی کہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سے بھی اتنی نفرت نہ تھی، یہی طریقہ انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے ساتھ جاری کیا (نقشِ حیات ج ۱ ص ۱۲۰ ''مولوی

احمد رضا خان صاحب بریلوی کا قضیہ'' مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، اشاعتِ اول)

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ انہوں نے سلطان عبدالحمید خان کے اوائلِ زمانہ میں حجاز اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ میں قبضہ کرنے والے اہلِ نجد کو عقائد واعمال میں غالی سمجھا تھا، اور اس کی وجہ سے، جو لوگ ان کے عقائد و اعمال کے خلاف ہوتے تھے، اہلِ نجد کے ان کو ستانے کا حکم لگایا تھا، ممکن ہے کہ حضرت مدنی کو اس سلسلہ میں کچھ باتیں غلط یا غلو پر مبنی پہنچی ہوں، یا اس زمانے کے بعض اہلِ نجد نے یہ غلو والا طریقہ اختیار کیا ہو، بہرحال جو کچھ بھی ہو، فی الجملہ اہلِ نجد کے بعض عقائد و اعمال میں تشدد ہونے کا انکار درست نہیں، خواہ وہ کسی درجہ میں ہو، اور وہ اجتہادی نوعیت کا اور نیک نیتی و اخلاص پر مبنی کیوں نہ ہو، جیسا کہ بعض مسلمانوں کے قابلِ تاویل افعال و اقوال میں تاویل کو نظر انداز کر کے تکفیر کا مسئلہ۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے ''نقشِ حیات'' میں اکابر علمائے دیوبند اور طائفۂ وہابیہ کے مابین چند چیزوں میں فرق بھی واضح فرمایا ہے، جس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں درجِ ذیل ہے:

> محمد بن عبدالوہاب اور اس کے فرقہ سے ان حضراتِ (علماءِ دیوبند) کا دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ عقائد واقوال جو طائفۂ وہابیہ کے مشہور اور مابہ الامتیاز ہیں، اُن کے خلاف اِن حضرات (علماءِ دیوبند) کی تصانیف بھری ہوئی ہیں۔
>
> (1)...... وہ (یعنی وہابیہ) وفاتِ ظاہری کے بعد انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ جسمانی اور بقاءِ علاقہ بین الروح والجسم (یعنی جسم اور روح کے درمیان تعلق باقی رہنے) کے منکر ہیں۔ اور یہ حضرات (علماءِ دیوبند) صرف اس کے قائل ہی نہیں، بلکہ مُثبِت (یعنی ثابت کرنے والے) بھی ہیں۔
>
> (2)...... وہابیہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے روضہ) کی زیارت کے لئے

سفر کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فقط مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے سفر کرنا چاہئے ، وہاں پہنچنے کے بعد زیارت بھی کر لی جائے۔ ہمارے اکابر زیارتِ مطہرہ کے لئے سفر کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ افضلُ المستحبات اور قریب واجب قرار دیتے ہیں بلکہ محض زیارت کے لئے سفر کرنا جس میں اور کوئی دوسری قربت منوِی (پیشِ نظر) اور ملحوظ نہ ہو۔ افضل اور اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔

(3)......وہابیہ: **توسُّل بالانبیاء والاولیاء** کو بعدالوفاۃ ممنوع اور حرام قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس کو نہ صرف جائز بلکہ ''**ارجی للاجابت**'' (یعنی زیادہ قبولیت کی امید کا باعث) اور مفید قرار دیتے ہیں۔

(4)......وہابیہ: بارگاہِ نبوت میں (بظاہر) گستاخانہ کلمات استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ حضرات بارگاہِ نبوت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اس قدر اظہارِ عقیدت فرماتے ہیں کہ ظاہر بین (یعنی صرف ظاہری نظر و علم والے) اس کو غلو اور تجاوز عَنِ الحد (یعنی حد سے آگے بڑھنا) شمار کرنے لگتا ہے۔

(5)......وہابیہ: تصوف اور بیعتِ طریقت اور اس کے اشغال ذکر و مراقبہ و توجہ، حلقہ ہائے ذکر وغیرہ کے سخت منکر ہیں۔ اور یہ حضرات سب کے سب ان کے پابند ہیں (جبکہ مذکورہ اُمور میں کوئی بدعت شامل نہ ہو)

(6)......وہابیہ: کے اکثر لوگ، تقلیدِ شخصی کے مخالف ہیں اور جو لوگ قائل بھی ہیں وہ نہایت ڈھیلے ہیں، مگر یہ حضرات سب کے سب تقلیدِ شخصی کو واجب اور اس کے تارک کو گناہ گار فرماتے ہیں، سراجُ الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام جزئیات وکلّیات میں مقلّد ہیں اور نہایت مضبوطی اور سختی سے ان کا اتباع کرتے ہیں۔

(7)......وہابیہ: ائمہ طریقت حضرت جنید بغدادی، سری سقطی، ابراہیم بن ادہم،

شبلی، عبدالواحد بن زید، خواجہ بہاءُالدین نقشبندی، خواجہ معینُ الدین چشتی، غوثُ الثقلین، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ بہاءُ الدین سہروردی، شیخ اکبر ابنِ عربی، شیخ عبدالوہاب شعرانی وغیرہ قدس اللہ اسرارہم اجمعین کی شان میں سخت گستاخی اور بے ادبی کے کلمات کہتے ہیں اور یہ حضرات اُن کی محبت اور تعظیم اور توسل کو بہت مفید اور ضروری اور باعثِ برکات اور موجبِ رضاءِ خداوندی سمجھتے ہیں۔

الغرض وہابیہ کے عقائد وخیالات اوراُن کے اعمال سے اِن (دیوبندکے) بزرگواروں کو دُور کا بھی تعلق نہیں ہے اور نہ تھا۔ وہابی مسلمانوں کو ذرا ذرا سی بات میں مشرک اور کافر قرار دیتے ہیں، اوران کے مال اور خون کو مباح جانتے ہیں، اور جانتے تھے، جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ردالمحتار'' میں لکھا ہے، اور جیسا کہ ''غطغط'' وغیرہ کے معاملات سے حجاز میں ظاہر ہوا، اوران اکابر کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے کسی قول اور عقیدہ میں سو احتمال ہوں، جن میں سے ننانوے احتمال کفر کے ہوں، اور ایک احتمال بھی ایمان کا ہو، تو اس کی تکفیر جائز نہیں ہے، اور نہ وہ مباح الدم والمال ہوسکتا ہے، بلکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز اپنے مکتوب ''انوار القلوب'' میں تصریح فرماتے ہیں کہ یہ قول فقہاء ''نناوے احتمال'' کا تحدیدی نہیں ہے، بلکہ اگر کسی کے کلام میں ہزار احتمال ہوں، جن میں سے نوسوننانوے احتمالاتِ کفریہ ہوں، اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو، تو اس کی بھی تکفیر جائز نہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

خلاصہ یہ کہ ان حضرات کی طرف تہمتِ وہابیت ایسی ہی تھی اور ہے، جیسے کہ زنگی کو کافور اور دن کو رات کہنا، مگر انگریزی پروپیگنڈوں اور ڈیوائیڈ اینڈ رول کی پالیسی اور نفسانی سازشوں نے سب کچھ کرایا۔

خرد کا نام جنون رکھ لیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بہرحال اہلِ حرمین کے جذبات پراگیختہ کرنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا گیا، جو کہ عوام مسلمانوں میں ہندوستان میں خاندانِ ولی اللّٰہی اور حضرت امامِ زماں سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہم اوران کے متوسلین کے لیے حکومتِ انگریزی اوراس کے آلہ کار اشخاص نے کیا تھا، اوراس کے ذریعہ سے جذبۂ جہادوحریت کو بڑے درجہ تک مسلمانوں سے فنا کردینے اوران مجاہدین فی سبیل اللہ سے بالکلیہ متنفر کردینے میں کامیاب ہوگئی تھی، ان حضرات پر وہابیت کا الزام لگا کر وہابیت کے نام سے عوام میں اس قدر نفرت پھیلائی گئی کہ شرک وکفر، عیسائیت اور یہودیت ہندویت اور بت پرستی سے مسلم عوام کو اتنی نفرت نہیں ہوئی جتنی کہ وہابیت سے ہوئی۔

مجھ کو بخوبی یاد ہے کہ غالباً 1925 عیسوی یا اسی کے قریبی زمانہ میں پنجاب کے اخباروں میں ایک واقعہ چھپا تھا کہ کسی گاؤں کا امام وہاں کے ایک ہندو بنئے کا مقروض تھا، قرضہ بڑھ گیا تھا، بنئے نے تقاضا کیا، اورآئندہ قرض دینا بند کردیا، امام صاحب نے اس کو سمجھایا، مگروہ بنیا نہ مانا، اورکہا کہ جب تک پہلا قرضہ ادا نہ کردو، میں تم کو کچھ قرض نہ دوں گا۔ امام صاحب دھمکی دے کر چلے گئے اور مسجد میں بعد نمازِ جمعہ اعلان کیا کہ فلاں بنیا وہابی ہوگیا ہے، اس لئے کسی قسم کا معاملہ خریدوفروخت، آمدورفت کا جائز نہیں ہے۔ تمام باشندگانِ دیہہ نے بنئے کا بائیکاٹ کردیا۔ بنیا بے چارہ دن بھر دوکان پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا، کوئی آدمی اس کی دوکان پر نہیں آتا تھا، اس نے بعض لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ تو وہابی ہوگیا ہے، اس لئے ہم تجھ سے لین دین نہیں کرسکتے۔ بالآخر بنئے نے جا کر امام صاحب سے صلح کی تو امام

صاحب نے اگلے جمعہ کو اعلان کردیا کہ بنئے نے وہابیت سے توبہ کرلی ہے، اب لین دین جاری کردو، چنانچہ بازار کُھل گیا۔خیال کیجئے کہ بنئے کا ہندو اور بت پرست مشرک ہونا تو لین دین میں حارِج نہ تھا، مگر وہابی ہونا حارِج (رکاوٹ) ہوگیا

(نقشِ حیات ج ا ص ۱۲۲ تا ۱۲۷، ملخصاً ''رسالہ حسام الحرمین کی حقیقت'' مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، اشاعتِ اول)

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے جو اہلِ دیوبند واہلِ نجد یا طائفۂ وہابیہ کے مابین چند چیزوں میں فرق بیان فرمایا ہے، ممکن ہے کہ بعض غالی وہابیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہوں، لیکن محمد بن عبدالوہاب نجدی اوران کے بعض معتبر متبعین وترجمان حضرات کی اپنی تحریرات سے مندرجہ بالا بعض باتوں کی نفی معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ ان کے حوالہ سے پہلے گزرا، اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی طرف بھی کچھ لوگ اپنی نسبت کریں، تو یہ نسبت اسی وقت معتبر اور سچی یا صحیح ہوتی ہے، جبکہ ان باتوں سے اس شخصیت کی موافقت بھی ثابت ہو، ورنہ تو آج بہت سے اہلِ بدعت بھی اپنی نسبت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہیں، لیکن ان اہلِ بدعت کے بدعت پر مشتمل اقوال وافعال کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں، یہی حال دوسری جماعتوں اور سلسلوں کا بھی ہے۔

چنانچہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف سے وفات کے بعد روح اور جسم کے مابین تعلق کا اثبات گزر چکا ہے، جس میں شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی نے خود تصریح کی ہے کہ میں قبر کے فتنے وعذاب اور قبر کی نعمتوں پر اور روحوں کے جسموں کی طرف اعادہ پر ایمان رکھتا ہوں، نیز شیخ موصوف کے بیٹے، شیخ عبداللہ کے مکتوب کے حوالہ سے بھی گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں برزخی حیات کے ساتھ زندہ ہیں، اور آپ کی حیات، شہداء وغیرہ سے بھی اعلیٰ ہے۔

البتہ اس کی کیفیت اوراس کی تفصیل ایک آگے کا مرحلہ ہے، اور جو حضرات کیفیات اوراس کی

تفصیلات کے اثبات میں غلو اور کھود کرید کرنے کے در پے ہوتے ہیں، وہ درست طرزِ عمل نہیں، کیونکہ اس عالمِ دنیا میں عالمِ برزخ کی تمام کیفیات کا ہر ایک کو پوری طرح سمجھنا آسان نہیں، ان کیفیات کی مختلف تعبیرات وتوجیہات اور ان کی تشریحات وتوضیحات کی بناء پر بعض اوقات تشویش واختلاف رونما ہوکر کم علم اور کم فہم لوگوں میں بڑا فساد برپا ہوجاتا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

(مرنے والے کا) تعلق قبر سے کچھ نہ کچھ باقی رہنا احادیث سے ثابت ہے، لیکن یہ تعیین کہ کس قسم کا تعلق رہتا ہے، مشکل ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں قبروں پر رہتی ہیں، اور بعض سے اس کے خلاف، اس لیے اپنی طرف سے کوئی فیصلہ اس میں کرنا مناسب نہیں، بلکہ سکوت وتوقف مناسب ہے، کیونکہ حلال وحرام سے اس کا تعلق نہیں (امداد المفتیین ص۱۸۲، کتاب السنۃ والبدعۃ، مطبوعہ: دارالاشاعت کراچی، مئی 2001ء)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں ایک اور سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

حیاتُ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسئلے کو دونوں طرف سے بلاوجہ معرکۂ بحث بنا کر عام مسلمانوں میں تشویش پیدا کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ فریقین کو توفیق عطا فرمائے کہ وقت کے اہم مسائل پر غور وفکر کریں، اس مسئلے میں صرف اتنا عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو برزخ میں خاص قسم کی حیات نصیب ہوتی ہے، جس کا اثر بدن تک پہنچتا ہے، کہ بدن بھی مٹی سے متاثر نہیں ہوتا، باقی اس کی حقیقت اور کیفیت کی بحث، نہ اللہ اور رسول نے اس کی تحقیق کرنے کا حکم دیا، نہ ہمارے ذمّہ ہے، نہ اس میں بحث کرنا کوئی دین کی خدمت ہے۔ واللہ اعلم۔

بندہ محمد شفیع عفی عنہ۔ دارالعلوم کراچی۔ ۸/۶/۱۳۸۲ھ۔ (فتوی نمبر ۳۵/۱۳)

(امداد المفتین جامع، جلد ۱، ص ۳۸۹، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بحیاۃ الانبیاء علیہم الصلاۃ والسلام، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018)

کفایت المفتی میں ہے کہ:

انبیائے کرام صلواتُ اللہ علیہم اجمعین، اپنی قبور میں زندہ ہیں، مگر ان کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہے، بلکہ برزخی اور تمام دوسرے لوگوں کی زندگی سے ممتاز ہے، اسی طرح شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے، اور انبیاء کی زندگی سے نیچے درجے کی ہے، دنیا کے اعتبار سے تو وہ سب اموات میں داخل ہیں ''إنک میت وإنهم میتون'' اس کی صریح دلیل ہے، محمد کفایت اللہ۔ (کفایت المفتی مدلّل مکمل مع عنوانات، جلد ۱ صفحہ ۸۰، کتاب العقائد، دوسرا باب: انبیاء علیہم السلام۔ مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: جولائی ۲۰۰۱)

کفایت المفتی میں ہی ہے کہ:

جماہیرِ امت کا یہ قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، قبرِ اطہر میں حیاتِ مخصوص کے ساتھ حیات ہیں، باقی یہ بات کہ اس حیات کی حقیقت کیا ہے، یہ حضرتِ حق کو ہی معلوم ہے، وہ حیات، حضورِ انور پر میت کے اطلاق کے منافی نہیں، اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں حضور کو خطاب کرکے فرمایا ''إِنَّکَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ'' اور دوسری جگہ فرمایا ''أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ'' اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، مجمعِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو خطاب کرکے فرمایا تھا ''مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ'' محمد کفایت اللہ۔ (کفایت المفتی مدلّل مکمل مع عنوانات، جلد ۱ صفحہ ۱۰۲، کتاب العقائد، دوسرا باب: انبیاء علیہم السلام۔ مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، طباعت: جولائی ۲۰۰۱)

اسی طرح محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی نفی بھی ان کی تصریح کی روشنی میں گزر چکی ہے، اوران کے بیٹے کی طرف سے بھی یہ تصریح گزر چکی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں مطلقاً افضل ہیں۔

اوران کے حوالہ سے یہ بھی گزر چکا ہے کہ وہ اولیائے کرام وبزرگانِ دین کی شان میں گستاخی کوروانہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے بعض افعال واقوال کواجتہادی خطا پر سمجھنے کی وجہ سے معذور قرار دیتے تھے۔

اورمحمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف سے فروع میں امام احمد بن حنبل کے مذہب کا مقلد ومتبع ہونے اورائمہ اربعہ کے مقلدین پرنکیر نہ کرنے کی تصریح بھی گزر چکی ہے، پھر بعد کے لوگوں نے اس سلسلہ میں افراط وتفریط پیدا کی ہوتو الگ بات ہے۔

تاہم اس موقع پر یہ امر بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ تقلیدِ شخصی اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک انتظامی طور پر یا کسی اوروجہ سے ضروری ہو، لیکن اس کے باوجود یہ بھی اجتہادی مسئلہ ہے، اور اگرکوئی تقلیدِ شخصی پر عامل نہ ہو، یا وہ اس سلسلہ میں سختی کا قائل نہ ہو، لیکن وہ تقلیدِ ائمہ اورتقلیدِ شخصی پرنکیر نہ کرے، نہ ہی ائمہ وفقہائے کرام کی تحقیر وتذلیل کرے، تو وہ محض اس طرزِ عمل کی وجہ سے اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج نہیں ہوجاتا۔

چنانچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

> نفسِ وجوبِ تقلیدِ شخصی کے انکار سے اہلِ سنت سے خارج نہیں ہوتے، کیونکہ ہمیشہ سے مختلَف فیہ مسئلہ رہا ہے، چنانچہ بعض محدثین بھی اس کے عدمِ وجوب کے قائل ہیں (دعواتِ عبدیت، جلد۱۹صفحہ۱۴۶۰، تحفۃ العلماء، جلد۲، صفحہ۴۸۵''اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ'')

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ایک سوال وجواب درجِ ذیل طریقہ پر ہے:

سوال: ''جماعتِ اہلِ حدیث (غیر مقلدین) کے بارے میں آپ کی کیارائے

ہے؟ کیا یہ اہلِ سنت والجماعت میں داخل نہیں؟

جواب: ”ان میں جو حضرات ائمہ مجتہدین پر لعن طعن کرتے ہیں، اور تمام مقلدین کو مشرک کہتے ہیں، وہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہیں، لیکن عموماً اہلِ حدیث حضرات کا یہ خیال نہیں، صرف مسائل میں اختلاف ہے، مگر ائمہ دین کا وہ بھی احترام کرتے ہیں، اور مقلدین کو مشرک نہیں کہتے، وہ لوگ اہلِ سنت والجماعت میں داخل ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد شفیع عفی عنہ۔ دارالعلوم کراچی۔۱۹/۲/۱۳۸۴ھ۔ (فتویٰ نمبر ۱۷۵۵/۱۵)

(امداد المفتیین جامع، جلد۱، ص۵۹۱، کتاب الایمان والعقائد، باب احکام الکفر، فصل فی التقلید، زیرِ اہتمام مولانا مفتی محمد رفیع و مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحبان، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018)

اور محمد بن عبدالوھاب کے حوالہ سے یہ بھی گزر چکا ہے کہ وہ صوفیائے کرام کے بعض غیر مسنون اذکار واشغال میں اپنے زمانہ میں غلو کی وجہ سے مسنون اذکار واشغال کو ترجیح دیتے تھے، اور اس حد تک اگر کوئی خود سے صوفیا کے غیر مسنون اذکار واشغال کو اختیار نہ کرے اور مسنون اعمال واذکار کو انجام دے، اور غیر مسنون اذکار واشغال میں غلو و بدعت کے شامل ہونے کی وجہ سے منع کرے، وہ قابلِ مذمت نہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے شیخ اور پیر ومرشد حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کی خدمت میں اپنے متعلق ایک مکتوب میں یہ تحریر کیا کہ:

”عقائد میں امام مالک کے اس اصول کا پیرو ہوں ”الاستویٰ معلوم و الکیفیۃ مجھول والایمان بہ واجب والسؤال عنہ بدعۃ“

فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں، مگر اہلِ حدیث بالمعنیٰ المتعارف نہیں ہوں، ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیۃً ان سے عدول حق

نہیں سمجھتا۔

فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں۔

امامِ ربانی مجدد الفِ ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ سے عقیدتِ تامّہ رکھتا ہوں۔

خرافات وطاماتِ صوفیہ کا دل سے منکر ہوں‘‘

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ مکتوب کے جواب میں ان کے پیرومرشد اور شیخِ وقت حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا کہ:

’’جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا، اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا، دو وجہ سے، ایکؔ صدق وخلوص پر دال ہونے کی وجہ سے۔

دوسؔرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے، تمام اہلِ حق کا یہی مسلک ہے، کسی جزوی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی، صرف رنگ بدلتا ہے۔

چنانچہ اس احقر پر دو جگہ دوسرا رنگ ہے۔

ایک یہ کہ میں بوجہ اپنی قلتِ روایت و درایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں، دوسرے یہ کہ صوفیہ کے احوال واقوال کو محتملُ التاویل سمجھتا ہوں‘‘ (تذکرۂ سلیمان، مصنفہ: غلام محمد، بی، اے، عثمانیہ، مطبوعہ: ادارہ مجلسِ علمی کراچی، تاریخِ طبع 1960ء، بابِ سوم، صفحہ 88 تا صفحہ 93، مکتوب سلیمان نمبر 2 اور جوابِ اشرف)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ایک اور تفصیلی مکتوب میں درجِ ذیل مضمون تحریر فرمایا کہ:

’’مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلفِ صالحین رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیٰحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید

بتمامہٖ نہیں ہوسکی، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے۔

لیکن کبھی کوئی رائے ایسی اختیار نہیں کی، جس کی تائید ائمۂ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی۔

خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابنِ تیمیہ، حافظ ابنِ قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے (تذکرۂ سلیمان، صفحہ 146، 147، بعنوان، سیدُ العلماء کا اعلانِ رجوع، اور حکیم الامت کی تبریک وتحسین، مصنفہ غلام محمد، بی، اے، عثمانیہ، مطبوعہ ادارہ مجلس علمی کراچی، تاریخ طبع 1960ء)

حضرت مولانا سید اسماعیل شہید رحمہ اللہ ذکرِ الٰہی کی مخصوص ترکیبوں اور ذکر میں ضربیں لگانے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''یہ سب اکثر طالبین کے حق میں بدعتِ حقیقی کی قسم میں داخل ہے، کیونکہ وہ اس کو ہی اصل کمالِ شرعی سمجھتے ہیں، یا شریعت کا تکملہ گردانتے ہیں، البتہ خواص کے حق میں یہ بدعتِ حکمیہ شمار ہوں گی، جو اِن امور کو صرف وسیلہ سمجھ کر ان کی تعلیم وترویج کی کوشش کرتے ہیں، اور جہاں تک خاصُ الخاص کا تعلق ہے، جو کہ محض چند غبی اور کُند ذہن لوگوں کی ہدایت کے لیے کہ ان کے نفوس حد درجے کے کند ذہنی اور سرکشی کی وجہ سے ناقص ہوگئے ہیں، ان کو ان مذکورہ بالا امور کی تعلیم دیں، اور ان کو طرح طرح کی رغبتیں دِلا کر حق تعالیٰ کی اطاعت وعبادت پر آمادہ کریں، اور صرف ان لوگوں کے ناقص استعدادوں کی اصلاح کے لئے بقدرِ ضرورت وسیلوں کے طور پر اور بغیر کسی التزام کے اور بغیر کسی ترویجِ عام اور اہتمام کے ان امور کو کام میں لائیں، اور مقصد حاصل ہونے کے بعد ان کو چھوڑ دیں، تو بے شک اس صورت میں ان مذکورہ بالا اُمور کی تعلیم اگرچہ ان حضرات کی

جانب سے بعض اوقات چندلوگوں کے ذہنوں (کی تربیت) کے لئے اتفاقیہ طور پراور مصلحتِ وقت کی خاطر وجود میں آئے، توان کے حق میں یہ اُمور بدعت شمار نہیں ہوں گے، لیکن ہم یہاں جوکلام کررہے ہیں، وہ اہلِ زمانہ کی اکثریت کے بارے میں ہے، جواِن امورکوشریعتِ مستمرّہ اورطریقۂ مسلوکہ (مستقل شریعت اور مستقل مسلک) کے مثل سمجھتے ہیں‘‘ (بدعت کی حقیقت اوراس کے احکام، ترجمہ ایضاح الحق الصریح ص ۷۹و۸۰، مترجم: معراج محمد بارق۔ درذیل تیسرامسئلہ، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اشغالِ صوفیاء بطور معالجہ کے ہیں، سب کی اصل نصوص سے ثابت ہے، جیسا اصل علاج ثابت ہے، مگر شربت بنفشہ حدیث صریح سے ثابت نہیں، ایسا ہی سب اذکار کی اصل ہیئت ثابت ہے، جیسا توپ بندوق کی اصل ثابت ہے، اگرچہ اس وقت میں نہ تھی، سو یہ بدعت نہیں، ہاں ان ہیئات کوسنت، ضروری جاننا بدعت ہے، اور اس کوبھی علماء نے بدعت لکھا ہے (تالیفاتِ رشیدیہ، ص۱۹۴، کتاب الاخلاق والتصوف، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، تصحیح شدہ جدید ایڈیشن باردوم، 1416ھ، 1992ء)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

ذکرکومقصود سمجھنا اور مطلق زیادتِ عددکو زیادتِ اجر کا سبب سمجھنا اور اوضاع وضربات وجلسات کواز قبیل مصالحِ طبیہ سمجھنا بدعت نہیں، اورخودان کوقربات سمجھنا بدعت ہے (بوادرالنوادرص۷۷۹، رسالہ: اعدادالجنة للتوقی عن الشبهة فی اعداد البدعة والسنة)

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ ’’دعائے حزب البحر‘‘ کے متعلق تحریرفرماتے ہیں کہ:

تنبیہ! یہ (حزب البحر نام کی) دعا بے شک متبرک ہے، لیکن احادیث وقرآن مجید

میں جو دعائیں وارد ہوئی ہیں، ان کا رتبہ اور اثر اس سے کہیں اعلیٰ ہے، خوب یاد رکھو، لوگ اس میں بڑی غلطی کرتے ہیں (مناجاتِ مقبول، ص ۲۰۷، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور)

معلوم ہوا کہ محقق واہلِ حق صوفیائے کرام نے جو اشغال یا ذکر کے اعداد وضربات اور مراقبات یا غیر منصوص اذکار وغیرہ بیان واختیار کیے، وہ مباح درجہ کے تھے، اور وہ بعینہٖ یعنی اپنی مخصوص شکل و ہیئت میں کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں تھے، اسی لیے محقق صوفیائے کرام نے ان کو سنت یا بذاتِ خود قربت سمجھ کر اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ بطور علاج ومعالجہ کے اختیار کیا تھا، اس حیثیت سے ان کا اختیار کرنا مباح تھا، اور ان کو سنت اور قربتِ مقصودہ یا ضروری سمجھنا بدعت تھا، اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے، تو وہ ان حضرات کے نزدیک بھی بدعت ہوگا، اور کوئی اس سے منع کرے، تو اس کا منع کرنا بھی درست ہوگا۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب وسنت سے ماخوذ اور منصوص اذکار اور طریقوں کو اختیار کرنا افضل ہے، اور غیر منصوص کو مسنون اذکار وطریقوں سے افضل سمجھنا درست نہیں، بلکہ بڑی غلطی ہے، جس کو خوب یاد رکھنا ضروری ہے۔

پھر تصوف کے اشغال واذکار وغیرہ کے سلسلہ میں حالات واغراض اور شخصیات یا ازمنہ و امکنہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے حکم مختلف ہوسکتا ہے، یعنی یہ بات ممکن ہے کہ کسی زمانہ یا علاقہ میں مخصوص مباح چیزوں کو لوگ بذاتِ خود قربت وسنت نہ سمجھتے ہوں، اور کسی دوسرے زمانہ یا علاقہ کے لوگ سنت وقربت سمجھتے ہوں، یا کسی علاقہ یا زمانہ کے لوگوں میں التــــزام مــــالا یلــزم جیسی چیزیں ذکر کے ساتھ شامل نہ ہوں، اور دوسرے علاقہ یا زمانہ میں ایسی چیزیں شامل ہوجائیں۔

مذکورہ اور اس جیسی وجوہات کی بناء پر عین ممکن ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین نے اپنے زمانے اور علاقے میں تصوف وطریقت کے عنوان سے پائے جانے والے بعض

امور میں غلو و بدعت کو محسوس کیا ہو، اور اس وجہ سے انہوں نے ان چیزوں پر نکیر کی ہو، جیسا کہ ان کی متعدد تحریرات وتصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔

اور آج بھی ہندوستان و پاکستان کے بہت سے ان مقامات پر، جو کسی زمانے میں جلیل القدر صوفیائے کرام کی اصلاح گاہ تھے، آج وہاں تصوف وطریقت وغیرہ کے عنوان سے بے شمار خرافات ومنکرات رائج ہیں، اگر کوئی ان سے منع کرے، تو ظاہر ہے کہ وہ اصل اور صحیح تصوف وطریقت کا منکر نہ سمجھا جائے گا۔

چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی اپنے ایک محقق ومفصل رسالے ''**احکامُ الایتلاف فی احکام الاختلاف**'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

بعض منسوبین الی التصوف میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ ان کے یہاں بدعت وسنت کا فرق ہی لاشیٔ ہے، ان کا مذاق یہ ہے کہ ایسے امور میں نزاع واختلاف ناحقیقت شناسی سے ہے، سب کو توسع سے کام لینا چاہئے۔

اور یہ تو ان کا ذکر ہے، جو اللہ کا نام لینے والے اور کسی قدر مجاہدہ سے اپنے اخلاق کو درست کر چکے ہیں، ورنہ ان میں جو ذکر ومجاہدہ سے محروم ہیں، وہ تو اہلِ حق کے دشمن اور سنت سے نفور ہیں، اور متبعینِ سنت کو برے القاب سے یاد کرتے ہیں، اور اپنے تابعین کو ان سے نفرت دلاتے ہیں، اور بدعات کو سنن، بلکہ فرائض سے بڑھ کر مثل جزو ایمان کے اور اللہ ورسول کی محبت کی علامات میں سے ٹھہرا رکھا ہے، ان کی بے ہودگی کا تو ذکر ہی نہیں۔

میں ان کا ذکر کرتا ہوں، جن میں کچھ اثر ذکر وفکر کا ہے، سو اِن کا مذاق، جس کو وہ مذاقِ تصوف سمجھتے ہیں، یہ ہے کہ ایسے امور میں باہم اختلاف نہ کرنا چاہئے، بلکہ بعض تو جو زیادہ غالی ہیں، اسلام وکفر کے اختلاف میں بھی تنگی کو اچھا نہیں سمجھتے، اور ان کا مقولہ یہ ہے کہ ''موسیٰ بدینِ خود، عیسیٰ بدینِ خود'' اور اس کے دلائل اس

قسم کے اقوال ہیں۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص وعام

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

سو اول تو خدا جانے یہ کس کا قول ہے، دوسرے اگر کسی بزرگ کا بھی ہو، تب بھی دو حال سے خالی نہیں، اگر قرآن وحدیث کے خلاف ہے، تو اس کو بزرگ کا قول ہی کہنا جائز نہیں، اور اگر موافق ہے، تو موافقت کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان اقوال میں کوئی ایسی تاویل کی جائے، جس سے وہ قرآن وحدیث کے معارض نہ رہے (بوادر النوادر، ص ۶۸۷، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات، لاہور پاکستان۔ سنِ اشاعت: ۱۹۸۵ء)

باقی جن اختلافات کا حضرت مدنی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے، وہ اختلافات فقہی واجتہادی نوعیت کے ہیں، اور ان کو اپنے درجہ پر رکھا جائے، تو علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ وغیرہ کی تصریح کے مطابق وہ اختلافات زیادہ اہم نہیں، کیونکہ ان میں بعض دیگر اہلِ علم حضرات کا بھی اختلاف ہے، اور دونوں طرف شرعی دلائل ہیں، جیسا کہ پہلے گزرا، اور آگے بھی آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کہیں عوامی توسل یا وسیلہ کے مفہوم واستعمال اور اسی طرح شدِّ رحال وغیرہ کے مسئلہ میں کوئی مفسدہ ومنکر پایا جائے، تو اس صورت میں ''سداً للباب ''منع کیا جائے، تو مشائخِ دیوبند کی تصریح کے مطابق اس میں حرج نہیں۔

چنانچہ امدادُ الفتاویٰ میں ہے:

توسل، دعاء میں مقبولانِ حق کا خواہ وہ احیاء ہوں، یا اموات ہوں، درست ہے...... ہاں اگر کہیں عوام کو اُن کا غلو دیکھ کر بالکل بھی باز رکھا جائے، یہ بھی درست ہے، مگر حق تعالیٰ پر اجابت کو ضروری سمجھنا یا ان بزرگوں سے سہارے کی امید رکھنا یا ان کے اسماء کو اسمائے الٰہیہ کے برابر سمجھنا، یہ زیادۃ علی الشرع ہے (امدادُ الفتاویٰ، ج ۴، ص ۲۷۲، مسائلِ شتی، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی)

اور بوادرُ النوادر میں ہے:

البتہ اگر عوام کی (دینی) مصلحت کے لیے، اس (توسل) سے منع کیا جائے، تو ہم بھی ابنِ تیمیہ کی مخالفت نہ کریں گے، لیکن کلام مسئلہ کی تحقیق میں ہے، سو اس میں حق ہمارے ساتھ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ (بوادر النوادر، صفحہ ۷۰۹، رسالہ ''الادراک والتوصل الیٰ حقیقۃ الاشراک والتوسل'' مطبوعہ: ادارہ اسلامیات، لاہور، سنِ اشاعت: 1985ء)

حق ہمارے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اجتہادی دلائل سے جواز کا قول حق وصواب ہونے کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ہے، اگرچہ دوسرا اپنے نزدیک اجتہادی دلائل سے حق وصواب اپنے ساتھ سمجھتا ہو، جیسا کہ اس طرح کے دیگر مجتہَد فیہا مسائل میں بھی یہی مطلب ہوتا ہے، اور فقہائے کرام کے درمیان ''صواب اور خطاء'' کی بنیاد پر ہی اجتہادی عمل ہوتا ہے۔

اسی طرح مشائخِ دیوبند کے نزدیک ہر طرح کے منکرات وبدعات سے بچتے ہوئے زیارتِ قبور کے لیے سفر کا جائز ہونا راجح ہے۔

لیکن وہابیہ زیارتِ قبور کے لیے سفر کو ممنوع قرار دیتے ہیں، اگرچہ وہ مسجدِ نبوی کی زیارت کے لیے سفر کو مشروع وجائز مانتے ہیں۔

البتہ بزرگوں کی قبروں پر عرس وغیرہ کے مواقع پر جو لوگ سفر کرتے ہیں، مشائخِ دیوبند کے نزدیک اس سے منع کیا جائے گا، کیونکہ عرس میں متعدد منکرات پائے جاتے ہیں، نیز عرس میں شرکت سے مقصود عموماً زیارتِ قبور نہیں ہوتا، بلکہ اجتماع میں شرکت ہوتی ہے، اس لیے یہ زیارتِ قبور کے لیے سفر نہ ہوا، بلکہ قبر پر میلہ لگانے کے لیے ہوا، جس کی وجہ سے یہ فعلِ منکر میں داخل ہوگا۔

چنانچہ امداد الفتاویٰ میں ہے:

مقابر کی زیارت کو دور دراز سے جانا اس نہی میں داخل نہیں، البتہ اگر دوسرا سبب نہی کا ہو، تو منہی عنہ ہو جاوے گا، جیسے عرس متعارف کے مفاسد، کہ وہ بلاشبہ تحریمِ

حضور کے موجب ہیں، اور ظاہر ہے کہ سفر للمحرم، محرم ہے (امداد الفتاویٰ، ج۵ص۸۱، کتاب مایتعلق بالحدیث، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع ششم: 1409ھ)

ایک اور مقام پر ہے:

البتہ اگر سفر الی المقابر میں کوئی مفسدہ ہو، تو اس کو اس مفسدہ کی بناء پر منع کیا جاوے گا، گو اس (شدِ رحال والی) حدیث کا مدلول نہ ہو (امداد الفتاویٰ، ج۵ص۸۲، کتاب مایتعلق بالحدیث، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع ششم: 1409ھ)

اور ایک مقام پر خود حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے مساجدِ ثلاثہ کے علاوہ کی طرف مستقل سفر کر کے جانے کو غیر ثابت قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت کے ایک ملفوظ میں ہے کہ:

مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ، مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھنے میں تضاعفِ نماز موعود ہے، سو اس تضاعف کی تحصیل اگر بدون سفر ممکن نہ ہو، سفر کی بھی اجازت ہے، بخلاف دوسرے مشاہد کے (مثلاً کوہِ طور، کربلا، اجمیر وغیرہ) وہاں کوئی دلیل ثواب کی نہیں، اس لیے وہاں اس نیت سے سفر کرنا امرِ غیر ثابت کا اعتقاد ہے (ملفوظاتِ حکیم الامت ''ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ'' ج۲۳، ص۱۱۱، ملفوظ نمبر ۲۷۴، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ اشاعت: 1424ہجری)

جس سے معلوم ہوا کہ مساجدِ ثلاثہ کے علاوہ کی طرف سفر کی مشروعیت کا مسئلہ مجتہَد فیہ ہے۔

تاہم محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مسلمانوں کے قابلِ تاویل افعال واقوال میں تاویل نہ کرنے اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بعض متبعین کی طرف سے تارکِ صلاۃ وغیرہ کو کافر قرار دینے کا مسئلہ اگرچہ اجتہادی ہو، لیکن اس میں تاویل نہ کرنے کی وجہ سے فتنہ لازم آیا، اور آج بھی کوئی یہ طرزِ عمل اختیار کرے، تو اس کی وجہ سے متعدد فتنے لازم آئیں گے، چنانچہ جو لوگ قابلِ تاویل اقوال وافعالِ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، یا وہ جان بوجھ کر فرض نماز ترک کر دیتے ہیں، وہ لوگ چونکہ دوسرے مسلمانوں کے معاشرے میں گھل مِل کر رہتے ہیں،

اس لیے ان کو صریح کافر و مرتد قرار دینے کی صورت میں نہ ان کا ذبیحہ درست ہوتا ہے، نہ ان کا نکاح درست ہوتا ہے، اور نہ ہی اس نکاح کے بعد اولاد کا نسب صحیح ثابت ہوتا ہے، نہ ان کا جنازہ پڑھنا درست ہوتا ہے، نہ ان کی مغفرت کی دعاء کرنا اور ایصالِ ثواب کرنا درست ہوتا ہے، اور نہ ہی ان کی مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین کرنا درست ہوتا ہے۔

اور ظاہر بات ہے کہ ان تمام چیزوں کو ترک کرنا آسان نہیں، بلکہ ممکن ہی نہیں، اسی وجہ سے نجدیوں کی حکومت میں آج بھی اس قسم کے قابلِ تاویل افعال و اقوال کے مرتکبین اور تارکینِ صلاۃ کے ساتھ صریح کفر و شرک کے مرتکبین جیسا سلوک اختیار نہیں کیا جاتا۔

اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احادیث میں منافق کو قتل کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگ یہ باتیں کریں گے کہ یہ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَتٰـى رَجُـلٌ رَسُـوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجِعْرَانَةِ مُنْصَرَفَهٗ مِنْ حُنَيْـنٍ، وَفِـىْ ثَـوْبِ بِلَالٍ فِـضَّةٌ، وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَـقْبِـضُ مِـنْهَـا، يُعْطِي النَّاسَ، فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، اِعْدِلْ، قَالَ: وَيْلَكَ وَمَـنْ يَّـعْـدِلُ إِذَا لَـمْ أَكُـنْ أَعْـدِلُ؟ لَـقَدْ خِبْتُ وَخَسِرْتُ إِنْ لَمْ أَكُنْ أَعْـدِلُ فَـقَـالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: دَعْنِيْ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَـأَقْتُـلَ هٰـذَا الْـمُـنَـافِقَ، فَقَالَ: مَعَاذَ اللّٰهِ، أَنْ يَتَحَدَّثَ النَّاسُ أَنِّيْ أَقْتُلُ أَصْـحَابِيْ، إِنَّ هٰذَا وَأَصْحَابَهٗ يَقْرَءُ وْنَ الْقُرْآنَ، لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ، يَـمْـرُقُـوْنَ مِـنْـهُ كَـمَـا يَـمْـرُقُ السَّهْـمُ مِـنَ الـرَّمِيَّةِ (مسلم، رقم الحديث ١٠٦٣ "١٤٢" كتاب الزكاة، باب ذكر الخوارج وصفاتهم)

ترجمہ: مقامِ جعرانہ پر ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت غزوۂ حنین سے لوٹے تھے، اور حضرت بلال رضی اللہ

عنہ کے کپڑے میں چاندی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مٹھی بھر بھر کر (مستحق) لوگوں کو دے رہے تھے، اس آنے والے آدمی نے کہا کہ اے محمد! انصاف کیجئے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے لئے ویل (وہلاکت) ہو، کون ہے جو انصاف کرے، جب میں انصاف نہ کروں، اور اگر میں عدل و انصاف نہ کروں، تو خائب وخاسر (یعنی نقصان وخسارہ اٹھانے والا) ہوں گا، تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجئے، تاکہ میں اس منافق کو قتل کردوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی پناہ! لوگ باتیں کریں گے کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں یہ اور اس کے ساتھی قرآن پڑھتے ہیں لیکن وہ ان کے گلوں سے تجاوز نہیں کرتا (یعنی حلق سے آگے نہیں بڑھتا) اور یہ لوگ قرآن سے ایسے نکل جائیں گے، جیسے تیر اپنے شکار سے آر پار ہو کر نکل جاتا ہے (مسلم)

اور اسی وجہ سے علامہ ابنِ قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے تارکِ صلاۃ سے متعلق امام احمد رحمہ اللہ کی مختلف روایات کے ذیل میں فرمایا کہ:

ولأن ذلك إجماع المسلمين، فإنا لا نعلم فى عصر من الأعصار أحدا من تاركى الصلاة ترك تغسيله، والصلاة عليه، ودفنه فى مقابر المسلمين، ولا منع ورثته ميراثه، ولا منع هو ميراث مورثه، ولا فرق بين زوجين لترك الصلاة من أحدهما؛ مع كثرة تاركى الصلاة، ولو كان كافرا لثبتت هذه الأحكام كلها، ولا نعلم بين المسلمين خلافا فى أن تارك الصلاة يجب عليه قضاؤها، ولو كان مرتدا لم يجب عليه قضاء صلاة ولا صيام .

وأما الأحاديث المتقدمة فهى على سبيل التغليظ، والتشبيه له بالكفار، لا على الحقيقة، كقوله -عليه السلام :-سباب المسلم

فسوق، وقتاله كفر .وقوله : كفر بالله تبرؤ من نسب وإن دق . وقوله :من قال لأخيه يا كافر .فقد باء بها أحدهما .وقوله :من أتى حائضا أو امرأة في دبرها، فقد كفر بما أنزل على محمد . قال :ومن قال :مطرنا بنوء الكواكب .فهو كافر بالله، مؤمن بالكواكب .وقوله :من حلف بغير الله فقد أشرك .

وقوله :شارب الخمر كعابد وثن .وأشباه هذا مما أريد به التشديد في الوعيد، وهو أصوب القولين، والله أعلم (المغني لابن قدامة، ج ۲، ص ۳۳۲، كتاب الصلاة، باب الحكم في من ترك الصلاة، مسألة ترك الصلاة وهو بالغ عاقل جاحدا لها أو غير جاحد)

ترجمہ: مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے، اور ہمیں کسی بھی زمانے میں یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ نماز کے ترک کرنے والے کے فوت ہونے پر اس کے غسل دینے اور اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کو ترک کیا گیا ہو، یا وارثوں کو اس کی میراث سے منع کیا گیا ہو، یا اس کو اپنے مورِث کی میراث سے منع کیا گیا ہو، یا میاں بیوی میں سے کسی ایک کے نماز کو ترک کرنے پر دونوں کے درمیان تفریق وجدائی کرائی گئی ہو، باوجودیکہ نماز ترک کرنے والوں کی کثرت ہے، اور اگر نماز ترک کرنے والا کافر ہوتا، تو یہ تمام احکام بھی ثابت ہوتے، اور ہمیں مسلمانوں کا بھی اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ملتا کہ نماز کے تارِک پر قضا واجب ہوتی ہے (یعنی نماز کے تارک پر بالاتفاق قضا واجب ہے) اور اگر نماز کا تارک مرتد شمار ہوتا، تو اس پر نماز اور روزے کی قضا واجب نہ ہوتی۔

جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے، جو پیچھے گزریں (جن میں نماز کے ترک

کرنے کو کفر بتایا گیا ہے) تو وہ تغلیظ وتشدید کے طور پر، اور کفار کے ساتھ مشابہت کے طور پر واقع ہوئی ہیں، ان میں حقیقی کفر مراد نہیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ نسب سے برائت کرنا اگر چہ کمزور درجے کی ہو، یہ اللہ کے ساتھ کفر ہے۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جس نے اپنے بھائی کو کافر کہا، تو ان دونوں میں سے کوئی ایک اس کا مستحق ہو جائے گا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو حائضہ عورت کے پاس آیا، یا جس نے اپنی عورت کی دُبر سے شہوت پوری کی، تو اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہوئی چیز کا انکار کیا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے یہ کہا کہ ہم پر فلاں ستاروں کی وجہ سے بارش کی گئی ہے، تو اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، اور وہ ستاروں پر ایمان لایا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھائی، تو اس نے شرک کیا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شراب پینے والا، بت کی عبادت کرنے والے کی طرح ہے۔

اور اس کے علاوہ بھی کئی احادیث میں وعید کی تشدید اور سختی کو مراد لیا گیا ہے، اور یہ دونوں قولوں میں زیادہ صواب والا قول ہے۔ واللہ اعلم (المغنی)

اس لیے ہم محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے ان متبعین کو جو مسلمان کے قابلِ تاویل افعال واقوال میں تاویل کے قائل نہیں، اور عمداً تارکِ صلاۃ کو شرکِ اکبر کا مرتکب قرار دیتے

ہیں، ان کو اس سلسلہ میں اجتہادی خطا پر سمجھتے ہیں، اگرچہ ان مسائل کے اجتہادی ہونے کی وجہ سے اُن کو عاصی و گناہ گار بھی نہیں سمجھتے۔

البتہ اگر کوئی حکمران، لوگوں کو شرکِ صوری اور بدعات سے بزورِ قوت نہی عن المنکر کرے، پھر ان افعال کے مرتکبین کی طرف سے اس کا بزورِ قوت مقابلہ ومقاتلہ کیا جائے، تو ان کے ساتھ حکمران جماعت کی طرف سے باغی ہونے کی حیثیت سے قتال درست ہوسکتا ہے، جبکہ اس کے علاوہ ان کے شر کو دبانے کا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، مگر یہ بات ظاہر ہے کہ بغاوت کا یہ مسئلہ تکفیر سے بالکل الگ اور جدا ہے۔ [1]

اب مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا وہ مکتوب ملاحظہ فرمایئے، جس میں انہوں نے اہلِ نجد یا وہابیہ کے متعلق اپنے سابق سخت موقف سے رجوع کا اعلان فرمایا ہے۔

مولانا حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی (المتوفیٰ: 1367ہجری/ 1978عیسوی) نے اپنی تالیف ''اکمل البیان فی تائید تقویۃ الإیمان ،بجواب اطیب البیان ''میں ، روزنامہ ''زمیندار'' لاہور، مورخہ 17 مئی 1925 عیسوی کے حوالے سے مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا درجِ ذیل اعلان نقل کیا ہے:

> مجھ کو اس امر کے اعلان کرنے میں ذرہ پس وپیش نہیں ہوسکتا کہ میری وہ تحقیق جس کو میں (برخلاف اہلِ نجد) رسالہ ''رجوم المذنبین'' اور ''الشہاب الثاقب'' میں لکھ چکا ہوں، اس کی بنا اُن کی کسی تالیف وتصنیف پر نہ تھی، بلکہ محض افواہوں یا ان کے مخالفین کے اقوال پر تھی، اب ان کی معتبر تالیف بتارہی ہے کہ ان کا خلاف جمہور اہلِ سنت والجماعت سے اس قدر ہرگز نہیں، جیسا کہ ان کی نسبت مشہور کیا گیا ہے، بلکہ چند جزوی امور میں صرف اس درجہ تک ہے کہ جس کی وجہ سے ان کی

---

[1] إذا ما دعا الإمام البغاة إلى الدخول فی طاعته، وكشف شبهتهم، فلم يستجيبوا وتحيزوا مجتمعين، وكانوا متهيئين للقتال فإنه يحل قتالهم .ولكن هل نبدؤهم بالقتال، أم لا نقاتلهم إلا إذا أظهروا المغالبة؟ هناک اتجاهان (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٨ص١٣٨ ، مادة " بغاة ")

تکفیر، تفسیق یا تضلیل نہیں کی جا سکتی، واللہ اعلم (اکمل البیان فی تائید تقویۃ الإیمان، بجواب اطیب البیان، صفحہ ۹، ۱۰، دیباچہ، مطبوعہ: المکتبۃ السّلفیہ، لاہور، 1965 عیسوی)

حضرت مدنی کے مذکورہ مکتوب کو مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے بھی اپنے مضمون ''شیخ محمد بن عبدالوھاب اور ہندوستان کے علمائے حق'' میں صفحہ 93 پر نقل کیا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے مذکورہ اعلان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ''الشھاب الثاقب'' وغیرہ میں جو اہلِ نجد کے متعلق پہلے سخت حکم بیان کیا تھا، اور اہلِ نجد کی تفسیق وغیرہ کی تھی، اس کی بنا مخالفین کی طرف سے پھیلائی ہوئی افواہوں پر تھی، لیکن اہلِ نجد کی معتبر کتابیں مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اہلِ نجد کا جمہور اہل السنۃ والجماعۃ سے اس درجہ کا اختلاف نہیں کہ جس کی وجہ سے ان کی تکفیر، تفسیق یا تضلیل کی جا سکے، بلکہ صرف چند جزوی یا فروعی نوعیت کے مسائل میں اختلاف ہے، جن میں ان کو اجتہادی طور پر خاطی تو قرار دینے کی گنجائش ہے، لیکن گمراہ اور عاصی قرار دینے کی گنجائش نہیں۔

پس جس طرح مولانا مدنی کے مذکورہ اعلان سے یہ معلوم ہوا کہ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے متبعین اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج نہیں، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ اکابر دیوبند کا اہلِ نجد سے چند جزوی وفروعی اور فقہی مسائل میں اختلاف موجود ہے، جن میں سے بعض اختلافات کا ذکر ''نقشِ حیات'' کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کی مذکورہ تحریر بھی مشائخِ دیوبند کے افراط وتفریط سے بچ کر راہِ اعتدال اختیار کرنے اور رجوع الی الحق کی واضح دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ افراط وتفریط سے بچ کر راہِ اعتدال پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(20)......مولانا محمد منظور نعمانی کا حوالہ

برصغیر، بطورِ خاص پاک وہند کی علمی دنیا اور بالاخص ہندوستان وپاکستان کے دیوبندی مکتبِ

فکر میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1417ہجری) کا نامِ نامی واسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی کئی دینی وعلمی تصنیفات مسلمانوں کے عام وخاص کے بڑے حلقہ میں مقبولِ عام ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں ''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق'' کے نام سے ایک تفصیلی مضمون تحریر فرمایا ہے، جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

یہ مضمون پہلے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی حیات میں ان کے ماہنامہ ''الفرقان'' میں بھی قسط وار شائع ہوا تھا، جس کی آخری قسط ماہنامہ ''الفرقان'' کے ربیع الآخر 1398ہجری، بموافق مارچ 1978عیسوی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، ماہنامہ ''الفرقان'' میں اس مضمون کی اشاعت کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ (شیخ الحدیث :مظاہرالعلوم، سہارن پور)اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ (مہتمم : دارالعلوم دیوبند، ہند) کی طرف سے بھی مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے اس مضمون کی تحسین وتعریف اور تائید کی گئی، جس کی وجہ سے اس مضمون کی اہمیت، مشائخِ دیوبند واہلِ دیوبند کے نزدیک خاص حیثیت اختیار کرگئی، اوراس کونظرانداز کرنا درست نہ رہا، البتہ مولانا منظور نعمانی صاحب کے اس مضمون میں مذکور چند جزوی چیزوں میں اختلاف ہونا نقصان دہ نہیں، ہمیں بھی اس کی چند جزوی چیزوں سے اختلاف ہے، جن کو ہم نے اپنے اس مضمون کا حصہ نہیں بنایا۔

ہم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ کے اس مضمون کے چند اہم اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

مولانا منظور نعمانی صاحب اپنے مذکورہ رسالے ''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''اب سے قریباً 32، 33 سال پہلے 1946 عیسوی میں مرحوم مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ''محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم و بدنام مصلح'' شائع ہوئی، یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی سوانحِ حیات ہے، جو مصنف مرحوم نے خود شیخ کی تصانیف، ان کی سوانح اور ان کی حمایت و تائید اور مخالفت و تردید میں عربی، انگریزی وغیرہ مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی پچاسوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد بڑی محنت و کاوش سے لکھی تھی، اس کے مصنف کی بعض رایوں سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کا مطالعہ کرنے والے ہر انصاف پسند کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مصنف نے مؤرخانہ تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔

بہرحال سب سے پہلے اسی کتاب کے مطالعہ سے راقم سطور کو شیخ محمد بن عبد الوہاب کی شخصیت و سوانح، ان کی دعوتِ اخلاص، توحید اور اس کے اثرات و ثمرات اور معاند مخالفین کی طرف سے اس کی مخالفت و مزاحمت کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔ [1]

اس کے بعد دعوت اور مسلک کی وضاحت سے متعلق خود شیخ ممدوح، ان کے فرزندوں، تلامذہ اور ان کے حلقہ کے بعض دیگر مصنفین کی چھوٹی بڑی بہت سی تصنیفات مختلف اوقات میں دیکھنے کا اتفاق ہوا، نیز اِن کی شخصیت اور سوانح پر ان کے معتقدین کی لکھی ہوئی بعض کتابیں اور ان کے بعض سخت ترین مخالفین کی کتابیں بھی پڑھیں، ان سب چیزوں کے مطالعہ کے بعد راقم سطور کی رائے یہ قائم ہوئی کہ ان کا مسلک و موقف قریب قریب وہی ہے، جو شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ، ان کے تلامذہ حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے، اور ردِ شرک اور دعوتِ اخلاصِ توحید کے بارے میں ان کا رویہ (کچھ فرق کے ساتھ) وہی ہے، جو

---

[1] مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی اس کتاب کا ذکر اور اس کے چند اقتباسات آگے آرہے ہیں۔محمد رضوان۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا ''تقویۃ الایمان'' میں ہے۔ [1]

اور اسی مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح ہمارے ملک میں قبر پرستوں، تعزیہ پرستوں اور بدعات وخرافات کو اپنا دین بنا لینے والوں کی طرف سے ،حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے خلاف طرح طرح کی افترا پردازیاں کر کے عام مسلمانوں کو ان سے متنفر کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں (جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے) یہی معاملہ شیخ محمد بن عبدالوھاب کے ساتھ بھی ہوا ہے، بلکہ چونکہ ان کی اخلاصِ توحید کی دعوت اور اصلاحی جدوجہد کے پروگرام میں جہاد بالسیف بھی شامل تھا، اور ان کی جماعت کو مسلسل کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں، اور علاقے کے علاقے ان کے قبضہ میں آ رہے تھے، یہاں تک کہ نجد کے علاقے سے نکل کر حجازِ مقدس اور حرمین شریفین کو بھی انہوں نے اپنے دائرۂ اقتدار میں لے لیا، اس کی وجہ سے آس پاس کے اربابِ ریاست وحکومت بھی ان سے خطرہ محسوس کرنے لگے، اور مختلف بلاد وامصار کے ان کے مذہبی مخالفین، قبوریین اور خرافیین ان کے خلاف جو مذہبی پروپیگنڈا کر رہے تھے، اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پاک میں گستاخیاں کرنے والے، اولیاء اللہ کے دشمن اور اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر، مشرک اور مباحُ الدم قرار دینے والے مشہور کر رہے تھے، یہ اربابِ حکومت بھی اپنے پورے وسائل اور مکائد کے ساتھ اس پروپیگنڈے میں شریک ہو گئے، اور پھر جب حکومتِ عثمانیہ ترکی کے حکم سے والیٔ مصر محمد علی پاشا کی فوجوں نے ان وہابیوں کو 1227 ہجری میں حجازِ مقدس سے بے دخل کر دیا، اور اس کے کچھ عرصہ بعد ''درعِیَّۃ'' کی آلِ سعود کی حکومت کا بھی

---

[1] البتہ خود صاحبِ ''تقویۃ الایمان'' شاہ اسماعیل شہید اور حضرت گنگوہی اور علامہ کشمیری وغیرہ رحمہم اللہ نے اس کتاب میں کچھ الفاظ وانداز کے سختی وتشدد پر مبنی ہونے کا اعتراف واظہار فرمایا ہے، جیسا کہ پہلے گزرا، اسی طرح سے مشائخِ دیوبند نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے انداز ومزاج میں بھی سختی وتشدد کا حکم لگایا ہے۔ محمد رضوان۔

گویا خاتمہ کر دیا، تو خاص طور سے حجازِ پاک، شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت کے خلاف اس پروپیگنڈے کا مرکز بن گیا، اور وہاں سے ان کے متعلق ایسی باتیں مشہور ہونے لگیں، جن کو سن کر ہر مسلمان نہ صرف یہ کہ ان سے متنفر ہو، بلکہ ان کو دنیا بھر کے کافروں سے بدتر قسم کا کافر سمجھے، اور چونکہ حج ادا کرنے کے لیے سارے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی حرمین شریفین میں حاضری ہوتی تھی، اس لیے ان وہابیوں، نجدیوں کے خلاف وہاں جو باتیں عام طور سے مشہور تھیں، کہی اور لکھی جاتی تھیں، اور وہ ان حاجیوں کے ذریعہ سارے عالمِ اسلام میں پہنچ جاتی اور پھیل جاتی تھیں، پھر ان وہابیوں کے ہر علاقہ کے دشمن، قبوریین وخرافیین غالباً اس پر حاشیہ آرائی بھی کرتے تھے (شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص ۱۲ تا ۱۵ ''مقدمہ'' مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا یہ تجزیہ واقعی حقائق کے مطابق ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے خلاف مخالفین ومعاندین نے ایک مہم کے طور پر خوب پروپیگنڈہ کیا، جس سے بعض متدین واصحابِ علم بھی متاثر ہوئے، اور انہوں نے بعض باتوں کو حقیقت کے مطابق سمجھتے ہوئے نیک نیتی کے ساتھ اپنی تحریرات میں نقل کر دیا ''**وما یعلم الغیب الا اللہ**''

اپنے اسی مذکورہ رسالہ میں ایک موقع پر مولانا منظور نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں ایک دوسری یہ واقعی حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ان کی دعوت وتحریک صرف وعظ ونصیحت اور تصنیف وتالیف یا تبلیغی دوروں تک محدود نہیں تھی، بلکہ جہاد بالسیف بھی اس کا ایک جزء تھا، وہ قبروں کو سجدہ کرنے، نذر نیاز چڑھانے، ان سے مرادیں مانگنے، اور اس طرح کے تمام مشرکانہ افعال کو بت پرستی کی طرح شرک اور ان کے مرتکبین کو مشرک قرار دیتے تھے، اسی طرح تارکینِ صلاۃ (بے نمازیوں) کو (امام احمد بن حنبل کے مسلک

کے مطابق) خارج از اسلام کافر سمجھتے تھے، اوراس طرح کے سب لوگوں کے بارے میں (جو اپنے کو مسلمان کہتے ہوں، اور کسی طرح کے کفر یا شرک کے مرتکب ہوں) ان کا نقطۂ نظر اور رویہ (جو اِن کی کتابوں میں پوری صراحت اور صفائی کے ساتھ لکھا ہے) یہ تھا کہ ان کو قرآن وحدیث کے حوالوں سے پہلے اللہ و رسول کا حکم پہنچایا جائے، اور ناصحانہ طور پر سمجھانے کی کوشش کی جائے، اور پوری طرح حجت کا اتمام کیا جائے، اگر اس کے بعد بھی باز نہ آئیں، تو پھر بشرطِ استطاعت ان کے خلاف جہاد کیا جائے۔

اپنے اس نقطۂ نظر کی بنیاد پر وہ یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ''مسلمانوں'' میں سے (مذکورہ بالاقسم کا) کفر وشرک ختم کرنے کے لیے اور صحیح اسلام پر ان کو لانے کے لیے سیاسی اور حکومتی اقتدار حاصل کیا جائے، اور علاقہ نجد کی ایک ریاست (''درعِیَّۃ'' کی آلِ سعود کی حکومت) جس نے ان کی دعوت کو قبول کرلیا تھا، اس سیاسی اور حربی مہم کی علمبردار بن گئی تھی، لیکن اس کے قائد اور روحِ رواں شیخ محمد بن عبدالوہاب ہی تھے، ان کے بعد ان کی اولاد کا یہی کام اور مقام تھا۔

آس پاس کی اکثر ریاستوں سے ان کی جنگیں بھی ہوئیں، جن میں تحریک کے ابتدائی دور میں اکثر وبیشتر ان کو کامیابی حاصل ہوئی، اور ''درعِیَّۃ'' کی آلِ سعود کی حکومت کی حدود کافی وسیع ہوگئیں، پھر ایک وقت آیا کہ انہوں نے بڑھ کر حرمین شریفین پر بھی قبضہ کرلیا، اور وہاں بھی حکومت کی طاقت سے اپنے دینی و مذہبی نقطۂ نظر کے مطابق انہوں نے اصلاحات نافذ کیں، مزارات پر بنے ہوئے قبے تڑوائے، اور اس طرح کے اور بھی اقدامات کیے، اس سلسلہ میں مختلف بلاد وامصار اور مختلف علاقوں کے ان علماء کی طرف سے ان کی شدید مخالفت ہوئی، اور فتوے جاری ہوئے، جو اِن سے مذہبی اور مسلکی اختلاف رکھتے تھے۔

اوران میں سے بہت سوں نے اس مخالفت میں وہی روش اختیار کی، اور اسی طرح کا پروپیگنڈا کیا، جیسا کہ ہمارے ملک میں حضرت شاہ اسماعیل شہید کے مخالف علماء نے شرک و بدعات کے خلاف ان کی جدوجہد اور ''تقویۃ الایمان'' کی تصنیف واشاعت کے بعد کیا تھا، جس کا سلسلہ راہِ خدا میں ان کی شہادت پر قریباً ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک چل رہا ہے۔

پھر جن ریاستوں یا حکومتوں سے آلِ سعود کی حکومت کا ٹکراؤ ہوا (جس کی اصلی طاقت اور روح بلاشبہ شیخ **محمد بن عبدالوھاب** کی دعوت وتحریک ہی تھی) اور علیٰ ہذا جن حکومتوں نے اس دعوت وتحریک کو اپنے لیے سیاسی خطرہ سمجھا، انہوں نے بھی اس کا راستہ روکنے اور عالمِ اسلامی میں اس کے خلاف نفرت وعداوت کی آگ بھڑکانے کے لیے ان کے خلاف مذہبی پروپیگنڈے ہی کو حکومتی ذرائع سے آگے بڑھایا، اور اس تدبیر سے انہوں نے اپنے مقصد میں یقیناً بڑی کامیابی حاصل کی (شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص۳۰ تا ۳۲ ''شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں ایک قابلِ لحاظ حقیقت''، مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

مولانا منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ کا مندرجہ بالا تبصرہ کافی حد تک درست ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ قبروں کو سجدہ کرنے اور نذر و نیاز چڑھانے اور تارکینِ صلاۃ کو شرکِ اکبر کا مرتکب قرار دینے کا مسئلہ اپنی ذات میں مجتہد فیہ کیوں نہ ہو، مگر ان افعال میں مسلمانوں کی طرف سے کسی تاویل کو قبول نہ کرنا اور شرکِ جلی کا حکم لگانا سخت فتنے کا باعث بنا۔

جس کو ہم اجتہادی طور پر خطاء سمجھتے ہیں، بے نمازی کے کافر قرار دینے کے مسئلہ پر علامہ ابنِ قدامہ حنبلی کی عبارت پہلے گزر چکی ہے، بعض چیزوں کا خود مولانا منظور نعمانی صاحب نے آنے والی عبارت میں ذکر فرمایا ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ بے نمازی کے کفرِ جلی کا حکم لگانے نہ لگانے میں امام احمد بن حنبل سے مختلف

روایات مروی ہیں، جس طرح تارکینِ زکاۃ وتارکینِ صوم وغیرہ کے متعلق بھی مختلف روایات مروی ہیں، اوران کا ذکر آگے علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے آتا ہے۔

مولانا منظور نعمانی صاحب اپنے رسالے ''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق''میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

مگر اصولی درجہ میں اس توافق اور طرزِ فکر میں اس یکسانیت اور یگانگت کے باوجود بعض نظریات ومسائل میں ہمارے اکابر شاہ اسماعیل شہید اور علمائے دیوبند وغیرہ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت کے نقطۂ نظر اور رویہ میں کچھ فرق واختلاف بھی ہے، مثلاً وہ (اہلِ نجد) حضرات، زیارتِ نبوی کو مستحب ومسنون بلکہ ''افضلِ اعمال'' ماننے کے باوجود مشہور حدیث ''لاتشد الرحال.... الخ '' کی بنیاد پر خاص زیارت کے لیے مدینہ منور کی طرف سفر کرنا جائز نہیں سمجھتے، جوکہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ وابنِ القیم وغیرہ کا مشہور مسلک ہے، ان کے نزدیک سفر مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کی نیت سے کرنا چاہیے، پھر وہاں پہنچ کر زیارت کی سعادت اوراس کا ثواب بھی حاصل کرے، یا مسجد شریف میں ادائے نماز کی نیت کے ساتھ ضمنی طور پر زیارت کی بھی نیت کرلے (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں شیخ عبداللہ بن شیخ محمد بن عبدالوہاب کے رسالے کے حوالے سے نقل کیا جاچکا ہے) لیکن ہمارے اکابر کے نزدیک زیارتِ نبوی کی نیت سے مدینہ منور کا سفر کرنا بھی از قبیلِ حسنات وقربات اور باعثِ اجر وثواب ہے، اس لیے وہ یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ مدینہ منورہ جانے والے حضرات، زیارتِ نبوی اور مسجد شریف میں ادائے نماز دونوں کی مستقل نیت کریں، حدیث ''لاتشد الرحال.... الخ '' کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ اس ممانعت کا تعلق صرف مساجد کے لیے سفر کرنے سے ہے (تفصیل شروحِ حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے)

اسی طرح دعا میں توسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم اور توسل بالصالحین کو شیخ محمد بن عبدالوہاب اوران کے متبعین بالکل جائز نہیں سمجھتے، اور ہمارے اکابر کے نزدیک وہ ناجائز نہیں ہے، کیونکہ وہ فی الحقیقت ''توسل باعمالھم الصالحۃ ''ہی کی ایک صورت ہے(اور توسل بالاعمال الصالحۃ بالاتفاق جائزاور ثابت ہے)ہاں !اگر کوئی جاہل اور گمراہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اللہ کے کسی اور مقبول وفات یافتہ بندے کے وسیلہ سے دعا کرے،اور یہ سمجھے کہ اس وسیلہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر معاذ اللہ کوئی بوجھ اور دباؤ پڑے گا،اور وہ قبول ہی کرلیں گے،یا یہ سمجھ کر وسیلہ سے دعاء کرے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس وسیلہ کے بغیر دعاء قابلِ سماعت نہ ہوگی،تو بے شک یہ عقیدہ سخت گمراہانہ اور یہ فعل حرام ہوگا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر سلام عرض کرنے کے ساتھ آپ سے شفاعت کے سوال کو شیخ محمد بن عبدالوہاب اوران کے متبعین ناجائز بلکہ ''ایک طرح کا شرک'' کہتے ہیں، جیسا کہ شیخ عبداللہ بن محمد کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے(اس بارے میں ان کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے، جو اِن حضرات کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے)لیکن ہمارے اکابر اس اصولی عقیدہ اور یقین میں ان سے متفق ہونے کے باوجود کہ ''قیامت اور آخرت میں کوئی نبی یا ولی یا فرشتہ، اللہ تعالیٰ کے اذن واجازت کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں کرسکے گا، اور صرف اسی بندے کے حق میں شفاعت ہوسکے گی،جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اجازت ہوگی'' زائر کے لیے روضۂ مبارک پر حاضر ہوکر سلام عرض کرنے کے ساتھ آپ سے شفاعت اور استغفار کی استدعا کو بھی صحیح سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک ان دونوں باتوں میں کوئی منافات نہیں ہے،اور اس طرح کی شفاعت کی ہرگز یہ بنیاد نہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کے معاملہ میں ''خود

مختار“ سمجھتے ہیں، ایسا سمجھنا بلاشبہ سخت گمراہی ہے، کسی مخلوق کو بھی بارگاہِ خداوندی میں بطورِ خود شفاعت کرنے کا اختیار نہیں ہے، اور نہ ہوگا (”قل للّٰہ الشفاعة جمیعا .... من ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہ)

اسی طرح کا ایک اختلاف ان حضرات کے اور ہمارے اکابر کے رویہ میں یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اشعار وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے استعانت اور استغاثہ کے انداز میں ندا اور خطاب کرتے ہیں، ان کے بارے میں ہمارے اکابر کا موقف یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر اور عالمُ الغیب و متصرف سمجھ کر ایسا خطاب اور استمد اد واستغاثہ کیا جائے، تو بلاشک وشبہ قطعاً شرک ہے، لیکن اگر کسی شخص کا عقیدہ صحیح ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ حاضر وناظر سمجھتا ہے، نہ عالمُ الغیب اور متصرف سمجھتا ہے، بلکہ ایسا سمجھنے کو شرک جانتا ہے، لیکن شوقیہ طور پر حاضر فی الذہن سے خطاب کر رہا ہے (جیسا کہ اشعار میں بکثرت ہوتا ہے) یا اس امید پر خطاب کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا یہ پیام آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادے گا، اور آپ ان شاءاللہ دعاء فرمائیں گے، تو یہ ہرگز شرک نہیں ہے، اور اسی بنا پر صاحبِ قصیدۂ بردہ بوصیری اور مولانا جامی وغیرہ کے اس طرح کے اشعار کو اسی پر محمول کرتے ہیں، اور یہ ہرگز ”زبردستی کی تاویل“ نہیں ہے، شاعری میں اور محبت میں غائبین سے اس طرح کا خطاب شائع ذائع ہے، ہاں! اسی کے ساتھ ہمارے اکابر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ عوام کے عقیدہ کی حفاظت کے لیے اس طرح کی تعبیرات سے بچنا چاہیے، کیونکہ یہ ایہامِ شرک سے خالی نہیں ہے، ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا گنگوہی کے فتاویٰ میں اس مسئلہ کے بارے میں یہی وضاحت وتفصیل کی گئی ہے (فتاویٰ رشیدیہ، حصہ اول، صفحہ ۸۴)

لیکن شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے متبعین اس مسئلہ میں یہ تفصیل نہیں کرتے،

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بھی وفات یافتہ بزرگ سے اس طرح کے خطاب کو بہرحال ''شرک'' قرار دیتے ہیں (حالانکہ عقیدہ کی بنیاد پر حکم میں فرق ہونا ہمارے نزدیک بدیہی بات ہے)

ان مسائل میں ان حضرات کا جو موقف اور رویہ ہے، غالباً اسی کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے فتوے میں ''مزاج کی شدت'' سے تعبیر کیا ہے۔

تارکینِ صلاۃ (مسلمان کہلانے کے باوجود نماز نہ پڑھنے والوں) کی تکفیر وعدمِ تکفیر کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے، جن میں ان حضرات کا اور ہمارے اکابر کا موقف مختلف ہے، وہ حضرات تارکِ صلاۃ کو قطعی کافر قرار دیتے ہیں، اور ہمارے اکابر انتہائی درجہ کا گناہ گار اور انتہائی درجہ کی سزا کا مستحق قرار دینے کے باوجود اس کو کافر اور خارج از ملت قرار نہیں دیتے۔

اس مسئلہ کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے، اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل اور بعض دوسرے ائمہ سلف بھی تارکِ صلاۃ کو کافر، مرتد قرار دیتے ہیں۔ [1]

بہرحال ان تمام مسائل میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے، جس کی وجہ سے کسی بھی فریق کو اسلام یا دائرہ اہلِ سنت سے خارج قرار دیا جا سکے۔

ان مسائل کا ذکر اس موقع پر صرف اس غرض سے کیا گیا ہے کہ دونوں جماعتوں کے مسلکی اختلاف کی نوعیت اور اس کا درجہ سامنے آ جائے، اور کم از کم اہلِ علم اور اربابِ دانش کو معلوم ہو جائے کہ ان میں کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے، جس کی بناء پر کوئی فریق خدا ترسی کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں دوسرے فریق کی تکفیر، تفسیق یا تضلیل کر سکے۔

---

[1] تاہم امام احمد ہی سے تارکِ صلاۃ کی عدمِ تکفیر کی روایت بھی مروی ہے، جس کو خود بعض حنابلہ نے راجح قرار دیا ہے۔ محمد رضوان۔

رہا دلائل اور علمی بحث مباحثہ کا معاملہ، تو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہ، ان کے تلامذہ اوران کے بالمقابل ان کے معاصر، امت کے جلیل القدر عالم شیخ تقی الدین سبکی شافعی اوران کے حلقہ کے اہلِ علم سے لے کر ہماری اس چودھویں صدی کے آغاز میں شیخ احمد زینی دحلان مکی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، نواب صدیق حسن خان ، اور مولانا عبدالحیئ فرنگی محلی اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے سلسلہ کے درجنوں علماء ومصنفین اور ہمارے پاس، دور تک دونوں مسلکوں کے عرب وعجم کے اہلِ علم واصحابِ قلم نے قریباً سات سو سال کی طویل مدت میں ان مسائل پر جو بے گنتی کتابیں لکھی ہیں، اگر ان کا صرف ایک ایک نسخہ لیا جائے، تو اچھا خاصہ کتب خانہ بن جائے گا۔

راقمِ سطور کے نزدیک اس کے بعد بالکل ضرورت نہیں ہے کہ ان مسائل کو علمی بحث ومباحثہ کا موضوع بنایا جائے، جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، یہ سب اس قسم کے مسائل ہیں، جن میں اہلِ سنت کے مختلف طبقات میں مسلک وموقف کا اختلاف رہا ہے، اور رہے گا، اور یقین ہے کہ اس اختلافِ رائے کی وجہ سے دونوں میں سے کوئی فریق بھی جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا۔

طرزِ فکر کے فرق اور بعض مسائل میں اختلافِ رائے کا یہ ذکر تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آگیا، اب ہم اور ناظرین پھر اصل موضوع پر آجائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب اوران کے سلسلہ کے اکابر علماء کی کتابیں دیکھنے کے بعد یہ حقیقت بغیر کسی شک وشبہ کے سامنے آجاتی ہے کہ ان کی اصل دعوت اخلاصِ توحید واتباعِ سنت کی اور ہر قسم کے شرک وبدعت کے خلاف حسبِ استطاعت جہاد اور اسلام کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنے کی تھی، اور بنیادی طور پر ان کا پیغام وہی تھا، جو ''تقویۃ الایمان'' کے ذریعہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ

نے ہندوستان کے بگڑے ہوئے مسلمانوں کو دیا تھا۔

بعد میں شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی اسی دعوت اور پیغام کے علمبردار جماعت دیوبند کے اکابر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اوران کے خلفاء وتلامذہ بھی رہے، اوراسی جرم میں بدایوں، بریلی وغیرہ کے شرک وبدعت کے حامی مولویوں، مفتیوں نے ان کو وھابی قرار دے کر ہر جگہ کے جاہل عوام کوان کے خلاف بھڑکایا، کیونکہ وہابیوں (یعنی شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت) کے خلاف اس زمانہ کی کئی ایک حکومتوں نے (جو اِن کی جماعت کے جذبۂ جہاداوران کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کواپنے لیے خطرہ سمجھتی تھیں) اوران کے ساتھ مل کر قبر پرستی وغیرہ مشرکانہ اعمال اور بدعات کے حامی علمائے سوء نے اپنے پورے وسائل سے کام لے کر امکانی حد تک پوری اسلامی دنیا میں ایسا پروپیگنڈا کیا تھا کہ قریباً ہر جگہ کے مسلمان، صرف عوام ہی نہیں، بلکہ وہ علماء اور خواص بھی جو حقیقتِ حال سے واقف نہیں تھے، ان نجدی وہابیوں کو یہود ونصاریٰ اور مجوس وہنود سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔

اس لیے عام طور سے صحیح العقیدہ مسلمان بھی ان کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا تھے، اوران سے بے تعلقی اور برأت ظاہر کرنا، بلکہ نفرت وعداوت کا اظہار کرنا ایمان واسلام اوراللہ ورسول کی محبت کا تقاضا سمجھتے تھے۔

اس صورتِ حال کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم نے بھی (جو ہندوستان میں مسلکِ اہلِ حدیث کے اولین اور پر جوش داعیوں میں تھے، اور بلاشبہ جن کا حصہ ہندوستان میں اس مسلک کی اشاعت اور فروغ میں دوسرے سب لوگوں سے زیادہ ہے) شیخ محمد بن عبدالوہاب اوران کی دعوت ومسلک سے اپنی اور جماعتِ اہل حدیث کی برائت

ظاہر کرنا، اوران کو مطعون ومجروح کرنا، اور''فسادی'' تک قرار دینا ضروری سمجھا، ان کی کتاب ''ترجمان وہابیہ'' کا یہی مقصد اور موضوع ہے (شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص ۶۸ تا ۶۷، بعنوان: ''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور اکابر جماعت دیوبند کے طرزِ فکر میں بعض جزوی اختلافات'' مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی مذکورہ تفصیلی عبارت سے وہابیہ اور دیگر علمائے ہند بالخصوص علمائے دیوبند کے مسلکی واجتہادی اختلاف کا ایک نمونہ سامنے آجاتا ہے۔

ہمیں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے اس موقف سے اتفاق ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور مشائخِ دیوبند کے مابین جن مسائل میں اختلاف ہے، وہ جزوی وفروعی اور اجتہادی نوعیت کا ہے، جن کی بناپر کسی جماعت کی بھی تکفیر وتضلیل اور تفسیق جائز نہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> شیخ محمد بن عبدالوہاب کے سوانح نگاروں نے بھی کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے متبعین میں کچھ لوگ بہت غالی بھی تھے، وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے (دیکھی جائے احمد عبدالغفور عطار کی کتاب محمد بن عبدالوہاب صفحہ ۱۲۳ تا ۱۷۵)
> اور غالبًا جماعت کے اسی جاہل اور غالی عنصر کی حرکتوں کی وجہ سے جماعت زیادہ بدنام ہوئی (شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص ۱۰۴ و ۱۰۵، بعنوان: ''شیخ کے خاندان میں علمِ دین اور خدمتِ دین کا توارث اور تسلسل'' مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے نام لیوا بعض لوگ بہت غالی تھے، جن کے طرزِ عمل سے جہاں دوسرے مسلمانوں کو نقصان پہنچا، اسی کے ساتھ محمد بن عبدالوہاب نجدی اوران کی جماعت کی ساکھ پر بھی ان کے طرزِ عمل سے بُرا اثر پڑا۔

اور پیچھے بعض معتبر اہلِ نجد کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ انہوں نے بعض اس قسم کے غالی لوگوں کو زجر وتنبیہ بھی کی تھی۔

اور پہلے یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ دیگر بہت سے اہل حق کے سلسلوں اور جماعتوں میں بھی غالی افراد ہوتے رہے ہیں، اور آج بھی موجود ہیں، جن کا طرزِ عمل خود اپنے مسلک و جماعت کے بانی و مقتداء کے طرزِ عمل سے میل نہیں کھاتا، اور وہ ان اہلِ حق سلسلوں و جماعتوں کی سخت بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

چنانچہ آج صرف حنفیہ وغیرہ ہی میں نہیں، اہلِ دیوبند کے سلسلے میں بھی ایسے بہت سے افراد موجود ہیں، جن کا طرزِ عمل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اصل مشائخِ دیوبند کے ذوق سے میل نہیں کھاتا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو حنفیت اور دیوبند کا صحیح ترجمان سمجھتے اور اس کا برملا دعویٰ کرتے ہیں۔

مولانا منظور نعمانی صاحب اپنے رسالے ''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت و مسلک کے بارے میں راقم سطور نے یہاں تک جو کچھ لکھا وہ سب وہ تھا جو شیخ ممدوح اور ان کے فرزندوں اور تلامذہ کی تصنیفات، ان کی سوانحِ حیات اور ان کے بعض سخت مخالفین کی کتابوں کے مطالعہ سے اس عاجز نے جانا اور سمجھا، لیکن اس بارے میں زیادہ اطمینان اور شرح صدر ان کے سلسلہ کے بعض ان اکابر علماء و مشائخ کو قریب سے دیکھ اور برت کر حاصل ہوا، جن کو شیخ کی اور ان کی دعوت کی ''زندہ اور ناطق کتابیں'' کہا جا سکتا ہے، اس سے میری مراد خاص طور سے ان کی جماعت کے دو موجودہ جلیل القدر عالم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ ابنِ باز اور شیخ عبداللہ بن حُمید ہیں۔

اللہ کی شان کہ یہ دونوں بزرگ نابینا ہیں، اولُ الذکر شیخ عبدالعزیز بن باز پہلے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے سربراہ (وائس چانسلر) تھے، وہیں قیام رہتا تھا، اب سعودی حکومت کے مختلف دینی شعبوں کی سربراہی ونگرانی ان کے سپرد کر دی گئی

ہے، اس وقت وہ سعودی حکومت کی سب سے بڑی دینی شخصیت ہیں، اور ثانی الذکر شیخ عبداللہ بن حُمید پہلے حرم شریف (مکہ مکرمہ) سے متعلق تمام دینی مذہبی امور کے نگرانِ اعلیٰ اور سربراہ تھے اور مکہ معظّمہ ہی میں قیام رہتا تھا، اب حکومت کی طرف سے زیادہ اہم دینی و علمی ذمہ داریاں ان کو سپرد کر دی گئی ہیں، اور اب ان کا مستقل قیام دارالحکومت ریاض میں رہتا ہے۔

راقم سطور پر اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار انعامات ہیں، ان میں ایک عظیم انعام یہ بھی ہے کہ 1965 عیسوی میں مجھے رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کی مجلسِ تاسیسی کا رکن منتخب کیا گیا (جبکہ مجھ کو اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا) اس وقت سے مجھے ''رابطہ'' کے اجلاسوں میں حاضری نصیب ہوتی رہی ہے، یہ دونوں حضرات بھی رابطہ کی اُسی مجلسِ تاسیسی کے رکن ہیں، اور شیخ ابنِ باز تو اس کے اجلاسوں کے مستقل صدر ہیں، اور رابطہ کے اجلاس دو دو اور کبھی تین تین ہفتوں تک چلتے ہیں، جس کی صبح شام کی نشستوں میں ان حضرات کے ساتھ مسلسل رہنا ہوتا ہے۔

رابطہ کی مجالس کے علاوہ ان دونوں بزرگوں کے ممتاز علمی و دینی مقام کی وجہ سے ان حضرات سے نجی ملاقاتیں بھی ہوتی رہی ہیں، الغرض ان حضرات سے دس بارہ سال سے بھی زیادہ مدت سے صرف تعارف نہیں، بلکہ ایک طرح کا تعلق اور رابطہ ہے، اور رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ تو ان حضرات کا ایسا تعلق ہے جو باہر کے کم ہی حضرات کے ساتھ ہوگا، مولانا موصوف اور اس عاجز کا ان دونوں بزرگوں کے بارے میں یہ اندازہ اور احساس ہے کہ نابینا ہونے کے باوجود یہ دونوں حضرات متبحر اور وسیع النظر عالمِ دین بھی ہیں اور ورع وتقویٰ اور خشیت وتعلق باللہ کی نعمت سے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو حصۂ وافر عطا فرمایا ہے

(واللہ اعلم باحوال عبادہٖ)

اخلاصِ توحید اوراس کی دعوت سے شغف اور شرک اوراس کے تمام مظاہر سے سخت نفرت وعداوت اور اعتصام بالکتاب والسنہ کے ساتھ اتباعِ سلف پر اصرار کے بارے میں ہم نے ان کا وہی حال پایا جس کی بنا پر ان کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی ''ناطق کتابیں'' کہا جاسکتا ہے۔

راقمِ سطور نے ان حضرات کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے مسلک کا صحیح نمائندہ اور نمونہ پایا، اوراسی سے اس اطمینان میں اضافہ ہوا کہ شیخ محمد کا مسلک وہی تھا اوران کی دعوت وہی تھی جو راقم سطور نے ان کی تصانیف اور سوانح وغیرہ سے سمجھی تھی، اور یہ کہ شیخ احمد زینی دحلان جیسے حضرات نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ بالکل بے اصل اور خلافِ واقعہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی دانستہ یا نادانستہ غلطی کو معاف فرمائے۔

درعیۃ (نجد) کی آلِ سعود کی حکومت جس نے اب سے قریباً ڈھائی سوسال پہلے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کو قبول کر کے ان کو اپنا دینی امام اور مرشد بنالیا تھا، اس کا پورا نظام شیخ ممدوح کی ہدایت وتعلیم کے نتیجہ میں شریعت اور سنت کے مطابق ہوگیا تھا، جس کی تفصیل حکومتِ آلِ سعود کی تاریخوں اور تذکروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی دور کے ایک مصری مؤرخ اور مصنف عبدالرحمٰن بن حسن جبرتی نے اپنی کتاب ''**عجائب الآثار فی التراجم والاخبار** ''میں''سعودی حکومت'' کے خلاف لڑنے والی مصری فوج کے ایک افسر کا یہ بیان نقل کیا ہے، جو آلِ سعود کی حکومت کی ٹھیٹ اسلامیت اوراتباعِ شریعت وسنت کے جذبہ کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، جبرتی کی روایت کے مطابق مصری فوج کے اس افسر نے کہا:

''ہمیں فتح کیسے نصیب ہو؟ ہماری فوج کا بڑا حصہ بے دین ہے، کسی آئین کی

پابندی نہیں، بکس کے بکس مسکرات (یعنی نشہ آور چیزوں) سے بھرے ہوئے ساتھ ہیں، ہماری چھاؤنی میں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی، ان کے دلوں میں دین اور شعائرِ دین کا خیال بھی نہیں آتا اور یہ نجدی قوم (یعنی شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متبعین کی سعودی فوج) وقت ہوتے ہی اذان دیتی ہے، اور ایک امام کے پیچھے خشوع خضوع کے ساتھ صف بندی کرتی ہے۔

اگر جنگ کے دوران میں کہیں نماز کا وقت آ گیا تو مؤذن اذان دیتا ہے، اور سب صلاۃِ خوف پڑھتے ہیں، ایک جماعت جنگ کے لیے آگے بڑھتی ہے، دوسرا گروہ نماز کے لیے پیچھے ہٹ جاتا ہے (جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا طریقہ تھا) ہماری سپاہ حیرت سے منہ تکتی ہے، ان بے چاروں نے دیکھنا تو درکنار سنا بھی نہیں'' عجائبُ الآثار (مطبوعہ مصر 1297ھجری) ج:۴ص:۱۴۔

(''محمد بن عبدالوھاب'' از مسعود عالم ندوی ص ۱۲۱ و ۱۲۲)

نجد وحجاز کی موجودہ سعودی حکومت بھی آلِ سعود کی اسی حکومت کی گویا وارث اور جانشین ہے، اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کو اسی طرح اپنا دینی رہنما اور امام سمجھتی ہے، جس طرح ان کے پیشرو سمجھتے تھے۔

اب سے قریباً 55 سال پہلے جب حرمین شریفین پر ان کا اقتدار قائم ہوا تھا، اس وقت اس حکومت کے سربراہ سلطان ابنِ سعود مرحوم اور ان کے عوام کی دینداری کا کچھ حال ناظرین کو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ کے اس مکتوب سے معلوم ہو چکا ہے، جو اِسی کتاب کے صفحہ 45 و 46 پر درج ہو چکا ہے، حضرت مولانا نے اس مکتوب میں ان لوگوں کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔

اگرچہ بعد میں پٹرول کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت کی بے حساب فراوانی اور یورپ وامریکہ میں تعلیم پانے والے نوجوانوں کے ساتھ آنے والے زہریلے

جراثیم اور ایمان کش ہواؤں نے اس ''نجدی وہابی'' معاشرہ میں بھی سخت فساد برپا کر دیا ہے، اور ساری دنیا کی طرح ان میں بھی بے دینی اور بد دینی تیزی سے پھیل رہی ہے، اور بلاشبہ نظامِ حکومت پر بھی اس کے اثرات پڑ رہے ہیں، اور راقم سطور کو معلوم ہے کہ ان کے مخلص علماء ومشائخ اور دیندار عوام اس تغیر اور فساد سے سخت رنجیدہ اور بیزار ہیں، لیکن اس سب کے باوجود یہ بھی واقعہ ہے کہ اس دور میں بھی جبکہ چودھویں صدی ہجری ختم ہو رہی ہے اور بیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ بھی قریب ہی ہے، جہاں تک اپنا علم ہے روئے زمین پر صرف ایک یہی سعودی حکومت ہے، جس میں صرف قرآن وحدیث کی فرمانروائی ہے، ''شریعت'' ہی سرکاری قانون ہے، قرآن کے حکم کے مطابق چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، غیر شادی شدہ زانی کو دُرّے لگائے جاتے ہیں، اگر شادی شدہ آدمی زنا کا مرتکب ہو، تو شرعی معیار کے مطابق جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں سنگسار کیا جاتا ہے۔

چند ہی مہینے پہلے کا یہ واقعہ یہاں کے اخبارات میں بھی آ چکا ہے کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک عورت جدہ میں اس گناہ کی مرتکب ہوئی تو قاضیٔ شریعت کے حکم سے وہ اور زانی مرد دونوں قتل کیے گئے۔

ہر جاننے والے کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس حکومت کے فرمانروا بادشاہ الحمدللہ ابھی تک صوم وصلاۃ وغیرہ فرائضِ دینی کے پابند ہیں، اور عوام سے بھی پابندی کرانا چاہتے ہیں، بلاشبہ یہ سب صدقہ ہے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دینی دعوت اور جدوجہد کا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عالمِ اسلام میں ایسے خانوادے شاذونادر ہی ہوں گے، جن میں ان آخری صدیوں میں بھی علمِ دین اور دینی زندگی اور دین کی خدمت ایسے تسلسل سے رہی ہو، جیسے تسلسل سے

شیخ کے خاندان میں رہی ہے، بارھویں صدی کے وسط سے اب تک ڈھائی سو سال گزر چکے ہیں، اس طویل ترین مدت میں شیخ کی نسل میں مسلسل اکابر علماء، فضلاء اور صلحا ہوتے رہے ہیں، جیسا کہ ان حضرات کی تصانیف اور تاریخ سے ظاہر ہے، بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص فضل ہے۔ **واللہ یختص برحمته من یشاء واللّٰہ ذوالفضل العظیم** (شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص ۹۸ تا ۱۰۳، مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کی مذکورہ طویل عبارت سے معلوم ہوا کہ سعودی عرب کی موجودہ حکومت اور ان کی طرف سے امتیازی عہدوں پر مامور علماء صحیح العقیدہ اور متدین افراد ہیں، اور موجودہ زمانے میں سعودی حکمرانوں کا وجود نہایت غنیمت ہے، فردِ بشر ہونے کی حیثیت سے نبیوں کے علاوہ کون انسان غلطیوں اور خطاؤں سے بچا ہوا ہے، لیکن مجموعی حالات پر نظر کرنی چاہئے۔

(21)......مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا حوالہ

مشائخِ دیوبند کے سلسلہ میں ایک نام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کا ہے، آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور ہندوستان کے عظیم شیخ الحدیث اور تبلیغی جماعت میں پڑھی جانے والی مشہور کتاب ''فضائل اعمال'' کے مصنف ہیں۔

''شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق'' کے عنوان سے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا مذکورہ بالا مضمون پہلے قسط وار ''ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ'' میں شائع ہوا تھا، جس کی آخری قسط مارچ 1978 عیسوی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، اس وقت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ (المتوفی: 1402 ہجری) مدینہ منورہ میں مقیم تھے، مولانا منظور نعمانی صاحب کے اس مضمون کو ملاحظہ کرکے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ

نے تحسین فرمائی، اور اپنے ایک مکتوب میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کو لکھا کہ:

اس پورے مضمون کو جتنی جلدی ہوسکے، مستقل کتابی شکل میں بھی شائع کردیا جائے، اور اس کے پانچ سو نسخوں کا میں پیشگی خریدار ہوں، ڈھائی سو نسخے یہاں مدینہ منورہ بھجوادیے جائیں، اور ڈھائی سو سہارنپور۔

بعد کے ایک دوسرے گرامی نامہ محررہ مورخہ 22 اکتوبر 1978 عیسوی میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

شیخ محمد بن عبدالوہاب سے متعلق آپ کے مضمون کے بارے میں جو خط پہلے لکھ چکا ہوں، اس خط کا مضمون کتاب کے ساتھ (میری طرف سے تصدیق وتوثیق کے لیے) شائع کیا جاسکتا ہے (شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص ۱۳۷، مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کی طرف سے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے مضمون پر مذکورہ بلند و بالا تحسین وتشجیع پر مشتمل مختصر کلمات، اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اصولی طور پر مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ بھی اس بات سے متفق ہوگئے تھے کہ شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کی طرف بہت سی باتیں جھوٹی منسوب کی گئی ہیں، اور ان کا اہلُ السنۃ والجماعۃ کے ساتھ کوئی ایسا بنیادی اختلاف نہیں، کہ جس کی بناء پر محمد بن عبد الوھاب نجدی یا ان کے متبعین کی تکفیر یا تضلیل وتفسیق کی جائے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مشائخِ دیوبند کی طرف سے کسی رائے کے صواب، ظاہر ہونے کے بعد، خواہ وہ کسی دوسرے کی تحقیق کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو، اس کی تصدیق وتوثیق اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع میں تامل نہیں ہوا کرتا تھا۔

برخلاف موجودہ دور کے بہت سے اہلِ علم حضرات کے کہ وہ نہ تو اس طرح کی تحقیق پر بآسانی تصدیق کرنے کے لیے آمادہ ہوتے، اور نہ یہ بآسانی اپنی سابق رائے یا اکابر میں سے کسی

کی ایسی رائے کو مرجوح قرار دینے کے لیے تیار ہوتے کہ اگر خود ان بزرگ کے سامنے بھی اپنی رائے کے خلاف یہ تحقیق آجاتی، تو وہ خود رجوع کرنے میں ذرا تأمل نہ فرماتے۔

بلکہ مذکورہ دور کے علم وعمل اور تفقہ وتدین میں کمزور اصحابِ علم کا طرز تو یہ بن گیا ہے کہ وہ اس طرح کی تحقیق کرنے والے کو اکابر کا مخالف اور گستاخ وغیرہ نہ جانے کیا کیا الزامات دیتے ہیں، اور اپنے تئیں اپنے آپ کو اس طرزِ عمل میں اکابر کا صحیح متبع اور محبّ سمجھتے ہیں، جبکہ ان کا طرزِ عمل ان حضراتِ اکابر کے طرزِ عمل سے ہرگز میَل نہیں کھاتا۔

کیونکہ اصولی بات یہ ہے کہ جو شخص تحقیق واجتہاد کے بعد کوئی رائے **فیما بینہٗ و بین اللہ** صواب سمجھتے ہوئے قائم کرے، تو اس کو اس پر بہرحال اجر وثواب حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عنداللہ مخطی ہوا، تو ایک اجر، ورنہ دُہرا اجر حاصل ہوتا ہے، لیکن اگر اس رائے کو **فیما بینہٗ وبین اللہ** خطا سمجھتے ہوئے اختیار کرے، تو اس پر اجر وثواب حاصل نہیں ہوتا، بلکہ مؤاخذہ ہوتا ہے۔

اب جن اکابر نے اپنی تحقیق کی روشنی میں جو رائے صواب سمجھتے ہوئے اختیار کی تھی، لیکن بعد والوں پر اس رائے کا خطا ہونا ظاہر ہوگیا، تو اس رائے کو ترک کرنا ضروری ہوگیا، ورنہ اس صورت میں وہ اکابر تو اجر وثواب کے مستحق ہوں گے، اور ان سے محبت واتباع کا اظہار کرنے والا گناہ گار ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اکابر کی اتباع ہمیشہ ان کی رائے کو ترجیح دینے میں منحصر نہیں ہوتی، بلکہ کبھی اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔

جبکہ کم علم حضرات ہمیشہ ایک ہی طریقہ کو اکابر کی اتباع میں منحصر سمجھ کر خود بھی گناہ گار ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی گناہ گار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس طرح کے بے اعتدال اہلِ علم حضرات کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔

(22)......مولانا قاری محمد طیب کا حوالہ

سلسلۂ دیوبند کی ایک عظیم علمی شخصیت اور اپنے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے مدیر اور مسلکِ دیوبند کے امتیازی ترجمان، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ ہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب سے متعلق، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے مضمون پر مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ (رئیس: جامعہ دارالعلوم دیوبند، ہندوستان، المتوفیٰ: 1403 ہجری) نے بھی انتہائی خوشی کا اظہار فرمایا، اور اس کی تائید وتوثیق فرمائی، مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی وہ تائید وتوثیق ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دام مجدہٗ (رکن مجلس شوریٰ: دارلعلوم دیوبند) نے جو مقالہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور علمائے دیوبند کے مسلک کی وضاحت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے، یہ احقر اس کی قسطوں سے ''الفرقان'' اور ''الداعی'' کے ذریعہ برابر مستفید ہوتا رہا، اور علمی اور مسلکی طور پر اس سے حظِ وافر حاصل کرتا رہا، مولانا ممدوح نے اس مقالہ کے ذریعہ جو کارنامہ انجام دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ انہی کا حق تھا، ساتھ ہی برسوں کی میری وہ تمنا بھی پوری ہوگئی، جسے میں بار بار مولانا ممدوح کی خدمت میں عرض کرتا رہا ہوں کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں، اور اس خلیج کو پاٹنے اور ان بدگمانیوں کو دور کرنے کی سعی فرمائیں، جو محض غلط اطلاعات اور غلط فہمیوں کی وجہ سے دین کی خادم اور توحید وسنت کی داعی وحامی، عالمِ اسلام کی دو اہم جماعتوں کے درمیان پیدا ہوگئی تھیں، مولانا کا یہ پُر از معلومات اور مدلل مقالہ جو اس موضوع پر حاوی اور کافی شافی ہے، ہم سب منتسبین جماعتِ دیوبند خصوصاً خدّامِ دارالعلوم کے لیے غیر معمولی طور پر موجبِ مسرت وطمانیت ہوا ہے۔

میں تو اسے ہی کافی بلکہ بڑی کامیابی سمجھے ہوئے تھا کہ اس بارے میں حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے مختصر فتوے ہی کو (جس کا مولانا نعمانی نے کئی بار تذکرہ فرمایا تھا) متن بنا کر اس کی شرح کر دی جائے، لیکن منجانب اللہ غیبی مدد ہوئی کہ جب مولانا نے قلم اٹھایا، تو اس سلسلہ کا نہایت کار آمد اور مفید مقصد مواد جو بطونِ اوراق میں مدفون تھا، ملتا چلا گیا، اور یہ مقالہ ایک مستقل رسالہ اور اپنے موضوع پر تشفی بخش کتاب کی صورت اختیار کر گیا، جس نے وہ خلیج جو جماعت دیوبند اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت کے درمیان بعض مشہورِ زمانہ بے بنیاد افواہوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی، **الحمد لِلّٰہ** باحسنِ اسلوب پاٹ دی۔

مولانا نے اس مقالہ میں اپنی جماعت کے مسلک کی وضاحت کے ساتھ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت کے مسلک وموقف کی بھی وضاحت خود ان کی تحریروں سے فرمائی، اور ان کی طرف سے مدافعت کی خدمت بھی پورے انصاف اور تحقیق کے ساتھ انجام دی۔

اس مقالہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے مسلک اور دینی طرزِ فکر میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے، بلکہ بڑی حد تک قرب وتوافق ہے۔

اس لیے مولانا کا یہ مقالہ محض علمی اور تاریخی وتحقیقی انداز کا نہیں ہے، بلکہ امتِ مسلمہ کی ایک عظیم اصلاحی خدمت بھی ہے، جس سے اتحاد بین المسلمین کے اہم ترین اسلامی مقصد کو تقویت پہنچتی ہے۔

فجزاه الله عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء.

اب دلی آرزو ہے کہ یہ ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' رسالہ جلد سے جلد اردو وعربی زبانوں میں کتابی صورت میں شائع ہو، اور اس سے وہ دینی، ملّی اور جماعتی مقصد

حاصل ہو، جس کے لیے مولانا نے یہ لکھا ہے، اور جو میری دیرینہ دلی تمنا تھی۔

وباللہ التوفیق.

محمد طیب

رئیس: جامعہ دارالعلوم دیوبند (الہند)

5 / ذی قعدہ / 1398 ہجری

(شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق، ص ۱۳۸ تا ۱۴۰، مطبوعہ: قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی)

حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کی مذکورہ رائے دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے بڑی اہمیت کی حامل ہے، جس میں انہوں نے ایک طرف تو مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے اصولی موقف کی توثیق وتائید فرمائی ہے، اور دوسری طرف اس مضمون کو اس سلسلہ میں پائی جانے والی مختلف غلط فہمیوں کے ازالہ کا بھی باعث قرار دیا ہے، اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اعتراف فرمایا ہے کہ محمد بن عبدالوھاب اور اہلِ دیوبند کی جماعتوں میں بنیادی طور پر کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے، بلکہ بڑی حد تک قرب وتوافق ہے، اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے اس مضمون کو انہوں نے اتحاد بین المسلمین کا اہم ذریعہ قرار دیا۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلکِ دیوبند میں تمام مسالکِ حقہ اور فقہی مذاہب کی رعایت رکھی گئی ہے، جس میں فقہی عملی مسائل کے ساتھ ساتھ بتقضائے قواعدِ شرعیہ، فروعی عقائد کے معانی میں اجتہادی نظر وفکر سے رونما ہونے والا اختلاف بھی داخل ہے۔

اسی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے، خود حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' نامی مفصل ومدلل کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

تمام ائمہ کے فقہی مراتب بحیثیتِ مجموعی اس (دیوبندی) مسلک میں آجاتے ہیں،

زیادہ سے زیادہ راجح ومرجوح یا افضل ومفضول یا اصل وفرع یا عزیمت ورخصت کا فرق نکل سکتا ہے، البتہ کہیں کہیں جائز وناجائز کا بھی فرق پیدا ہوتا ہے، مگر قلیل، سواس سے فقہ حنفی کی جامعیت اور دوسرے فقہوں کے برحق ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، خواہ دونصوص باہم متعارض ہوں، یا ایک ہی نص کے دو پہلو فقہی طور پر متعارض ہوں، اس لیے اجتہادی فروعات میں اختلاف تو ہوجاتا ہے، مگر خلاف و نزاع کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوسکتی کہ کسی فقہی مسلک سے اعراض یا گریز کی تہمت آئے، اس لیے ائمہ اجتہاد کی حقانیت وعظمت بھی ان کی شان کے مناسب قائم رہتی ہے، اوران کے فقہی مسلک کی صداقت وعظمت اور تعظیم وتوقیر میں بھی فرق نہیں آتا، پھر یہ اختلاف بھی حق وباطل کا نہیں ہوتا کہ باعثِ کش مکش ہو، بلکہ محض (اجتہادی وظنی) خطأ وصواب کا ہوتا ہے، جن میں سے کوئی بھی پہلو اجر سے خالی نہیں، اور ظاہر ہے کہ جب سارے فقہوں اور فقیہوں کے اجتہادات اس طرح ایک مرکز پر جمع ہوکر درجہ بدرجہ اپنے اپنے مقام ومرتبہ کے مناسب قائم رہتے ہیں، تو نہ صرف یہ کہ نزاع وجدال کے رخنے مسدود ہوجاتے ہیں، بلکہ قدرِ مشترک کے طور پر ایک مابہ الاتحاد بھی پیدا ہوجاتا ہے، جس کے تحت یہ سارے فقہ اور فقہی مراتب نہ صرف معتبر ہی ٹھہرتے ہیں، بلکہ ایک مرکز پر سمٹ آتے ہیں، جو اس (دیوبندی) مسلک کی جامعیت کی کھلی دلیل ہے۔

رہے فِرَقِ حقہٗ اسلامیہ جو اصول ومبانی میں متحد رہ کر فروعی عقائد کے معانی میں بمقتضائے قواعدِ شرعیہ کچھ مختلف ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا بھی اجتہادی نظر وفکر ہی ہے، جس سے بتفاوتِ اجتہاد، متفاوت نظریات قائم ہوکر عقیدے کی صورت اختیار کرلیں، اور وہ فرقہ سمجھے جانے لگیں، دراں حالیکہ وہ فرقہ نہیں ہوتے، جبکہ تمام اصول اور مبانیِ اسلام میں متحد ہیں، لیکن حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب

رحمہ اللہ کا مسلک جبکہ جامع نص واجتہاد ہے، تو ان فروعی عقائد کا بھی کوئی اجتہادی پہلو جب تک کہ شریعت کے بنیادی اصول اور اساسی قواعد وضوابط سے متصادم نہ ہو، نا قابلِ قبول نہیں رہتا، بجز اس کے کہ اس پہلو کو مسئلہ کا بنیادی مقام دینے کے بجائے اُسے ضمنی، فرعی مقام پر رکھ دیا جائے، ترک نہیں کیا جاتا، اس طرح سے کوئی بھی حقانی فرقہ اور اس کا کوئی بھی اعتقادی مسئلہ جبکہ تھوڑی سی توجیہ کے بعد اس مسلک سے باہر نکلنے نہیں پاتا، صرف مقصدی اور غیر مقصدی درجہ کا فرق باقی رہ جاتا ہے، تو اسے بھی کلیۃً متروک کر دینے کی صورت پیدا نہیں ہوتی، جبکہ وہ کسی نص کے محتملات یا کسی شرعی اصول کی فرعیات کے دائرہ میں ہے، اس لیے اس جامع مسلک میں یہ اسلامی فرقے بھی اصل فرقۂ حقہ سے کلیۃً جدا نہیں ہوتے، بلکہ اس سے قریب تر ہو جاتے ہیں، صرف فرقِ باطلہ ہی باہر رہ جاتے ہیں، جو حق کے دائرہ میں داخل ہی ہونا نہیں چاہتے (تاریخ دار العلوم دیوبند، ص۲۹ و ۳۰، مقدمہ، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اپنے اسی مضمون میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

بہر حال اس مسلکِ اعتدال کا دائرہ اصولاً اس حد تک جامع، وسیع اور حاوی ہے کہ نہ اس سے اجتہادی طبقات جدا رہ سکتے ہیں، نہ کلامی گروہ اور نہ عقلی اور فلسفی حلقے کٹ سکتے ہیں، جبکہ ان کے مسلّمات سب اس میں لپٹے ہوئے ہیں، جس کے معنیٰ اس کے سوا دوسرے نہیں ہیں کہ ولی اللّٰہی مسلک نے تمام فرقوں، تمام حلقوں اور تمام طبقات کو اصولاً اپنے اندر سمیٹ کر کے جمع کر لیا ہے، جس میں مرکزیت کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں، جو کسی بھی معقول پسند طبقہ کو اپنے سے باہر نہیں رہنے دیتیں، اور جب بھی انہیں انصاف اور حق پسندی سے کام میں لایا جائے گا، وہ ان سب کے لیے ایک تشفی بخش نسخہ اور جامع مرکزِ توجہ ثابت ہوں گی،

اور باہمی نزاعات یا قومی تفرقے کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکیں گی (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص۳۱، مقدمہ)

اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ اپنی تالیف ''علماءِ دیوبند کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج'' میں تحریر فرماتے ہیں:

شرعی مذاہب میں مذہبِ اہل سنت و الجماعت بلحاظِ اساس و بنیاد اعدلُ المذاہب ہے، اوراس کے پیرو خواہ وہ حنفیہ ہوں یا شافعیہ، مالکیہ ہوں یا حنابلہ بہ تفاوتِ اصولِ تفقّہ، اہل السنّت والجماعت ہیں (علماء دیوبند کا دینی رُخ و مسلکی مزاج، ص۲۵، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، باراول، ذوالقعدہ 1408ھ، جولائی 1988ء)

نیز حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ اپنی اسی مذکورہ تالیف میں تقلید واجتہاد کے معاملہ میں مسلکِ دیوبند کے اعتدال اور وسعت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

پس نہ وہ (یعنی علمائے دیوبند) کورانہ اور غیر محققانہ تقلید کا شکار ہیں، اور نہ برخود غلط ادّعائے اجتہاد کے وہم میں گرفتار، اس لیے ایک طرف تو وہ خود رائی اور آزادیٔ نفس سے بچنے کی خاطر نصوصِ کتاب وسنت تو بجائے خود ہیں، اقوالِ سلف اور ذوقِ سلف تک کا پابند رہنا ضروری سمجھتے ہیں، اور دوسری طرف بے بصیرتی اور کور ذہنی سے بچنے کی خاطر افتاء اور فتاویٰ کو ان کے اصل ماخذوں سے نکلتا ہوا دیکھنے اور حسبِ ضرورت کسی متماثل جزئی پر پیش آمدہ جزئیات کو قیاس کر کے فقہی حکم لگانے سے بھی بے تعلق رہنا نہیں چاہتے۔

غرض نہ تو وہ مجتہدین فی الدین کے بعد اجتہادِ مطلق کے قائل ہیں، جبکہ عملاً اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا ہے، اور نہ ہی جنسِ اجتہاد کی کلی نفی کر کے فتاویٰ کے حقائق و علل کے استخراج اور ان کے مؤیدات کے استنباط یا متماثل جزئیات سے جزئیاتِ وقت کے استخراج سے گریزاں ہیں، بلکہ تقلید کے ساتھ تحقیق کا ملا جلا

رنگ لیے ہوئے ہیں (علمائے دیوبند کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج، ص۱۴۳و۱۴۴، بعنوان: فقہ اورفقہاء، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، باراول، ذوالقعدہ 1408ھ، جولائی 1988ء)

اورحضرت قاری صاحب موصوف رحمہ اللہ آگے اس سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اس مسلک پر ائمہ اجتہاد کی محبت وعظمت کے حقوق کی ادائیگی یہ نہیں ہے کہ اپنے اجتہادی مذہب کی فوقیت ظاہر کرکے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اس کی تبلیغ و اشاعت کی فکر کی جائے، یا اپنے مذہب کی تائید کے لیے دوسرے مذاہب فقہیہ کے ردّ وابطال میں زورصرف کیا جائے، یا دوسرے ائمہ اجتہاد اور سلفِ صالحین کی شان میں گستاخی، سوءِ ادب اوران کی فرعیات کے ساتھ تمسخرواستہزاء سے دنیا وآخرت تباہ کی جائے، جبکہ ان میں سے ایک صورت بھی ترجیح یا تقویتِ مذہب کی نہیں، ابطالِ مذہب کی ہے، اوریا پھر غرورِ علم کی ہے کہ بزعمِ خود اپنے ہی مذہب میں حق کو منحصر سمجھ لیا جائے، جو بلا شبہ افراط وتفریط ہے، جس سے مسلک علماء دیوبند بالکل الگ ہے (علمائے دیوبند کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج، ص۱۴۵، بعنوان: فقہ اور فقہاء، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، باراول، ذوالقعدہ 1408ھ، جولائی 1988ء)

مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ، جن کی علومِ شریعت اور مسلکِ دیوبند کے صحیح مزاج ومذاق پر گہری نظر تھی، ان کی مذکورہ عبارات، موجودہ دور کے افراط وتفریط کا شکار عوام وخواص کے لیے انتہائی عبرت کا سامان اپنے اندر لیے ہوئے ہے، بشرطیکہ اخلاص وللّٰہیت پیشِ نظر ہو، اوراس کے مقابلے میں تحاسد وتباغض اور تعصب وتحزب سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا ہو، جس کی موجود دور کے بہت سے اصحابِ علم اور مشائخِ دیوبند کی طرف اپنی نسبت کرنے والے لوگوں میں بھی کمی نظر آتی ہے۔

(23)......مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا حوالہ

زمانہ قریب میں ہندوستان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے منسلک ایک انتہائی معتدل علمی شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ہے، جنہوں نے اپنے زمانے میں نہ صرف یہ کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں، اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے مزاج میں اعتدال اور میانہ روی کی بنا پر دیوبند کے حلقہ میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب لکھتے ہیں:

شیخ (محمد بن عبدالوہاب نجدی) ہمارے دینی حلقوں میں جس قدر بدنام ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، انگریزوں اور ترکوں نے اور علمائے حجاز نے اپنی اپنی مصلحت سے ان کے متعلق جو کچھ مشہور کر دیا، ہمارے علماء نے بلاتحقیق و تفتیش تسلیم کرلیا، اور کسی نے براہِ راست ان کی تصانیف اور ان کے حالات کے صحیح مآخذ کے مطالعہ کی زحمت گوارہ نہیں کی، ضرورت تھی کہ کوئی مردِ حق شناس ان کے صحیح حالات وخیالات پیش کرتا، تاکہ اہلِ علم و طالبین حق کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملتا، علمائے نجد اور شیخ کے جانشینوں نے تو متعدد کتابیں لکھیں، اور وہ حجاز و مصر میں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اردو میں کوئی کتاب نہ تھی، مسعود (عالم ندوی) صاحب نے اس بدنام مظلوم مصلح کی سیرت نگاری کا بیڑا اٹھایا، اور خاص مؤرخانہ اور محققانہ حیثیت سے ان کی سوانح، ان کی تحریک دعوت کی تاریخ مرتب کرنی شروع کی، اس سلسلہ کا کوئی مضمون شاید معارف میں شائع ہوا تھا، اور اس پر راقم سطور نے مسعود صاحب کو داد دی تھی (پرانے چراغ، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، حصہ اول، ص ۳۰۲، مطبوعہ: مکتبۃ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ لکھنوء، بار ششم 1431 ہجری، 2010ء)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے جس مضمون کا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے مذکورہ عبارت میں حوالہ دیا ہے، اور اس کی تحسین فرمائی ہے، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کی طرح، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے بھی مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے اس مضمون کی تحسین فرمائی ہے، جیسا کہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ کے مضمون میں گزرا۔

لیکن افسوس کہ موجودہ دور کے بعض متعصبین، جن کو مولانا مسعود عالم ندوی صاحب سے کچھ چیزوں میں اختلاف ہے، ان کے مذکورہ مضمون کی تحسین تو در کنار، وہ تو ان کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے، جو مشائخِ دیوبند اور سلفِ صالحین کا طریقہ نہیں، اگرچہ یہ لوگ اپنے آپ کے متعلق مشائخِ دیوبند اور سلفِ صالحین کے طریقے پر گمان کیوں نہ کریں، لیکن ہر کسی کے گمان کا واقع کے مطابق اور صواب ہونا ضروری نہیں۔

(24)......مولانا مسعود عالم ندوی کا حوالہ

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی ایک مفصل تالیف ''محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم اور بدنام مصلح'' کے نام سے ہے، جس میں مولانا موصوف نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد و افکار اور اس زمانے کے تاریخی حالات پر روشنی ڈالی ہے، جس کا ذکر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبان کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے اپنے اس مضمون میں مستند و معتبر مأخذ سے اس موضوع پر عمدہ ذخیرہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے، چند جزوی چیزوں سے اختلاف کے امکان کے باوجود یہ کتاب اپنے موضوع پر لائقِ مطالعہ ہے۔

اس مضمون کے مقدمہ میں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب لکھتے ہیں:

اس سلسلہ میں ایک چیز کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ''نجدی وہابیت''

(یعنی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک) یا ''ہندوستانی وہابیت'' (یعنی سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک) کی تاریخ مرتب کرنے سے ہماری غرض اس بات کی تبلیغ نہیں کہ حق وصداقت انہیں دونوں جماعتوں میں محدود ہیں، یا یہ کہ مختلف ادبی ومذہبی ''اسکولوں'' کی طرح، ان جماعتوں کو ہم ایک خاص مشرب یا اسکول کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، ممکن ہے ان جماعتوں کے بعض سرگرم داعیوں یا پُرجوش معتقدوں کا ایسا خیال ہو، لیکن ہم اس ''تحزُّب'' کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں حد درجہ مضر سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک حق صرف کتاب وسنت کی پیروی میں ہے، ہم رشد و ہدایت کو کسی فقہی مدرسے یا ملکی جماعت کا اجارہ نہیں سمجھتے، یہ نہ نجد کی زرخرید ہے، نہ ہندوستان کی، اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات واضح اور نمایاں ہیں، جو ان پر ٹھیک ٹھیک چلے گا، وہ ہدایت وفلاح سے شادکام ہوگا............

اسی طرح ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ نجد اور ہندوستان کی یہ دونوں جماعتیں معصوم ہیں، اور ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں نہیں ہوئیں، اہلِ نجد کے بارے میں تو غلو اور شدت کا شکوہ دوستوں کو بھی ہے، ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ یہ مخلص جماعتیں تھیں، جو اللہ کے نام پر اٹھیں، اور جہاں تک انسانی کوششوں کا تعلق ہے، اعلاءِ کلمۃ اللہ میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، آپ اس نظر سے ان کے کاموں کا جائزہ لیجیے، سنی سنائی باتوں، دشمنوں اور جاہل مولویوں، اور صوفیوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر غلط رائے قائم کرلینا، طالبِ حق کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔

ہم نے اس کتاب میں ''رائے زنی'' سے مقدور بھر احتیاط برتی ہے، امکانی چھان بین اور زیادہ سے زیادہ مستند مآخذ کی بنیاد پر ہم نے حالات ومعتقدات کے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، اگر کامیابی ہوئی تو یہ اللہ کی توفیق سے، ورنہ ایک ہیچ

میر ز طالبعلم سے غلطیوں اور فروگزاشتوں کا رہ جانا بعید نہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ نیت وعمل میں اخلاص اور اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔آمین۔

عاجز: مسعود عالم ندوی

پٹنہ، 8/ جمادی الاولیٰ 1361ھ

(محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم اور بدنام مصلح، ص ۱۷ و ۱۸، مطبوعہ: طارق اکیڈمی، لائلپور ''فیصل آباد'' تاریخِ طباعت: مئی 1975ء)

مذکورہ عبارت میں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے محمد بن عبدالوہاب نجدی اور سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ کی تحریک کی تحسین کی، لیکن ساتھ ہی یہ واضح کر دیا کہ حق وصداقت ان دونوں جماعتوں میں منحصر نہیں، بلکہ اس کا دار ومدار قرآن وسنت کی پیروی میں ہے، قرآن وسنت کی پیروی، جو جماعت بھی کرے گی، وہ حق وصداقت پر مبنی سمجھی جائے گی، خواہ وہ کوئی بھی ہو، نیز مذکورہ دونوں تحریکوں اور جماعتوں کو معصوم سمجھنا بھی درست نہیں، بلکہ ان سے غلطیوں اور کوتاہیوں کے صدور کا امکان ہے، بالخصوص اہلِ نجد کے غلو اور شدت کا شکوہ تو ان کے حامی افراد کو بھی ہے، اس لیے اس طرح کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی نفی نہیں کی جاسکتی، لیکن اس کے باوجود یہ مخلص جماعتیں تھیں، اور ان کو گمراہ قرار دینا درست نہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب، اپنی مذکورہ کتاب میں ہی تحریر کرتے ہیں:

''مصرِ جدید کے مشہور مصلح عالم اور سید جمال الدین افغانی رحمہ اللہ کے رفیقِ خاص، شیخ محمد عبدہٗ رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1323 ہجری، 1905 عیسوی) سیاست اور اس کی بے انصافیوں سے پناہ مانگتے تھے۔

'' ما دخلت السياسة فى شىء الا أفسدته ''

ان کا مشہور فقرہ ہے، ایک حد تک یہ سچ بھی ہے، مقصد برآری کے لیے اربابِ

سیاست جائز اور ناجائز کا خیال نہیں کرتے، اور اس لیے صداقتوں کے مسخ کرنے میں وہ عارضی طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔

شیخ الاسلام (محمد بن عبدالوہاب نجدی) رحمہ اللہ کی دعوت جسے ''وہابیت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے، کتاب وسنت کی صحیح تعلیم کے سوا وہ اور کچھ نہیں پیش کرتے، لیکن سیاسی اغراض کے ماتحت شیخ رحمہ اللہ کی دعوت کو وہابیت کا نام دے کر اس طرح پیش کیا گیا، جیسے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی دعوت دی جا رہی ہو۔

سوءِ اتفاق سے اہلِ نجد کے بدنام کرنے میں تین جماعتیں شریک ہو گئیں، ترکی اور مصری حکومتوں سے تو براہِ راست ٹکر تھی، اور جنگ و پیکار کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، حکومتِ ہند سے بھی ایک دو ٹکر ہو گئی تھی، اس لیے تینوں حکومتوں اور ان کے وظیفہ خواروں نے اس کارِ خیر میں نمایاں حصہ لیا، ان کے علاوہ اشرافِ مکہ اور ان کے حواری اپنی نذر و نیاز کی آمدنیوں کی بندش پر الگ برہم تھے، نیز عام یورپی سیاح، انگریزوں کے علاوہ بھی جزیرۃُ العرب میں صحیح مذہبی بیداری کو اچھی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مختلف اسباب کے ماتحت، مختلف حکومتوں اور جماعتوں نے شیخ کی دعوت کی برائی اور بدنامی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک ''وہابیت'' نے ایک ''ہوّے'' کی شکل اختیار کر لی تھی، پھر ہندوستان میں حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ کی تحریکِ تجدید وامامت کو ''وہابیت'' کا نام دے کر اسے اسلام سے الگ ایک خارجی قسم کے مذہب کی حیثیت دے دی گئی۔

آج سے تیس چالیس برس پہلے، ان غلط الزامات کے قبول کرنے کی کوئی توجیہ کی

جا سکتی تھی، اہلِ نجد کی کتابیں عام طور پر نہیں ملتی تھیں، اور خود علمائے نجد اپنے محدود علاقہ سے باہر تبلیغ واشاعت پر بہت کم توجہ کرتے تھے، اس لیے اس وقت یہ بہت ممکن تھا کہ کوئی شخص سچائی کے ساتھ ان کے متعلق غلط رائے رکھتا ہو، لیکن آج جب کہ شیخ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات چھپ کر عام ہو چکی ہیں، لاعلمی کا عذر مسموع نہیں ہو سکتا۔

مختصر طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ الاسلام (محمد بن عبدالوہاب نجدی) رحمہ اللہ دین کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، عقائد واعمال ہر چیز میں سلف کی پیروی ان کے دل سے لگ گئی تھی، فروعِ فقہ میں وہ امام اہلِ سنت احمد بن حنبل رحمہ (المتوفی: 246 ہجری) کے مسلک پر عمل کرتے تھے، لیکن حنابلہ کے مسلک کے خلاف کوئی حدیث مل جانے پر انہیں کوئی طاقت اس حدیث پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

وأما مذهبنا: فمذهب الامام احمد بن حنبل امام اهل السنة فى الفروع ،ولا ندعى الاجتهاد ،واذا بانت لنا سنة صحيحة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ،عملنا بها ، ولا نقدم عليها قول احد كائنا من كان (الهدية السنية : ص ۹۹)

’’ہمارا مذہب فروع اور احکام میں امام اہلِ سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اور ہم اجتہاد کا دعویٰ نہیں کرتے، اور جب رسول اللہ کی کوئی صحیح سنت ہم پر آشکارا ہو جاتی ہے، تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں، اور اس پر کسی کا (خواہ کوئی بھی ہو) قول مقدم نہیں کرتے‘‘۔

امام ابنِ تیمیہ اور امام ابنِ قیم رحمہما اللہ کے اقوال سے وہ بسا اوقات استدلال کرتے ہیں، لیکن ان کی تقلید کا پھندا بھی شیخ نے گردن میں نہیں ڈالا، ابنِ تیمیہ

اورابنِ قیم رحمہما اللہ اسی وقت تک ان کے پیش رو ہیں، جب تک ان کے علم کے مطابق وہ کتاب وسنت سے منحرف نہیں ہوتے، بلکہ وہ امام یا عالم ان کی نگاہ میں صرف اس لیے محبوب ہے کہ وہ کتاب وسنت پر صحیح صحیح عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

الامام ابن القيم و شيخه اماما حق من اهل السنة ،و كتبهم عندنا من اعز الكتب ،الا انا غير مقلدين لهم فى كل مسئلة (الهدية السنية : ص ۵۳)

''امام ابن القیم رحمہ اللہ اوران کے استاد دونوں اہلِ سنت کے ائمہ حق میں سے ہیں، اوران کی کتابیں ہمیں بہت محبوب ہیں، مگر یہ کہ ہر مسئلہ میں ہم ان کے مقلد نہیں''۔

سچی بات یہ ہے کہ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، وہ حنبلی مسلک کی اتباع کرتے ہوئے بھی دوسروں کواس کی پیروی پر مجبور نہیں کرتے، وہ شافعی کو شافعی اور حنفی کو حنفی بننے کی دعوت دیتے ہیں، بدعات اور بے ہودہ رسمیں کسی امام نے روانہیں رکھیں، غنا اور مزامیر کے بارے میں فقہائے حنفیہ سے کون زیادہ سخت ہے؟ لیکن آج ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے کو''حنفی'' کہنے والے کیا کیا نہیں کر رہے؟

شیخ کے فقہی مسلک کی مزید توضیح کے لیے ایک اوراقتباس ملاحظہ ہو:

ونحن ايضا فى الفروع على مذهب الامام احمد بن حنبل ،ولا ننكر على من قلد احد الاربعة دون الغير ، لعدم ضبط مذاهب الغير كالرافضة الخ .

''ہم بھی فروع میں امام احمد بن حنبل کے مذہب پر ہیں، اور ائمہ اربعہ کے مقلدین پر نکیر نہیں کرتے، البتہ ان کے علاوہ دوسروں کی تقلید روانہیں رکھتے، اس

لیے کہ اوروں کے مذاہب صحیح طور پر مدون نہیں، جیسے روافض وغیر ہم''

ولا نستحق الاجتهاد المطلق ،ولا احد منايدعيها الا أننا فى بعض المسائل اذا صح لنا نص جلى من كتاب او سنة غير منسوخ، ولا مخصص ،ولا معارض باقوى منه ،وقال به احد الائمة الاربعة اخذنا به ،و تركنا المذهب ،كارث الجد والاخوة ،فانا نقدم الجد،وان خالف مذهب الحنابلة (بحواله تاريخ نجد للآلوسی : ص ۴۵ و ۴۶ ، صيانة الانسان : ص ۱۷۱)

''اور ہم ''اجتہادِ مطلق'' کے اہل نہیں، اور نہ ہم میں سے کوئی اس امر کا دعویٰ کرتا ہے، مگر یہ کہ بعض مسائل میں اگر کتاب یا سنت کی کوئی غیر منسوخ واضح نص سامنے آجائے، جس کی تخصیص یا تعارض بھی کسی دوسری قوی نص سے نہ ہو، اور ائمہ اربعہ میں سے کسی نے اسے اختیار کیا ہو، تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں، جیسے جد اور بھائیوں (اخوۃ) کے ترکہ میں ہم حنابلہ کے مسلک کے خلاف جد کو اخوۃ پر مقدم رکھتے ہیں''۔

عقائد کے باب میں وہ ''سلف'' کے مسلک پر ہیں، قرآن کریم اور صحیح حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کی جو صفتیں آئی ہیں، انہیں ہو بہو تسلیم کرنا اور ''کیفیت'' کی نفی کے ساتھ ان کے ظاہر پر ایمان لانا، یہی سلف کا مسلک ہے۔

صفات کا مسئلہ علمائے اسلام کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، ایک جماعت ''تشبہ'' اور ''تمثیل'' کے خوف سے ''صفات'' ہی کا انکار کر بیٹھی، یہ گویا اللہ کو معطل کر دینا ہوا، دوسری جماعت، صفات کی قائل ہوئی، تو تشبہ اور ''تکیف'' کی حد تک آ گئی، یہ بھی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ''جسمیت'' سے منزہ ہے، متکلمین اشاعرہ نے اس ''تعطل'' اور

تشبہ'' سے بچنے کے لیے ان تمام آیتوں اور حدیثوں کی تاویل شروع کردی، وہ ''استوا'' سے ''استیلا'' مراد لینے لگے، اسی طرح ''ید اللہ'' کی تفسیر ''نعمت'' اور ''قدرت'' سے کرنے لگے، ''فانک بأعیننا'' سے حفظ ونگہداشت کے معنیٰ لیے گئے الخ، لیکن سلف اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اس تاویل سے اتفاق نہیں کرتے، یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان الفاظ سے جو آپ مراد لے رہے ہیں، وہی مرادِ الٰہی بھی ہے؟ اور پھر تاویل کرنے والوں کو بعض آیتوں اور حدیثوں کی تاویل میں ایسی دوراز کار تاویلیں کرنا پڑتی ہیں کہ پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ابن فورک (المتوفی: 406 ہجری) کی ''مشکل الحدیث'' میں اس ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں، سلف کا مسلک اس ''تکیف وتعطیل اور تاویل'' سے الگ ہے، ائمۂ سلف کا مسلک امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی زبان میں یوں بیان کیا جاتا ہے۔

''ائمہ سلف کا مذہب یہ ہے کہ ہم اللہ کو تحریف، تعطیل، تکیف، تمثیل کا ادنیٰ شائبہ آئے ہوئے بغیر اِن صفتوں کے ساتھ متصف کردیں، جن کے ساتھ خود اس نے اپنے کو اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متصف کیا ہے، تو ان صفات کی نفی جائز نہیں، جن سے اس نے اپنے کو متصف کیا ہے، اور نہ ان صفات کو مخلوق کی صفتوں کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے، بلکہ اس کی ذات ان چیزوں سے منزہ ہے، اس کا مثل کوئی نہیں، نہ ذات میں نہ صفات میں نہ افعال میں، تو سلف کا مذہب دو مذہبوں کے بین بین اور دو گمراہیوں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے، یعنی صفات کا اثبات اور مخلوقات کے ساتھ مماثلت کی نفی۔ الخ (جلاء العینین: ص۲۱۲)

تو گویا سلف کا مسلک اثبات اور نفی کے درمیان ہوا، وہ ید، عین اور اس قسم کی دوسری صفتوں کی تاویل نہیں کرتے، بلکہ ان کے ظاہر ہی پر ایمان لاتے ہیں،

لیکن مماثلت کی نفی کے ساتھ ''ید'' اور ''عین'' سے صفاتِ باری میں وہ معنیٰ نہیں سمجھے جائیں گے، جو انسانوں کے ساتھ سمجھے جاتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کیف اور جسمیت سے منزہ ہے، اصل مفہوم اور کیف کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، ہمارا کام بے چوں وچرا ایمان لانا ہے، امام دارالہجرۃ مالک ابنِ انس رحمہ اللہ کا مشہور مقولہ مسلکِ سلف کا بہتریں ترجمان ہے:

الاستواء غير مجهول ،والكيف غير معقول ،والايمان به واجب ، والسؤال عنه بدعة .

''استواء نامعلوم نہیں، اور کیف کا تصور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا ،اور اس پر ایمان لانا واجب ہے، اور اس کے متعلق کرید نا بدعت'' (ایضاً: ص۲۲۹)

یہ سلف کا مسلک صرف حنابلہ یا امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کا نہیں، بلکہ تمام ائمۂ اسلام کا یہی مسلک رہا ہے، ''تشبیہ اور تجسم'' کی نفی کے ساتھ تاویل سے بچنا ''**الامساک عن التاويل مطلقا مع نفی التشبيه والتجسيم** '' تمام ائمہ کا مسلک رہا ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، محمد بن الحسین، سعد بن معاذ مروزی، عبداللہ بن المبارک، سفیان ثوری، امام بخاری، ترمذی، ابوداؤد سجستانی رحمہم اللہ وغیرہم سب اسی مسلک پر گامزن رہے ہیں (انتقاد الرجیح علیٰ حاشیۃ جلاء العینین، ص۲۰۳)

خود امام ابوالحسن اشعری سے رجوع ثابت ہے، امام الحرمین سے بھی اس کی تائید منقول ہے، تمام صحابہ اور تابعین کا تو یہ مسلک تھا ہی، تاویل کا دروازہ تو ''عقلیت'' کی گرم بازاری کے بعد کھلا۔

متاخرین اشاعرہ اور عام علمائے اسلام (متاخرین) کا مسلک تاویل کا رہا ہے، مدرسوں میں عقائد کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ یہی اہلِ تاویل کا

مسلک ہے، لیکن تاویل کے وہ معنیٰ تو ان الفاظ کا ایک محمل ہے، ایسی بیسیوں تاویلیں اور بھی کی جاسکتی ہیں، یہ کہاں سے ثابت ہوگیا کہ آپ کی تاویل عین مرادِ الٰہی کے مطابق ہے، اور اگر اس کا یقین نہیں (اور یقینی نہیں) تو ہم پھر اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈالیں؟ سلامتی اسی میں ہے کہ اسلاف کے طریقہ کے مطابق ہم بھی ''**كل ما ورد فى الشرع**'' پر بلا تعطیل وتکیف کے اعتقاد رکھیں، یہی پہلے بزرگوں کا مسلک ہے، اور اسی پر آج بھی ٹھیٹھ اہلِ توحید وسنت اعتقاد رکھتے ہیں، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور ان کے پیروں کا بھی یہی عقیدہ ہے:

....وبالجملة فعقيدتنا فى جميع الصفات الثابتة فى الكتاب والسنة، عقيدة اهل السنة والجماعة، نؤمن بها ونمر بها كما جاء ت مع اثبات حقائقها وما دلت عليه، من غير تكييف ولا تمثيل ومن غير تعطيل ولا تبديل ولا تاويل(الهدية السنية: ص ٩٩)

''خلاصہ یہ کہ ان تمام صفات کے بارے میں جو کتاب وسنت میں ثابت ہیں، ہمارا عقیدہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے، ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں، اور زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کرتے، اور ان کے معانی وحقائق پر اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن کسی تکیف، تمثیل یا تعطیل وتبدیل اور تاویل کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دیتے، الخ''۔ [1]

---

[1] مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:
جمہور سلف کا یہی مذہب ہے کہ متشابہات کے معانی کی تحقیق میں نہ پڑنا چاہیے، بلکہ اس پر ایمان لانا چاہیے کہ جو کچھ حق تعالیٰ کی مراد ہے، وہ حق ہے، اگرچہ ہم نہیں جانتے، اور ہمارے نہ جاننے سے کیا ہوتا ہے، ہم تو اپنے پیٹ کے اندر کے حالات کو بھی نہیں جانتے، اور بڑے سے بڑا ماہر اپنے نفس اور روح کی حقیقت کو نہیں جانتا، حق تعالیٰ کے اسرار کو جاننے کا دعویٰ کوئی صحیح العقل انسان نہیں کرسکتا (امداد المفتین جامع، جلد ا، ص ۳۶۶، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بذات اللہ وصفاتہ، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018)

آیاتِ صفات کے باب میں سلف کا مسلک مشہور ہے (جس کی مختصر توضیح اوپر کی گئی) صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شیخ الاسلام بھی سلف کا عقیدہ رکھتے تھے، قرونِ اولیٰ کے بعد امام ابنِ تیمیہ (المتوفیٰ: 768ہجری) سے زیادہ کسی نے اس سلسلے میں تکلیفیں نہیں اٹھائیں، اشاعرہ اور متکلمین کے خیالات ذہن اور دماغ پر کچھ اس طرح مسلط ہوگئے تھے کہ راہِ حق بھی لوگوں کو جاہلوں اور کم عقلوں کا مسلک نظر آتی تھی۔

بہرحال امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی طرح شیخ الاسلام ابنِ عبدالوہاب رحمہ اللہ بھی سلف کے عقیدے پر سختی کے ساتھ قائم رہے، اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے آلوسی کی ''جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے، جہاں فاضل مصنف نے پوری بحث کا نچوڑ دے دیا ہے، ابنِ تیمیہ، ابن جوزی (المتوفیٰ: 644ہجری) شیخ عبدالقادر جیلی (المتوفیٰ: 565ہجری) اور خود امام ابوالحسن اشعری (المتوفیٰ: 334ہجری، تقریباً) کی تصنیفات سے اقتباسات دیے ہیں۔ [1]

شیخ نے اپنی تمام کتابوں اور رسائل میں توحید پر بہت زور دیا ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کی تصنیفات میں صرف توحید ہی توحید ہے، ان کی دعوت بھی توحید کی تھی، شعار کلمہ ''لاالٰہ الا اللہ'' تھا، وہ ہر ایک کو اسی کلمہ کا مفہوم سمجھاتے، اور اس کی حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے، اسی لیے ان کے ماننے والے بسااوقات، موحدین کے نام سے بھی پکارے جاتے ہیں۔

---

[1] مگر افسوس کہ موجودہ دور کے بعض حضرات نے دونوں طرف سے صفاتِ متشابہات کے اس نازک مسئلہ کو موضوعِ بحث بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے ایک دوسرے پر فسق وضلالت کے فتوے لگائے جاتے ہیں، اور مضامین ورسائل تحریر کیے جاتے ہیں، اور ان ابنائے زمانہ کا حال یہ ہے کہ خود سے وہ اعتراض کیے جانے والی شخصیت کے موقف کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتے، اللہ تعالیٰ اس قسم کے فتنوں سے امتِ مسلمہ کی حفاظت فرما کر، ضروری اور اہم مسائل اور امتِ مسلمہ کی اصلاح میں مشغول ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ محمد رضوان۔

توحید کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق قرار دینا، بات معمولی سی ہے، لیکن شیطان کی گھاتیں بہت وسیع ہیں، اس نے ایک اللہ کے پرستاروں سے بھی وہ کام کرائے، جو شرک کی حدود میں داخل ہوتے ہیں، اخلاصِ توحید کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اعمال واقوال سے پرہیز کیا جائے، جن میں غیرُ اللہ کی شرکت کا ادنیٰ شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو، شیخ الاسلام نے ان اعمال واقوال کی توضیح میں کوئی کمی نہیں کی، ان کے مضرات اور برائیاں کھول کھول کر بیان کیں، جن راہوں سے یہ برائیاں پیدا ہوتی تھیں، ان کے روکنے کی کوششیں کیں، لیکن وہ قوم جو سارے عالم کے لیے توحید کا پیغام لے کر نکلی تھی، بعد کی صدیوں میں خود قبر پرستی، تعزیہ پرستی اور اس قسم کی دوسری ''پرستیوں'' کا اس طرح شکار ہوئی کہ جب ایک عرصہ کے بعد اس کے کانوں میں توحید کی آواز پہنچی، تو اسے اجنبیت محسوس ہونے لگی، کتاب وسنت سے نصوص پیش کیے گئے، تو تاویلیں کی گئیں، اور خود توحید کے علمبرداروں کو وہابی، مشرک، خارجی اور مختلف فقہی اور مذہبی گالیوں سے نوازا گیا۔

شیخ الاسلام (محمد بن عبدالوہاب نجدی) کا سارا قصور یہ ہے کہ انہوں نے کھلم کھلا توحید کی دعوت دی، شرک اور اس کی آلودگیوں سے بچنے کی تاکید کی، ''اوثان من دون اللہ'' کی مذمت کی، غیر اللہ کی قسمیں کھانا، نذریں ماننا اور قبروں کی پرستش کی صاف صاف برائی کی، اور اگر یہ واقعی قصور ہے، تو پھر ہر مسلمان کو سچے دل سے قصوروار بن جانا چاہیے (محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم اور بدنام مصلح، ص۱۲۶ تا ۱۳۴، مطبوعہ: طارق اکیڈمی، لائلپور (فیصل آباد) تاریخِ طباعت: مئی 1975ء)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس کے بعد شدِ رحال اور توسل وغیرہ کے فروعی مسائل میں بھی شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی کے موقف اور اختلاف کا ذکر کیا

ہے، چونکہ اس قسم کے مسائل کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل میں بھی اختلاف اجتہادی نوعیت کا ہے، اس لیے طوالت سے بچنے کے لیے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی مزید تفصیلی عبارات کو نقل کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

بہرحال مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی مندرجہ بالا رسالہ میں مذکور تحقیق سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی، عالمِ اسلام کی عظیم شخصیت ہیں اور بہت سی باتیں ان کی طرف جو منسوب کی گئی ہیں، وہ افترا پردازی اور بہتان پر مبنی ہیں۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.

(باب نمبر 2)

متأوِّل کی تکفیر پر ابنِ تیمیہ ومشائخِ دیوبند کا موقف

شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور وھابیہ چونکہ عموماً علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی اتباع کرتے ہیں، اس لیے اب اس باب میں متأول کے متعلق علامہ ابنِ تیمیہ اور چند مشائخِ دیوبند کا موقف ذکر کیا جاتا ہے، جس کے ذیل میں اہلِ بدعت کے فرقوں اور ''مجتهدِ متأول'' پر بھی کلام کیا گیا ہے۔
جس سے وھابیہ اور مشائخِ دیوبند کے اس باب میں اختلاف کی نوعیت واضح ہوتی ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ ''مجتهدِ متأول'' کے متعلق اپنی تالیف ''منهاج السنة'' میں فرماتے ہیں:

فلو قال قائل :إن عليا ومن قاتله قد التقيا بسيفهما، وقد استحلوا دماء المسلمين ، فيجب أن يلحقهم الوعيد.

لكان جوابه :أن الوعيد لا يتناول المجتهد المتأول وإن كان مخطئا، فإن الله تعالى يقول فى دعاء المؤمنين :(ربنا لا تؤاخذنا إن نسينا أو أخطأنا)قال " :قد فعلت "فقد عفى للمؤمنين عن النسيان والخطأ، والمجتهد المخطء مغفور له خطؤه، وإذا غفر خطأ هؤلاء فى قتال المؤمنين، فالمغفرة لعائشة لكونها لم تقر فى بيتها إذ كانت مجتهدة أولى (منهاج السنة النبوية فى نقض كلام الشيعة القدرية،لا بن تيمية، ج۴،ص ۳۱۹، ۳۲۰،كلام الرافضى على عائشة رضى الله عنها

أنها أذاعت سر رسول الله وخالفت أمر الله بالخروج على علي والرد عليه)

ترجمہ: پس اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ حضرت علی اور جنہوں نے ان سے قتال کیا، ان دونوں نے تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کا مقابلہ کیا، اور انہوں نے مسلموں کے خون کو حلال سمجھا، لہٰذا واجب ہوگا کہ ان کو بھی (مومن کو قتل کرنے کی) وعید شامل ہو۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ وعید "مجتهدِ متأول" کو شامل نہیں ہوتی، اگرچہ وہ مخطی ہو، اللہ تعالیٰ کا مومنوں کی دعاء کے متعلق سورہ بقرہ میں ارشاد ہے کہ "ربنا لا تؤاخذنا إن نسينا أو أخطأنا" پس مومنین سے نسیان اور خطا کو معاف قرار دے دیا گیا ہے، اور مجتہدِ مخطی کی خطا کو معاف کیا گیا ہے، اور جب ان لوگوں کو بھی مومنین کے قتال میں معاف قرار دیا گیا ہے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اپنے گھر میں مستقر نہ ہونے کا معاف ہونا بدرجۂ اولیٰ ہوگا، کیونکہ وہ (اپنے اس معاملہ میں) مجتہد تھیں (منہاج)

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی مومن دوسرے مومن کے ساتھ "مجتهدِ متأول" ہونے کی حیثیت سے قتال کرے، اگرچہ وہ متأول، مخطی ہو، تب بھی اس کو قتالِ مومن کی وعید شامل نہ ہوگی۔

پس اس بنیاد پر اگر شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین نے بعض ایسے لوگوں کو شرکِ اکبر کا مرتکب ہونے کی وجہ سے مرتد یا دائرۂ اسلام سے خارج سمجھ کر قتل کیا، کہ جن کے متعلق حنفیہ ومشائخِ دیوبند وغیرہ تاویل کے قائل تھے، تو ان وہابیہ کو قتلِ مسلم کی وعید شامل نہ ہوگی۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا دوسرا حوالہ

"منهاج السنة" میں ہی ایک اور مقام پر علامہ ابنِ تیمیہ نے فرمایا کہ:

وهـذا مبـنى على مسألتين :إحـداهما :أن الـذنـب لا يوجب كفر صـاحبـه، كـمـا تـقـولـه الـخـوارج، بـل ولا تخليده فى النار ومنع الشفاعة فيه، كما يقوله المعتزلة.

الثـانـى أن الـمتـأول الـذى قصده متابعة الرسول لا يكفر، بل ولا يـفسـق إذا اجتهد فأخطأ .وهـذا مشهـور عـند الناس فى المسائل العملية .وأما مسائل العقائد فكثير من الناس كفر المخطئين فيها. وهذا القول لا يعرف عن أحد من الصحابة والتابعين لهم بإحسان، ولا عن أحـد مـن أئـمة الـمسلمين، وإنما هو فى الأصل من أقوال أهـل البـدع، الـذيـن يبتـدعـون بـدعة ويـكـفـرون مـن خـالفهم، كـالـخوارج والمعتزلة والجهمية، ووقع ذلک فی کثیر من أتباع الأئمة، كبعض أصحاب مالک والشافعی وأحمد وغيرهم.

وقـد يسـلـكون فى التكفير ذلک ;فـمـنهـم من يكفر أهل البدع مـطـلقا، ثم يجعل كل من خرج عما هو عليه من أهل البدع .وهذا بـعينه قول الخوارج والمعتزلة الجهمية .وهـذا القول أيضا يوجد فـى طـائـفة مـن أصـحـاب الأئمة الأربعة، وليـس هو قول الأئمة الأربعة ولا غيـرهم ، وليـس فيهـم مـن كـفـر كـل مبتدع، بل الـمـنـقـولات الـصـريـحة عنهم تناقض ذلک، ولكن قد ينقل عن أحدهم أنـه كـفـر من قال بعض الأقوال، ويكون مقصوده أن هذا الـقـول كفر ليحذر، ولا يلزم إذا كان القول كفرا أن يكفر كل من قـالـه مـع الـجهل والتأويل ;فـإن ثبـوت الـكـفر فى حق الشخص الـمـعيـن، كثبـوت الـوعيد فى الآخرة فى حقه، وذلک له شروط

وموانع، كما بسطناه فى موضعه.

وإذا لـم يـكونوا فى نفس الأمر كفارا لم يكونوا منافقين، فيكونون مـن الـمـؤمنين، فيستغفر لهم ويترحم عليهم .وإذا قـال المؤمن : (رَبَّنَـا اغْـفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ) (سورة الحشر) يقصد كل من سبقه من قرون الأمة بالإيمان، وإن كان قد أخطأ فى تأويل تأوله فخالف السنة،

أو أذنـب ذنبـا، فـإنـه من إخوانه الذين سبقوه بالإيمان، فيدخل فى الـعـمـوم، وإن كـان من الثنتين والسبعين فرقة، فإنه ما من فرقة إلا وفيهـا خـلـق كثيـر ليسـوا كـفـارا، بـل مؤمنين فيهم ضلال وذنب يستحقون به الوعيد، كما يستحقه عصاة المؤمنين.

والنبى -صـلـى الـله عليه وسلم -لـم يـخرجهم من الإسلام، بل جـعـلهـم من أمته، ولـم يقل :إنهـم يـخـلدون فى النار .فهذا أصل عـظيـم ينبغى مراعاته ;فـإن كثيـرا من المنتسبين إلى السنة فيهم بـدعة، مـن جنس بدع الرافضة والخوارج .وأصـحاب الرسول - صـلـى الـله عليه وسلم -عـلـى بـن أبـى طـالب وغيره لم يكفروا الـخـوارج الـذيـن قـاتـلـوهـم، بـل أول مـا خرجوا عليـه وتحيزوا بـحـروراء ، وخـرجوا عن الطاعة والجماعة، قال لهم على بن أبى طـالب رضى الله عنه :إن لـكـم علينا أن لا نمنعكم مساجدنا ولا حقكم من الفىء .ثـم أرسل إليهم ابن عباس فناظرهم فرجع نحو نـصـفهم، ثم قاتل الباقى وغلبهم، ومع هذا لم يسب لهم ذرية، ولا غـنـم لهـم مـالا، ولا سـار فيهـم سيـرـة الـصـحـابة فى المرتدين،

كمسيلمة الكذاب وأمثاله، بل كانت سيرة على والصحابة فى الخوارج مخالفة لسيرة الصحابة فى أهل الردة، ولم ينكر أحد على على ذلك، فعلم اتفاق الصحابة على أنهم لم يكونوا مرتدين عن دين الإسلام .

قال الإمام محمد بن نصر المروزى " : وقد ولى على رضى الله عنه قتال أهل البغى، وروى عن النبى -صلى الله عليه وسلم - فيهم ما روى، وسماهم مؤمنين، وحكم فيهم بأحكام المؤمنين. وكذلك عمار بن ياسر ."

وقال محمد بن نصر أيضا " :حدثنا إسحاق بن راهويه، حدثنا يحيى بن آدم، عن مفضل بن مهلهل، عن الشيبانى، عن قيس بن مسلم، عن طارق بن شهاب قال " :كنت عند على حين فرغ من قتال أهل النهروان، فقيل له :أمشركون هم؟ قال :من الشرك فروا .فقيل :فمنافقون ؟ قال :المنافقون لا يذكرون الله إلا قليلا . قيل :فما هم؟ قال :قوم بغوا علينا فقاتلناهم "(منهاج السنة النبوية فى نقض كلام الشيعة القدرية، لا بن تيمية، ج۵، ص ۲۳۹ الىٰ ۲۴۲، فصل الله أمر بالاستغفار لأصحاب محمد فسبهم الرافضة)

ترجمہ: اور یہ دو باتوں پر مبنی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ گناہ گار شخص، گناہ کی وجہ سے کافر قرار نہیں پاتا، جیسا کہ خوارج کہتے ہیں، بلکہ جہنم میں ہمیشہ رہنے کا بھی مستحق نہیں ٹھہرتا، اور (انبیائے کرام وغیرہ کی) شفاعت سے بھی محروم نہیں ہوتا، جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ متأول جس کا ارادہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع

کرنے کا ہو، اس کو کافر نہیں قرار دیا جاتا، بلکہ فاسق بھی قرار نہیں دیا جاتا، جبکہ وہ اجتہاد میں خطا کرے، اور یہ بات لوگوں میں عملی مسائل کے متعلق تو مشہور ہے (جس کی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں) جہاں تک عقائد کے مسائل کا تعلق ہے، تو بہت سے لوگ عقائد کے مسائل میں خطا کار مجتہدین کو کافر قرار دیتے ہیں، لیکن یہ قول نہ تو صحابۂ کرام سے معروف ہے، اور نہ ہی ان کی نیک عمل میں اتباع کرنے والے تابعین سے معروف ہے، اور نہ ہی ائمۂ مسلمین میں سے کسی سے معروف ہے، بلکہ یہ بنیادی طور پر ان اہلِ بدعت کے اقوال میں سے ہے، جو بدعت کو ایجاد کرتے ہیں، اور پھر وہ اپنی مخالفت کرنے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، جیسا کہ خوارج اور معتزلہ اور جہمیہ، اور یہی بات ائمہ کرام کے بہت سے متبعین کی طرف سے کی گئی ہے، جیسا کہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کے بعض اصحاب کی طرف سے۔

جو اس سلسلہ میں تکفیر کے قائل ہیں، پس ان میں سے بعض تو مطلقاً اہلِ بدعت کی تکفیر کے قائل ہیں، پھر ان اہلِ بدعت میں سے جو اس باعثِ کفر بدعت سے خارج ہو جائے، اس کو اہلِ بدعت میں شمار کرتے ہیں، اور یہ بعینہٖ خوارج اور معتزلۂ جہمیہ کا قول ہے، جو کہ ائمہ اربعہ کے اصحاب کی ایک جماعت میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن یہ نہ تو ائمہ اربعہ کا قول ہے، اور نہ ان کے علاوہ دیگر ائمہ کا قول ہے، کیونکہ ان میں سے کسی نے ہر بدعتی کو کافر قرار نہیں دیا، بلکہ ان ائمہ کرام کی تصریحات اس کے برخلاف منقول ہیں، لیکن بعض اوقات ان کی طرف سے بعض اس طرح کے اقوال کو نقل کیا جاتا ہے، جن کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ قول کفر ہے، تاکہ اس سے بچا جائے، اور کسی قول کے کفر ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جس نے جہالت اور تاویل کے ساتھ یہ قول کیا ہو، تو اس کو کافر قرار دیا جائے،

کیونکہ کسی متعین شخص کے حق میں کفر کا ثبوت ایسا ہی ہے، جیسا کہ اس کے حق میں آخرت کی وعید کو ثابت کیا جائے، جس کے لیے کچھ شرائط اور موانع ہیں، جن کی ہم نے اپنے مقام پر تفصیل ذکر کردی ہے۔

اور جب یہ اہلِ بدعت حقیقت میں کافر نہیں ہیں، تو یہ منافق بھی نہیں ہوں گے، بلکہ مومنین میں شمار ہوں گے، جن کے لیے استغفار بھی کیا جائے گا، اور ان کے لیے رحم کی دعا بھی کی جائے گی، اور جب مومن یہ دعا کرتا ہے کہ

''رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ''

تو وہ ہر زمانہ میں گزرے ہوئے مومن امتی کا ارادہ کرتا ہے، اگرچہ اس مومن نے کسی تاویل میں خطاء کی ہو، اور سنت کی مخالفت کی ہو، یا کوئی گناہ کیا ہو، کیونکہ وہ سب لوگ اس کے ان بھائیوں میں شامل ہوتے ہیں، جو ایمان کے ساتھ گزر چکے ہیں، اس لیے وہ اس عموم میں داخل ہوتے ہیں، اگرچہ وہ (غیر ناجی) بہتّر 72 فرقوں سے تعلق رکھتے ہوں، اس لیے کہ ان فرقوں میں سے کوئی بھی فرقہ ایسا نہیں ہے، جس میں خلقِ کثیر نہ ہو، اور وہ کفار نہیں ہیں، بلکہ مومن ہیں، جن میں گمراہ لوگ بھی ہیں، اور گناہ گار بھی ہیں، جو اسی طرح کی وعید کے مستحق ہیں، جس طرح کی وعید کے گناہ گار مومنین مستحق ہوتے ہیں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام سے خارج قرار نہیں دیا، بلکہ ان کو اپنے امتیوں میں شمار کیا، اور یہ نہیں فرمایا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، پس یہ شریعت کا بہت بڑا قاعدہ ہے، جس کی رعایت ضروری ہے، کیونکہ بہت سے سنت کی طرف نسبت کرنے والے لوگوں میں ایسی بدعت کا وجود پایا جاتا ہے، جو کہ رافضیہ اور خوارج کی بدعت کی جنس سے تعلق رکھتی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام، مثلاً حضرت علی بن ابی طالب اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ان

خوارج کو کافر قرار نہیں دیا، جنہوں نے ان سے قتال کیا، بلکہ شروع میں جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا، اور حروراء میں قبضہ کیا اور وہ (خلیفۂ راشد کی) اطاعت اور جماعت سے خارج ہو گئے، تو ان کو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ ہم تمہیں اپنی مساجد سے منع نہ کریں، اور نہ تمہارے مالِ فیء کے حق سے منع کریں، پھر ان کی طرف ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کو بھیجا، جنہوں نے ان سے مناظرہ کیا، جس کی بناء پر ان کے آدھے کے قریب لوگوں نے رجوع کر لیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باقی لوگوں سے قتال کیا، اور ان پر غلبہ حاصل کیا، لیکن اس کے باوجود ان کی اولاد کو قید نہیں کیا، اور نہ ان کے مال کو مالِ غنیمت بنایا، اور نہ ہی ان کے متعلق صحابہ کے اس طریقہ کو اختیار کیا، جو صحابہ کرام نے مرتدین کے بارے میں اختیار کیا، جیسا کہ مسیلمہ کذاب اور ان کے مثل، بلکہ حضرت علی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ خوارج کے متعلق، صحابۂ کرام کے اس طریقہ کے خلاف ہے جو انہوں نے مرتدین کے بارے میں اختیار کیا تھا، اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی، جس سے صحابۂ کرام کا اس بات پر اتفاق ثابت ہو گیا کہ وہ لوگ دینِ اسلام سے مرتد نہیں تھے۔

امام محمد بن نصر مروزی نے فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغی لوگوں سے قتال کیا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے متعلق جو کچھ مروی ہے، وہ معلوم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا نام مومن رکھا، اور ان پر مومنوں والے احکام جاری فرمائے، اور اسی طریقہ سے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے کیا۔

اور محمد بن نصر نے ہی اسحاق بن راہویہ سے، انہوں نے یحیٰی بن آدم سے، انہوں نے مفضل بن مہلہل سے، انہوں نے، شیبانی سے، انہوں نے قیس بن مسلم سے،

انہوں نے طارق بن شہاب سے روایت کیا ہے کہ میں اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا، جب وہ اہلِ نہروان کے قتال سے فارغ ہوئے، آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ مشرک ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ وہ شرک سے بھاگ چکے ہیں، پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ منافق ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ منافق تو اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں، پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ وہ باغی لوگ ہیں، جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، جس کے نتیجے میں ہم نے ان سے قتال کیا (منہاج السنۃ)

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی مذکورہ تفصیلی عبارت سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک جس طرح فقہی وعملی مسائل میں متأول، مجتہد کافر نہیں، بلکہ فاسق بھی نہیں، اسی طرح عقائد کے مسائل میں بھی ''مجتهدِ متأول'' کافر نہیں، اسی وجہ سے جمہور ائمۂ متبوعین نے عقائد کے باب میں اختلاف کرنے والے مختلف فرقوں کو علی الاطلاق کافر قرار نہیں دیا، جن میں بہت سارے فرقے اور ہر فرقے میں بہت سے لوگ داخل ہیں۔

اور ائمہ متبوعین کے علاوہ جن بعد کے علماء نے ان کو کافر قرار دیا، ان کا قول مرجوح ہے، اور ائمہ کرام کی تصریحات، اس کے برخلاف ہیں۔

جس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ صحابۂ کرام نے اہلِ خوارج کی اس جماعت کو بھی کافر قرار نہیں دیا، جنہوں نے ان سے قتال کیا، بلکہ ان کو مومن قرار دیا، اور ان سے قتال صرف بغاوت کی وجہ سے کیا۔

یہی بات متعدد فقہائے حنفیہ نے بھی کہی ہے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

پس علامہ ابنِ تیمیہ کی اس تصریح کی رُو سے ہم بھی عقائد کے باب میں تاویلات کرنے والوں کو اہلِ بدعت میں تو بالیقین شمار کرتے ہیں، لیکن تاویل کی وجہ سے شرکِ اکبر کا مرتکب

اور مرتد ہونے کی وجہ سے واجب القتل نہیں سمجھتے، البتہ اگر وہ حاکمِ وقت سے بغاوت و مقابلہ پر اتر آئیں، خواہ انہوں نے حاکمِ وقت کی طرف سے ان بدعات اور قابلِ تاویل شرکیہ افعال واقوال پر نکیر کرنے کی وجہ سے ہی کیوں نہ بغاوت کی ہو، ان سے بوجہ بغاوت، قتال کو جائز سمجھتے ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کسی فرد یا فرقے سے فروعی کے بجائے اصولی اختلاف کے باوجود، اس کو مومن شمار کرنے میں مانع نہیں، کیونکہ اہلِ بدعت فرقوں کا اہلُ السنۃ والجماعۃ سے اکثر اصولی اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود ان کو علی الاطلاق کافر قرار نہیں دیا جاتا، اور مسلمان کے اقوال وافعال میں تاویل کے قائلین کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ ہر زمانے میں اہلِ بدعت کے تمام فرقوں کو تاویل کر کے ہی مسلمان قرار دیا جاتا رہا، لہٰذا موجودہ زمانے کے اہلِ بدعت کو بھی وہی حکم دینا چاہیے، اور انہیں صریح مشرک و کافر قرار دینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

مذکورہ تفصیل سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ بعض اہلِ علم حضرات نے جو اہلِ بدعت کے ساتھ کفار ومشرکین کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، یہ بھی راجح نہیں، جس کی مزید تفصیل علامہ ابنِ تیمیہ ہی کے حوالہ سے آگے آتی ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا تیسرا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

فصل: ولا يجوز تكفير المسلم بذنب فعله ولا بخطأ أخطأ فيه كالمسائل التى تنازع فيها أهل القبلة فإن الله تعالى قال (آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

غُفُرَانَکَ رَبَّنَا وَإِلَیْکَ الْمَصِیْر)وقد ثبت فی الصحیح أن الله تعالی أجاب هذا الدعاء وغفر للمؤمنین خطأهم .والخوارج المارقون الذین أمر النبی صلی الله علیه وسلم بقتالهم قاتلهم أمیر المؤمنین علی بن أبی طالب أحد الخلفاء الراشدین .واتفق علی قتالهم أئمة الدین من الصحابة والتابعین ومن بعدهم .ولم یکفرهم علی بن أبی طالب وسعد بن أبی وقاص وغیرهما من الصحابة بل جعلوهم مسلمین مع قتالهم ولم یقاتلهم علی حتی سفکوا الدم الحرام وأغاروا علی أموال المسلمین فقاتلهم لدفع ظلمهم وبغیهم لا لأنهم کفار .ولهذا لم یسب حریمهم ولم یغنم أموالهم .وإذا کان هؤلاء الذین ثبت ضلالهم بالنص والإجماع لم یکفروا مع أمر الله ورسوله بقتالهم فکیف بالطوائف المختلفین الذین اشتبه علیهم الحق فی مسائل غلط فیها من هو أعلم منهم؟ فلا یحل لأحد من هذه الطوائف أن تکفر الأخری ولا تستحل دمها ومالها وإن کانت فیها بدعة محققة فکیف إذا کانت المکفرة لها مبتدعة أیضا؟ وقد تکون بدعة هؤلاء أغلظ والغالب أنهم جمیعا جهال بحقائق ما یختلفون فیه .

والأصل أن دماء المسلمین وأموالهم وأعراضهم محرمة من بعضهم علی بعض لا تحل إلا بإذن الله ورسوله .قال النبی صلی الله علیه وسلم لما خطبهم فی حجة الوداع "(إن دماء کم وأموالکم وأعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا) " وقال "(کل المسلم علی المسلم حرام:

دمه وماله وعرضه) ." وقال "(من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا فهو المسلم له ذمة الله ورسوله) " وقال "(إذا التقى المسلمان بسيفيهما فالقاتل والمقتول فى النار قيل يا رسول الله هذا القاتل فما بال المقتول؟ قال :إنه أراد قتل صاحبه) "وقال " :(لا ترجعوا بعدى كفارا يضرب بعضكم رقاب بعض) "وقال "(إذا قال المسلم لأخيه يا كافر فقد باء بها أحدهما) " وهذه الأحاديث كلها فى الصحاح .

وإذا كان المسلم متأولا فى القتال أو التكفير لم يكفر بذلك كما (قال عمر بن الخطاب لحاطب بن أبى بلتعة :يا رسول الله دعنى أضرب عنق هذا المنافق فقال النبى صلى الله عليه وسلم إنه قد شهد بدرا وما يدريك أن الله قد اطلع على أهل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم؟) وهذا فى الصحيحين .وفيهما أيضا :من حديث الإفک :(أن أسيد بن الحضير .قال لسعد بن عبادة :إنک منافق تجادل عن المنافقين واختصم الفريقان فأصلح النبى صلى الله عليه وسلم بينهم) . فهؤلاء البدريون فيهم من قال لآخر منهم :إنک منافق ولم يكفر النبى صلى الله عليه وسلم لا هذا ولا هذا بل شهد للجميع بالجنة .وكذلک ثبت فى الصحيحين عن (أسامة بن زيد أنه قتل رجلا بعد ما قال لا إله إلا الله وعظم النبى صلى الله عليه وسلم ذلک لما أخبره وقال يا أسامة أقتلته بعد ما قال لا إله إلا الله؟ وكرر ذلک عليه حتى قال أسامة :تمنيت أنى لم أكن أسلمت إلا يومئذ) . ومع هذا لم

يـوجب عليه قودا ولا دية ولا كفارة لأنه كان متأولا ظن جواز قتل ذلک القائل لظنه أنه قالها تعوذا .

فهكـذا السـلف قـاتـل بـعـضهـم بـعـضـا من أهل الجمل وصفين ونـحـوهم وكلهم مسلمون مؤمنون كما قال تعالى :(وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِـنَ الْـمُـؤْمِـنِيْـنَ اقْتَتَـلُـوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْـرٰى فَـقَـاتِـلُـوا الَّتِـى تَبْـغِـىْ حَتّٰـى تَـفِيْءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ فَإِنْ فَائَتْ فَـأَصْـلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْن) فقد بيـن الـلـه تـعـالـى أنهـم مع اقتتالهم وبغى بعضهم على بعض إخوة مؤمنون وأمر بالإصلاح بينهم بالعدل.

ولهـذا كـان السلف مع الاقتتال يوالى بعضهم بعضا موالاة الدين، لا يـعـادون كـمـعـادات الـكـفار فيقبل بعضهم شهادة بعض ويأخذ بـعضهم العلم عن بعض ويتوارثون ويتناكحون ويتعاملون بمعاملة الـمسلمين بعضهم مع بعض، مع ما كان بينهم من القتال والتلاعن وغير ذلک .وقـد ثبـت فـى الـصـحيـح أن (النبى صلى الله عليه وسـلـم سأل ربه أن لا يهلک أمته بسنة عامة فأعطاه ذلک وسأله أن لا يسـلـط عـليهـم عـدوا من غيرهم فأعطاه ذلک وسأله أن لا يـجـعـل بأسهم بينهم فلم يعط ذلک) " وأخبـر أن الـله لا يسلط عـليهـم عـدوا مـن غيـرهـم يغلبهم كلهم حتى يكون بعضهم يقتل بـعضا وبعضهم يسبى بعضا .وثبـت فى الصحيحين (لما نزل قوله تعالى (قُـلْ هُـوَ الْقَادِرُ عَلٰى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ) قال أعـوذ بـوجهک (أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ) قـال أعوذ بوجهک (أَوْ

يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْض) قال هاتان أهون) ." هذا
مع أن الله أمر بالجماعة والائتلاف ونهى عن البدعة والاختلاف
وقال :(إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِينَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ)
وقال النبى صلى الله عليه وسلم "(عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّ يَدَ اللّٰهِ
عَلَى الْجَمَاعَةِ) وقال:(الشَّيْطَانَ مَعَ الوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الاثْنَيْنِ أَبْعَدُ)
وقال :(الشيطان ذئب الإنسان كذئب الغنم والذئب إنما يأخذ
القاصية والنائية من الغنم) ." فالواجب على المسلم إذا صار فى
مدينة من مدائن المسلمين أن يصلى معهم الجمعة والجماعة
ويوالى المؤمنين ولا يعاديهم وإن رأى بعضهم ضالا أو غاويا
وأمكن أن يهديه ويرشده فعل ذلك وإلا فلا يكلف الله نفسا إلا
وسعها وإذا كان قادرا على أن يولى فى إمامة المسلمين الأفضل
ولاه وإن قدر أن يمنع من يظهر البدع والفجور منعه .وإن لم يقدر
على ذلك فالصلاة خلف الأعلم بكتاب الله وسنة نبيه الأسبق
إلى طاعة الله ورسوله أفضل كما قال النبى صلى الله عليه وسلم
فى الحديث الصحيح " :(يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ، فَإِنْ
كَانُوْا فِي الْقِرَائَةِ سَوَاءً، فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ
سَوَاءً، فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً، فَأَقْدَمُهُمْ سِنًّا)
."وإن كان فى هجره لمظهر البدعة والفجور مصلحة راجحة
هجره كما هجر النبى صلى الله عليه وسلم الثلاثة الذين خلفوا
حتى تاب الله عليهم .وأما إذا ولى غيره بغير إذنه وليس فى ترك
الصلاة خلفه مصلحة شرعية كان تفويت هذه الجمعة والجماعة

جهلا وضلالا وكان قد رد بدعة ببدعة .حتى إن المصلى الجمعة خلف الفاجر اختلف الناس فى إعادته الصلاة وكرهها أكثرهم حتى قال أحمد بن حنبل فى رواية عبدوس :من أعادها فهو مبتدع .وهذا أظهر القولين لأن الصحابة لم يكونوا يعيدون الصلاة إذا صلوا خلف أهل الفجور والبدع ولم يأمر الله تعالى قط أحدا إذا صلى كما أمر بحسب استطاعته أن يعيد الصلاة . ولهذا كان أصح قولى العلماء أن من صلى بحسب استطاعته أن لا يعيد حتى المتيمم لخشية البرد ومن عدم الماء والتراب إذا صلى بحسب حاله والمحبوس وذووا الأعذار النادرة والمعتادة والمتصلة والمنقطعة لا يجب على أحد منهم أن يعيد الصلاة إذا صلى الأولى بحسب استطاعته(مجموع الفتاوىٰ لابنِ تيمية، ج٣ص ٢٨٢، الىٰ ٢٨٧، مجمل اعتقاد السلف، فصل لا يجوز تكفير مسلم بذنب فعله)

ترجمہ: فصل: اور مسلم کو اس کے کیے ہوئے کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار دینا جائز نہیں، اور نہ ہی مسلم کی کسی خطا کی وجہ سے اس کو کافر قرار دینا جائز ہے، جیسا کہ ان مسائل کی وجہ سے، جن میں اہلِ قبلہ کا نزاع ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ’’آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ‘‘ (مذکورہ آیت میں تمام مومنوں کو، اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے والا قرار دیا گیا ہے) اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ نے اس دعاء کو قبول فرمالیا، اور مومنین کی خطاؤں کو معاف فرمادیا‘‘ (جس کا ذکر ’’رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ

نَسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا ''میں ہے) اور خوارج جو (اسلام سے) تیر کی طرح نکلنے والے ہیں، اور ان سے قتال کرنے کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، ان سے امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قتال فرمایا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین میں سے ایک خلیفۂ راشد ہیں، اور ان کے قتال کرنے پر صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے ائمۂ دین کا اتفاق ہے، لیکن خوارج کو علی بن ابی طالب اور سعد بن ابی وقاص، اور ان کے علاوہ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کافر قرار نہیں دیا، بلکہ ان کے ساتھ قتال کرنے کے باوجود، ان کو مسلمان قرار دیا، اور ان سے اس وقت تک قتال نہیں کیا، جب تک کہ انہوں نے ناجائز خون نہیں بہایا، اور مسلمانوں کے مالوں پر ناجائز قبضہ نہیں کیا، پھر ان سے ان کے ظلم اور بغاوت کو دور کرنے کے لیے ہی قتال فرمایا، ان سے کافر ہونے کی وجہ سے قتال نہیں فرمایا، اور اسی وجہ سے ان کی خواتین کو قید نہیں فرمایا، اور ان کے مالوں کو مالِ غنیمت نہیں بنایا، اور جب یہ لوگ کہ جن کی گمراہی نص اور اجماع سے ثابت ہے، اور اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قتال کا بھی حکم دیا ہے، ان کو بھی کافر قرار نہیں دیا گیا، تو ان جماعتوں کو کیسے کافر قرار دیا جاسکتا ہے، جو اختلاف کرتے ہیں، اور ان پر چند مسائل میں حق مشتبہ ہے، اور اس قسم کے مسائل میں ان سے زیادہ علم والوں نے بھی غلطی کی ہے؟ پس ان جماعتوں میں سے کسی کے لیے بھی یہ حلال نہیں ہے کہ وہ دوسری جماعتوں کی تکفیر کرے، اور نہ ہی ان کا خون اور مال حلال ہے، اگرچہ کسی جماعت میں بدعت متحقق بھی ہو جائے، پس جب کافر قرار دی جانے والی جماعت مبتدع ہو، تو اس کو کیسے کافر قرار دیا جاسکتا ہے، اور بعض اوقات ان لوگوں کی بدعت زیادہ سخت ہوتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ تمام لوگ ان چیزوں کے حقائق سے ناواقف ہیں،

جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اور اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے خون اور ان کے اموال، اور ان کی عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول کی اجازت سے ہی حلال ہوسکتی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر، تمہارے اس دن کی طرح حرام ہیں، تمہارے اس شہر میں، اور تمہارے اس مہینے میں ہونے کی طرح'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون اور مال اور عزت حرام ہے''، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو ہماری طرح نماز پڑھے، اور ہمارے قبلے کا استقبال کرے، اور ہمارے ذبیحے کو کھالے، تو وہ مسلم ہے، اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے'' (ان لوگوں کو اہلِ قبلہ کہا جاتا ہے) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ باہم مقابلہ کریں، تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے، عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! قاتل کے تو جہنم میں جانے میں شبہ نہیں، لیکن مقتول کے جہنم میں جانے کی کیا وجہ ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس نے دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم میرے بعد کافر ہو کر مت لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنوں کو مارو'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جب مسلمان اپنے بھائی کو اے کافر! کہتا ہے، تو اس کافر کہنے کا ان دونوں میں سے کوئی ایک مستحق ہوجاتا ہے'' اور یہ تمام احادیث صحاحِ ستہ میں ہیں۔

اور جب مسلمان قتال کرنے یا کافر قرار دینے میں تاویل کرنے والا ہو، تو اس کو اس کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیا جائے گا'' جیسا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے

حاطب بن ابی بلتعہ کے بارے میں فرمایا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن کو ماردوں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص غزوۂ بدر میں شریک ہوا ہے، اور آپ کو کیا معلوم کہ اللہ نے اہلِ بدر والوں کے لیے یہ اعلان فرمایا ہے کہ تم جو چاہے عمل کرو، میں نے تمہاری مغفرت کردی ہے'' اور یہ حدیث صحیحین میں ہے، اور صحیحین ہی میں حدیثِ افک میں ہے کہ'' اسید بن حضیر نے سعد بن عبادہ سے کہا کہ تو منافق ہے، منافقین سے جدال بھی کرتا ہے، اور دونوں فریقوں کا جھگڑا ہو گیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان مصالحت فرمائی'' پس یہ صحابۂ کرام بدری ہیں، جن میں وہ شخص بھی داخل ہے، جس نے دوسرے سے یہ کہا کہ تو منافق ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو اِس کو کافر قرار دیا، اور نہ اُس کو کافر قرار دیا، بلکہ سب کے لیے جنت کی گواہی دی (کیونکہ ان کا اختلاف اجتہاد پر مبنی تھا) اور اسی طرح سے صحیحین میں یہ واقعہ موجود ہے کہ'' اسامہ بن زید نے ایک آدمی کو'' لا الٰہ الا اللہ'' کہنے کے بعد قتل کردیا، اور انہوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر دی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہت بڑی چیز سمجھا، اور فرمایا کہ اے اسامہ! آپ نے اُس آدمی کو '' لا الٰہ الا اللہ'' کہنے کے بعد بھی قتل کردیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بار بار دہرائی، یہاں تک کہ اسامہ کہتے ہیں کہ میں یہ تمنا کرنے لگا کہ کاش کہ میں آج کے دن سے پہلے اسلام نہ لایا ہوتا (اور آج اسلام لے آتا، تاکہ اس شخص کو بحالتِ کفر قتل کرنے کا گناہ آج اسلام لانے کی وجہ سے ختم ہوجاتا)'' لیکن اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ پر نہ تو جرمانہ عائد کیا، اور نہ دیت عائد کی، اور نہ کفارہ کا حکم فرمایا، کیونکہ وہ متأول تھے، اور انہوں نے اس کلمے کو کہنے والے آدمی کے قتل کے جائز ہونے کا گمان کرلیا تھا، چونکہ آپ کا گمان یہ تھا کہ

اس شخص نے یہ کلمہ جان بچانے کے لیے کہا ہے۔

پس اسی طریقے سے اسلاف میں سے بعض نے بعض کے ساتھ قتال کیا، مثلاً اہلِ جمل نے اور اہلِ صفین نے، اوران کے مثل دوسرے حضرات نے، لیکن وہ تمام حضرات مسلم اور مومن ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''**وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ فَإِنْ فَائَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ** ''مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمادیا کہ وہ آپس میں قتال کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کرنے کے باوجود بھائی بھائی ہیں، مومن ہیں، اوران کو آپس میں عدل کے ساتھ اصلاح کرنے کا حکم فرمایا۔

اوراسی وجہ سے سلف ایک دوسرے سے قتال کرنے کے باوجود، دین کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، کفار کی طرح، ایک دوسرے سے عداوت نہیں رکھتے تھے، اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی گواہی کو قبول کرتے تھے، اور وہ ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے تھے، اورایک دوسرے کے وارث بنتے تھے، اور ایک دوسرے سے نکاح کرتے تھے، اور وہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ مسلمانوں والے معاملات کیا کرتے تھے، باوجودیکہ ان کے درمیان قتال اور تلاعن وغیرہ کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور صحیح حدیث میں یہ بات مذکور ہے کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے یہ دعاء کی کہ آپ کی امت قحط سالی کی وجہ سے ہلاک نہ ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے اس دعاء کو قبول فرمالیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء بھی کی کہ ان پر، ان کے علاوہ دشمنوں کو مسلط نہ کیا جائے، اس دعاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے

ایک دعاء یہ کی کہ ’’ان کے درمیان آپس میں جدال وقتال نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دعاء کو قبول نہیں فرمایا‘‘ اور اس بات کی خبر دی کہ اللہ ان پر، ان کے علاوہ ایسے دشمن کو تو مسلط نہیں فرمائے گا کہ وہ تمام مغلوب ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں، اور ایک دوسرے کو قید کریں، اور صحیحین میں یہ حدیث موجود ہے کہ ’’جب اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا کہ ’’قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ ‘‘ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں آپ کی ذات سے پناہ چاہتا ہوں ’’أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ ‘‘ تو فرمایا کہ میں آپ کی ذات سے پناہ طلب کرتا ہوں ’’أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ‘‘ تو فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں ہلکی ہیں‘‘ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی (یعنی اس آخری بات کو ہلکا قرار دیا) حالانکہ اللہ نے اجتماعیت اور آپس میں محبت کا حکم فرمایا ہے، اور بدعت اور اختلاف سے منع فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ’’إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ‘‘ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ’’تم اپنے اوپر جماعت کو لازم پکڑلو، کیونکہ جماعت کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے‘‘ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ’’ایک کے ساتھ شیطان ہوتا ہے، اور وہ دو افراد سے زیادہ دور ہوتا ہے‘‘ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ’’شیطان، انسان کا بھیڑیا ہے، جس طریقے سے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے، اور بھیڑیا اکیلی بکری اور ریوڑ سے الگ ہونے والی بکری کو کھالیتا ہے‘‘ پس مسلمان پر واجب ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر میں ہو، تو وہ ان کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھے، اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھے، اور مومنوں سے محبت رکھے، اور ان سے عداوت نہ رکھے، اگرچہ بعض مومنوں کو (بدعت اور فسق کی وجہ سے) گمراہ یا بھٹکنے والا کیوں نہ سمجھے، اور اگر ممکن

ہو، تو اس کو ہدایت اور سیدھے راستے کی تعلیم دے، اور اگر یہ بات ممکن نہ ہو، تو حرج نہیں، کیونکہ اللہ، ہر نفس کو اس کی وسعت کے مطابق ہی مکلّف فرماتا ہے، اور جب وہ اس بات پر قادر ہو کہ وہ مسلمانوں کی امامت میں افضل آدمی کو مقرر کرے، تو اسی کو مقرر کرنا چاہیے، اور جب اس بات پر قادر ہو کہ بدعات اور فسق وفجور ظاہر کرنے والے کو منع کر سکے، تو اسے منع کرنا چاہیے، لیکن اگر اس بات پر قادر نہ ہو، تو پھر اس کے پیچھے نماز پڑھنا افضل ہے، جو کتابُ اللہ اور سنتِ نبیؐ اللہ کو زیادہ جانتا ہو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں زیادہ سبقت لے جانے والا ہو، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح حدیث میں ارشاد ہے کہ ''لوگوں کی امامت وہ کرائے، جو ان میں کتابُ اللہ کی زیادہ قرائت کرنے والا ہو، پھر اگر سب لوگ قرائت میں برابر ہوں، تو وہ امامت کرائے، جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، پھر اگر وہ سنت کے اندر بھی برابر ہوں، تو وہ امامت کرائے، جس نے پہلے ہجرت کی ہو، اور اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں، تو وہ امامت کرائے، جو ان میں زیادہ عمر والا ہو''

اور اگر اس بدعت اور فسق وفجور کا اظہار کرنے والے سے ترکِ تعلق کرنے میں کوئی مصلحت راجح ہو، تو پھر اس سے ترکِ تعلق کر دے، جیسا کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین لوگوں سے ترکِ تعلق کیا، جو جہاد سے پیچھے رہ گئے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی''

اور جب اس کی اجازت کے بغیر کسی اور (یعنی بدعتی یا فاسق فاجر وغیرہ) کو امامت کی ذمہ داری سونپ دی جائے، اور اس کے پیچھے نماز کو ترک کرنے میں کوئی شرعی مصلحت نہ ہو، تو اس کی اقتداء میں جمعہ اور جماعت کو فوت کرنا جہل اور ضلالت میں داخل ہوگا، اور یہ ایک بدعت کی، دوسری بدعت سے تردید کرنے والا شمار

ہوگا، یہاں تک کہ فاجر کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھنے والے کی نماز کا اعادہ کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہے، اس کو اکثر حضرات نے مکروہ قرار دیا ہے، یہاں تک کہ امام احمد بن حنبل نے عبدوس کی روایت میں فرمایا کہ ''جس نے ایسی نماز کا اعادہ کیا، تو وہ بدعتی ہوگا'' اور یہ دونوں قولوں میں سے زیادہ راجح قول ہے، اس لیے کہ صحابۂ کرام، اہلِ فجور واہلِ بدعت کے پیچھے جب نماز پڑھا کرتے تھے، پھر وہ اس کا اعادہ نہیں کیا کرتے تھے، اور جس نے اپنی حسبِ استطاعت، اللہ کے حکم کے مطابق نماز پڑھ لی، اللہ نے اس کو نماز کے اعادے کا حکم نہیں فرمایا، اس وجہ سے علماء کے دو قولوں میں سے صحیح تر قول یہ ہوگا کہ جس نے اپنی حسبِ استطاعت نماز پڑھ لی، تو وہ نماز کا اعادہ نہیں کرے گا، یہاں تک کہ سردی کے ڈر اور پانی اور مٹی کے موجود نہ ہونے کی صورت میں جب اپنی حسبِ حالت نماز پڑھ لی، اور محبوس اور عذر والے نے، خواہ وہ عذر نادر ہو، یا معتاد ہو، متصل ہو یا منقطع ہو، جب نماز پڑھ لی، تو ان میں سے کسی پر نماز کا اعادہ واجب نہیں ہوگا، جبکہ اس نے پہلے اپنے حسبِ استطاعت نماز پڑھ لی ہو (مجموع الفتاویٰ)

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی مفصل ومحقق عبارت سے کئی اہم اور پیچیدہ باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ کوئی مسلمان گناہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خطا کی وجہ سے کوئی بھی مسلمان کافر نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اہلِ قبلہ کی سینکڑوں جماعتوں کو کافر قرار نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ خوارج، جنہوں نے صحابۂ کرام سے قتال کیا اور ان سے قتال کرنے اور ان کے گمراہ ہونے کا احادیث میں ذکر آیا، ان کو بھی کافر قرار نہیں دیا گیا، بلکہ جب انہوں نے بغاوت کی یا معصوم جانوں اور مالوں کو ضائع کیا، تو اس ظلم وشر کو دور کرنے کے لیے ان سے قتال کیا گیا۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اہلِ بدعت کی جتنی بھی جماعتیں ہیں، ان کو بھی کافر قرار نہیں دیا

جائے گا۔
چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ اہلِ بدعت کی اقتداء میں بوقتِ مجبوری نماز ادا کرلی جائے گی۔
پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ اہلِ بدعت کے ساتھ مسلمانوں والا برتاؤ کیا جائے گا۔
اور صرف مصلحت وضرورت کی وجہ سے ہی ان سے بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت ترکِ تعلق کیا جائے گا۔
چھٹی بات یہ معلوم ہوئی کہ بوقتِ عذر بدعتی کی اقتداء میں ادا کی ہوئی نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔
پس علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت کی روشنی میں وہ مسلمان جو قبور کو سجدہ اور دیگر منکراتِ قبور کا تاویلاً ارتکاب کریں، ہم ان کو بدعتی قرار دیتے ہیں، اوران کو صریح مشرک و کافر قرار نہیں دیتے، جس طرح کے خیر القرون سے لے کر اب تک تمام فرقوں کو بدعتی اوراہل السنۃ سے خارج تو قرار دیا گیا، لیکن صراحتاً کافر ومشرک قرار نہیں دیا گیا، اور ہم اس سلسلہ میں اہلِ نجد کے اس قول کو جس کی رو سے بدعتیوں کا صریح مشرک وکافر ہونا لازم آتا ہے، مرجوح اور خطا پر مبنی خیال کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اس قول میں اہلِ نجد کو زیادہ سے زیادہ خاطی سمجھتے ہیں، لیکن عاصی اور ضال نہیں سمجھتے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا چوتھا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

والتحقيق فى هذا :أن القول قد يكون كفرا كمقالات الجهمية الذين قالوا :إن الله لا يتكلم ولا يرى فى الآخرة ؛ ولكن قد يخفى على بعض الناس أنه كفر.

فيطلق القول بتكفير القائل ؛ كما قال السلف من قال :القرآن

مخلوق فهو كافر ومن قال :إن الله لا يرى فى الآخرة فهو كافر. ولا يكفر الشخص المعين حتى تقوم عليه الحجة كما تقدم كمن جحد وجوب الصلاة .والزكاة واستحل الخمر ؛ والزنا وتأول . فإن ظهور تلك الأحكام بين المسلمين أعظم من ظهور هذه فإذا كان المتأول المخطء فى تلك لا يحكم بكفره إلا بعد البيان له واستتابته -كما فعل الصحابة فى الطائفة الذين استحلوا الخمر - ففى غير ذلك أولى وأحرى (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية، ج۷،ص ۶۱۹، فصل فى الجمع بين الاحاديث التى ذكرت فيها اركان الاسلام الخمسة ، وبين الاحاديث التى لم يذكر فيها بعضها، موقف الامام علیٰ من الحرورية)

ترجمہ: اس سلسلہ میں تحقیقی بات یہ ہے کہ کوئی قول بعض اوقات کفر ہوتا ہے، جیسا کہ جہمیہ کا یہ کہنا کہ اللہ کلام نہیں کرتا، اور نہ آخرت میں اللہ کی زیارت ہوگی۔

لیکن بعض لوگوں پر اس کا کفر ہونا مخفی رہ جاتا ہے۔

پھر اس قول کے قائل پر مطلقاً تکفیر کا حکم لگا دیا جاتا ہے، جیسا کہ سلف نے فرمایا کہ جو قرآن کو مخلوق قرار دے، وہ کافر ہے، اور جو شخص آخرت میں اللہ کی زیارت کا انکار کرے، تو وہ کافر ہے۔

لیکن کوئی متعین شخص اس وقت تک کافر قرار نہیں دیا جائے گا، جب تک کہ اس پر حجت قائم نہ ہو جائے، جیسا کہ پہلے نماز کے وجوب کے اور زکاۃ کے وجوب کے انکار کرنے والے اور شراب اور زنا کے تاویل کے ساتھ حلال سمجھنے والے کے بارے میں گزرا، کیونکہ مسلمانوں کے درمیان ان (یعنی فرضیتِ نماز، زکاۃ اور حرمتِ شراب وزنا کے) احکام کا ظہور اس (آخرت میں اللہ کی زیارت اور قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے) مسئلے سے زیادہ واضح ہے۔

پس جب ان احکام میں متأول مخطی پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا، تا آنکہ اس کے سامنے واضح نہ کر دیا جائے، اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے، جیسا کہ صحابۂ کرام نے شراب کو حلال سمجھنے والی جماعت کے بارے میں کیا، تو ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کا یہ حکم بدرجۂ اولیٰ ہوگا (مجموع الفتاویٰ)

اس سے معلوم ہوا کہ جو قول باعثِ کفر ہو، لیکن کسی پر اس کا باعثِ کفر ہونا مخفی ہو، تو اس کے مرتکب پر کفر کا حکم لگانے سے پہلے حجت قائم کی جائے گی۔

اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین جو متأول مخطی کے سامنے پہلے دلائل سے خطاء کا ہونا واضح کیا کرتے تھے، اور پھر توبہ کا حکم دیا کرتے تھے، وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق ہی تھا، جس کا علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا عبارت میں ذکر کیا۔ واللہ اعلم۔

اور یہ ان اقوال کا حکم ہے، جو باعثِ کفر ہوں، لیکن جو باعثِ کفر ہونے کے بجائے، باعثِ فسق وبدعت ہوں، ان کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا پانچواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ کے فتاویٰ میں ایک مقام پر ہے کہ:

فهذه النصوص وأمثالها تبين أن الميت يسمع في الجملة كلام الحي ولا يجب أن يكون السمع له دائما، بل قد يسمع في حال دون حال كما قد يعرض للحي فإنه قد يسمع أحيانا خطاب من يخاطبه، وقد لا يسمع لعارض يعرض له، وهذا السمع سمع إدراك، ليس يترتب عليه جزاء، ولا هو السمع المنفي بقوله: (إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى) فإن المراد بذلك سمع القبور

والامتثال .فإن الله جعل الكافر كالميت الذى لا يستجيب لمن دعاه، وكالبهائم التى تسمع الصوت، ولا تفقه المعنى.
فالميت وإن سمع الكلام وفقه المعنى فإنه لا يمكنه إجابة الداعى، ولا امتثال ما أمر به، ونهى عنه، فلا ينتفع بالأمر والنهى .وكذلك الكافر لا ينتفع بالأمر والنهى، وإن سمع الخطاب، وفهم المعنى.
كما قال تعالى :(وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ)
وأما رؤية الميت :فقد روى فى ذلك آثار عن عائشة وغيرها

(الفتاوى الكبرى لابن تيمية، ج٣،ص ٦٢ ،كتاب الجنائز،هل الميت يسمع كلام زائره ويرى شخصه)

ترجمہ: پس یہ اور ان کے مثل دوسری نصوص سے ظاہر ہوتا ہے کہ میت فی الجملہ زندہ کے کلام کو سنتی ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ اس کا سننا دائمی ہو، بلکہ وہ کبھی ایک حالت میں سنتی ہے، دوسری حالت میں نہیں سنتی، جیسا کہ زندہ بھی کبھی اپنے مخاطب کی بات کو سنتا ہے، اور کبھی اس کو پیش آنے والے کسی عارض (مثلاً متکلم کے دور ہونے یا درمیان میں کوئی حائل ہونے، یا قوتِ سماعت میں کمزوری ہونے وغیرہ) کے باعث نہیں سنتا، اور میت کا یہ سننا ''سمعِ ادراک'' ہوتا ہے، جس پر کوئی جزا مرتب نہیں ہوتی، اور نہ ہی یہ وہ سننا ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے اس قول میں نفی کی گئی ہے کہ ''إِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی'' کیونکہ اس سے مراد اہلِ قبور کا سننا اور سنی ہوئی بات کا امتثال کرنا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے کافر کو اس میت کی طرح قرار دیا ہے، جو پکارنے والے کا جواب نہ دے، اور ان بہائم کی طرح قرار دیا ہے، جو آواز کو سنتے ہیں، لیکن معنیٰ کو نہیں سمجھتے۔
پس میت اگرچہ کلام کو سنتی ہے، اور معنیٰ کو سمجھتی ہے، لیکن اس کو داعی کا جواب دینا

ممکن نہیں، اور نہ اس کا امتثال ممکن ہے، جس کا اسے حکم دیا جائے، اور جس چیز سے منع کیا جائے، پس میت، امر اور نہی سے انتفاع نہیں کرتی، اور اسی طریقہ سے کافر بھی امر و نہی سے انتفاع نہیں کرتا، اگرچہ وہ خطاب کو سنتا ہے، اور معنیٰ کو سمجھتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

”وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ“

جہاں تک میت کے دیکھنے کا تعلق ہے، تو اس میں حضرت عائشہ اور ان کے علاوہ دیگر حضرات کی سند سے مختلف آثار مروی ہیں (الفتاویٰ الکبریٰ)

علامہ ابنِ تیمیہ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ میت کو فی الجملہ زندہ کے کلام کو سننے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے، لیکن اس کو دوسرے کے نفع وضرر کا اختیار نہیں ہوتا، پس جو مسئلہ سماعِ میت پر متفرع ہو، اور اس میں شرکِ جلی نہ ہونے کی تاویل ہوسکتی ہو، جیسا کہ غیراللہ کو مخصوص عقیدہ کے ساتھ پکارنا، جس میں اللہ کی صفات کے ساتھ یقینی شرکت لازم نہ آئے، تو اس پر شرکِ جلی کا حکم لگانے سے اجتناب مناسب ہوگا، لیکن کسی مفسدہ یا منکر کے پائے جانے کی صورت میں حسبِ منکر وحسبِ مفسدہ منع کیا جائے گا، اور گناہ قرار دیا جائے گا، جیسا کہ محققین مشائخِ دیوبند نے بھی یہی موقف اختیار کیا اور اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا چھٹا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

وأن كل ما أجمعوا عليه فلا بد أن يكون فيه نص عن الرسول ؛ فكل مسألة يقطع فيها بالإجماع وبانتفاء المنازع من المؤمنين ؛ فإنها مما بين الله فيه الهدى ، ومخالف مثل هذا الإجماع يكفر كما يكفر مخالف النص البين.

وأما إذا كان يظن الإجماع ولا يقطع به فهنا قد لا يقطع أيضا بأنها مما تبين فيه الهدى من جهة الرسول ، ومخالف مثل هذا الإجماع قد لا يكفر ؛ بل قد يكون ظن الإجماع خطأ .والصواب فى خلاف هذا القول وهذا هو فصل الخطاب فيما يكفر به من مخالفة الإجماع وما لا يكفر .و "الإجماع "هل هو قطعى الدلالة أو ظنى الدلالة ؟ .فإن من الناس من يطلق الإثبات بهذا أو هذا ، ومنهم من يطلق النفى لهذا ولهذا .والصواب التفصيل بين ما يقطع به من الإجماع ويعلم يقينا أنه ليس فيه منازع من المؤمنين أصلا ؛ فهذا يجب القطع بأنه حق ؛ وهذا لا بد أن يكون مما بين فيه الرسول الهدى ؛ كما قد بسط هذا فى موضع آخر

(مجموع الفتاوى، لا بن تيمية، ج٧، ص ٣٩، كتاب الايمان الكبير، الاجماع حجة ، وهل هو قطعى الدلالة أو ظنى الدلالة ؟)

ترجمہ: اور ہر وہ چیز جس پر مومنین کا اجماع ہے، تو ضروری ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص پائی جائے، پس ہر وہ مسئلہ جس میں یقینی اجماع پایا جاتا ہو، اور مومنین کے اختلاف کی نفی بھی پائی جاتی ہو (یعنی کسی حکم کا صراحتاً اثبات اور اس کے خلاف کی صراحتاً نفی پائی جاتی ہو) تو یہ اجماع ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے کہ جن کے متعلق اللہ نے ہدایت کو واضح فرمادیا ہے۔ اور اس اجماع کا مخالف کافر ہے، جس طرح سے کہ واضح نص کا مخالف کافر ہے۔

لیکن جب یہ اجماع غالب ظن پر مبنی ہو، یقین پر مبنی نہ ہو، تو اس قسم کے اجماع میں اس بات کا یقین نہیں کیا جائے گا کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے، جن میں رسول کی طرف سے ہدایت واضح ہوچکی ہے۔ اور اس اجماع کا مخالف بعض اوقات کافر

قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ اجماع کا گمان بھی خطا پر مبنی ہوسکتا ہے، اور صواب، اس کے خلاف میں ہوسکتا ہے (جس کو اجماع کے خلاف گمان کیا جارہا ہے، اور ایسا نہ بھی ہو، تب بھی زیادہ سے زیادہ جمہور کا قول کہا جاسکتا ہے، جو دوسروں پر حجت نہیں) اور یہی اس سلسلہ میں قولِ فیصل ہے کہ کون سے اجماع کی مخالفت کو کفر قرار دیا جائے، اور کون سے اجماع کی مخالفت کو کفر قرار نہ دیا جائے؟ اور اجماع، کیا وہ قطعی الدلالت ہے یا ظنی الدلالت؟

پس بعض لوگ ان دونوں کو مطلقاً ثابت کرتے ہیں، اور بعض لوگ ان دونوں کی مطلقاً نفی کرتے ہیں، اور درست بات یہی ہے کہ اس بارے میں تفصیل کی جائے کہ جو اجماع قطعی ہے، اور اس کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس میں مومنین کا قطعاً کوئی اختلاف نہیں، تو اس کے حق ہونے کا یقین کرنا واجب ہے، اور اس کے بارے میں ضروری ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہو کہ جس کے بارے میں رسول نے ہدایت کو واضح فرمادیا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بیان کردی گئی ہے (مجموع الفتاویٰ)

علامہ ابنِ تیمیہ کے مذکورہ محققانہ کلام سے معلوم ہوا کہ ہر اجماع کے منکر کو کافر قرار دینا درست نہیں، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجماعِ قطعی ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ثبوت بھی قطعی ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ مبحوث فیہ مسئلہ پر اس اجماع کی دلالت بھی قطعی ہو، جیسا کہ بعض دیگر فقہائے کرام نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ [1]

---

[1] والحق أن المسائل الإجماعية تارة يصحبها التواتر عن صاحب الشرع كوجوب الخمس، وقد لا يصحبها فالأول يكفر جاحده لمخالفته التواتر لا لمخالفته الإجماع......

إذا لم تكن الآية أو الخبر المتواتر قطعي الدلالة أو لم يكن الخبر متواترا، أو كان قطعيا لكن فيه شبهة أو لم يكن الإجماع إجماع الجميع أو كان ولم يكن إجماع الصحابة أو كان ولم يكن إجماع جميع الصحابة أو كان إجماع جميع الصحابة ولم يكن قطعيا بأن لم يثبت بطريق التواتر أو كان قطعيا لكن كان إجماعا سكوتيا ففي كل من هذه الصور لا يكون الجحود كفرا يظهر ذلک لمن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور جو اجماع اس طرح کا قطعیُ الثبوت اور قطعی الدلالت نہ ہو، اور اس کے اجماع ہونے کا کسی کی طرف سے گمان کیا جارہا ہے، تو خود اس گمان کے خطا ہونے کا بھی امکان ہوسکتا ہے۔

پس علامہ ابنِ تیمیہ کے اس قول سے جس طرح ان کے بعض مسائل میں متفرد ہونے اور اجماع کی مخالفت کا مسئلہ منقح کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ جن مسائل میں انہوں نے الگ رائے قائم کی، وہ واقعتاً قطعی الثبوت وقطعی الدلت اجماع کے خلاف ہیں یا نہیں؟ اسی طرح محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بعض مسائل میں موقف کی تعیین بھی ہوجاتی ہے کہ ان کے موقف کا ہر مسئلہ میں قطعی اجماع کے خلاف ہونا بھی ضروری نہیں، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے بعض مسائل کو اجماعی سمجھا ہو، اور اجماعی سمجھ کر ان پر حکم لگایا ہو، لیکن وہ قطعی اجماعی نہ ہوں، یا ان مسائل میں اجماع کی وہ دلالت قطعی نہ ہو، مثلاً کسی چیز کے حرام ہونے پر تو اجماع ہو، لیکن اس کے شرکِ جلی ہونے پر اجماع نہ ہو، لیکن محمد بن عبدالوہاب نجدی یا ان کے متبعین نے اجماع کی اس دلالت کو قطعی خیال کرلیا ہو۔ [1]

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

نظر فی کتب الأصول فاحفظ ھذا الأصل فإنہ ینفعک فی استخراج فروعہ حتی تعرف منہ صحۃ ما قیل، إنہ یلزم الکفر فی موضع کذا، ولا یلزم فی موضع آخر (رد المحتار علی الدر المختار، ج۴، ص ۲۲۳، کتاب الجھاد، باب المرتد، مطلب فی منکر الإجماع)

القضاء بہ لا ینفذ إما أن یکون معارضا لما کان من الکتاب قطعی الدلالۃ غیر منسوخ أو ما کان من السنۃ کذلک متواتر الثبوت أو ما کان من الإجماع قطعی الثبوت والدلالۃ وھذا لا شک فیہ لکن فی صدور ھذا من المجتھد بعد عظیم؛ لأن استحلال مخالفۃ کل من ذلک کفر فلا ینبغی أن یکون المراد.

وإما أن یکون معارضا لما کان من الکتاب أو السنۃ ظنی الدلالۃ سواء کانت السنۃ قطعیۃ الثبوت أو لا ومن الإجماع ما کان ظنی الثبوت أو الدلالۃ وھذا فی عدم نفاذ الحکم بمعارضہ مطلقا نظر ظاھر إلی أن قال والذی یظھر أن القضاء بحل متروک التسمیۃ عمدا وبشاھد ویمین المدعی ینفذ (منحۃ الخالق، علی البحر الرائق، ج۷، ص ۱۱، کتاب القضاء)

[1] اور بندہ کا غالب گمان اور حسنِ ظن کا تقاضا یہی ہے کہ علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کو جن مسائل میں متفرد قرار دیا جاتا ہے، مثلاً طلاقِ ثلاثہ بلفظ واحد میں، اور شدرحال الی القبور وغیرہ کے مسئلہ میں۔
علامہ ابنِ تیمیہ کے نزدیک ان کے متعلق قطعی الثبوت وقطعی الدلالت اجماع ثابت نہیں اور وہ ان کو اجتہادی مسائل تصور کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ محمد رضوان

یہ بھی ملحوظ رہے کہ محققین کے نزدیک کسی مسئلہ پر اجماع کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر اس دور کے تمام مجتہدین کا اجماع ہو، اگر کسی مسئلہ پر ائمہ متبوعین یا ائمہ اربعہ کا تو اجماع ہو، لیکن دیگران مجتہدین کا اجماع نہ ہو، جن کے مجتہد ہونے کو تسلیم کیا گیا ہے، تب بھی وہ جمہور کا تو قول کہلاتا ہے، لیکن اجماعی قول نہیں کہلاتا، اور بعض اوقات اختلاف کرنے والے کے متعلق مجتہد ہونے نہ ہونے میں بھی اختلاف رُونما ہوجاتا ہے۔ [1]

---

[1] قد اختلف علماء الاصول فی انعقاد الاجماع مع ندرة المخالف ، فالجماهير من جميع الطوائف على أنه لا ينعقد الاجماع مع مخالفة الواحد، لأن المجمعين حينئذ ليسوا كل الأمة ، والعصمة فی الاجماع انما يثبت لكل الأمة لالبعضهم (فوائد فی علوم الفقه ،تاليف: الشيخ حبيب احمد الكيرانوى ، علىٰ ضوء ما افاده : حكيم الامت مولانا الشيخ اشرف على التهانوى، ص ٣٠٠"تحقيق فی حجية الاجماع مع ندرة المخالف" مطبوعة: ادارة القرآن والعلوم الاسلامية، كراتشى، الطبعة الثالثة: ١٤١٤هـ)

والظاهر أن مراد المصنف بالإجماع هاهنا هو إجماع أئمتنا الثلاثة الذين وقع الخلاف بين أعظمهم وبين صاحبيه فيما ذكر آنفا من مسألة الاستهلاك، لا إجماع الأمة الذى هو من الأدلة؛ لأن هذا الإجماع إنما يتحقق باتفاق جميع المجتهدين الموجودين فی عصر من أمة محمد -صلى الله عليه وسلم -على حكم شرعی وهو غير ثابت فيما نحن فيه(فتح القدير، ج٩،ص٣٦٣، كتاب الغصب)

ومراد المصنف بالإجماع فی قوله ولهذا يستأتی حولا بالإجماع إنما هو إجماع المجتهدين دون إجماع المشايخ، وانتفاء أحد الإجماعين لا يستلزم انتفاء الآخر؛ ألا يرى أن المشايخ كثيرا ما يختلفون فی رواية المسألة عن المجتهدين، فبعضهم يروى اجتماع المجتهدين فيها وبعضهم يروى اختلافهم فيها(فتح القدير، ج١٠،ص٢٩٥، كتاب الديات)

أما لو قضى بشهادة الابن لأبيه أو بالعكس ففيه خلاف بين الصحابة ثم وقع الإجماع على بطلانه فينفذ قضاؤه عند أبی يوسف بناء على أن الإجماع المتأخر لا يرفع الخلاف السابق عنده.

وعند محمد لا ينفذ بناء على أنه يرفعه عنده فلم يكن قضاء فی فصل مجتهد فيه(رد المحتار على الدر المختار، ج٤،ص٤٩٣، كتاب الوقف)

(والمختار) أنه (ليس) إجماع الأكثر (إجماعا) أصلا فلا يكون حجة ظنية ولا قطعية لأنه ليس بكتاب ولا سنة ولا إجماع ولا قياس ولا من الأدلة المعتبرة عند الأمة (تيسير التحرير،لمحمد أمين بن محمود البخارى المعروف بأمير بادشاه الحنفی، ج٣،ص٢٣٧،الباب الرابع فی الإجماع)

إذا اتفق الأكثرون وخالف واحد فلا يكون قول غيره إجماعا ولا حجة هذا هو المشهور ومذهب الجمهور(البحر المحيط فی اصول الفقه، للزركشی، ج٣، ص ٥٢٢، كتاب الاجماع، الفصل الثانی)

وإذا ثبت اشتراط قول جميع المجتهدين فی الاجماع قال صاحب الكتاب فلو خالف واحد لم يكن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علامہ ابنِ تیمیہ کا ساتواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

’’جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ بنتِ زنا سے نکاح کرنا جائز نہیں، یہی قول یقینی طور پر صواب ہے، یہاں تک کہ جمہور کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ایسا کرنے والے کو قتل کیا جائے گا، یا نہیں؟ امام احمد سے اس کے قتل کرنے کا حکم منقول ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس وقت ہے، جبکہ وہ متأول نہ ہو، لیکن متأول کو قتل نہیں کیا جائے گا، اگرچہ وہ مخطی ہو، اور بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو مطلقاً قتل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ جمہور کا قول ہے کہ اختلافی نبیذ کے پینے پر کوڑے لگائے جائیں گے، جبکہ متأول ہو، لیکن اس کے باوجود امام شافعی کے نزدیک اس کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، امام احمد کی دو روایتوں میں سے ایک روایت بھی اس کے مطابق ہے، اور امام مالک نے اس کو فاسق قرار دیا ہے، امام

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قول غيره اجماعا لأن قوله سبيل المؤمنين يتناول الكل وليسوا دون الواحد كل المؤمنين هذا مذهب الجمهور. (الابهاج فى شرح المنهاج، لتقى الدين السبكى، ج۲، ص ۳۸۷، الكتاب الثالث فى الاجماع، الباب الثالث فى شرائطه،المسألة الأولى: لابد فيه من قول كل عالمى ذلك الفن)

أهل السنة لم يقل أحد منهم إن إجماع الأئمة الأربعة حجة معصومة، ولا قال: إن الحق منحصر فيها وإن ما خرج عنها باطل، بل إذا قال: من ليس من أتباع الأئمة كسفيان الثورى والأوزاعى والليث بن سعد ومن قبلهم ومن بعدهم من المجتهدين قولا يخالف قول الأئمة الأربعة ، رد ما تنازعوا فيه إلى الله ورسوله ، وكان القول الراجح هو القول الذى قام عليه الدليل (منهاج السنة النبوية، لابن تيمية، ج۳، ص ۴۱۲، الفصل الثانى،فصل كلام الرافضى على قول أهل السنة بالقياس وأخذهم بالرأى والرد عليه)

وفى بعض الأحيان نجد بعض العلماء يُعَبِّر بالإجماع كإجماع، ويُعَبِّر بالاتفاق لاتفاق الأئمة الأربعة، يعنى: إذا قال: واتفق العلماء، المراد: الأئمة الأربعة، وهذا ليس بإجماع؛ لأن الأئمة الأربعة إذا اتفقوا فليس بإجماع، فقد يتفقون على أمر مجمع عليه، وقد يتفقون على أمر يخالفهم غيرهم، كالإمام داود الظاهرى رحمه الله (شرح زاد المستقنع للشنقيطى، ج۲۰۲، ص ۱۹، باب الشركة ،معنى كلمة (لو) فى مصطلحات المتون)

احمد کی دوسری روایت بھی اسی کے مطابق ہے۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ متأول، معذور ہوگا، نہ تو اس کو فاسق قرار دیا جائے گا، اور نہ ہی گناہ گار قرار دیا جائے گا، اور امام احمد کو اس مسئلہ میں اختلاف کا علم نہیں ہوا تھا (اس لیے انہوں نے بنتِ زنا سے نکاح کرنے والے پر قتل کا حکم لگایا)''۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مجتہد سے کسی فعل کے مرتکب کے مستحقِ قتل ہونے کا حکم یا تو متأول نہ ہونے پر محمول ہوسکتا ہے، یا اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس مجتہد کو اس مسئلہ میں اختلاف کا علم نہ ہوا ہو، اور اس نے اس فعل کے اجماع کے خلاف ہونے کی وجہ سے کافر سمجھ لیا ہو، اور اس وجہ سے اس کو مستحقِ قتل قرار دیا ہو۔

پس اسی طرح تارکِ صلاۃ وغیرہ کے مسئلہ میں امام احمد کی طرف سے مستحقِ قتل قرار دیے جانے کی روایت کے مسئلہ میں بھی تقریر کی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ وہ متأول نہ ہونے پر محمول ہو، یا امام احمد نے اس کے کفر پر اجماع سمجھا ہو، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

نیز بعض وہ مسائل جن میں محمد بن عبدالوہاب نجدی یا ان کے متبعین نے کسی فعل کے مرتکب پر مستحقِ قتل ہونے کا حکم لگایا، ان میں بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اس فعل کے مرتکب کو بالاجماع کافر سمجھا ہو، جبکہ فی الواقع ایسا نہ ہو، جیسا کہ تارکِ صلاۃ کا مسئلہ۔

---

[1] وسئل شيخ الإسلام ابن تيمية -رحمه الله عن بنت الزنا :هل تزوج بأبيها ؟ فأجاب :الحمد لله ، مذهب الجمهور من العلماء أنه لا يجوز التزويج بها وهو الصواب المقطوع به ؛ حتى تنازع الجمهور :هل يقتل من فعل ذلك ؟ على قولين .والمنقول عن أحمد :أنه يقتل من فعل ذلك .فقد يقال :هذا إذا لم يكن متأولا .وأما "المتأول "فلا يقتل ؛ وإن كان مخطئا .وقد يقال :هذا مطلقا كما قاله الجمهور :إنه يجلد من شرب النبيذ المختلف فيه متأولا ؛ وإن كان مع ذلك لا يفسق عند الشافعي وأحمد في إحدى الروايتين وفسقه مالك وأحمد في الرواية الأخرى .والصحيح :أن المتأول المعذور لا يفسق ؛ بل ولا يأثم .وأحمد لم يبلغه أن في هذه المسألة خلافا (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية، ج ٣٢،ص ١٣٤، ١٣٥ ، كتاب النكاح، باب اركان النكاح وشروطه)

علامہ ابنِ تیمیہ کا آٹھواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

الشرع "فی هذا الزمان يطلق على ثلاثة معان :شرع منزل. وشرع متأول. وشرع مبدل " .

فالمنزل "الكتاب والسنة فهذا الذى يجب اتباعه على كل واحد ومن اعتقد أنه لا يجب اتباعه على بعض الناس فهو كافر .

و "المتأول "موارد الاجتهاد التى تنازع فيها العلماء. فاتباع أحد المجتهدين جائز لمن اعتقد أن حجته هى القوية أو لمن ساغ له تقليده ولا يجب على عموم المسلمين اتباع أحد بعينه إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم .فكثير من المتفقهة إذا رأى بعض الناس من المشايخ الصالحين يرى أنه يكون الصواب مع ذلك وغيره قد خالف الشرع وإنما خالف ما يظنه هو الشرع وقد يكون ظنه خطأ فيثاب على اجتهاده. وخطؤه مغفور له. وقد يكون الآخر مجتهدا مخطئا.

وأما "الشرع المبدل : "فمثل الأحاديث الموضوعة والتأويلات الفاسدة والأقيسة الباطلة والتقليد المحرم .فهذا يحرم أيضا .وهذا من مثار النزاع فإن كثيرا من المتفقهة والمتكلمة قد يوجب على كثير من المتصوفة والمتفقرة اتباع مذهبه المعين وتقليد متبوعه ؛ والتزام حكم حاكمه باطنا وظاهرا ويرى خروجه عن ذلك خروجا عن الشريعة المحمدية وهذا

جهل منه وظلم ؛ بل دعوى ذلک على الإطلاق كفر ونفاق .كما أن كثيرا من المتصوفة والمتفقرة يرى مثل ذلک فى شيخه ومتبوعه وهو فى هذا نظير ذلک.

وكل من هؤلاء قد يسوغ الخروج عما جاء به الكتاب والسنة لما يظنه معارضا لهما إما لما يسميه هذا ذوقا ووجدا ومكاشفات ومخاطبات.وإما لما يسميه هذا قياسا ورأيا وعقليات وقواطع .وكل ذلک من شعب النفاق بل يجب على كل أحد تصديق الرسول صلى الله عليه وسلم فى جميع ما أخبر به وطاعته فى جميع ما أمر به وليس لأحد أن يعارضه بضرب الأمثال ولا بآراء الرجال وكل ما عارضه فهو خطأ وضلال (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية، ج ١١،ص ٤٣٠، ٤٣١،قاعدة فى المعجزات والكرامات،لفظ الشرع يطلق على ثلاثة امعان)

ترجمہ:اس زمانے میں شرع تین معانی پر بولا جاتا ہے،ایک شرع منزَّل ، دوسرے شرع متأوَّل،تیسرے شرع مبدَّل۔

پس شرع منزَّل تو کتاب اورسنت ہے،اور ہر ایک پر اسی کتاب وسنت کی اتباع واجب ہے،اور جو اس بات کا اعتقاد رکھے کہ بعض لوگوں پر کتاب وسنت کی اتباع واجب نہیں،تو وہ کافر ہے۔

اور شرع متأوَّل وہ اجتہادی مواقع ہیں،جن میں علماء کا اختلاف ہے،پس ایسے امور میں مجتہدین میں سے کسی ایک کی اتباع جائز ہے،جس کے بارے میں یہ اعتقاد ہو کہ اس کی دلیل قوی ہے،یا (دلیل کے قوی ہونے کا تو علم نہ ہو،لیکن اس کے مجتہد ہونے کی وجہ سے)اس کی تقلید کرنے کی گنجائش ہو،اور عام مسلمانوں پر مجتہدین میں سے کسی ایک کی متعین طریقے پر (فی نفسہٖ) اتباع واجب نہیں،

سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے، پس بہت سے متکلف فقہاء نے جب (اپنے موقف کے خلاف) مشائخِ صالحین میں سے بعض لوگوں کو دیکھا، تو انہوں نے یہ سمجھا کہ صواب ان کے اپنے ساتھ ہے، اوران کے علاوہ (دوسرے مذکورہ مشائخِ صالحین) نے شریعت کی مخالفت کی ہے، حالانکہ شریعت نے مخالفت صرف ان کے گمان کے مطابق کی ہے، اور ممکن ہے کہ ان کا گمان خطا پر مبنی ہو، جس کا اجتہاد کرنے پر مجتہد کو ثواب عطا کیا جاتا ہے، اوراس کی خطا کو معاف کیا جاتا ہے، اور کبھی دوسرا مجتہد مخطی ہوتا ہے۔

جہاں تک شرع مبدَّل کا تعلق ہے، تواس کی مثال موضوع اور خودساختہ احادیث اور تاویلاتِ فاسدہ اور قیاساتِ باطلہ اور تقلیدِ حرام ہے، پس یہ شرع مبدَّل حرام ہے، اوراس میں بہت زیادہ نزاع پھیل گیا ہے، کیونکہ بہت سے متکلف فقہاء اور چرب لسان لوگ، دوسرے صوفیاء اور فقراء پر اپنے معین مذہب کی اتباع اور اپنے متبوع کی تقلید کو واجب قرار دیتے ہیں، اوراس مذہب کے مطابق حاکم کے حکم کو باطنی اور ظاہری طور پر لازم قرار دیتے ہیں، اوراس مذہب سے خارج ہونے کو شریعتِ محمدیہ سے خروج خیال کرتے ہیں، اور یہ ان کی طرف سے جہل اور ظلم ہے، بلکہ اس کا علی الاطلاق دعویٰ کرنا کفر ونفاق ہے، جیسا کہ بہت سے متکلف صوفیاء اور متکلف فقراء، اپنے شیخ اور متبوع کے بارے میں اس طرح کی رائے رکھتے ہیں، جو اس شرعِ مبدَّل کی نظیر ہیں۔

اوران میں سے ہر ایک کتاب وسنت کی باتوں سے خروج کو جائز سمجھتا ہے، کیونکہ وہ اس کے گمان کے خلاف ہوتی ہے، یا تو اس وجہ سے کہ اس طرح کے شرعِ مبدَّل سے وابستہ لوگ) اس کا نام ذوق اور وجد اور مکاشفات اور مخاطبات رکھتے ہیں، یا اس وجہ سے کہ وہ اس کا نام قیاس اور خواب اور عقلیات اور قواطع رکھتے

ہیں، اور یہ تمام باتیں نفاق کے شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں، کیونکہ ہر ایک انسان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تمام چیزوں میں تصدیق کرنا واجب ہے، جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی، اور ان تمام چیزوں میں اطاعت کرنا واجب ہے، جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، اور کسی کے لیے ان کہاوتوں اور انسانوں کی آراء سے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا) مقابلہ کرنا جائز نہیں، اور جو چیز بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آئے گی، وہ خطا اور گمراہ ہی ہوگی (مجموع الفتاویٰ)

علامہ ابنِ تیمیہ نے شرع کی جو تین قسمیں ذکر کی ہیں، وہ بہت جامع ہیں، جن کی روشنی میں متأول کی قسم میں بہت سے لوگوں کے متعلق غلو کا طرزِ عمل واضح ہو جاتا ہے، لہٰذا جو امور اجتہادی ہیں، ان میں شرعِ منزل والا معاملہ کرنا، اور کسی مجتہد کے قول کو قطعی صواب سمجھنا، درست نہیں، پس اگر ایک شخص ایک مجتہد کی تقلید کرتا ہے، یا اس کی دلیل کو قوی سمجھ کر اختیار کرتا ہے، اور دوسرا شخص دوسرے مجتہد کی تقلید کرتا ہے، یا اس کی دلیل کو قوی سمجھ کر اختیار کرتا ہے، تو ایک دوسرے پر طعن و تشنیع درست نہیں۔

اور ہم نے یہ مسئلہ دوسرے مقام پر ذکر کر دیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی دوسرے کو متعین طور پر واجبُ الاتباع سمجھنا درست نہیں، البتہ واجبُ الاتباع سمجھے بغیر کسی متعین شخص کو شارحِ شرع اور غیر معصوم سمجھ کر اس کی اتباع، یا تقلیدِ شخصی کرنا جائز ہے، اور جائز ہونے سے اس کا بہرصورت واجب ہونا لازم نہیں آتا، الا یہ کہ کسی خاص عارض کی وجہ سے واجب لغیرہٖ قرار دیا جائے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا نواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

وقد اتفق المسلمون على أنه من لم يأت بالشهادتين فهو كافر وأما الأعمال الأربعة فاختلفوا فى تكفير تاركها ونحن إذا قلنا : أهل السنة متفقون على أنه لا يكفر بالذنب فإنما نريد به المعاصى كالزنا والشرب وأما هذه المبانى ففى تكفير تاركها نزاع مشهور .وعن أحمد :فى ذلك نزاع وإحدى الروايات عنه :إنه يكفر من ترك واحدة منها وهو اختيار أبى بكر وطائفة من أصحاب مالک كابن حبيب .وعنه رواية ثانية :لا يكفر إلا بترک الصلاة والزكاة فقط ورواية ثالثة :لا يكفر إلا بترک الصلاة والزكاة إذا قاتل الإمام عليها. ورابعة :لا يكفر إلا بترک الصلاة .وخامسة : لا يكفر بترک شىء منهن .وهذه أقوال معروفة للسلف (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية، ج۷،ص ۳۰۲، كتاب الايمان الكبير، اتفق المسلمون على تكفير من لم يأت بالشهادتين ،بخلاف بقية الاركان)

ترجمہ: مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو اللہ کے معبود ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی گواہی نہیں دے گا، تو وہ کافر ہوگا، رہے باقی چار ارکان واعمال (یعنی نماز، روزہ، زکاۃ اور حج)، تو ان کے تارک کو فر قرار دینے میں اختلاف ہے، اور ہم اگر یہ بات کہیں کہ اہلِ سنت اس بات پر متفق ہیں کہ گناہ کی وجہ سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا جاتا، تو ہم گناہ سے زنا اور شراب جیسے گناہ مراد لیں گے، جہاں تک ان چار بنیادی ارکان کا تعلق ہے، تو ان کے تارک کو کافر قرار دینے میں مشہور نزاع ہے، اور امام احمد سے اس بارے میں اختلاف مروی ہے، امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ ان چار ارکان میں سے کسی ایک کو ترک کرنے والا کافر ہے، اس روایت کو ابوبکر نے اور امام مالک کے اصحاب کی ایک جماعت، مثلاً ابنِ حبیب نے اختیار کیا ہے۔ اور امام احمد کی دوسری روایت یہ ہے کہ صرف

نماز اور زکاۃ کے ترک کرنے پر ہی کافر قرار دیا جائے گا۔اور امام احمد کی تیسری روایت یہ ہے کہ نماز اور زکاۃ کے ترک پر اسی صورت میں کافر قرار دیا جائے گا، جب امام، نماز یا زکاۃ کے ترک پر قتال کرے۔اور امام احمد کی چوتھی روایت یہ ہے کہ صرف نماز کے ترک پر کافر قرار دیا جائے گا۔اور امام احمد کی پانچویں روایت یہ ہے کہ ان چاروں ارکان میں سے کسی کے ترک کرنے پر کافر قرار نہیں دیا جائے گا،اور یہ اقوال سلف کے معروف ہیں (مجموع الفتاویٰ)

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ امام احمد رحمہ اللہ سے اسلام کے علاوہ ارکانِ اربعہ، یا ان میں سے بعض کے ترک پر کافر ہونے نہ ہونے کے متعلق اختلاف فروعی ہے،اور تارکِ صلاۃ وغیرہ کا کافر ہونا متفق علیہ نہیں۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا دسواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

وأما "تارك الصلاة" فإنه يستحق العقوبة باتفاق الأئمة وأكثرهم -كمالك والشافعي وأحمد- يقولون: إنه يستتاب فإن تاب وإلا قتل. وهل يقتل كافرا مرتدا أو فاسقا كغيره من أصحاب الكبائر؟ على قولين (مجموع الفتاوى، لا بن تيمية، ج۳۴، ص۲۱۷، باب حد المسكر، وسئل رحمه الله تعالى عن المداومة على شرب الخمر وترك الصلاة وما حكمه فى الإصرار على ذلك؟)

ترجمہ: جہاں تک نماز کے تارِک کا تعلق ہے، تو ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ سزا کا مستحق ہے، اور اکثر ائمہ مثلاً امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد کا قول یہ ہے کہ اسے توبہ کا حکم دیا جائے گا، اگر وہ توبہ کرلے، تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے قتل

کیا جائے گا، اور کیا اس کو کافر مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا، یا فاسق ہونے کی وجہ سے، جس طرح دوسرے اہلِ کبائر کا معاملہ ہے، تو اس میں دونوں قول ہیں (مجموع الفتاویٰ)

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ تارکِ صلاۃ کے کافر ہونے میں اختلاف ہے۔

اور ممکن ہے کہ تارکِ صلاۃ کے کفر کی وجہ سے قتل کا قول تاویل نہ ہونے کی صورت پر محمول ہو، یا امام احمد کو اس کے کفر میں اختلاف نہ ہونا پہنچا ہو، جیسا کہ پہلے بنت الزنا سے نکاح کرنے کے مسئلہ میں علامہ ابن تیمیہ کے حوالہ سے ہی گزرا۔

علامہ ابنِ قیم کا حوالہ

علامہ ابنِ قیم حنبلی رحمہ اللہ (المتوفی: 751ھ) نے اپنی کتاب ''الصلاۃ'' میں فرمایا کہ:

''کفر کی دو قسمیں ہیں، ایک کفرِ عملی، اور دوسرے کفرِ جحودی وعنادی، کفرِ جحودی یہ ہے کہ اس چیز کا انکار کرے، جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لانا معلوم ومعروف ہو، جیسا کہ رب تعالیٰ کے اسماء، اور اس کی صفات اور اس کے افعال، اور اس کے احکام کا انکار، اور کفر کی یہ صورت مِنْ کلِ الوجوہ، ایمان کے مخالف ہے۔

جہاں تک کفرِ عملی کا تعلق ہے، تو اس کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم ایمان کے مخالف ہے، اور ایک قسم ایمان کے مخالف نہیں، چنانچہ بت کو سجدہ کرنا، اور قرآن مجید کی توہین کرنا، اور نبی کو قتل کرنا اور اس کو سب وشتم کرنا، ایمان کے مخالف ہے، اور اللہ کے حکم کے علاوہ کا فیصلہ کرنا، اور نماز کو ترک کرنا، تو یہ یقینی طور پر کفرِ عملی ہے، کفرِ اعتقادی نہیں۔

پھر چند احادیث اور مثالیں بیان کرنے کے بعد علامہ ابنِ قیم نے فرمایا کہ کفرِ عملی،

دائرۂ اسلام اور مذہبِ اسلام سے بالکلیہ خارج نہیں کرتا، اور یہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا قول ہے، جو اللہ کی کتاب اور اسلام اور کفر اور ان کے لوازمات کو زیادہ جاننے والے ہیں، لہٰذا ان مسائل کو صحابۂ کرام سے ہی لیا جائے گا، اور بعض متاخرین، جو ان کی مراد کو نہیں سمجھ سکے، اور وہ افراط یا تفریط میں مبتلا ہوئے، ان کے قول کو نہیں لیا جائے گا، اور اہلُ السنۃ والجماعۃ کا قول افراط وتفریط سے پاک ہے، جو ''کفرٌ دون کفرٍ'' اور ''نفاقٌ دون نفاقٍ'' اور ''شركٌ دون شركٍ'' اور ''فسوقٌ دون فسوقٍ'' اور ''ظلمٌ دون ظلمٍ'' کی تقسیم وتفریق کرتے ہیں''۔ [1]

[1] "فصل :"وها هنا أصل آخر وهو أن الكفر نوعان: كفر عمل وكفر جحود وعناد, فكفر الجحود أن يكفر بما علم أن الرسول جاء به من عند الله جحودا وعنادا من أسماء الرب وصفاته وأفعاله وأحكامه, وهذا الكفر يضاد الإيمان من كل وجه .
وأما كفر العمل فينقسم إلى ما يضاد الإيمان وإلى ما لا يضاده .فالسجود للصنم والاستهانة بالمصحف وقتل النبى وسبه يضاد الإيمان, وأما الحكم بغير ما أنزل الله وترك الصلاة فهو من الكفر العملى قطعا ولا يمكن أن ينفى عنه اسم الكفر بعد أن اطلقه الله ورسوله عليه فالحاكم بغير ما أنزل الله كافر وتارك الصلاة كافر بنص رسول الله صلى الله عليه وسلم, ولكن هو كفر عمل لا كفر اعتقاد, ومن الممتنع أن يسمى الله سبحانه الحاكم بغير ما أنزل الله كافرا ويسمى رسول الله صلى الله عليه وسلم تارك الصلاة كافرا ولا يطلق عليهما اسم كافر .وقد نفى رسول الله صلى الله عليه وسلم الإيمان عن الزانى والسارق وشارب الخمر وعمن لا يأمن جاره بوائقه, وإذا نفى عنه اسم الإيمان فهو كافر من جهة العمل وانتفى عنه كفر الجحود والاعتقاد وكذلك قوله: " لا ترجعوا بعدى كفارا يضرب بعضكم رقاب بعض ."فهذا كفر عمل .وكذلك قوله:" من أتى كاهنا فصدقه أو امرأة فى دبرها فقد كفر بما أنزل على محمد ."وقوله: " إذا قال الرجل لأخيه يا كافر فقد باء بها أحدهما ."وقد سمى الله سبحانه وتعالى من عمل ببعض كتابه وترك العمل ببعضه مؤمنا بما عمل به وكافرا بما ترك العمل بت, فقال تعالى: } وإذ أخذنا ميثاقكم لا تسفكون دمائكم ولا تخرجون أنفسكم من دياركم ثم أقررتم وأنتم تشهدون م أنتم هؤلاء تقتلون أنفسكم وتخرجون فريقا منكم من ديارهم تظاهرون عليهم بالأثم والعدوان وإن يأتوكم أسارى تفادوهم وهو محرم عليكم إخراجهم أفتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض فما جزاء من يفعل ذلك منكم إلا خزى فى الحياة الدنيا ويوم القيامة يردون إلى أشد العذاب وما الله بغافل عما تعملون . {فأخبر سبحانه أنهم أقروا بميثاقه الذى أمرهم به والتزموه .وهذا يدل على تصديقهم به أنهم لا يقتل

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ ابنِ قیم، بلاعذر جان بوجھ کر نماز ترک کرنے والے کو ایسا کافر قرار نہیں دیتے، جس کی وجہ سے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے، اور انہوں نے جو تارکِ نماز پر کفر کا حکم لگایا ہے، اس سے مراد ایسا کفر نہیں ہے، جو دائرہ اسلام سے خارج کرنے اور مرتد قرار دینے کا سبب بنے۔

نیز مذکورہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی تارکِ صلاۃ کو کفرِ جحودی اور کفرِ اکبر میں داخل نہیں مانا۔

صاحبِ "مرعاۃُ المفاتیح" نے بھی امام احمد اور علامہ ابنِ قیم کے اسی موقف کو ترجیح دی ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ بعضهم بعضا ولا يخرج بعضهم بعضا من ديارهم ثم أخبر أنهم عصوا أمره وقتل فريق منهم فريقا وأخرجوهم من ديارهم فهذا كفرهم بما أخذ عليهم في الكتاب ثم أخبر أنهم يفدون من أسر من ذلك الفريق وهذا إيمان منهم بما أخذ عليهم في الكتاب فكانوا مؤمنين بما عملوا به من الميثاق كافرين بما تركوه منه, فالإيمان العملي يضاده الكفر العملي والإيمان الاعتقادي يضاده الكفر الاعتقادي.

وقد أعلن النبي صلى الله عليه وسلم بما قلناه في قوله في الحديث الصحيح:" سباب المسلم فسوق وقتاله كفر ."ففرق بين قتاله وسبابه وجعل أحدهما فسوقا لا يكفر به والآخر كفر, ومعلوم أنه إنما أراد الكفر العلمي لا الاعتقادي, وهذا الكفر لا يخرجه من الدائرة الإسلامية والملة بالكلية كما لا يخرج الزاني والسارق والشارب من الملة وإن زال عنه اسم الإيمان, وهذا التفصيل هو قول الصحابة الذين هم أعلم الأمة بكتاب الله وبالإسلام والكفر ولوازمهما فلا تتلقى هذه المسائل إلا عنهم فإن المتأخرين لم يفهموا مرادهم فانقسموا فريقين فريقا أخرجوا من الملة بالكبائر, وقضوا على أصحابها بالخلود في النار, وفريقا جعلوهم مؤمنين كاملي الإيمان فهؤلاء غلوا وهؤلاء جفوا وهدى الله أهل السنة للطريقة المثلى والقول الوسط الذي هو في إذنه كالإسلام في الملل فها هنا كفر دون كفر ونفاق دون نفاق وشرك دون شرك وفسوق دون فسوق وظلم دون ظلم(الصلاة وأحكام تاركها لابن القيم، ص ٥٦ الىٰ ٥٨، "فصل"المسألة الثالثة: بماذا يقتل هل بترك صلاة أو صلاتين أو ثلاث صلوات)

[1] قلت :الراجح في ذلك ما ذهب إليه أحمد، لأن ظواهر الأحاديث الواردة بتكفير تؤيده، لكن المراد كفر دون كفر، أي :كفر غير الكفر المخرج من الملة .والله تعالى أعلم .ولا حاجة إلى هذه التأويلات التي ذكرها السندي وغيره ممن لم يذهب إلى تكفيره .وارجع إلى كتاب الصلاة للإمام ابن القيم، فإنه قد بسط الكلام فيه في ذلك بسطا حسنا(مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج٢،ص ٢٧٩، كتاب الصلاة، الفصل الثالث)

اورعلامہ مبارک پوری نے ''تحفۃُ الاحوذی'' میں امام شوکانی کی تحقیق کا بھی یہی خلاصہ بیان کیا ہے، اور یہ قرار دیا ہے کہ امام شوکانی اور جمہور کے درمیان یہ نزاعِ لفظی ہے۔ [1]

علامہ ابنِ قدامہ کا حوالہ

علامہ ابنِ قدامہ حنبلی نے نماز کے تارِک سے متعلق امام احمد کی مختلف روایات نقل کر کے اس روایت کو ترجیح دی ہے، جس کی رو سے تارکِ صلاۃ کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔

چنانچہ انہوں نے اس روایت کی ترجیح بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

ولأن ذلک إجماع المسلمين، فإنا لا نعلم فی عصر من الأعصار أحدا من تارکی الصلاة ترک تغسيله، والصلاة عليه، ودفنه فی مقابر المسلمين، ولا منع ورثته ميراثه، ولا منع هو ميراث مورثه، ولا فرق بين زوجين لترک الصلاة من أحدهما؛ مع کثرة تارکی الصلاة، ولو کان کافرا لثبتت هذه الأحکام کلها، ولا نعلم بين المسلمين خلافا فی أن تارک الصلاة يجب عليه قضاؤها، ولو کان مرتدا لم يجب عليه قضاء صلاة ولا صيام.

وأما الأحاديث المتقدمة فهی علی سبيل التغليظ، والتشبيه له بالکفار، لا علی الحقيقة، کقوله -عليه السلام :-سباب المسلم فسوق، وقتاله کفر .وقوله : کفر بالله تبرؤ من نسب وإن دق . وقوله :من قال لأخيه يا کافر .فقد باء بها أحدهما .وقوله :من أتی حائضا أو امرأة فی دبرها، فقد کفر بما أنزل علی محمد .

---

[1] قلت لو تأملت فی ما حققه الشوکانی فی تارک الصلاة من أنه کافر وفی ما ذهب إليه الجمهور من أنه لا يکفر لعرفت أنه نزاع لفظی لأنه کما لا يخلد هو فی النار ولا يحرم من الشفاعة عند الجمهور کذلک لا يخلد هو فيها ولا يحرم منها عند الشوکانی أيضا(تحفة الأحوذی ،لمحمد عبد الرحمن المبارکفوری، ج۷،ص ۱ ۳۱، کتاب الإيمان،باب ما جاء فی ترک الصلاة)

قال :ومن قال :مطرنا بنوء الكواكب .فهو كافر بالله، مؤمن بالكواكب .وقوله :من حلف بغير الله فقد أشرك .
وقوله :شارب الخمر كعابد وثن .وأشباه هذا مما أريد به التشديد في الوعيد، وهو أصوب القولين، والله أعلم (المغني لابن قدامة، ج ۲، ص ۳۳۲، كتاب الصلاة، باب الحكم في من ترك الصلاة، مسألة ترك الصلاة وهو بالغ عاقل جاحدا لها أو غير جاحد)

ترجمہ: مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے، اور ہمیں کسی بھی زمانے میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ نماز کے ترک کرنے والے کے فوت ہونے پر اس کے غسل دینے اور اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے اور اس کے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کو ترک کیا گیا ہو، یا وارثوں کو اس کی میراث سے منع کیا گیا ہو، یا اس کو اپنے مورِث کی میراث سے منع کیا گیا ہو، یا میاں بیوی میں سے کسی ایک کے نماز کو ترک کرنے پر دونوں کے درمیان تفریق وجدائیگی کرائی گئی ہو، باوجودیکہ نماز ترک کرنے والوں کی کثرت ہے، اور اگر نماز ترک کرنے والا کافر ہوتا، تو یہ تمام احکام بھی ثابت ہوتے، اور ہمیں مسلمانوں کا بھی اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ملتا کہ نماز کے تارِک پر قضا واجب ہوتی ہے (یعنی نماز کے تارک پر بالاتفاق قضا واجب ہے) اور اگر نماز کا تارک مرتد شمار ہوتا، تو اس پر نماز اور روزے کی قضا واجب نہ ہوتی۔

جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے، جو پیچھے گزریں (جن میں نماز کے ترک کرنے کو کفر بتایا گیا ہے) تو وہ تغلیظ وتشدید کے طور پر، اور کفار کے ساتھ مشابہت کے طور پر واقع ہوئی ہیں، ان میں حقیقی کفر مراد نہیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ نسب سے برائت کرنا اگرچہ کمزور درجے کی ہو، یہ اللہ کے ساتھ کفر ہے۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جس نے اپنے بھائی کو کافر کہا، تو ان دونوں میں سے ایک اس کا مستحق ہو جائے گا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو حائضہ عورت کے پاس آیا، یا جس نے اپنی عورت کی دُبر سے شہوت پوری کی، تو اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہوئی چیز کا انکار کیا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے یہ کہا کہ ہم پر فلاں ستاروں کی وجہ سے بارش کی گئی ہے، تو اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، اور وہ ستاروں پر ایمان لایا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھائی، تو اس نے شرک کیا۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شراب پینے والا، بت کی عبادت کرنے والے کی طرح ہے۔

اور اس کے علاوہ بھی کئی احادیث میں وعید کی تشدید اور سختی کو مراد لیا گیا ہے، اور یہ دونوں قولوں میں زیادہ صواب قول ہے۔ واللہ اعلم (المغنی)

اس سے معلوم ہوا کہ تارکِ صلاۃ کو کافر قرار دینے کی روایت، خود علامہ ابنِ قدامہ حنبلی کے نزدیک بھی راجح نہیں، اور احادیث میں ترکِ صلاۃ پر، جو کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، اس سے حقیقی کفر مراد نہیں، جیسا کہ بہت سی دوسری احادیث میں مختلف گناہوں پر کفر وغیرہ کا اطلاق کیا گیا ہے اور وہاں بھی حقیقی کفر مراد نہیں، اور علامہ ابنِ قدامہ حنبلی کے مذکورہ موقف کی طرح ہم بھی تارکِ صلاۃ عامداً کو جب تک وہ نماز کو فرض سمجھتا رہے، لیکن کسل کی وجہ سے نماز کو

ترک کرتا ہو، کفرِ اکبر کا مرتکب نہیں سمجھتے، کیونکہ موجودہ زمانے میں عرب وعجم میں تارکین صلاۃ کی کثرت ہے، جبکہ وہ توحید کے بھی قائل ہیں، اور جمعہ وعیدین کی نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں، اور کبھی یومیہ فرض نمازیں بھی ادا کرتے ہیں۔

سعودی عرب کی موجودہ نجدی حکومت کے زیرِ اثر علاقوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ ہوگی، اور وہاں حکومتی وقانونی سطح پر ایسے لوگوں کو حقیقی کافر ومرتد نہیں سمجھا جاتا، اور نہ ہی ان کے ساتھ کافروں ومشرکوں والے دوسرے ان امور کو بروئے کار لایا جاتا، جن کا علامہ ابنِ قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے مندرجہ بالا عبارت میں ذکر فرمایا۔

اور موجودہ دور کے بعض علمائے عرب، جو تارکِ صلاۃ کو ''کافرِ حقیقی'' یا ''مرتد'' قرار دیتے ہیں، ان کا یہ قول جمہور اور خود شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی مذکورہ تصریح، اور علامہ ابنِ قیم وغیرہ کے بھی خلاف ہے، جیسا کہ پہلے گزرا، اور اس کی مزید تفصیل ہم نے اپنی دوسری تالیف ''قضاء نماز کو ادا کرنے کا حکم'' میں بیان کردی ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

دیگر فقہائے کرام کا حوالہ

دیگر اکثر فقہائے کرام، بالخصوص ائمۂ متبوعین اور فقہائے حنفیہ نے اہلُ البدعۃ کے مختلف فرقوں کو جو اپنے عقائد وافکار میں تاویل کرتے ہیں، کافر قرار نہیں دیا۔

ملا علی قاری نے علامہ ابنِ حجر سے نقل کیا ہے کہ اکثر علمائے سلف وخلف کے نزدیک اہلِ بدعت اور اہلِ ہواء کافر نہیں ہیں، الا یہ کہ وہ کفرِ صریح کا ارتکاب کریں، نہ کہ کفرِ استلزامی کا، کیونکہ اصح یہ ہے کہ مذہب کا لازم، لازم نہیں ہوتا۔ [1]

حنفیہ کی ''فتح القدیر، البنایۃ، رد المحتار اور حاشیۃ الشلبی'' وغیرہ میں اس کی

---

[1] وقال ابن حجر: فمن أطلق تكفير الفريقين أخذا بظاهر هذا الخبر فقد استروح، بل الصواب عند الأكثرين من علماء السلف والخلف أنا لا نكفر أهل البدع والأهواء إلا إن أتوا بمكفر صريح لا استلزامي؛ لأن الأصح أن لازم المذهب ليس بلازم (مرقاة المفاتيح، ج ١، ص ١٨٠، كتاب الايمان، باب الإيمان بالقدر)

تصریح ہے۔

جن سے علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے اس موقف کی تائید ہوتی ہے، جوانہوں نے اہلِ بدعت کی عدمِ تکفیر کے متعلق اختیار کیا ہے۔

چنانچہ علامہ ابنِ ہمام رحمہ اللہ نے''**الهداية**'' کی شرح''**فتح القدير**''میں فرمایا کہ:

ابنِ منذر نے فرمایا کہ اہلِ بدعت وخوارج کی تکفیر کا صرف بعض اہلِ حدیث نے حکم لگایا ہے، اوران سے کسی کی موافقت ہمارے علم میں نہیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ فقہائے کرام کا اہلِ بدعت کی عدمِ تکفیر پر اجماع ہے۔

پھر علامہ ابنِ ہمام نے محیط کے حوالہ سے ایک قول تکفیر کا نقل کر کے ابنِ منذر کے قول کو ترجیح دی ہے، پھر فرمایا کہ اہلِ بدعت وخوارج کی تکفیر صرف بعض اہلِ مذاہب کے اصحاب سے مروی ہے، مجتہدینِ فقہاء سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، اور غیر فقہاء کے قول کا اعتبار نہیں۔

''**ردُّ المحتار**''میں بھی اس کو ترجیح دی ہے، اور''**البناية**''اور''**حاشية الشلبی**''میں بھی۔ [1]

---

[1] قال ابن المنذر: ولا أعلم أحدا وافق أهل الحديث على تكفيرهم، وهذا يقتضى نقل إجماع الفقهاء .وذكر فى المحيط أن بعض الفقهاء لا يكفر أحدا من أهل البدع، وبعضهم يكفرون بعض أهل البدع وهو من خالف ببدعته دليلا قطعيا ونسبه إلى أكثر أهل السنة، والنقل الأول أثبت، نعم يقع فى كلام أهل المذاهب تكفير كثير ولكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون بل من غيرهم، ولا عبرة بغير الفقهاء، والمنقول عن المجتهدين ما ذكرنا، وابن المنذر أعرف بنقل مذاهب المجتهدين، وما ذكره محمد بن الحسن فى أول الباب من حديث كثير الحضرمى يدل على عدم تكفير الخوارج(فتح القدير، ج٦ص ١٠٠، كتاب السير، باب البغاة)

م: (وتقبل شهادة أهل الأهواء) ش: أى أصحاب البدع كالخارجى والرافضى، والجبرى والقدرى، والمشبه، والمعطل وسمى أهل البدع أهل الأهواء لميلانهم إلى محبوب نفوسهم بلا دليل شرعى، أو عقلى، والهوى محبوب النفس من هوى الشيء إذا أحبه، وفى "الذخيرة "تقبل شهادته إذا كان هوى لا يكفر به صاحبه، ولا يكون شاحنا، ويكون عدلا فى تعاطيه، وهو الصحيح، وأصول أهل الأهواء ستة الجبر والقدر والرفض والخروج والشيعة، والتعطيل، وكل واحد يصير اثنى عشر فرقة، فتبلغ إلى اثنين وسبعين فرقة(البناية شرح الهداية، ج٩ص ١٥١، كتاب الشهادة، باب من تقبل شهادته ومن لا تقبل شهادته، شهادة اهل الهواء)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور''شرح مسلم الثبوت''میں بھی اہلِ بدعت کی عدمِ تکفیر کوترجیح دی ہےاورفرمایا کہ:

کفریہ قول وفعل سے التزامِ کفر لازم نہیں آتا، نیز اہلِ قبلہ کی تکفیر کی ممانعت احادیث میں واردہوئی ہے۔

اوراہل السنۃ والجماعۃ کے علاوہ دیگرفرقوں کو بدعتی ہونے کی وجہ سے عذاب کا مستحق قراردیا گیاہے،لیکن عذابِ مخلد کا مستحق قرارنہیں دیا گیا۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

اتفق الأئمة على تضليل أهل البدع أجمع وتخطئتهم وسب أحد من الصحابة وبغضه لا يكون كفرا، لكن يضلل إلخ .وذكر فى فتح القدير أن الخوارج الذين يستحلون دماء المسلمين وأموالهم ويكفرون الصحابة حكمهم عند جمهور الفقهاء وأهل الحديث حكم البغاة .وذهب بعض أهل الحديث إلى أنهم مرتدون .قال ابن المنذر :ولا أعلم أحدا وافق أهل الحديث على تكفيرهم، وهذا يقتضى نقل إجماع الفقهاء .وذكر فى المحيط أن بعض الفقهاء لا يكفر أحدا من أهل البدع. وبعضهم يكفرون البعض، وهو من خالف ببدعته دليلا قطعيا ونسبه إلى أكثر أهل السنة، والنقل الأول أثبت وابن المنذر أعرف بنقل كلام المجتهدين، نعم يقع فى كلام أهل المذهب تكفير كثير ولكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون بل من غيرهم، ولا عبرة بغير الفقهاء ، والمنقول عن المجتهدين ما ذكرنا اهـ ومما يزيد ذلك وضوحا ما صرحوا به فى كتبهم متونا وشروحا من قولهم :ولا تقبل شهادة من يظهر سب السلف وتقبل شهادة أهل الأهواء إلا الخطابية(رد المحتار على الدر المختار، ج۴،ص۲۳۷، كتاب الجهاد،باب المرتد)

وحكم الخوارج عند جمهور الفقهاء والمحدثين حكم البغاة .وذهب بعض المحدثين إلى كفرهم . قال ابن المنذر :ولا أعلم أحدا وافق أهل الحديث على تكفيرهم، وهذا يقتضى نقل إجماع الفقهاء .مطلب فى عدم تكفير الخوارج وأهل البدع.

وقد ذكر فى المحيط أن بعض الفقهاء لا يكفر أحدا من أهل البدع .وبعضهم يكفر من خالف منهم ببدعته دليلا قطعيا ونسبه إلى أكثر أهل السنة والنقل الأول أثبت نعم يقع فى كلام أهل مذهب تكفير كثير، لكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون بل من غيرهم .

مطلب لا عبرة بغير الفقهاء يعنى المجتهدين.ولا عبرة بغير الفقهاء ، والمنقول عن المجتهدين ما ذكرنا وابن المنذر أعرف بنقل مذاهب المجتهدين(رد المحتار على الدر المختار، ج۴، ص۲۶۳، كتاب الجهاد،باب المرتد)

(قوله: فى المتن وأهل الأهواء) قال الأتقانى أراد بأهل الأهواء أصحاب البدع كالخارجى والرافضى الجبرى والقدرى والمشبه والمعطل ويسمى أهل البدع أهل الأهواء لميلهم إلى محبوب أنفسهم بلا دليل شرعى أو عقلى فالهوى محبوب النفس من هوى الشىء إذا أحبه وقد مر فى التبيين فى باب أقسام السنة اهـ (حاشية الشلبى علىٰ تبيين الحقائق، ج۴ص۲۲۳، كتاب الشهادة، باب من تقبل شهادته ومن لا تقبل)

اورعدمِ تکفیر کا یہی قول جمہور فقہاء و متکلمین کا ہے اور یہی حق وصواب ہے، اوراس میں صرف چند حضرات ہی کا اختلاف ہے۔

اورخوارج وغیرہ سے قتال، ان کے کفر کو مستلزم نہیں، بلکہ وہ ان کے بغاوت کرنے پرمبنی ہے۔ [1]

---

[1] (وكجهل المبتدع مثل التنزيه بنفى الصفات) كما عن المعتزلة (و) التنزيه بنفى (الرؤية) كما عليه المعتزلة والروافض خذلهم الله تعالى (والتشبيه بالجسم) كما عليه بعض المجسمة (ونحو ذلك) كإنكار الشفاعة لأهل الكبائر وعليه الروافض والمعتزلة وتضلل أكثر أجلة الصحابة وعليه الروافض والخوارج (فان الكتاب والسنة الصحيحة) المتوارت المعنى (دالان دلالة واضحة قاطعة بحيث لا مساغ للامتراء فيه (على بطلانهما) بل بطلان كل عقائد اهل البدع لا شك فيه (لكن لا نكفره لتمسكه) أى المبتدع (بالقرآن أو الحديث أو العقل فى الجملة) فهم ملتزمون حقية كلام الله ورسوله وما أتى به اجمالا وهو الايمان وإنما وقعوا فيما وقعوا لتدينهم وتوهم الفاسد أنه الدين المحمدى وأما لزومهم تكذيب ما ثبت قطعا أنه دين محمدى فليس كفرا وإنما الكفر التزام ذلك (وللنهى عن تكفير أهل القبلة) بقوله صلى الله عليه وآله وأصحابه وسلم من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذى له ذمة الله ورسوله فلا تخفر واله فى ذمته رواه البخارى (وان دخلوا) أى كل الفرق (فى النار إلا واحدا) وهم المتبعون للصحابة بالنص فالروافض والخوارج أبعد من هذا وذلك لان هذا الجهل لما لم يكن عذر الزم التعذيب للاثم (لان عاقبتهم إلى الجنة) بعد المكث الطويل فى النار إن ماتوا على ملة الإسلام وان كان شائبة بغض أولياء الله من أكابر الصحابة أزالت عن الاعتقاد بالله ورسوله عند الموت وليس ببعيد فهم مخلدون أبدا فى النار (وعليه) أى على عدم التكفير (جمهور الفقهاء والمتكلمين وهو الحق) وفيه لم يوجد الخلاف بين أهل السنة إلا عن الإمام مالك فى تكفير الروافض وعن متأخرى مشايخنا (إلا من أنكر ضروريا) من الدين وكان بحيث لا مساغ للشبهة فى كون انكاره خروجا عن الدين كالأركان الأربعة وحقيقة القرآن،اعلم انى رأيت فى مجمع البيان تفسير بعض اشيعة انه ذهب بعض أصحابهم إلى أن القرآن العياذ بالله كان زائدا على هذا المكتوب المقروء قد ذهب بتقصير من الصحابة الجامعين العياذ بالله ولم يختر صاحب ذل التفسير هذا القول فمن قال بهذا القول فهو كافر لانكاره الضرورى فافهم (وكجهل الباغى وهو الخارج على الإمام الحق بتأويل فاسد) وهذا الجهل أيضاً لا يكون عذرا فيعذب فى الآخرة ويقتل فى الدنيا (ولم يكفره أحد من أهل الحق) منهم (قال) أمير المؤمنين (على) كرم الله وجهه ووجوه آله الكرام فيهم (اخوانا بغوا علينا) وقد قال الله تعالى وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما فان بغت احداهما على الأخرى فقاتلوا التى تبغى فسمى الله تعالى البغاة مؤمنين(فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، لابن نظام الدين الأنصارى، ج۲ص ۴۲۱، ۴۲۲،خاتمة : الاجتهاد بذل الطاقة من الفقيه،مسئلة كل مجتهد فى المسئلة الاجتهادية مصيب عند القاضى)

مولانا رشید احمد گنگوہی کا حوالہ

مشائخِ دیوبند کی اہم علمی شخصیت، مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ایک سوال کے جواب میں ہے کہ:

افعالِ شرکیہ بعض ایسے ہیں کہ شرکِ محض ہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ مشرک لوگ ان کو کرتے ہیں، اور تاویل ان میں ہوسکتی ہے، پس پہلی قسم کا فعل جیسا سجدہ بت کو کرنا، زنار ڈالنا، ان امور سے تو مشرک ہوگیا، اور سب معاملات مشرکین کے اس کے ساتھ کرنا ہے، اور دوسری قسم کے افعال سے گناہِ کبیرہ ہوتا ہے، اس سے خروج عن الاسلام نہیں ہوتا، کیونکہ شرک بعض اصل شرک اور اعلیٰ درجہ کا ہے، اور بعض کم اسی واسطے ''شرک دون شرک'' کہتے ہیں، تو دوسرے درجے کے شرک حقیقتاً شرک نہیں، جیسا کہ قسم بغیر اللہ کو شرک فرمایا، اور ریا کو شرک فرمایا، لہٰذا یہ سب افعال چونکہ صورت میں شرک کے ہیں، ان کو شرک فرمادیا ہے، ان کے کرنے سے فاعل حقیقی مشرک نہیں ہوجاتا، فقہاء نے لکھا ہے کہ مسلم کے فعل میں اگر ننانوے (99) احتمال کفر کے ہوں، اور ایک احتمال ایمان کا ہو، تو اس کو ایمان پر حمل کرنا اور مومن ہی کہنا چاہیے (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص۱۷۸، کتاب الایمان: ایمان اور کفر کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے بعض افعالِ شرک، جن میں تاویل ہوسکتی ہے، ان کو حقیقی شرک قرار نہیں دیا جائے گا، البتہ صورتاً شرک قرار دیا جائے گا، جیسا کہ غیر اللہ کی قسم کھانے کو احادیث میں شرک کہا گیا ہے، لیکن اس کو ظاہر پر رکھ کر حکم بیان نہیں کیا جاتا، اور اسی وجہ سے اگر غیرُ اللہ کی قسم بنیتِ عبادت نہ ہو تو اس کو شرکِ اکبر قرار نہیں دیا جاتا اور اسی واسطے فقہاء نے ''شرک دون شرک'' کی تقسیم کی ہے، اسی کا ذکر علامہ ابنِ تیمیہ نے بھی فرمایا ہے، جیسا کہ اگلی فصل میں آتا ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا دوسرا حوالہ

مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب کے فتاویٰ میں ایک مقام پر ہے کہ:

نداء، غیرُ اللہ تعالیٰ، کو کرنا دور سے شرکِ حقیقی جب ہوتا ہے کہ ان کو عالم، سامع مستقل عقیدہ کرے (یعنی اس میں دوسرے کو مستقل بالذات سمجھے) ورنہ شرک نہیں، مثلاً یہ جانے کہ حق تعالیٰ اس کو مطلع فرمادے گا، یا باذنہٖ تعالیٰ انکشاف ان کو ہوجاوے گا، یا باذنہٖ تعالیٰ ملائکہ پہنچادیویں گے، جیسا درود کی نسبت وارِد ہے، یا محض شوقیہ کہتا ہو، محبت میں، یا عرضِ حال، محلِ تحسر وحرماں میں کہ ایسے مواقع میں اگرچہ کلماتِ خطابیہ بولتے ہیں، لیکن ہرگز نہ مقصود اسماع ہوتا ہے، نہ عقیدہ، پس ان ہی اقسام سے کلماتِ مناجات واشعار بزرگان کے ہوتے ہیں کہ فی حد ذاتہٖ نہ شرک، نہ معصیت، مگر ہاں بوجہ موہم ہونے کے ان کلمات کا مجامع میں کہنا مکروہ ہے کہ عوام کو ضرَر رہے، اور فی حدِ ذاتہٖ ایہام بھی ہے، لہٰذا نہ ایسے اشعار کا پڑھنا منع ہے، اور نہ اس کے مولف پر طعن ہوسکتا ہے، اور کراہت موہوم ہونے کی وجہ غلبۂ حجت کے منجر (یعنی ختم) ہوجاتی ہے، مگر ایسی طرح پڑھنا اور پڑھوانا کہ اندیشۂ عوام کا ہو، بندہ پسند نہیں کرتا، گو اس کو معصیت بھی نہیں کہہ سکتا، مگر خلافِ مصلحتِ وقت کے جانتا ہے۔

مگر ہاں جس کلام میں صاف کلماتِ کفر ہوں، اس کو نہ سننا حلال ہے، اور نہ سکوت روا ہے، اگر قادر نہ ہو، تو الگ ہوجاوے، اور جو عالم باوجود قدرت کے اس کو رَد نہ کرے، یہ مداہنت ہوگی (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص۱۸۲، کتاب الایمان: ایمان اور کفر کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ نداءِ غیر اللہ، اگر اللہ کی صفات میں شریک بنا کر ہو، تو شرکِ حقیقی وشرکِ

اکبر ہے، ورنہ بعض صورتوں میں گناہ اور بعض صورتوں میں خلافِ احتیاط یا کم از کم جائز ہے، اورعقائد وحالات اور شخصیات کے مختلف ہونے سے اس کا حکم مختلف ہوسکتا ہے۔

حضرت گنگوہی کا مذکورہ فتویٰ اس سلسلہ میں انتہائی جامع اور محققانہ ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا تیسرا حوالہ

فتاویٰ رشیدیہ میں ''یارسول اللہ کا وظیفہ'' کے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے کہ:

ایسے کلمات کو نثر ہو یا نظم، ورد کرنا مکروہ تنزیہی ہے، کفر وفسق نہیں، کیونکہ وجہ کفر کی، غیر کو حاضر ومتصرف جاننا ہے، اور وجہ فسق کی احتمال فسادِ عقیدہ عوام اور اپنے اوپر تہمتِ شرک رکھنا ہے، اور کراہتِ تنزیہی یہ کہ فی الجملہ مشابہت استعانتِ غیر سے ہونے کی تھی، گو نیت نہیں، جیسا قسم غیرُ اللہ تعالیٰ کی، کو شرک، حدیث میں فرمایا، اور خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہی بعض اوقات غیر کی قسم کھائی، تو اس کو عمداً صغیرہ پر حمل کیا ہے، علماء نے، اور سہواً معاف ومباح، پس اس کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص۲۰۶، کتاب الایمان: ایمان اور کفر کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اس عبارت سے بھی غیر اللہ کی نداء کی تقسیم معلوم ہوئی کہ بعض صورتوں میں یہ کفر وشرکِ حقیقی ہے، ہر صورت میں نہیں، جیسا کہ غیر اللہ کی قسم اٹھانا ہر صورت میں شرکِ حقیقی نہیں، باوجودیکہ اس کو احادیث میں شرک بتلایا گیا ہے، اور اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات غیر اللہ کی قسم اٹھائی ہے، اسی طرح بعض دوسرے ایسے امور میں بھی حکم ہوگا، جن کو بعض نصوص میں شرک بتلایا گیا ہے، اور ان میں تاویل کی گنجائش ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا چوتھا حوالہ

فتاویٰ رشیدیہ میں ''یا شیخ عبدالقادر جیلانی کا وظیفہ'' کے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے کہ:

اس کا ورد کرنا بندہ جائز نہیں جانتا، اگرچہ شرک نہیں، لیکن مشابہ شرک ہے، اور بعض فعل مشابہ بشرک ہوتے ہیں، اور صغیرہ ہوتے ہیں کہ شرک کلی مشکک ہے کہ اس کے افراد قلت وکثرتِ معصیت میں متفاوت ہیں، مثلاً قسم بغیر اللہ تعالیٰ کو حدیث میں شرک فرمایا ہے، معہٰذا وہ گناہِ صغیرہ ہے، پس ورد اس کا مشابہ بشرک ہے کہ غیرُ اللہ تعالیٰ سے طلبِ حاجت ہے، مگر جو محض ان کلمات میں اثر جان کر پڑھتا ہے، وہ کافر ومشرک نہ ہوگا، اگرچہ معصیت سے خالی بھی نہ ہوگا، اور جو شیخ قدس سرہٗ کو متصرف بالذات اور عالمِ غیب بذاتِ خود جان کر پڑھے گا، وہ مشرک ہے، اور اس عقیدہ سے پڑھنا کہ شیخ کو حق تعالیٰ اطلاع کر دیتا ہے، اور باذنہٖ تعالیٰ شیخ حاجت براری کر دیتے ہیں، یہ بھی مشرک نہ ہوگا (باقی مومن کی نسبت بدظن ہونا بھی معصیت ہے) اور جلدی سے کسی کو کافر مشرک بتا دینا بھی غیر مناسب ہے، اور ایسے موہوم الفاظ کا پڑھنا بھی بے جا ومعصیت ہے (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص ۲۰۹، کتاب الایمان: ایمان اور کفر کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ نداءِ غیر اللہ پر مطلقاً کفرِ اکبر وشرکِ جلی کا حکم نہیں لگانا چاہئے، بلکہ مختلف صورتوں کے اعتبار سے حکم بیان کرنا چاہئے، اور اس سلسلہ میں لوگوں کے عقائد وافکار اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات ونتائج پر نظر رکھنا چاہئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی کے مذکورہ وظیفہ کا جو حکم مولانا گنگوہی نے اوپر کی عبارت میں بیان فرمایا، ہمارے نزدیک یہی راجح ہے کہ اس کا گناہ ہونا تو متعین ہے، جبکہ بعض صورتوں میں شرک بھی ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا پانچواں حوالہ

مولانا رشید احمد گنگوہی کے ہی فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کہ:

استعانت کے تین معنیٰ ہیں، ایک یہ کہ حق تعالیٰ سے دعاء کرے کہ بحرمتِ فلاں میرا کام کردے، یہ باتفاق جائز ہے، خواہ عندالقبر ہو، خواہ دوسری جگہ، اس میں کسی کو کلام نہیں۔ [1]

دوسرے یہ کہ صاحبِ قبر سے کہے کہ تم میرا کام کردو، یہ شرک ہے، خواہ قبر کے پاس کہے، خواہ قبر سے دور کہے۔ [2]

اور بعض روایات میں جو آیا ہے ''اعینونی عباداللہ'' تو وہ فی الواقع کسی میت سے استعانت نہیں، بلکہ ''عباداللہ'' جو صحرا میں موجود ہوتے ہیں، ان سے طلبِ اعانت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اسی کام کے واسطے وہاں مقرر کیا ہے، تو وہ اس باب سے نہیں ہے، اس سے حجت، جواز پر لانا، جہل ہے معنیٰ حدیث سے۔

تیسرے یہ کہ قبر کے پاس جا کر کہے کہ اے فلاں! تم میرے واسطے دعا کرو کہ حق تعالیٰ میرا کام کردیوے، اس میں اختلاف علماء کا ہے، مجوزینِ سماعِ موتیٰ اس کے جواز کے مقر ہیں، اور مانعینِ سماع منع کرتے ہیں، سو اِس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے، مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو خلاف نہیں، اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے، اور دلیلِ جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقتِ زیارتِ قبرِ مبارک، شفاعت، مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے، پس یہ جواز کے واسطے کافی ہے۔ [3]

اور جس کو قاضی صاحب نے منع لکھا ہے (یعنی بزرگوں سے دعاء مانگنا) وہ دوسری

---

[1] مگر بعض حضرات مثلاً علامہ ابنِ تیمیہ، اس کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں، اگرچہ شرک قرار نہ دیں، جیسا کہ اپنے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے۔ محمد رضوان۔

[2] اور شرکِ اکبر اسی صورت میں ہے، جبکہ دوسرے کو مستقل بالذات سمجھے، ورنہ صورتاً شرک اور گناہ ہے، جیسا کہ حضرت گنگوہی نے ہی اپنے دوسرے فتاویٰ میں تصریح فرمائی ہے۔ محمد رضوان۔

[3] تاہم استشفاع عندالقبر کو بھی تمام حضرات جائز نہیں کہتے، بعض اس کو موہمِ شرک یا مشابہ شرک ہونے کی وجہ سے ممنوع سمجھتے ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام پر ذکر کیا گیا۔ محمد رضوان۔

نوع کی استعانت ہے۔

حق یہ ہے کہ یہ مسئلہ مخلوط ہورہا ہے، اور سماعِ موتیٰ کا مسئلہ بھی صحابہ کے وقت سے مختلف فیہ ہے، مع ہٰذا اسلام کرنے کو کوئی منع نہیں کرتا، بہرحال یہ مسئلہ مختلفہ ہے، اس میں بحث مناسب نہیں (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص۱۵۱ و۱۵۲، کتاب العلم، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ استعانت کی مختلف صورتیں عوام میں رائج ہیں، اور سب کا یکساں حکم نہیں، بعض صورتوں کا جواز وعدمِ جواز سماعِ موتیٰ کے مسئلہ پر متفرع ہے، جس میں خود اختلاف ہے، اور اسی استعانت کے قَبیل سے استشفاع عند قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ بھی ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا چھٹا حوالہ

فتاویٰ رشیدیہ میں ہی ایک مقام پر ہے کہ:

استمداد تین قسم کا ہے، ایک یہ کہ اہلِ قبور سے مدد چاہے، اس کو سب فقہاء نے ناجائز لکھا ہے، دوسرے یہ کہ کہے اے فلاں! خدائے تعالیٰ سے دعاء کر کہ فلاں کام میرا پورا ہوجائے، یہ مبنی بر مسئلۂ سماع کے ہے، جو سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں، ان کے نزدیک درست، دوسروں کے نزدیک ناجائز، اس کو شیخ نے لکھا ہے کہ ''وأن الإستمداد بأهل القبور .... الیٰ قوله.... فقد انكره كثير من الفقهاء، الخ '' انبیاء کو اسی وجہ سے مستثنیٰ کیا کہ ان کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں، تیسرے یہ کہ دعاء مانگے ''الٰهی بحرمة فلاں '' میرا کام پورا کردے، یہ بالاتفاق جائز ہے، اور تمام (صوفیاء) شجروں میں موجود ہے، اسی وجہ سے اقوالِ علماء میں اختلاف ہے کہ استمداد لفظ مشترک ہے، کسی نے کسی کو لیا، اور

کسی نے کسی کو، قول ہر ایک کا اپنے معنیٰ ومراد پر صحیح ہے (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص۲۰۰، کتاب الایمان: ایمان اور کفر کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

مذکورہ عبارت سے بھی عوام میں استمداد کی مختلف صورتوں کا ہونا اوران کا حکم مختلف ہونا معلوم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ استمداد لفظِ مشترک ہے، کسی نے کسی معنیٰ کے اعتبار سے اور کسی نے کسی معنیٰ کے اعتبار سے اس کا حکم بیان کیا، جس کی وجہ سے اختلاف رونما ہوا، اور دلیل بھی ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر بیان کی، پس یہ مسئلہ اختلافی واجتہادی ہوا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا ساتواں حوالہ

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

اہلِ قبور سے اس طور پر دعاء کرنا کہ اے صاحبِ قبر! اس طرح میرا کام کردے، تو یہ تو حرام اور شرک بالاتفاق ہے۔ [1]

اور یہ بات کہ تم میرے واسطے دعاء کرو، تو اس باب میں اختلاف ہے، منکرینِ سماع اس کو لغو، ناجائز کہتے ہیں، اور مجوزینِ سماع جائز جانتے ہیں، اور یہی بندہ نے پہلے بعض سائلین کے جواب میں لکھا ہے۔

بندہ مختلف فیہا مسائل میں فیصلہ نہیں کرتا، لیکن احوط کو اختیار کرتا ہوں۔ فقط (فتاویٰ رشیدیہ مبوب بطرزِ جدید، ص۲۵۲، کتاب العقائد، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

معلوم ہوا کہ اہلِ قبور سے دعا کرانے کی بعض صورتیں کفر وشرک ہیں، اور بعض اس سے کم درجہ کی اور اختلافی ہیں، سب کو یکساں حکم حاصل نہیں، اور اہلِ قبور سے براہِ راست دعا کرنے اور اللہ سے دعا کی درخواست کرنے کا مسئلہ الگ الگ ہے، نیز بعض مسائل میں عوام کے مخصوص عقائد کی وجہ سے بھی فرق پیدا ہوجاتا ہے، یعنی ممکن ہے کہ ایک زمانے یا علاقے میں

[1] پھر بعض صورتوں میں شرکِ اکبر اور بعض صورتوں میں صورتاً شرک وحرام ہے، کما مرّ۔

اس کا استعمال ایک خاص عقیدے یا طریقے کے مطابق ہو، اور دوسرے زمانے یا علاقے میں اس کا استعمال دوسرے عقیدے یا دوسرے طریقے کے مطابق ہو، جس کی وجہ سے حکم بھی مختلف ہوگا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا حوالہ

مشائخِ دیوبند کی ایک اور اہم شخصیت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ''ننانوے احتمالات کفر کے، اور ایک احتمال ایمان کا'' ہونے کے متعلق مذکور ہے کہ:

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ننانوے باتیں کفر کی موجب پائی جاویں، تب بھی (کفر کا) فتویٰ نہ دیں گے، ننانوے تو بہت ہوتی ہیں، اگر ایک امر بھی موجبِ کفر یقینی پایا جاوے، تب بھی (کفر کا) فتویٰ دے دیں گے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ خود اس امر میں بہت سے احتمال ہیں، بعض احتمالات پر تو وہ موجبِ کفر ہے، اور وہ احتمالات ننانوے ہیں، اور بعض احتمال پر وہ موجبِ کفر نہیں، اور وہ ایک ہے، تو اس صورت میں اس امر کو محمول اسی احتمال پر کریں گے، جو موجبِ کفر نہیں، اور تکفیر سے احتیاط کریں گے (امداد الفتاویٰ مبوب، ج۴، ص۳۹۳، مسائلِ شتی، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

اس سے کفر میں مختلف احتمالات ہونے کے مسئلہ کی اچھی طرح وضاحت ہوگئی۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا دوسرا حوالہ

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

جس شخص میں کفر کی کوئی وجہ قطعی ہوگی، کافر کہا جاوے گا، اور حدیثیں (جن میں ہماری طرح نماز پڑھنے، اور ہمارے قبلے کا استقبال کرنے، اور ہمارا ذبیحہ کھانے والے کو مسلمان کہا گیا ہے، وہ) اس شخص کے بارے میں ہیں، جس میں کوئی وجہ

قطعی نہ ہو، اور اس مسئلہ کے یہ معنیٰ ہیں کہ اگر کوئی امرِ قولی یا فعلی ایسا ہو کہ محتمل کفر وعدمِ کفر دونوں کو ہو، گو احتمالِ کفر غالب و اکثر ہو، تب بھی تکفیر نہ کریں گے، نہ یہ کہ تکفیرِ قطعی پر بھی تکفیر نہ کریں گے، کیونکہ کافر کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ اس میں تمام وجوہ، کفر کی جمع ہوں، ورنہ جن کا کفر منصوص ہے، وہ بھی کافر نہ ہوں گے (امداد الفتاویٰ مبوب، ج۵،ص۳۹۱، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

اس سے احتمالاتِ کفر کے مسئلہ کی مزید توضیح ہوگئی۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا تیسرا حوالہ

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اپنے مواعظ میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

کافر بڑا سخت لفظ ہے، بڑی احتیاط چاہیے، کافر کسی کو اس وقت کہہ سکتے ہیں، جب کہ وہ کوئی فعل ایسا کرتا ہو، جو محتمل تاویل کو بھی نہ ہو، مثلاً کوئی شخص بت پرستی بلا اکراہ کھلم کھلا کرتا ہو، تو اس وقت اس کو کافر کہہ سکتے ہیں، اور جب ایک شخص بت پرستی سے نفرت رکھتا ہے، زبان سے کلمہ پڑھتا ہے، تو اس کی تکذیب کرنا اور کافر کہنا کیا معنیٰ (خطباتِ حکیم الامت، ج ۱۲ ''محاسنِ اسلام'' صفحہ ۴۵۲، ۴۵۳، وعظ ''الاسلام الحقیقی'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان 1413ھجری)

اور آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

اس (کفر کا حکم لگانے) میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، ہم نے آج کل یہ طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ اپنا جو ایک مسلک قرار دے لیا ہے، بس وہی اسلام ہے، اور وہی ایمان ہے، جو اس کے خلاف ہو، وہ کافر ہے، یہ بہت سخت بات ہے (خطباتِ حکیم الامت، ج ۱۲ ''محاسنِ اسلام'' صفحہ ۴۵۳، وعظ ''الاسلام الحقیقی'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان 1413ھجری)

اور آگے چل کر مزید تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

اہلِ حق کا طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان جب تک کوئی بھی تاویل بن سکے، کسی کو کافر نہ بتاویں، ہاں اگر وہ خود ہی تاویل کو بھی رَد کرے، تو مجبوری ہے کہ اب مدعی سست اور گواہ چست کا قصہ ہے۔

باقی (مستند علماء) اپنی طرف سے کبھی کسی کو کافر نہیں بناتے، اور جہاں کہیں بضرورتِ شرعی انہوں نے کسی کو کافر کہہ دیا ہے، بعض جہلاء اس پر بھی طعن کرتے ہیں کہ (علماء) لوگوں کو کافر بناتے ہیں، میں اس کے متعلق بطور لطیفہ کہا کرتا ہوں کہ انہوں نے کافر بنایا نہیں، بلکہ کافر بتایا ہے (دونوں میں ایک نقطہ کا فرق ہے) اس شخص نے واقعی ایسا ہی کام کیا ہے، جس پر کفر عائد ہوتا ہے، اور کوئی تاویل بھی نہیں بن سکتی، تو وہ کافر تو خود بن گیا، انہوں نے صرف بتا دیا ہے کہ اس پر کفر عائد ہوتا ہے، اور بتانے میں بھی اتنی احتیاط کی ہے کہ بعید سے بعید تاویل بھی اٹھا نہیں رکھی، جب کوئی تاویل بھی نہ بن سکی، تب انہوں نے یہ لفظ منہ سے نکالا۔

اور ان (مستند علماء) کی کوئی ذاتی غرض یا غیظ وغضب یا بات کی پچ اس میں شامل نہیں ہوتی، بلکہ خوفِ خدا اور ترحم شامل ہوتا ہے، کافر کے لفظ سے وہ کانپتے ہیں، اور کسی کے لیے بھی اس کے استعمال کو حتی الامکان گوارا نہیں کرتے، اور واقعی یہ لفظ ہے بھی ایسا ہی، کیونکہ اس کے معنیٰ ہیں ابدالآباد کے لیے رحمتِ خدا سے بالکل ناامید ومحروم ہو جانے والا، سو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ارحم الراحمین کی رحمت سے کسی کو ایسا ناامید کردیا جاوے (خطباتِ حکیم الامت، ج ۱۲ ''محاسنِ اسلام'' صفحہ ۴۵۵، ۴۵۶، وعظ ''الاسلام الحقیقی''، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان 1413 ہجری)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ محققین مشائخِ دیوبند، مسلمان کی تکفیر میں احتیاط کے قائل ہیں، اور وہ کفر کا حکم لگانے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔

مذکورہ نکتہ نظر تو اصل اور محققین مشائخِ دیوبند کا ہے، جبکہ آج کے دور میں ان اہلِ دیوبند کے نام لیوا کئی جذباتی اہلِ علم حضرات کا حال یہ ہے کہ وہ دوسرے عام مسلمانوں کے معاملہ میں تو درکنار، اپنے سلسلہ کے جید اور مستند اصحابِ علم سے بھی ذرا ذرا سا اختلاف ہونے پر گستاخِ رسول، اور کافر ومرتد ہونے کا حکم لگانے سے نہیں چوکتے، اپنی ذات میں یہ لوگ خواہ کتنے ہی مخلص اور بظاہر متقی وصاحبِ علم اور مقتداء کیوں نہ شمار ہوتے ہوں، لیکن ان کا مذکورہ طرزِ عمل نہ تو اصل مشائخِ دیوبند کے مزاج ومذاق سے میل کھاتا اور نہ شرعی اصولوں سے مطابقت رکھتا، لہٰذا اس قسم کے حضرات کے طرزِ عمل سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور ان کی وجہ سے اصل و محققینِ اہلِ دیوبند کے مزاج ومذاق کو غلط نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ خود ان لوگوں کو ہی مذکورہ اکابر ومشائخ کے طریقہ وذوق سے منحرف یا مختلف سمجھنا چاہیے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا چوتھا حوالہ

''امدادالفتاویٰ'' میں ایک سوال وجواب درجِ ذیل طریقہ پر ہے:

سوال: ''یارسول اللہ'' کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: عوام کو منع کرنا چاہیے (امداد الفتاویٰ مبوب، ج۵،ص۳۹۰، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

یعنی اگر عقیدہ شرکیہ بھی نہ ہو، تب بھی موہمِ شرک یا مشابہ شرک ہے، اس لیے عوام کے لیے بہر حال انتظاماً ممانعت ہونی چاہیے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا پانچواں حوالہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے امدادالفتاویٰ میں مذکورہ فتوے کے بعد، ایک فتوے میں ''یارسول اللہ'' کہنے کے متعلق درجِ ذیل جواب ہے:

بارادۂ استعانت واستغاثہ یا باعتقادِ حاضر وناظر ہونے کے، منہی عنہ ہے، اور

بدون اس اعتقاد کے محض شوقاً واستلذاذاً، ماذون فیہ ہے، چونکہ اشعار پڑھنے کی غرض محض اظہارِ شوق واستلذاذ ہوتا ہے، اس لیے (میری کتاب ''نشر الطیب'' میں) نقل میں توسع کیا گیا، لیکن اگر کسی جگہ اس کے خلاف دیکھا جائے، منع کر دیا جائے گا (امداد الفتاویٰ مبوب، ج ۵،ص ۳۹۰، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

مذکورہ عبارت سے نداءِ غیر اللہ کے حکم کا عقیدے وحالات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہونا معلوم ہوا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا چھٹا حوالہ

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ایک مقام پر ہے کہ:

(غیرُ اللہ کے لیے) ایسے خطابات میں تین مرتبے ہیں، اولؔ ان کو متصرف بالاستقلال سمجھنا، یہ تو صریح شرک ہے۔

دومؔ متصرف بالاذن اوران خطابات پر مطلع بالمشیۃ سمجھنا، یہ شرک تو کسی حال میں نہیں، لیکن یہ کہ اس کا وقوع ہوتا ہے یا نہیں؟ اس میں اکابرِ امت مختلف ہیں ''**فمنھم المثبت ومنھم النافی**'' لیکن جو مثبت بھی ہیں، وہ یہ اجازت نہیں دیتے کہ بعید سے ندا کرو، اور نہ بعید سے دواماً سننے کی کوئی دلیل ہے، اور بلا دلیلِ شرعی ایسا اعتقاد رکھنا گو حقیقتاً شرک نہ ہو، مگر معصیت اور کذب حقیقتاً اور شرک صورتاً ہے۔

معصیت ہونے کی یہ دلیل ہے ''**ولا تقف مالیس لک بہ علم**'' اور کذب ہونا اس کی تعریف صادق آنے سے ظاہر ہے۔

اور شرک صورتاً اس لیے کہ اول اعتقاد والوں کے ساتھ عادت میں تشبہ ہے، اور

اگر کسی بزرگ کی حکایت میں بطورِ کرامت کے ایسا امر منقول ہو، تو خرقِ عادت سے دوامِ عادت ثابت نہیں ہوتا، البتہ قبر پر جا کر مجاز کے مرتبہ سے ان سے استمداد مثبتین کے نزدیک جائز ہے، جب کہ اور کوئی مفسدہ عارض نہ ہو جائے، والا فلا۔

سوم نہ تصرف کا اعتقاد ہے، نہ سماع کا، محض ذوق شوق میں مثل خطاب بادِ صبا کے خطاب کرتا ہے، یہ نہ شرک ہے، نہ معصیت ہے، فی نفسہٖ جائز ہے، جب کہ الفاظ، خطاب کے حدِ شرعی کے اندر ہوں، اور کسی عامی کا اعتقاد فاسد نہ ہو جاوے، کیونکہ جس طرح خود معصیت سے بچنا فرض ہے، اسی طرح دوسرے مسلمانوں کو خصوصاً عوام کو بچانا فرض ہے، پس جہاں عوام کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو، وہاں اجازت نہ ہوگی۔

جب یہ تفصیل سمجھ میں آ گئی، تو اس سے اکابر کے اقوال کے معنیٰ بھی متعین ہو گئے، اور قائل کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔

اور جو شخص شرک کہتا ہے، اگر وہ مرتبۂ جائز کو کہتا ہے، تو غلطی ہے، توبہ واجب ہے۔

اور اگر ناجائز مرتبہ کو کہتا ہے، تو تاویل سے جائز ہے، جیسا حدیثوں میں بعض معاصی کو شرک فرمایا ہے۔ واللّٰہ تعالٰی اعلم (امداد الفتاویٰ مبوب، ج ۵، ص ۳۸۳، ۳۸۴، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

مذکورہ محققانہ فتوے سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کو پکارنے اور ان سے خطاب کرنے کی مختلف صورتیں وحالتیں ہیں، اور سب کا ایک جیسا حکم نہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا ساتواں حوالہ

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ہی ایک مقام پر ہے کہ:

جو استعانت واستمداد بالمخلوق، باعتقادِ علم وقدرت مستقل مستمد منہ ہو، شرک ہے، اور جو باعتقادِ علم وقدرت غیر مستقل ہو، مگر وہ علم وقدرت کسی دلیلِ صحیح سے ثابت نہ ہو، معصیت ہے، اور جو باعتقادِ علم وقدرت غیر مستقل ہو، اور وہ علم وقدرت کسی دلیل سے ثابت ہو، جائز ہے، خواہ وہ مستمد منہ ''حی'' ہو یا میت، اور جو استمداد بلا اعتقادِ علم وقدرت ہو، نہ مستقل نہ غیر مستقل، پس اگر طریقِ استمداد مفید ہو، تب بھی جائز ہے، جیسے **استمداد بالنار والماء والواقعات التاریخیة**، ورنہ لغو ہے (امداد الفتاویٰ مبوب، ج۵، ص۳۶۹، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: جولائی2010ء)

مذکورہ عبارت سے بھی استمداد واستعانت کی مختلف صورتوں کا ہونا اوران کے حکم کا مختلف ہونا معلوم ہوا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا آٹھواں حوالہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

''حاصل اس اعتقادِ تاثیر وعدمِ اعتقادِ تاثیر کے، معیارِ فرق کا یہ ہے کہ بعض کا تو یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مخلوق کو جو اُس کا مقرب ہے، کچھ قدرتِ مستقلہ نفع وضرر کی اس طرح سے عطا فرمادی ہے کہ اُس کا اپنے معتقد ومخالف کو نفع وضرر پہنچانا مشیتِ جزئیہ پر موقوف نہیں، گو اگر روکنا چاہے پھر قدرت حق ہی غالب ہے، جیسے سلاطین اپنے نائبین وحکام کو خاص اختیارات اس طرح دیدیتے ہیں کہ اُن کا اجرا، اُس وقت سلطانِ اعظم کی منظوری پر موقوف نہیں ہوتا گو روکنا چاہے تو سلطان ہی کا حکم غالب رہے گا سو یہ عقیدہ تو اعتقادِ تاثیر ہے اور مشرکینِ عرب کا اپنے الٰہۂ باطلہ کے ساتھ یہی اعتقاد تھا اور بعض کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ایسی

قدرتِ مستقلہ تو کسی مخلوق میں نہیں، مگر بعض مخلوقات کو قرب وقبول کا ایسا درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ اپنے متوسلین کے لئے سفارش کرتے ہیں، پھر اُس سفارش کے بعد قبول میں تخلف کبھی نہیں ہوتا اوراس سفارش کی تحصیل کے لئے اس کے ساتھ بلاواسطہ یابواسطہ معاملہ مشابہ عبادت کرتے ہیں یہ عقیدہ اعتقادِ تاثیر نہیں ہے، لیکن بلادلیلِ شرعی بلکہ خلافِ دلیلِ شرعی ایسا عقیدہ رکھنا معصیتِ اعقادیہ ہے اور مشابہ عبادت معاملہ کرنا معصیتِ عملیہ ہے ،اوراسی مشابہت کے سبب اطلاقاتِ شرعیہ میں اس کومشرک کہہ دیا جاتا ہے۔ھٰذاماسنح لی،واللہ اعلم‘‘

(حاشیہ بوادرُ النوادر صفحہ ۷۰۷، درذیل رسالہ ’’الادراک والتوسل الٰی حقیقۃ الاشراک والتوسل‘‘)

اس سے معلوم ہوا کہ غیراللہ میں نفع وضرر کا عقیدہ رکھنا، بعض صورتوں میں کفروشرکِ اکبر ہے، اور بعض صورتوں میں گناہ ہے،اس کی مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا نواں حوالہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک اور مقام پرفرماتے ہیں کہ:

’’شرک کی دو قسمیں ہیں، ایک شرکِ اصغر، دوسری شرکِ اکبر، ان دونوں میں فرق ہے، بس یہ سمجھ لیجئے کہ شرکِ اصغر، مزیلِ ایمان نہیں، البتہ مزیلِ واجباتِ ایمان ہے ،ہمارے اورنجدیوں کے درمیان یہی تو فرق ہے،وہ یہ دودرجے نہیں نکالتے، ان کے یہاں شرک، بس ایک ہی حقیقت ہے، یعنی شرکِ اصغر کوئی نہیں ......شرک کے ان دونوں درجوں میں ایک باریک فرق ہے......(بزرگوں کو معین ومددگار سمجھنے میں)استقلال کے اعتقاد کو جوشرک کہا گیا ہے، تواس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کوایسا متصرف مانا جاوے کہ گو قوتِ تصرف کی حق تعالیٰ ہی سے عطا ہوئی ہو، مگر بعد عطا پھر صرف اس کا ارادہ اس تصرف کے لئے کافی ہوجاوے، حق تعالیٰ

کے ارادۂ جزئیہ کی حاجت نہ ہو، گو اس قوت کا سلب کر لینا بھی حق تعالیٰ کے اختیار میں ہو، مگر جب تک سلب نہ فرماویں، اس وقت تک صرف اس کا ارادہ کافی سمجھا جاوے، حق تعالیٰ کے ارادہ پر موقوف نہ مانا جاوے......

اگر بزرگوں کے متعلق بھی کسی کا یہی عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو ایسا اختیار دے دیا ہے کہ جب یہ چاہیں، اس اختیار سے تصرف کر سکتے ہیں، حق تعالیٰ کی مشیتِ جزئیہ کی حاجت نہیں رہتی، بلکہ بلا مشیتِ جزئیہ کے بھی ان کا چاہنا پورا ہو سکتا ہے، تو بلاشک ایسا اعتقاد رکھنے والا کافر ہے اور یہ شرکِ اکبر ہے...... اور شریعت میں کافر و مشرک ایسے ہی مشرک کو کہتے ہیں، اور اگر ان بزرگ کے متعلق یہ اعتقاد ہے کہ وہ مشیتِ ایزدی کے محتاج تو ہیں، اور اذنِ جزئی کی بھی ان کو ضرورت تو ہوتی ہے، مگر ان کے چاہنے کے وقت مشیتِ ایزدی ہو ہی جاتی ہے، تو گو یہ شرک و کفر نہیں، مگر کذب فی الاعتقاد، و معصیت و شرکِ اصغر ہے، اور پہلا درجہ شرکِ اکبر ہے...... واعظ لوگ سب کو ایک لکڑی ہانکتے ہیں...... ہمارے اور نجدیوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ ہم شرکِ اصغر کے مرتکب کو مشرک اور کافر نہیں سمجھتے، بلکہ فاسق و بدعتی سمجھتے ہیں اور نجدی ایسے شخص کو بھی کافر و مشرک سمجھتے ہیں'' (القول الجلیل، ملفوظات حضرت تھانوی، حصہ اوّل، صفحہ ۸ تا ۱۱ ملخصاً، ملفوظ نمبر ۱۲، جمع وترتیب: مولانا جلیل احمد علیگڑھی صاحب، مطبوعہ: اشرف المطابع، تھانہ بھون، انڈیا)

معلوم ہوا کہ محققین مشائخِ دیوبند ''شرک دون شرک'' کے قاعدہ کے مطابق شرکِ اکبر و غیر شرکِ اکبر کی تقسیم کرتے ہیں، اور یہ تقسیم خود نصوص سے ثابت ہے، چنانچہ احادیث میں غیر اللہ کی قسم اٹھانے کو شرک قرار دیا گیا ہے، لیکن اہلِ علم حضرات بہر صورت اس کو شرکِ اکبر قرار نہیں دیتے، اور اہلِ نجد بعض مسائل میں اس طرح کی تقسیم کے قائل نہیں، کیونکہ وہ قرآن وسنت کے نصوص کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں، اور اس طرح کی تاویلات کے قائل نہیں، جس

طرح کی تاویلات کے محققین مشائخِ دیوبند قائل ہیں، جس کی وجہ سے بعض اوقات تکفیرِ مسلم کے مسئلہ میں اختلاف رونما ہوجاتا ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے مذکورہ عبارت میں شرکِ اکبر یا شرکِ جلی اور شرکِ اصغر یا شرکِ خفی کی جو تقسیم فرمائی ہے، اس کی دلائل وحوالہ جات کے ساتھ مزید تفصیل ان کے ایک مستقل رسالہ میں آگے آتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا دسواں حوالہ

اسی بنا پر محققین مشائخِ دیوبند نے بریلوی مسلک کے لوگوں پر علی العموم شرکِ جلی وکفرِ اکبر کا حکم نہیں لگایا۔

اور ہماری نظر میں یہ تحقیق جمہور اہلُ السنۃ والجماعۃ اور ائمہ متبوعین کے اسی موقف کا تسلسل ہے، جس میں انہوں نے مختلف زمانوں کے اہلِ بدعت کے فرقوں کی تاویل کی وجہ سے علی الاطلاق تکفیر نہیں کی۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ہم بریلی والوں کے پیچھے نماز پڑھیں تو نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

> فرمایا کہ ہاں، ہم ان کو کافر نہیں کہتے، اگرچہ وہ ہمیں کہتے ہیں، ہمارا مسلک تو یہ ہے کہ کسی کو کافر کہنے میں بڑی احتیاط چاہئے۔
>
> فرمایا کہ:
>
> ہم بریلی والوں کو اہلِ ہویٰ کہتے ہیں، اہلِ ہویٰ کافر نہیں۔
>
> ہاں ایک مسئلہ علم غیب ہمارے اوران کے درمیان ایسا متنازعہ فیہ ہے کہ اس میں اثباتِ صفتِ باری تعالیٰ غیر کے لیے لازم آتی ہے، مگر اس کی تاویل .... زیادہ دشوار نہیں، اور اب تو سنا ہے کہ وہ علمِ غیب کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے لیے ثابت تو کرتے ہیں، مگر علمِ باری تعالیٰ کی طرح علمِ محیط نہیں ثابت کرتے، بلکہ اس کی حد مانتے ہیں۔

الی ان یدخل اھل الجنۃ الجنۃ و اھل النار النار.

اگر یہ صحیح ہے تو شرک ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ صفتِ خاص باری تعالیٰ، علمِ محیط ہے، علمِ محدود نہیں، تو اب ہم میں اوران میں خلاف ایک امر ممکن میں رہا کہ وہ واقع ہوا یا نہیں، یعنی یہ علم کہ:

الی ان یدخل اھل الجنۃ الجنۃ و اھل النار النار.

حضور کو دیا گیا یا نہیں، ہم کہتے ہیں دیا جانا فی نفسہٖ ممکن ہے، مگر وقوع اس کا شریعت سے کہیں ثابت نہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ ثابت بھی ہے، ہمارے نزدیک وہ تمام دلیلیں اس وقوعہ کی جو وہ پیش کرتے ہیں ناتمام ہیں، اوران کے مدعا کو ثابت نہیں کرتیں، تو زائد سے زائد الزام ان پر یہ رہا کہ انہوں نے ایسی بات کو مان لیا، جو شرعی دلیل سے ثابت نہیں، اور یہ شان مبتدع کی ہے، نہ کہ کافر کی (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۹، مجالس الحکمۃ، ص۲۲۵ و ۲۲۶، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 1425ہجری)

بریلوی مسلک کے اعلیٰ حضرت جناب رضا احمد خان بریلوی صاحب نے بھی اپنی تحریر میں اللہ تعالیٰ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں کئی جہات سے فرق کیا ہے، جس میں علمِ نبی کے اللہ تعالیٰ کے علم کی طرح محیط نہ ہونے کا بھی فرق ہے، اور یہ فرق کسی مسلمان کے مؤول اور تاویل کرنے والا ہونے کو ثابت کرنا ہے، اوراس پر کفر کا حکم نہ لگنے میں موثر ہے۔ [1]

---

[1] چنانچہ جناب احمد رضا خان بریلوی صاحب نے اس سلسلے میں ایک رسالہ تالیف کیا ہے، جس کے چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

علمِ الٰہی ذاتی ہے، اور علمِ خلق عطائی۔ وہ واجب، یہ ممکن۔ وہ قدیم، یہ حادث۔ وہ نامخلوق، یہ مخلوق۔ وہ

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بریلوی مسلک کے متعلق جو حکم بیان فرمایا، وہ جمہور اور ائمہ مجتہدین کے موافق ہیں، جنہوں نے خوارج اور اہلِ بدعت بلکہ بہتر فرقوں کی تکفیر نہیں کی۔ اور علامہ ابنِ تیمیہ اور بعض دوسرے فقہائے کرام کے حوالہ جات پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں۔

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

نامقدور، یہ مقدور۔ وہ ضروری البقاء، یہ جائز الفناء۔ وہ ممتنع التغیر، یہ ممکن التبدل۔

ان عظیم تفرقوں کے بعد احتمال شرک نہ ہوگا، مگر کسی مجنون کو، بصیرت کے اندھے، اس علم ما کان وما یکون بمعنیٰ مذکور ثابت جاننے کو معاذ اللہ علمِ الٰہی سے مساوات مان لینا سمجھتے ہیں، حالانکہ العظمۃ للہ، علمِ الٰہی تو علمِ الٰہی، جس میں غیر متناہی علوم تفصیلی فراوانی بالفعل کے غیر متناہی سلسلے غیر متناہی یا وہ جسے گویا مصطلح حساب کے طور پر غیر متناہی کا مکعب کہیے بالفعل وبالدوام ازلاً ابداً موجود ہیں، یہ شرق تا غرب، وسماوات وارض، وعرش تا فرش، وما کان وما یکون من اول یوم الیٰ آخر الایام سب کے ذرے ذرے کا حال تفصیل سے جاننا وہ بالجملہ جملہ مکتوبات لوح ومکنونات قلم کو تفصیلاً محیط ہونا، علومِ محمد رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے (فتاویٰ رضویہ، ج۲۹، ص۵۰۱، ۵۰۲، رسالہ ''اِنباء المصفطیٰ بحال سِرّ واخفیٰ'' مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور، اشاعت: جمادی الاخریٰ 1423 ہجری، اگست 2002 عیسوی)

منکرین کو صدمہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لیے روزِ اول سے قیامت تک کے تمام ما کان وما یکون کا علم تفصیلی مانا جاتا ہے، لیکن بحمد للہ تعالیٰ وہ جمیع علم ما کان وما یکون علومِ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم سمندروں سے ایک نہر بلکہ بے پایاں موجوں سے ایک لہر قرار پاتا ہے۔..........

جن آیات واحادیث میں ارشاد ہوا ہے کہ علمِ غیب خاصہ خدا تعالیٰ ہے، مولیٰ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا، قطعاً حق اور بحمد اللہ تعالیٰ مسلمان کے ایمان ہیں............ علم بہ اعتبار منشا دو قسم ہے: ذاتی کہ اپنی ذات سے بے عطائے غیر ہو، اور عطائی کہ اللہ عزوجل کا عطیہ ہو، اور بہ اعتبارِ متعلق بھی دو قسم ہے، علم مطلق یعنی محیطِ حقیقی، تفصیلی فعلی فروانی کہ جمیع معلوماتِ الٰہیہ عزوعلا کو، جن میں غیر متناہی معلومات کے سلاسل وہ بھی غیر متناہیہ وہ بھی غیر متناہی بار داخل اور خود کنہ ذاتِ الٰہی واحاطہ تام صفاتِ الٰہیہ نامتناہی سب کو شامل فرداً فرداً تفصیلاً مستغفرق ہو، اور مطلق علم یعنی جاننا، اگر محیط باحاطہ حقیقیہ نہ ہو، ان تقسیمات میں علمِ ذاتی وعلمِ مطلق یعنی مذکور بلاشبہ اللہ عزوجل کے لیے خاص ہیں، اور ہرگز کسی غیرِ خدا کے لیے ان کے حصول کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

ہم ابھی بیان کر آئے کہ علم ما کان وما یکون بمعنیٰ مسطور اگرچہ کیسا ہی تفصیل بروجہ اتم واکمل ہو، علومِ محمدیہ کی وسعتِ عظیمہ کو نہیں پہنچتا، پھر علومِ محمدیہ تو علومِ الٰہیہ ہیں، جل وعلا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، مطلق علم ہرگز حضرتِ حق عزوعلا سے خاص نہیں، بلکہ قسمِ عطائی تو مخلوق ہی کے ساتھ خاص ہے۔

مولیٰ عزوجل کا علم عطائی ہونے سے پاک ہے، تو نصوصِ حصر میں یقیناً قطعاً وہی قسمِ اول مراد ہو سکتی ہے، نہ کہ قسمِ اخیر (فتاویٰ رضویہ، ج۲۹، ص۵۰۳ تا ۵۰۴ ملخصاً، رسالہ ''اِنباء المصفطیٰ بحال سِرّ واخفیٰ'' مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور، اشاعت: جمادی الاخریٰ 1423 ہجری، اگست 2002 عیسوی)

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ایک سوال و جواب درج ذیل طریقہ پر ہے:

سوال: مولانا عبدالجبار صاحب مقرر ریڈیو پاکستان نے پچھلے جمعہ ۱۵ستمبر ۱۹۶۷ء اپنے خطاب میں فرمایا تھا کہ:

''اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو بھی غیب کا علم ہے''

یہ عقیدہ رکھنے والے حضرات کافر ہیں، ان حضرات کے پیچھے نماز نہیں ہوتی؟

جواب: ایسے لوگوں کو کافر کہنا تو احتیاط کے خلاف ہے، گمراہ اور بدعتی ہونے میں شبہ نہیں، جن کے متعلق یقین ہو کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے لیے قرآنی اصطلاح کے مطابق علمِ غیب کو ثابت مانتے ہیں، وہ بلاشبہ مشرک ہیں، نماز ان کے پیچھے درست نہیں۔

لیکن اکثر عوام اور بہت سے لکھے پڑھے بھی غیب کی خبریں جو اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے کسی رسول یا ولی کو معلوم ہو جائیں، اس کو بھی علمِ غیب کہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایسا علم تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ حاصل تھا، قرآن کریم میں کئی جگہ فرمایا ''**ذالک من انبآء الغیب نوحیہ الیک**'' یہ لوگ انباء الغیب اور علمِ غیب میں بوجہ جہالت کے فرق نہیں کرتے، یہ جہالت تو ہے، مگر شرک نہیں، اس لیے علی الاطلاق سب لوگوں کو کافر کہہ دینا صحیح نہیں، تکفیرِ مسلم کے معاملے میں بڑی احتیاط لازم ہے، جو لوگ صراحتاً یہ کہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرّہ ذرّہ کا علم ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرح ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، وہ بلاشبہ مشرک ہیں۔

بندہ محمد شفیع عفی عنہ۔ دارالعلوم کراچی۔ ۱۵/ ۶/ ۱۳۸۷ھ (فتویٰ نمبر ۱۱۶۶/ ۱۸، الف)

(امداد المفتیین جامع، جلد ۱، ص ۳۹۷ و ۳۹۸، کتاب الإیمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بالعلم الغیب والحاضر والناظر والنور والبشر، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018ء)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا مذکورہ فتویٰ بھی جمہور اور ائمہ مجتہدین کے مطابق ہے، اور اس کی توضیح اس سے پہلے مولانا اشرف علی تھانوی کے حوالے سے اور اس کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا دوسرا حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

حقائقِ دین سے ناواقف کچھ نام کے علماء نے یہ پیشہ بنالیا کہ ذرا ذرا سی بات پر مسلمان کو کافر قرار دینے لگے، باہمی کفر کے فتوے چلنے لگے، اس میں ان لوگوں کو کتبِ فقہ کے ان مسائل سے بھی دھوکا لگا، جو کلماتِ کفریہ کے نام سے بیان کیے جاتے ہیں کہ فلاں فلاں باتیں کلمہ کفر ہیں، جن کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس کلمہ سے قطعیاتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار نکلتا ہے، اس کو کلمۂ کفر قرار دیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی حضراتِ فقہاء نے اس کی بھی تصریح فرما دی ہے کہ ان کلمات کے کلماتِ کفر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس شخص کی زبان سے یہ کلمات نکلیں، اس کو بے سوچے سمجھے اور بدون تحقیقِ مراد کے کافر کہہ دیا جائے، جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کی مراد وہی معنیٰ ومفہوم ہیں، جو کافرانہ عقیدہ یا کسی ضروری اسلام کا انکار ہے۔

لیکن حقیقتِ حال سے ناواقف لوگوں نے ان کلمات ہی کو فیصلہ کا مدار بنالیا، اور

تکفیر بازی شروع کردی، جس کی ایک بھاری مضرت تو یہ ہوئی کہ ایک مسلمان کو کافر کہنا بڑا سخت معاملہ ہے، جس کے اثرات پورے اسلامی معاشرہ پر پڑتے ہیں، اس کے علاوہ اس میں اپنے ایمان کا خطرہ ہوتا ہے (جواہر الفقہ، جلد اول، صفحہ ۹۹، ۱۰۰، کتاب الایمان والعقائد، رسالہ "ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں" طبع جدید: نومبر 2010ء، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ فقہائے کرام نے جن الفاظ کو کلماتِ کفر قرار دیا ہے، ان سے بعض اوقات غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، اور بعض حضرات اس قسم کے الفاظ کے محض صادر ہونے پر کفر کا حکم لگا دیتے ہیں، حالانکہ ان الفاظ سے کفر لازم آنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ التزامِ کفر بھی پایا جائے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا مندرجہ بالا موقف جمہور اور ائمہ مجتہدین کے مطابق ہے، جنہوں نے تاویلاً اہلِ بدعت اور فرقِ اسلامیہ کی تکفیر نہیں کی، اور اس سلسلہ میں تاویل کو ہی بنیاد بنایا۔

آج کل حقائق دین سے ناواقف اور نام کے علماء نے جو تکفیر سازی کو پیشہ بنالیا ہے، اور وہ جہاں کسی سے کوئی اختلاف پاتے ہیں، اس پر فوراً کافر، اور گستاخِ رسول اور مرتد وغیرہ ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں، مذکورہ عبارت سے ان شدت پسند حضرات کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا تیسرا حوالہ

پیر کو سجدۂ تعظیمی کرنے اور بغداد کی طرف منہ کر کے غوث پاک کو سجدہ کرنے، اور "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کی تسبیح پڑھنے کے ناجائز اور شرک ہونے کے بعد ان افعال کے مرتکبین کے متعلق، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ایک جواب کے ضمن میں فرمایا کہ:

چونکہ اس قسم کے افعال کرنے والوں کے افعال واقوال میں تاویلیں ہوسکتی ہیں، اس لئے ان سب کو (علی الاطلاق اور علی العموم) صریح کافر نہ کہا جاوے گا، مگر اس میں شک نہیں کہ خوف اندیشۂ کفر کا ہے (امداد المفتین، ص ۱۶۷، کتاب السنۃ والبدعۃ، مطبوعہ: دارالاشاعت کراچی، مئی 2001ء)

معلوم ہوا کہ بعض افعال واقوال اگرچہ باعثِ کفر وشرک ہوتے ہیں، لیکن جب تک کسی مسلمان کے قول وفعل میں تاویل ممکن ہو، اس وقت تک احتیاط مناسب ہے، تاہم ان افعال واقوال کو شرکِ صوری، گناہ و منع قرار دینے میں شک نہیں۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا چوتھا حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے سامنے ندائے غیرُ اللہ اور غیرُ اللہ کے متعلق علمِ غیب، اور حاضر ناظر ہونے کے بارے میں چند فتاویٰ میں کفر و عدمِ کفر کا تعارض پیش کیا گیا، جس کے جواب میں مفتی صاحب موصوف نے تحریر فرمایا کہ:

اصل یہ ہے کہ غیرُ اللہ کو حاضر، ناظر، سمیع وبصیر اور ہر قول وفعل کا جاننے والا، مثل حق تعالیٰ کے سمجھنا باتفاق کفر ہے، لیکن ابنائے زمانہ جو علمِ غیب وغیرہ کے قائل ہیں، ان سب کا ایسا ہی عقیدہ ہونا لازم و متعین نہیں، بلکہ ان کی تصریحات سے اور کہیں اشارات سے اس کے خلاف مستفاد ہوتا ہے، اور معاملہ تکفیرِ مسلم کا نہایت سخت ہے، اس لیے حسبِ ہدایاتِ فقہاء، جس کے کلام میں کچھ بھی تاویل ہو سکے، اس کو کافر نہیں کہا جا سکتا، یہی عقیدہ ہمارے سب اسلاف کا ہے، اور یہی فتویٰ اس وقت دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو مبتدع کہتے ہیں، کافر نہیں کہتے۔

حضرت گنگوہی نے کہیں ان لوگوں پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، کسی عقیدے یا کلمے کو کفر کہنا اور چیز ہے ''صرح به فی البحر الرائق، وغیرہ'' اور متکلم کو کافر کہنا اور

چیز (چنانچہ) حضرت گنگوہی نے ان کلمات وعقائد کو کفریہ فرمایا ہے، کہنے والوں کو علی الاطلاق کافر نہیں کہا (امداد المفتین جامع، جلد ا،ص ۳۹۳، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بعلم الغیب والحاضر والناظر والنور والبشر، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018ء)

مذکورہ فتوے میں بھی لزومِ کفر اور التزامِ کفر کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے کئی شبہات دور ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ بعض کتابوں اور فتاویٰ میں جن الفاظ کو باعثِ کفر بیان کیا جاتا ہے، ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اگر کوئی یہ الفاظ کہے، اور کوئی ایسی تاویل بھی کرے، جس کی وجہ سے کفر کے معنیٰ نہیں بنتے، تب بھی اس کو کافر قرار دیا جائے۔

اس باریک فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں بعض مسلمانوں پر بھی صریح کفر وارتداد کا حکم لگا بیٹھتے ہیں۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا پانچواں حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے ایک فتوے میں ''یارسول اللہ'' کہنے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> اصل یہ ہے کہ ''یارسول اللہ'' کہنا، نہ قطعاً جائز ہے، اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی شخص اس عقیدہ سے ''یارسول اللہ'' کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پر موجود ہیں، یا ضرور میری آواز کو سنیں گے، تو یہ جائز نہیں، بلکہ ایک نوعِ شرک (یعنی شرک دون شرک کی قسم) ہے، اور اگر محض تخیل کے طور پر شاعرانہ وعاشقانہ خطاب کرتا ہے، تو جائز ہے، جیسے اہلِ معانی وبلاغت نے بیان کیا ہے کہ بعض اوقات معدوم کو موجود فرض کر کے، یا غیر حاضر

کو حاضر فرض کر کے خطاب کیا جاتا ہے، اور یہ ایک نوعِ بلاغت ہے، قرآن کریم میں بھی بکثرت موجود ہے، اشعار و نظم میں یہ نوعِ بلاغت، بلا کسی نکیر کے تمام علماء کے نزدیک جائز ہے، بلکہ خود اجلہ علماء کا معمول ہے، اور اس میں درحقیقت کسی عقیدہ وغیرہ کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ محبت کے آثار میں سے ہے، اس لیے بعض لوگ کھنڈروں اور دیواروں کو خطاب کرتے ہیں، کوئی بلبل و قمری کو خطاب کرتا ہے۔ ؎

تو اے کبوتر بام حرم چہ مے دانی ‏ ‏ ‏ زحال ما کہ جدا از حریم دلداریم

باللّٰہ یا ظبیات القاع قلن لنا ‏ ‏ ‏ الیلای منکن ام لیلی من البشر

وغیر ذٰلک.

ہر زبان میں اس کے نظائر بکثرت ہیں، اسی طرح محبانہ شوق میں اگر کوئی بلا عقیدہ حاضر و ناضر کے خطاب کرے، تو مضائقہ نہیں، البتہ یہ صحیح ہے کہ محض ''یارسول اللہ، یارسول اللہ'' کو وظیفہ بنائے اور عبادت سمجھ کر اسی لفظ کو رٹتا رہے، یہ بدعت ہے، اور بے معنیٰ بھی ہے، بخلاف ''یا اللہ'' کے کہ نفسِ ذکر اسمِ ذات عبادت ہے، جس صیغہ اور جس صورت سے بھی ہو (امداد المفتین جامع، جلد ا، ص۳۶۸، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد ، فصل فیما یتعلق بالاستمداد والنداء بغیر اللہ تعالیٰ، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018ء)

مذکورہ فتوے سے بھی معلوم ہوا کہ نداءِ غیر اللہ، ہر حال میں کفر و شرکِ اکبر نہیں، بلکہ اس میں شخصیات و حالات کے اعتبار سے تقسیم و تفصیل ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا چھٹا حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی ''امداد المفتین'' میں ایک سوال اور جواب درجِ ذیل طریقہ پر ہے:

سوال: ’’یاشیخ عبدالقادر جیلانی شیئا للہ‘‘ کی تسبیح بطورِ وظیفہ کے پڑھنے والے پر کیا حکم ہے؟

جواب: علامہ شامی نے عدمِ تکفیر کو ترجیح دی ہے، اور توبہ استغفار اور تجدیدِ نکاح کا حکم فرمایا ہے، جب کہ قائل کو یہ خبر نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، اور اگر وہ سمجھدار ہے، اور معنیٰ صحیح مراد لیتا ہے، تو اس صورت میں ’’لا بأس به‘‘ فرمایا ہے (جو کہ اس کے مکروہ تنزیہی ہونے کا اشارہ کرتا ہے)

وينبغي أن يرجح عدم التكفير فإنه يمكن أن يقول أردت أطلب شيئا إكراما لله تعالى .اهـ .شرح الوهبانية .قلت: فينبغي أو يجب التباعد عن هذه العبارة، وقد مر أن ما فيه خلاف يؤمر بالتوبة والاستغفار وتجديد النكاح، لكن هذا إن كان لا يدرى ما يقول، أما إن قصد المعنى الصحيح فالظاهر أنه لا بأس به

(ردالمحتار، ج۴ص ۲۵۹، کتاب الجهاد، باب المرتد، مطلب المعصية تبقى بعد الردة)

(امدادالمفتین جامع، جلد۱، ص۳۷۶،۳۷۷، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بالاستمداد والنداء بغیر اللہ تعالیٰ، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018ء)

اس سے مذکورہ وظیفہ کا حکم مختلف لوگوں کے اعتبار سے مختلف ہونا معلوم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب صریح کفر لازم آنے میں شک یا اہلِ علم کا اختلاف ہو، اس وقت درمیانی صورت یہ ہے کہ اس کے ساتھ صریح مرتد والا برتاؤ کرنے کے بجائے توبہ واستغفار اور تجدیدِ نکاح کا حکم دیا جائے، تاکہ دوسرے اقوال کی بھی رعایت ہوجائے، اور احتمالِ کفر سے بھی برائت ہوجائے۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا ساتواں حوالہ

اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

ایسا شخص اگر شیخ عبدالقادر کو حاضر و ناظر اور قادرِ مطلق جان کر یہ وظیفہ پڑھتا ہے، تو کافر ہے، مگر عموماً اس وظیفے کے پڑھنے والوں کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا، اس لیے کفر کا حکم لگانا جائز نہیں، اور یہ عقیدہ نہیں، تب بھی بدعت ہے، جس سے بچنا ضروری ہے، تقویۃ الایمان میں اس کی تفصیل موجود ہے (امداد المفتین جامع، جلد ۱، ص ۳۷۲، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بالاستمداد والنداء بغیر اللہ تعالیٰ، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018ء)

مذکورہ فتوے سے معلوم ہوا کہ مذکورہ وظیفہ بعض صورتوں میں کفر اور بعض صورتوں میں بدعت و گناہ ہے، یعنی اس وظیفہ سے بہر حال منع کیا جائے گا، اور عوام کو روکا جائے گا، اگرچہ کفر و شرک بھی لازم نہ آئے، کیونکہ جو چیزیں صریح کفر و شرک نہ ہوں، لیکن موہمِ کفر و شرک ہوں، ان سے بھی اجتناب کا حکم ہوتا ہے، اور ایمان جیسی نعمت و دولت کی حفاظت کے لیے ان سے اجتناب میں ہی بہر حال سلامتی ہوتی ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا آٹھواں حوالہ

ایک سوال کے جواب میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو خداوند تعالیٰ کی طرح ہر جگہ حاضر و ناظر جان کر خطاب کرنا، اور یا محمد، یا علی پکارنا، جائز نہیں، بلکہ ایک قسم کا شرک ہے، خواہ نثر میں ہو یا نظم میں، اور جس کا یہ عقیدہ نہ ہو، محض شاعرانہ تخیل میں ایک غیر حاضر کو حاضر فرض کر کے، جیسے اشعار میں خطاب کیا جاتا ہے، اس میں مضائقہ نہیں، اور نثر میں خصوصاً اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے، کیونکہ نثر میں

فسادِ عقیدہ کا شبہ قوی ہو جاتا ہے، بخلاف نظم کے کہ اس میں اس قسم کے استعارات متعارف ہیں (امداد المفتین جامع، جلد ۱، ص ۳۶۹، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بالاستمداد والنداء بغیر اللہ تعالیٰ، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018ء)

مذکورہ فتوے سے بھی غیر اللہ کو پکارنے کے متعلق عقیدے اور استعمال کے مختلف ہونے کی صورت میں حکم کا مختلف ہونا معلوم ہوا۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا نواں حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، غیرُ اللہ پر لفظِ ''غوث'' کا اطلاق کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

یہ لفظ، غیرُ اللہ پر بولنا اس وقت شرک ہے، جبکہ اس عقیدے سے بولا جاوے کہ وہ شخص ہر وقت ہمارے حالات کو دیکھتا، اور سنتا ہے، اور ہماری مدد کرتا ہے، جس طرح کہ حق تعالیٰ کی شان ہے، اس عقیدے کے ساتھ کسی غیرُ اللہ کو غوث کہنا، بے شک شرک ہے، اور اسی کو ابنِ تیمیہ وغیرہ نے شرک فرمایا ہے۔

لیکن جب یہ عقیدہ نہ ہو، بلکہ ان کی برکاتِ معنویہ کو اپنی امداد سمجھ کر کیا جاوے، یا یہ بھی نیت نہ ہو، بلکہ اس نام سے موسوم ہونا، کسی بزرگ کا معروف ہے، سنی سنائی اس نے بھی یہی لفظ بول دیا، اس میں ہرگز شرک نہیں، اور عوام جو یہ الفاظ بولتے ہیں، عموماً وہ قسمِ دوم ہی میں داخل ہیں، اور بلا تصریح کے فسادِ عقیدہ کی بدگمانی، کسی مسلمان سے کرنا جائز نہیں، لہٰذا اس پر شرک کا حکم کرنا، بلا تصریح فسادِ عقیدہ، جائز نہیں ہے (امداد المفتین جامع، جلد ۱، ص ۳۷۲، ۳۷۳، کتاب الایمان والعقائد، باب العقائد، فصل فیما یتعلق بالاستمداد والنداء بغیر اللہ تعالیٰ، مطبوعہ: ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید: اگست 2018ء)

مذکورہ فتوے سے معلوم ہوا کہ لفظِ ''غوث'' کا اطلاق تمام صورتوں میں یکساں حکم نہیں رکھتا، اور علامہ ابنِ تیمیہ نے جس صورت کو شرک قرار دیا ہے، وہ اسی صورت پر محمول ہے، جس میں اللہ کی صفت کے ساتھ شرک لازم آتا ہو، اور جب دوسری تاویل ہوسکتی ہو اور اس لفظ کے استعمال کنندہ لوگوں کی طرف سے اس طرح کی تاویل ظاہر بھی ہو، تو پھر اس پر صریح کفر و شرک کا حکم لگانا مناسب نہیں، البتہ موہمِ شرک وغیرہ ہونے کی وجہ سے منع کیا جائے، تو اس میں اختلاف نہ ہوگا، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ہمارے علاقے کے عوام تو کیا خواص بھی ''غوث'' کے لفظ کو مخصوص فاسد عقیدہ کا ترجمان نہیں سمجھتے، بلکہ اس کے اصل معنیٰ سے خالی الذہن ہو کر بطور لقبِ محض کے اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں، جن پر کفر و فسق کا حکم لگانا درست نہیں۔

البتہ کسی جگہ معاملہ اس کے برعکس اور مختلف ہو، تو اس کا حکم جدا ہوگا۔

گزشتہ تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو چکا کہ فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق جو کفریہ کلمات شمار ہوتے ہیں، وہ ''لزومِ کفر'' کے الفاظ ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کسی تاویل وغیرہ کے بغیر یہ الفاظ کہے، یعنی التزامِ کفر کرے، تو پھر کفر لازم آتا ہے، ورنہ لازم نہیں آتا، اسی کو ''لزومِ کفر'' اور ''التزامِ کفر'' کا عنوان دیا جاتا ہے، یعنی کسی لفظ سے کفر لازم آجانا اور چیز ہے، اور اس سے کفر کو اپنے اوپر لازم کر لینا اور چیز ہے۔ [1]

---

[1] مطلب ما يشک فی أنه ردة لا يحکم بها (قوله قال فی البحر إلخ) سبب ذلک ما ذکره قبله بقوله وفی جامع الفصولين، روى الطحاوی عن أصحابنا
لا يخرج الرجل من الإيمان إلا جحود ما أدخله فيه ثم ما تيقن أنه ردة يحکم بها وما يشک أنه ردة لا يحکم بها إذ الإسلام الثابت لا يزول بالشک مع أن الإسلام يعلو وينبغی للعالم إذا رفع إليه هذا أن لا يبادر بتکفير أهل الإسلام مع أنه يقضی بصحة إسلام المکره .أقول :قدمت هذا ليصير ميزانا فيما نقلته فی هذا الفصل من المسائل، فإنه قد ذکر فی بعضها إنه کفر مع أنه لا يکفر علی قياس هذه المقدمة فليتأمل اهـ ما فی جامع الفصولين وفی الفتاوى الصغرى :الکفر شیء عظيم فلا أجعل المؤمن کافرا متى وجدت رواية أنه لا يکفر اهـ وفی الخلاصة وغيرها :إذا کان فی المسألة وجوه توجب التکفير ووجه واحد يمنعه فعلی المفتی أن يميل إلی الوجه الذی يمنع التکفير تحسينا للظن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کا حوالہ

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

کتبِ فقہ میں جو ''کلماتِ کفریہ'' کے نام سے بیان کیے جاتے ہیں، ان کا حاصل صرف یہ ہے کہ ان کلمات سے ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار نکلتا ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس شخص کی زبان سے یہ کلمات نکلیں، اس کو بے سوچ سمجھے اور بدون تحقیقِ مراد کے کافر کہہ دیا جائے، جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کی مراد وہی معنیٰ ومفہوم ہیں، جو کافرانہ عقیدہ ہے (یعنی ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کے منافی ہے) اس کی تکفیر جائز نہیں، فقہائے کرام نے اس کی جگہ جگہ صراحت فرمائی ہے (درسِ مسلم، ص ۱۵۴، ۱۵۵، مکتبہ نعمانیہ، کراچی)

مذکورہ فتوے سے بھی گزشتہ بیان شدہ اصول کی تائید ہوئی، اور مزید توضیح آگے آتی ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کا حوالہ

اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ:

فقہ کی کتابوں میں مثلاً فتاویٰ عالمگیری میں اس مسئلہ پر پورا باب قائم کیا گیا ہے، جس میں بہت سارے جملے لکھے گئے ہیں کہ اگر کسی نے یہ جملہ کہہ دیا، تو وہ کافر ہو جائے گا، اور کسی نے یہ جملہ کہہ دیا، تو وہ کافر ہو جائے گا، اور ان میں سے بعض

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

بالمسلم زاد فی البزازیة إلا إذا صرح بإرادة موجب الکفر فلا ینفعه التأویل ح وفی التتارخانیة :لا یکفر بالمحتمل، لأن الکفر نهایة فی العقوبة فیستدعی نهایة فی الجنایة ومع الاحتمال لا نهایة اهـ والذی تحرر أنه لا یفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علی محمل حسن أو کان فی کفره اختلاف ولو روایة ضعیفة فعلی هذا فأکثر ألفاظ التکفیر المذکورة لا یفتی بالتکفیر فیها ولقد ألزمت نفسی أن لا أفتی بشیء منها اهـ کلام البحر باختصار (رد المحتار علی الدر المختار، ج۴، ص ۲۲۴، کتاب الجهاد، باب المرتد)

جملے بظاہر معمولی سے نظر آتے ہیں، لیکن ان پر بھی کفر کا حکم لگا دیا گیا ہے، تو اس بات کا حاصل بھی یہ ہے کہ یہ کلماتِ کفر ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے بولنے والے پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے، اس میں مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس نے یہ بات کن حالات میں اور کس صورت میں، کس ماحول میں اور کس سیاق میں کہی ہے، اور اس کی مراد کیا ہے، ان سب باتوں کو دیکھا جاتا ہے (انعام الباری، ج۱ص۳۲۳، کتاب الایمان، مطبوعہ: مکتبۃ الحراء، کراچی)

مطلب یہ ہے کہ کسی کلام یا کام سے فی نفسہٖ کفر کے لازم آنے اور اس سے اپنے اوپر کفر کو لازم کر لینے میں فرق ہے، دونوں چیزوں کو ایک درجہ دینا غلط فہمی کا باعث ہے، جس کسی کو کفر لازم آنے والے افعال اور کلمات سے آگاہ کرنا ہو، تو اس کو ''لزومِ کفر والے'' افعال واقوال سے مطلع اور آگاہ کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی شخص سے اس طرح کے افعال یا اقوال کا صدور اور ظہور ہو جائے، تو پھر تاویل کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کوئی تاویل تو ایسی نہیں کرتا، جس کی وجہ سے وہ اپنے اوپر کفر لازم آنے کا انکار کر رہا ہو، اور تاویل اس سلسلہ میں موثر بھی ہو، اگر ایسا ہو، تو ''التزامِ کفر'' کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کا دوسرا حوالہ

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے درسِ بخاری میں ایک سوال وجواب درجِ ذیل ہے:

سوال: اگر کسی کا عقیدہ ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علمِ کلی عطاء کیا گیا، تو اس کو مشرک کہا جائے گا یا نہیں؟

جواب: اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا، اس لیے کہ وہ تاویل کرتے ہیں، اور تاویل بھی فی الجملہ یعنی غلط سہی، لیکن وہ حضرات جو کچھ کہتے ہیں، اس کا خلاصہ

یہ ہے کہ اللہ جل جلالہٗ کے علم میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں زمین وآسمان کا فرق ہے، اللہ جل جلالہٗ کا علم ازلی ہے، وہ کسی بھی لحہ اللہ تعالیٰ سے نفی نہیں ہوا، اور باری تعالیٰ کی صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم بغیر کسی واسطہ کے ہے، جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس بات کے قائل ہیں کہ ان کا علم ازلی نہیں ہے، جیسا کہ احمد رضا خان صاحب کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر عمر میں عطاء ہوا ہے، یعنی یہ کہ وہ علم عطاء کردہ ہے، احمد رضا خان صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ جل جلالہٗ کے علم کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو وہ نسبت بھی نہیں ہے، جو ایک قطرے کو سمندر کے ساتھ ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مقصود اشتراک نہیں ہے، اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علمِ کلی عطاء ہونے کا عقیدہ رکھنے والوں کو مشرک کہنا درست نہیں ہے، اور کفر کا فتویٰ لگا کر کافر نہیں کہا جائے گا، لیکن بہر حال یہ عقیدہ غلط اور گمراہی کی بات ہے (انعامُ الباری، ج۱ص۵۷۰، ۵۷۱، کتاب الایمان، مطبوعہ: مکتبۃُ الحراء، کراچی)

اس مسئلے کی کچھ توضیح، پیچھے مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبان کی بعض عبارات کے ذیل میں بھی گزر چکی ہے، جہاں جناب احمد رضا خان بریلوی صاحب کے حوالہ سے بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

شرک واقسامِ شرک پر مولانا اشرف علی تھانوی کا رسالہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے شرک اور اس کی اقسام کے متعلق ایک جامع تفصیلی رسالہ ''نهاية الإدراك في أقسام الإشراك'' کے نام سے تالیف فرمایا ہے، ساتھ ہی اس کا ایک تتمہ بھی تحریر فرمایا ہے، اور اس رسالہ پر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے بعض حواشی تحریر فرمائے ہیں، اس رسالہ کا ایک طویل اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے، جس پر بعض جگہ بندہ

محمد رضوان نے بھی حواشی تحریر کیے ہیں، اس رسالے سے شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام کے ساتھ ساتھ، شرک کی بعض اقسام میں مشائخ دیوبند کی تاویل وتوجیہ پر بھی روشنی پڑتی ہے، جس سے اس سلسلہ میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے موقف سے اختلاف کا بھی علم ہوتا ہے، جو اِس سلسلہ میں تاویل کے قائل نہیں۔

اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ محققینِ مشائخِ دیوبند جو اہلِ قبور کے متعلق مختلف شرک و بدعات کا ارتکاب کرنے والوں کو کفر وشرکِ اکبر کا مرتکب قرار نہیں دیتے، اور اس سلسلہ میں احتیاط وتاویل کے قائل ہیں، ان کا یہ قول سلف کے خلاف نہیں، بلکہ خود علامہ ابنِ تیمیہ وعلامہ ابنِ قیم رحمہما اللہ کی متعدد عبارات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

یہ رسالہ ''امدادالفتاویٰ'' کی چھٹی جلد اور ''امدادالاحکام'' کی پہلی جلد میں شائع ہوا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے اس رسالہ کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، اس رسالہ کا مضمون درجِ ذیل ہے:

وہ شرک جس پر عدمِ نجات وخلودِ نار مرتب ہے، اس کی تعریف یہ ہے، جو حاشیہ خیالی میں ''شرح مقاصد'' سے نقل کی ہے:

أن الكافر إن اظهر الإيمان فهو منافق، وإن طرأ كفره بعد الإيمان ، فهو مرتد، وإن قال بالشريک فی الألوهية فهو المشرک (حاشية خيالی، صفحة ۱۲۴) [1]

پس اب سمجھنا چاہیے کہ مشرکینِ عرب جو اصنام کی عبادت کرتے تھے، اور قبر پرست مسلمان، جو قبروں یا تعزیوں کو سجدہ کرتے ہیں، دونوں میں فرق ہے، مشرکینِ عرب ان کو شریک فی الالوہیت کرتے تھے، اور زبان سے بھی ان کو شریکِ خدائی کہتے تھے ''**دل عليه قوله تعالىٰ** :

---

[1] یعنی کافر اگر ایمان کو ظاہر کرے، تو وہ منافق ہے، اور اگر ایمان کے بعد کفر طاری ہوجائے، تو مرتد ہے، اور اگر شریک فی الالوھیۃ کا قائل ہو، تو وہ مشرک ہے۔ محمد رضوان۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا (سورة الانعام، رقم الآية ۱۳۶)

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ (سورة الانعام، رقم الآية ۱۰۰)

وقال تعالىٰ: وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا (سورة فصلت، رقم الآية ۹)

غير ذٰلک من الآيات.

مذکورہ اوراس جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ، شریک فی الالوہیت کے قائل تھے۔محمد رضوان

اور گو وہ لوگ اس میں تاویلیں کرتے تھے، مگر اسی کے ساتھ کلمۂ توحید سے متوحش بھی ہوتے تھے، اور کہتے تھے کہ:

"أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ "(سورة صٓ، رقم الآية ۵)

اور طواف میں کہتے تھے :

"لَبَّيْکَ لَا شَرِيْکَ لَکَ، إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَکَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَکَ (صحيح مسلم)"

اور قبر پرست یا تعزیہ پرست ایسے نہیں ہیں، نہ وہ کلمۂ توحید کے منکر ہیں، نہ اس سے متوحش ہیں، بلکہ بلا استثناء خدا تعالیٰ کو معبودِ واحد کہتے اور اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، اور ہنود اپنے دیوتاؤں کو شریکِ الوہیت مانتے ہیں، اور کلمۂ توحید سے منکر ومتوحش ہیں، جیسا کہ مشرکینِ عرب کی حالت اوپر معلوم ہوئی۔

پس دونوں میں فرق یہ ہے کہ قبر پرستوں اور تعزیہ پرستوں کا شرک عملی ہے، جب تک کہ وہ اپنے کو مسلم وموحد کہتے رہیں (اور کلمۂ توحید کا اقرار وتصدیق کرتے رہیں) اور ہنود کا شرک اعتقادی وعملی دونوں سے مرکب ہے۔ [1]

---

[1] مندرجہ بالا فرق اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے، کیونکہ آج کل بعض کم علم حضرات، ایسے افعال یا اقوال کی وجہ سے تکفیر میں جلد بازی کرتے ہیں کہ جن میں ایسی تاویل ہوسکتی ہے، جو اصل مشرک وکافر اور اس کے درمیان فرق کرتی ہے، اور وہ فرق شرک وکفرِ اکبر ہونے نہ ہونے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔محمد رضوان

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ سجدہ غیرُ اللہ کو کرنا مطلقاً شرک نہیں، بلکہ بعض صورتوں میں امارتِ شرک ہے، باقی حقیقتِ شرک وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوئی۔

أی القول بالشریک فی الالوھیة قلبا ولسانا

قال فی شرح العقائد:

ولا نزاع فی ان من المعاصی ماجعله الشارع امارة للتکذیب، وعلم کونہ کذلک بالادلة الشرعیة، کسجود الصنم ، والقاء المصحف فی القاذورات ، والتلفظ بالفاظ الکفر (شرح العقائد، ص۱۴۸)

باقی قبروں اور تعزیوں کو سجدہ کرنا، یہ علامتِ تکذیبِ شرع نہیں، کیونکہ کفار میں ان کی عبادت رائج نہیں، ہاں جس چیز کی عبادت کفار میں رائج ہے، اس کو سجدہ کرنا قضاءً حکمِ کفر کو مستلزم ہوگا۔

کما صرح بہ فی حاشیة شرح العقائد ، صفحة مذکور.

اور دیانتاً اگر تصدیق وایمانِ قلبی میں خلل نہ ہوا، عنداللہ مومن ہوگا۔ [1]

علامہ ابنِ تیمیہ کی کتاب صراطِ مستقیم (ص:۱۵۰ سے ص:۱۶۵) ملاحظہ ہو، علامہ نے اس میں تعظیمِ قبور اور سجدۂ قبور کے متعلق سخت تہدیدی کلام فرمایا ہے، مگر ان لوگوں کو کافر ومشرک نہیں کہا جو اس میں مبتلا ہیں۔ ہاں مشابہِ مشرکین ضرور کہا۔ [2]

---

[1] غیراللہ کو سجدہ کرنے کا حکم اگلی فصل میں کچھ وضاحت کے ساتھ آرہا ہے، جس میں اسی موقف کو راجح قرار دیا گیا ہے کہ غیراللہ کو سجدہ کرنا، اگر بقصدِ عبادت یا بصورتِ عبادت ہو، تو شرکِ اکبر، ورنہ صورتاً شرک اور گناہِ کبیرہ ہے۔
اور قبر کو سجدہ کرنا، اگر بقصدِ عبادت نہ ہو، تو صورتِ عبادت نہ ہونے کی وجہ سے شرکِ اکبر نہیں، بلکہ کبیرہ گناہ ہے۔ محمد رضوان۔

[2] بلکہ علامہ ابنِ تیمیہ نے "اقتضاء الصراط المستقیم" میں فرمایا کہ مبتدع شرک کی طرف تاویل کرتا ہے، اور کوئی مبتدع ایسا نہیں پایا جاتا، جس میں شرک کی کوئی نوع نہ پائی جائے۔ محمد رضوان

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نیز حدیث میں ہے "لعن اللّٰہ اقواما اتخذوا قبور أنبیائھم مساجد واللّٰھم لا تجعل قبری وثنا یعبد" الخ، مگر اس سے فقہاء نے سجدۂ قبر کی حرمت ہی مستنبط کی ہے، کسی نے ساجدِ قبر کو محض سجدہ کی وجہ سے کافر نہیں کہا۔ [1]

اللھم الا ان یقربانه علیٰ طریق العبادة وان صاحب القبر معبود ای شریک فی الالوھیة فافھم واللّٰہ تعالیٰ اعلم.

وفی الفتاویٰ الکاملیة:

اقول ولا یخفیٰ ما حصل لکثیر من العوام، بسبب تعظیم قبور الاولیاء وارخاء الستور علیھا من الضرر العظیم فی اعتقادھم، فانھم یعتقدون فی الاولیاء التاثیر مع الله تعالیٰ ،حتیٰ انھم ترکوا النذر لله تعالیٰ وھو مشروع، و اکثروا من النذر للاولیاء والتقرب الیھم ،وترکوا الحلف بالله تعالیٰ ،حتیٰ صار عندھم کالعدم ،ولا یتجاسرون علیٰ الحلف بھم لاعتقادھم ،ان من حلف بولی حانثا یضره فی بدنه و ماله واولاده ،و ھذا من الشرک والعیاذ بالله تعالیٰ .

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وقد قال تعالی لنبیه صلی الله علیه وسلم:(إنا أرسلناک شاهدا ومبشرا ونذیرا – وداعیا إلی الله بإذنه وسراجا منیرا)فأخبره أنه أرسله داعیا إلیه بإذنه فمن دعا إلی غیر الله فقد أشرک، ومن دعا إلیه بغیر إذنه فقد ابتدع، والشرک بدعة، والمبتدع یؤول إلی الشرک، ولم یوجد مبتدع إلا وفیه نوع من الشرک، کما قال تعالی: (اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله والمسیح ابن مریم وما أمروا إلا لیعبدوا إلها واحدا لا إله إلا هو سبحانه عما یشرکون)وکان من إشراکهم بهم: أنهم أحلوا لهم الحرام فأطاعوهم وحرموا علیهم الحلال فأطاعوهم(اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفة أصحاب الجحیم لابنِ تیمیة، ج۲ ص۳۷۵، ۳۷۶، فصل فی عدم اختصاص بقعة بقصد العبادة إلا المساجد)

[1] تاہم اس سے اتفاق مشکل ہے، کیونکہ بعض مشائخ واہلِ علم نے غیر اللہ کو سجدہ کرنے پر علی الاطلاق کفر کا حکم لگایا ہے، اگرچہ دوسرے حضرات کے نزدیک اس کا اطلاق راجح نہ ہو، وہ الگ بات ہے، جیسا کہ اگلی فصل میں آتا ہے۔ محمد رضوان۔

الا تـرى مـارواه صـاحـب الـحـجة البـالغة من قوله صلى الله عليه وسلـم مـن حلف بغير الله فقد اشرک ،قال و حمله بعضهم علىٰ الزجرو التغليظ ،وليس كذالک ،فانه علىٰ ظاهره ،حيث يحلفون مـعتـقدين فيهم انهم يضرونهم فى ابدانهم واموالهم ،حتىٰ سمعت مـن بـعـض قـضـاة الروم الموصوفين بالعلم والصلاح ،انه قال لو مـكنت من هدم قبب الاولياء لهد متها باجمعها، كما فعل عمر بن الـخـطاب رضى الله تعالىٰ عنه بالشجرة التى وقعت تحتها البيعة، لـمـا بـلـغـه ان قـوما ياتونها و يصلون عندها ،فانه قلعها باصولها ، مـخـافة ضـرر الـعـامة بها ،وفى الصحيح عن ابن عمر ان الشجرة اخـفيت ،قالوا والحكمة ان لا يحصل الافتنان بها، لما وقع تحتها مـن الـخيـر ،فـلـو بـقيـت لـمـا امـن تعظيم الجهال لها ،حتىٰ ربما اعتـقـدوا ان لها قوة نفع او ضرّ،كما نشاهد الآن فيما هو دونها و لـذلک اشـار ابـن عـمـر بـقوله كان خفائها رحمة من الله تعالىٰ، وروى ابن سعد بأسناد صحيح عن نافع ان عمر بلغه ان قوما يأتون الشجرة و يصلون عندها، فتوعدهم ،ثم امر بقطعها، فقطعت اهـ . من الجمل علىٰ الجلالين.

ومـما وقع من بعض العامة من اعتقاد التاثير فى الاولياء ،كتب فى حق عموم اهل السنة والجماعة الفرقة الوهابية، رسائل عديدة فى اشـراكهـم ،حتـى انهم يعبرون عنا معاشر اهل السنة بالمشركين، واذا تمكنوا بواحد منا، قالوا اقتلوا المشرک ،والمصيبة العظيمة فـى فـقهـاء الـقـرى ،فـانهـم يـامـرون العوام عند توجـه الحلف

علیهم،بالحلف بالولی ، و یقولون ان فیه اظهار الحق ،فانظر کیف یتوسلون الیٰ اظهار الحق الدنیوی بضیاع الدین من اصله ولا حول ولا قوة الا بالله تعالیٰ اهـ . (ص : ٢٦٤ و ص : ٢٦٥) [1]

قلت دلت العبارات المخطوط علیها علی ان تعظیم غیر الله تعالیٰ بالنذر له والحلف والسجدة بین یدیه ان کان مقرونا باعتقاد تاثیره مع اللّٰه تعالیٰ فهو من الشرک و صاحبه مشرک عملا و اعتقادا .

قال العلامة العارف ابن القیم فی شرح منازل السائرین .

والعبادة تجمع اصلین غایة الحب بغایة الذل الخضوع اهـ .

وقال محشیة العبادة تتضمن غایة الحب والخضوع کما قال ولکن لیس هذا کل معناها فان العاشق قد یجمع هذین المعنیین ولا یکون عابدا لمعشوقه وانما العبادة عن الاعتقاد والشعور بان للمعبود سلطة غیبیة فوق الاسباب یقدرها علیٰ النفع والضرر فکل دعاء او ثناء او تعظیم یصاحبه هذا الاعتقاد والشعور فهو عبادةاهـ. ص : ۴۰ ج : ١ .

ان عبارات کا مقتضاء یہ ہے کہ قبر پرستوں اور تعزیہ پرستوں میں جو لوگ اہلِ قبور یا تعزیہ کی نسبت تاثیرِ غیبی کے معتقد ہیں، وہ مشرک ہیں اور جو محض ظاہری تعظیم کے

---

[1] (الفتاویٰ الکاملیة، للشیخ محمد کامل الطرابلسی الحنفی "المتوفیٰ: 1315هـ، صفحة٢٦٤،٢٦٥، کتاب الحظر والاباحة ، مطبوعة: المکتبة الحقانیة، بشاور)

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ اولیاء اللہ کو اللہ کے ساتھ موثر سمجھ کر نذر لغیر اللہ وغیرہ کا ارتکاب کیا کرتے تھے، اور اہلِ وھابیہ نے اس کی بناء پر دوسرے اہل السنۃ کو بھی یہی حیثیت دی، حالانکہ دوسرے اہل السنۃ نہ اس عمل کا ارتکاب کرتے اور نہ اس کو جائز سمجھتے، اور تاویلاً مشرک قرار نہ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس کو جائز بھی سمجھتے ہوں، دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ محمد رضوان۔

طور پر ان کو سجدہ وغیرہ کرتے ہیں اور ان کے (معبود ہونے کے) معتقد نہیں، وہ شرکِ عملی کی وجہ سے فاسق ہیں، کافر نہیں۔اور حضرت شیخ نے اعتقادِ تاثیر وعدمِ اعتقادِ تاثیر کے معیار کا فرق یہ بیان فرمایا ہے کہ بعض کا تو یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مخلوق کو جو اس کا مقرب ہے کچھ قدرتِ مستقلہ نفع وضرر کی اس طرح سے عطا فرمادی ہے کہ اس کا اپنے معتقد ومخالف کو نفع یا ضرر پہنچانا مشیت جزئیہ حق پر موقوف نہیں، گو اگر روکنا چاہے تو پھر قدرت حق ہی غالب ہے، جیسے سلاطین اپنے نائبین حکام کو خاص اختیارات اس طرح دے دیتے ہیں کہ ان کا اجرا اس وقت سلطانِ اعظم کی منظوری پر موقوف نہیں ہوتا، گو روکنا چاہے تو سلطان ہی کا حکم غالب رہے گا۔سو یہ عقیدہ تو اعتقادتاثیر ہے اور (مشرکینِ عرب کا اپنے آلہہ باطلہ کے ساتھ یہی اعتقاد تھا) اور بعض کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ایسی قدرت مستقلہ تو کسی مخلوق میں نہیں، مگر بعض مخلوق کو قرب وقبول کا ایسا درجہ عطا ہوتا ہے کہ یہ اپنے متوسلین کے لیے سفارش کرتے ہیں، پھر اس سفارش کے بعد بھی ان کو نفع و ضرر کا اختیار نہیں دیا جاتا، بلکہ حق تعالیٰ ہی نفع وضرر پہنچاتے ہیں، لیکن اس سفارش کے قبول میں تخلف کبھی نہیں ہوتا، اور اس سفارش کی تحصیل کے لیے اس کے ساتھ بلاواسطہ یا بواسطہ معاملہ مشابہ عبادت کرتے ہیں، یہ عقیدہ اعتقاد تاثیر نہیں ہے۔[1]

لیکن بلا دلیلِ شرعی بلکہ خلاف دلیل شرعی ایسا عقیدہ رکھنا معصیت اعتقادیہ اور مشابہ عبادت معاملہ کرنا معصیت عملیہ ہے، اور اسی مشابہت کے سبب اطلاقات شرعیہ میں اس کو مشرک کہہ دیا جاتا ہے۔

قال الشیخ ھذا ما سنح لی واللّٰہ اعلم. اشرف علی.

---

[1] یہی تفصیل مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی طرف سے پہلے بھی ان کے دیگر حوالوں میں گزر چکی ہے۔محمد رضوان۔

اقول ومن ھھنا لم یکفر مشائخنا واکابرنا عابدی القبور والساجدین لھا وامثالھم لحملھم حالتھم علی الصورۃ الثانیۃ دون الاولیٰ، وقرینتہ دعویٰ ھؤلاء الاسلام والتوحید والتبری من الشرک بخلاف مشرکی العرب والھند ، فانھم یتوحشون من التوحید ومن نفی القدرۃ المستقلۃ عن الھتھم وقالوا أجعل الالھۃ الھا واحدا. [1]

واللہ اعلم" 13 /صفر/1348ھ

(امداد الفتاویٰ مبوب، ج۶ ص۸۳تا۸۶، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: جولائی 2010ء)

(تتمۃ رسالہ مذکورہ)

تقریرِ مذکور فارق بین الشرکین جو کہ ماخوذ ہے کلیاتِ شرعیہ سے، اپنے دونوں دعوؤں کے اعتبار سے (ایک یہ کہ مشرکین اس تصرف غیر مقید بالاذن کے قائل تھے، دوسرے یہ کہ تصرف مقید بالاذن کا قائل ہونا شرکِ اکبر نہیں) زیادت اقناع میں محتاج تھی ادلۂ جزئیہ کی، جن سے ایک مدت تک باوجود فکر و بحث کے ذہن خالی رہا۔

---

[1] یعنی مذکورہ تفصیل کی بناء پر ہمارے مشائخ واکابر نے قبور کی عبادت (مثلاً ان کے لیے نذرونیاز وغیرہ دینے) اور قبور کو سجدہ کرنے والے اور ان کے مثل دوسرے افعال اختیار کرنے والوں کی تکفیر نہیں کی، کیونکہ ان کی حالت کو دوسری صورت (یعنی مشابہ عبادت ومعصیتِ اعتقادیہ وعملیہ) پر محمول کیا ہے، پہلی صورت (یعنی اعتقادِ تاثیر وشرکِ اکبر) پر محمول نہیں کیا، جس کا قرینہ یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام اور توحید کا دعویٰ اور شرک سے برائت ظاہر کرتے ہیں، بخلافِ مشرکینِ عرب ومشرکینِ ہند کے کہ وہ اسلام وتوحید کا دعویٰ نہیں کرتے، اور توحید اور ساتھ ہی اپنے معبودانِ باطلہ سے قدرتِ مستقلہ کی نفی سے بھی متوحش ہیں، اور الٰہِ واحد کے عقیدہ پر تعجب کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ انتہیٰ۔

بندہ محمد رضوان عرض کرتا ہے کہ مذکورہ تاویل جس طرح مسلمانوں کے مذکورہ بالا فرقے کے عوام کے لیے موثر ہے، اسی طرح قضاءً ان کے اہلِ علم کے لیے بھی موثر ہے، اور باطنی فیصلہ آخرت میں ہوگا۔

لہٰذا بعض اہلِ علم کا مذکورہ فرقے کے عوام وخواص یا اصحابِ علم وغیر اصحابِ علم کے اعتبار سے فرق کر کے تکفیر میں فرق کے حکم سے ہمیں اتفاق نہیں ہوسکا۔ محمد رضوان۔

الحمدللہ پرسوں اور کل میں علی التعاقب تین دلیلیں ذہن اور نظر میں گزریں، جن کا مجموعہ دونوں دعووں میں تردد کے لیے بالکل نافی ہے، **دلیل اول عقلی بر اصول میزانیین** جو اپنی جزئیت کے سبب کلیات سے زیادہ کافی ہے، وہ یہ ہے کہ مسئلہ توحیدِ الٰہ واجب عقلی ہے، خواہ بدیہی ہو یا نظری، یہ دوسری بحث ہے اور کسی حکم کا وجوبِ عقلی، مستلزم ہوتا ہے، اس کی نقیض کے امتناعِ عقلی کو، پس نقیض توحید کا حکم ممتنع ہوگا اور اس نقیض کی دو قسمیں ہیں، ایک نفی الٰہ کہ کفر ہے، دوسرے تشریکِ الٰہ آخر معہٗ کہ شرک ہے، اور مقسم کا امتناع مستلزم ہوتا ہے اس کے سب اقسام کے امتناع کو۔

پس شرک کے لیے لازم ہوا کہ وہ کسی امرِ ممتنع کا اعتقاد ہوگا، اور اس امتناع و استحالہ کی طرف نصوص بھی مشیر ہیں کہ **کقوله تعالیٰ:**

(قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهٗ آلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا)

وقوله تعالیٰ: (لَوْ كَانَ فِيْهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا)

وقوله تعالیٰ: (مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ إِلٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ)

وقوله تعالیٰ: (لَوْ أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا لَاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ سُبْحَانَهٗ) ونحوها من الآيات علىٰ مافسرت فى بيان القرآن.

اور تصرف مقید بالاذن عقلاً ممتنع نہیں، پس وہ شرک نہ ہوگا، گو کسی تصرف منفی بالنص کا اعتقاد بوجہ مخالف نص کے معصیت یا کفر یا بدعت ہو، **على اختلاف مراتب النص و مراتب المخالفة۔**

مگر شرک کسی حال میں نہ ہوگا، اور جاہلانِ عرب کا مشرک ہونا نص سے ثابت ہے

، پس لامحالہ وہ تصرف غیر مقید بالاذن کے قائل تھے، اس سے بحمد اللہ تعالیٰ دونوں دعوے ثابت ہو گئے۔

دلیلِ ثانی نقلی من الاقوال المنقولة عن العلماء الربانيين جو بوجہ صراحت موافقت اکابر کے دلیلِ عقلی سے زیادہ شافی ہے۔

وهی هذه قال العلامة القاضی محمد اعلیٰ التهانوی رحمه الله فی كتابه كشاف اصطلاحات الفنون المولف سنة الف و مأة و ثمانية و خمسين من الهجرة فی معنی المشرک بالكسر انباز شدن و اعتقاد انباز بخدائے بے انباز كذا فی المنتخب .

قال العلماء: الشرک علی أربعة أنحاء .الشرک فی الألوهية، والشرک فی وجوب الوجود، والشرک فی التدبير، والشرک فی العبادة .وليس أحد أثبت لله تعالی شريكا يساويه فی الألوهية والوجوب والقدرة والحكمة إلا الثنوية، فإنهم يثبتون إلهين أحدهما حكيم يفعل الخير والثانی سفيه يفعل الشر، ويسمون الأول باسم يزدان والثانی باسم أهرمن وهو الشيطان بزعمهم . وأما الشريک فی العبادة والتدبير ففی الذاهبين إليه كثرة .فمنهم عبدة الكواكب وهم فريقان، منهم من يقول إنه سبحانه خلق هذه الكواكب وفوض تدبير العالم السفلی إليها، فهذه الكواكب هی المدبرات لهذا العالم، قالوا فيجب علينا أن نعبد هذه الكواكب تعبدا لله ونطيعه، وهؤلاء هم الفلاسفة .ومنهم قوم غلاة ينكرون الصانع ويقولون هذه الأفلاک والكواكب أجسام واجبة الوجود لذواتها ويمتنع عليها العدم فهی المدبرة لأحوال العالم السفلی

وهؤلاء هم الدهرية الخالصة .وممن يعبد غير الله النصارى الذين يعبدون المسيح ومنهم أيضا عبدة الأوثان.

ولا بـد مـن بيـان سبـب عبـادة الأوثان، إذ عبادة الأحجار من جم غـفيـر عقلاء ظاهر البطلان، وقد ذكروا لها وجوها .الوجه الأول أن الـنـاس لـمـا رأوا تغيرات هذا العالم منوطة ومربوطة بتغييرات أحـوال الـكـواكـب فإن بحسب قرب الشمس وبعدها عن سمت الـرأس تـحـدث الـفـصـول الأربـعة التى بسببهـا تحدث الأحوال الـمـختـلـفة فـى هذا العالم .ثـم إن الـنـاس رصـدوا أحـوال سائر الـكـواكـب فـاعـتـقـدوا انبسـاط السـعادات والنحوسات بكيفية وقوعها فى طوالع الناس على أحوال مختلفة .فلما اعتقدوا ذلك غـلبـت عـلى ظنونهم أن مبدأ الحوادث هو الاتصالات الكوكبية، فبالغوا فى تعظيمها.

فمنهم من اعتقدها واجبة الوجود لذواتها وهى خلقت هذا العالم . ومـنهم من اعتقد حدوثها وكونها مخلوقة للإله الأكبر إلا أنها هى الـمـدبرة لأحوال هذا العالم؛ وهؤلاء هم الذى أثبتوا الوسائط بين الإلــه الأكبـر وبيـن أحـوال هذا العالم .ثـم إنهـم لما رأوا أن هذه الـكـواكـب قـد تغيب عن الأبصار فى أكثر الأوقات اتخذوا لكل كوكب صنما من الجوهر المنسوب إليه كاتخاذهم صنم الشمس من الذهب والياقوت والألماس، ثم اشتغلوا بعبادة تلك الأصنام. وغرضهم منها عبادة تلك الكواكب والتقرب إليها .وأما الأنبياء فلهم مقامان: أحدهما إقامة الدليل على أن هذه الكواكب لا تأثير

لهـا البتة فـى أحـوال هـذا الـعالم لما قال الله تعالى: ألا لـه الخلق والأمر بعد أن بين أنها مسخرات.

وثـانيهـمـا أن بتـقدير تأثيرها دلائل الحدوث حاصلة فيها فوجب كونها مخلوقة .والاشتغال بعبادة الخالق أولى من الاشتغال بعبادة المخلوق .

وفي الكشاف في تفسير قوله تعالى:

فـلا تـجـعـلـوا لـلـه أنـدادا وأنتم تعلمون .الند المماثل فى الذات والمخالف فى الصفات .فـإن قلت كانوا يسمون أصنامهم باسمه ويعظمونها بما يعظم به من القرب، وما كانوا يزعمون أنها تخالف الـلـه وتـناديه؟ قلت: لـمـا تـقـربـوا إليها وعظموها وسموها آلهة اشتبهـت حـالهم حال من يعتقد أنها آلهة مثله قادرة على مخالفته ومضادته، فقيل لهم ذلک على سبيل التحكم.

الـوجـه الثـانـى مـا ذكـره أبـو معشر وهو أن كثيرا من أهل الصين والهـنـد كـانـوا يثبتـون الإله والملائكة إلا أنهم يعتقدون أنه تعالى جسـم ذو صـورة حسـنة وكـذا الـمـلائـكة، لـكنهم احتجبوا عنا بـالسـمـاوات فـاتـخذوا صورا وتماثيل، فيتخذون صورة فى غاية الحسن ويقولون إنها هيكل الإله وصورة أخرى دونها فى الحسن ويـجـعـلـونهـا صورة الملائكة، ثم يواظبون على عبادتها قاصدين بتلک العبادة الزلفى من الله وملائكته.

فـالسبب على عبادة الأوثان على هذا اعتقاد أن الله سبحانه جسم وفى مكان .الـوجـه الثـالث أن القوم يعتقدون أن الله فوض تدبير

كـل من الأقاليم إلى ملك معين وفوض تدبير كل قسم من أقسام العـالـم إلـى روح سـمـاوى بـعيـنه، فيقولون مدبر البحار ملك، ومـدبـر الـجبـال مـلك آخـر وهـكـذا، فـاتخذوا لكل واحد من الـملائكة المدبرة صنما مخصوصا، ويطلبون من كل صنم ما يليق بذلك الروح الكلى (كشاف اصطلاحات الفنون، ج ا ص ۱۰۲۰ الیٰ ۱۰۲۲، حرف الشین) [1]

قـلـت: وذكـر مثل ذلك الـمفسر العلامة نظام الدين نيسابورى القمى فى تفسيره "غرائب القرآن" فقال:

واعلم أنه ليس فى العالم أحد يثبت لله شريكا يساويه فى الوجوب والعـلـم والـقـدرة والحكمة، ولكن الثنوية يثبتون إلهين: حكيم يـفـعل الخير، وسفيه يفعل الشر .أمـا اتـخاذ معبود سوى الله ففى الذاهبين إليه كثرة: الفريق الأول: عبـدة الكواكب وهم الصابئة فإنهم يقولون: إن الـله تعالى خلق هذه الكواكب وهى المدبرات فـى هـذا الـعـلـم، فيـجـب علينا أن نعبد الله والكواكب تعبد الله. والـفـريق الثانى: عبـدة المسيح عليه السلام .والـفـريق الثالث: عبدة الأوثان.

فنقول: لا ديـن أقـدم من دين عبدة الأوثان لأن أقدم الأنبياء الذين نقل إلينا تاريخهم هو نوح عليه السلام، وهو إنما جاء بالرد عليهم وقـالوا لا تذرن آلهتكم ولا تذرن ودا ولا سواعا ولا يغوث ويعوق ونسرا .ودينهم باق إلى الآن .والدين الذى هذا شأنه يستحيل أن

---

[1] قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ کی مذکورہ تفصیلی عبارت سے معلوم ہوا کہ مشرکینِ حقیقی کا عقیدہ شرک کے معاملہ میں اس مسلم موحد سے مختلف ہوتا ہے، جو صورتاً شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

يعرف فساده بالضرورة، ولكن العلم بأن هذا الحجر المنحوت فى هذه الساعة ليس هو الذى خلقنا وخلق السماء والأرض علم ضرورى، فيمتنع إطباق الجمع العظيم عليه، فوجب أن يكون لهم غرض آخر سوى ذلك .والعلماء ذكروا فيه وجوها: أحدها: ما ذكره أبو معشر جعفر بن محمد المنجم البلخى أن كثيرا من أهل الصين والهند كانوا يقولون بالله وملائكته، ويعتقدون أنه جسم ذو صورة كأحسن ما يكون من الصور وكذا الملائكة، وأنهم كلهم قد احتجبوا عنا بالسماء، وأن الواجب عليهم أن يصوغوا تماثيل أنيقة المنظر على الهيئة التى كانوا يعتقدونها من صور الإله والملائكة فيعكفون على عبادتها قاصدين به طلب الزلفى إلى الله تعالى وملائكته، فعلى هذا السبب فى عبادة الأوثان هو اعتقاد الشبه.

وثانيها: ما ذكره أكثر العلماء، وهو أن الناس لما رأوا تغيرات أحوال هذا العالم مربوطة بتغيرات أحوال الكواكب، واعتقدوا ارتباط السعادة والنحوسة فى الدنيا بكيفية وقوعها فى طوالع الناس، بالغوا فى تعظيمها .فمنهم من اعتقد أنها واجبة الوجود لذواتها وهى التى خلقت هذه العوالم، ومنهم من اعتقد أنها مخلوقة لله الأكبر لكنها خالقة لهذا العالم، وأنها الوسائط بين الله والبشر، فلا جرم اشتغلوا بعبادتها والخضوع لها .ثم لما رأوا الكواكب مستترة فى أكثر الأوقات عن الأبصار، اتخذوا لها أصناما وأقبلوا على عبادتها قاصدين بتلك العبادة تلك الأجرام العالية، ومتقربين إلى أشباحها الغائبة .ولما طالت المدة تركوا

ذکر الکواکب وتجردوا لعبادة تلک التماثیل، فهؤلاء بالحقیقة عبدة الکواکب .

وثالثها: أن أصحاب الأحکام کانوا یرتقبون أوقاتا فی السنین المتطاولة نحو الألف والألفین، ویزعمون أن من اتخذ طلسما فی ذلک الوقت علی وجه خاص فإنه ینتفع به فی أحوال مخصوصة نحو السعادة والخصب ودفع الآفات، وکانوا إذا اتخذوا ذلک الطلسم عظموه لاعتقادهم أنهم ینتفعون به، فلما بالغوا فی ذلک التعظیم صار ذلک کالعبادة، ثم نسوا مبدأ الأمر بتطاول المدة واشتغلوا بعبادتها .

ورابعها: أنه متی مات منهم رجل کبیر یعتقدون فیه أنه مستجاب الدعوة ومقبول الشفاعة عند الله تعالی، اتخذوا صنما علی صورته وعبدوها علی اعتقاد أن ذلک الإنسان یکون شفیعا لهم یوم القیامة عند الله تعالی ویقولون هؤلاء شفعاؤنا عند الله .

وخامسها: لعلهم اتخذوها قبلة لصلاتهم وطاعاتهم ویسجدون إلیها لا لها کما أنا نسجد إلی القبلة لا للقبلة، ولما استمرت هذه الحالة ظن جهال القوم أنه یجب عبادتها .

وسادسها: لعلهم کانوا من المجسمة فاعتقدوا جواز حلول الرب فیها فعبدوها علی هذا التأویل (غرائب القرآن ورغائب الفرقان، ج ا ص۱۸۸، ۱۸۹، سورة البقرة) لے

لے قلت فتلخص لنا من هذا التفصیل ان اسباب الشرک معتددة:
الاول اعتقاد کون الشیء شریکا لله تعالیٰ فی الالوهیة والوجوب ولا قائل به سوی الوثنیة.
والثانی اعتقاد کون الشیء مدبرا فی العالم، واسطة بینه و بین الله تعالیٰ ،مؤثر فی العالم بالذات ای
﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

وقال (تلميذ ابن تيمية رحمه الله تعالىٰ)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ بارادته من غير احتياج الى ارادة الله ذلك ،تفويض الله ذلك اليه كما هو اعتقاد عبدة الكواكب وبعض من عبدة الاوثان ،اما اعتقاد كونه مدبرا ومؤثرا محتاجا فى تدبيره وتاثيره الىٰ مشية الله وارادته ،فليس ذلك بشرك، بقولهٖ تعالىٰ: "والمدبرات أمرا" وكذا اعتقاد كونه واسطة بينه وبين الله تعالىٰ كذلك ،ليس بشرك لكون الملائكة والرسل وسائط بين العباد والخالق فى المعرفة والاحكام ،وكون بعض الملائكة و سائط فى الامور التكوينة ، كما لا يخفىٰ على من طالع النصوص والاحاديث.

والثالث: السجود لشيء مع تسميتهٖ الهاً ،من غير اعتقاد كونه مؤثرا ومدبراً بالذات ،كما هو شان بعض من عبدة الاوثان.

والرابع اعتقاد كون الله تعالىٰ جسماً فى مكان ،ودخل فيه اعتقاد الولد والصاحبة له ،لكونه من خواص الجسم.

والخامس: اعتقاد كون الشيء سوى الله تعالىٰ نافعاً وضارا بالذات اى من غير احتياجه الىٰ اذن الله تعالىٰ فى ذلك ،كما هو اعتقاد اصحاب الطلاسم .

والسادس: اعتقاد حلول الرب فى شيء.

والسابع: اعتقاد كون الشيء شفيعاً له عندالله تعالىٰ ، و فيه تفصيل سيأتى.

فالعبادة هى اظهار غاية الذل والخشوع لشيء مع اعتقاد من تلك الاعتقادات فيه ،ومرجعه الى ما ذكرناه قبل ،ان العبادة غاية الحب بغاية الذل والخضوع مع الشعور، بان للمعبود سلطة غيبية فوق الاسباب ،يقدر بها على النفع والضر، وليس السجود لشيء عبادة مطلقاً ،لكون الملائكة سجدوا لآدم ،ولكون اخوة يوسف و ابويه خروا له سجدا. والظاهر الاصح ان هذا السجود كان بوضع الجبهة على الارض ،كما هو المتبادر فيه لغةً ،ولكنه لم يكن مقترناً بالاعتقاد من الاعتقادات المذكورة، بل كان لمحض التحية والاكرام ،وكان ذلك جائزا قبل ،ثم نسخ فى شرعنا.

ولذا قال العلماء أن سجود التحية حرام ،و سجود العبادة كفر ،و بعد ذلك فلنتأمل احوال ساجدى القبور، انهم بأى فريق من المشركين يشتبهون. فالظاهر من احوالهم كونهم مشابهين الذين اذا مات منهم رجل صالح يعتقدون فيه انه مستجاب الدعوة ومقبول الشفاعة عندالله تعالىٰ، اتخذوا له الها صنما على صورتهٖ ،وعبدوها على اعتقاد ،ان ذلك الانسان يكون شفيعاً لهم يوم القيامة عندالله تعالىٰ، ويقولون هؤلاء شفعاء نا عندالله ،غير ان ساجدى القبور لا يتخذون له صنما على صورته بخلاف المشركين.

نعم كلاهما يشتركان فى السجود لهذا الرجل ظاهراً ،و فى اعتقاد كونه شفيعاً باطناً، وقد مر آنفاً ان السجود لشيء ليس بشرك مطلقاً ،ولو كان من اكبر الكبائر .

ولنبحث الآن عن اعتقاد الشفاعة فى احد ،هل هو الشرك مطلقاً أم فيه تفصيل ،فلا يخفىٰ علىٰ من طالع النصوص ومارس الحديث ان اعتقاد الشفاعة فى احد ليس بشرك مطلقاً، لثبوت الشفاعة للانبياء ولحملة القرآن ،والانبياء يوم القيامة بعد اذنه تعالىٰ لهم فى ذلك ،فلا بد ان المشركين القائلين فى اصنامهم هؤلاء شفعاء نا عندالله ،كان مفهوم الشفاعة عندهم معنى فوق ذلك كما سيأتى من ابن القيم. ظفر احمد۔

العلامة ابن القيم رحمه الله فی "إغاثة اللهفان" : [1]

قال تعالى :(أَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُوْنَ. قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ)

فأخبر أن الشفاعة لمن له ملک السموات والأرض، وهو الله وحده .فهو الذی يشفع بنفسه إلى نفسه ليرحم عبده .فيأذن هو لمن يشاء أن يشفع فيه .فصارت الشفاعة فی الحقيقة إنما هی له، والذی يشفع عنده إنما يشفع بإذنه له وأمره بعد شفاعته سبحانه إلى نفسه وهی إرادته من نفسه أن يرحم عبده .وهذا ضد الشفاعة الشركية التی أثبتها هؤلاء المشركون ومن وافقهم، وهی التی أبطلها اللّٰه سبحانه فی کتابه، بقوله تعالى:

(وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ)وقوله (يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِیَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ) وقال تعالى :(وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ أَنْ يُحْشَرُوْا إِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهٖ وَلِیٌّ وَلَا شَفِيْعٌ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ)وقال:(اَللّٰهُ الَّذِی خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهٖ مِنْ وَلِیٍّ وَلَا شَفِيْعٍ)فأخبر سبحانه أنه ليس للعباد شفيع من دونه، بل إذا

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے اصل رسالہ میں "إغاثة اللهفان" کی پوری عبارت درج نہیں تھی، بلکہ اس کا کچھ ملخص تھا، ہم نے اس موقع پر درمیان درمیان کی چھوٹی ہوئی عبارتوں کو بھی افادۂ مزیدہ کے طور پر نقل کر کے پوری عبارت کو درج کر دیا ہے۔
اور اصل نسخہ سے ملا کر اغلاط کو بھی بحمد اللہ تعالیٰ صحیح کر دیا ہے۔ محمد رضوان۔

أراد اللّٰه سبحانه رحمة عبده أذن هو لمن يشفع فيه .كما قال تعالى:

(مَا مِنْ شَفِيْعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهٖ)وقال :(مَنْ ذَا الَّذِى يَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ)فالشفاعة بإذنه ليست شفاعة من دونه، ولا الشافع شفيع من دونه، بل شفيع بإذنه.

والفرق بين الشفيعين، كالفرق بين الشريک والعبد المأمور.

فالشفاعة التى أبطلها اللّٰه :شفاعة الشريک فإنه لا شريک له، والتى أثبتها :شفاعة العبد المأمور الذى لا يشفع ولا يتقدم بين يدى مالكه حتى يأذن له .ويقول :اشفع فى فلان .ولهذا كان أسعد الناس بشفاعته سيد الشفعاء يوم القيامة أهل التوحيد، الذين جردوا التوحيد وخلصوه من تعلقات الشرک وشوائبه، وهم الذين ارتضى اللّٰه سبحانه.

قال تعالىٰ :(وَلَا يَشْفَعُوْنَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى)، وقال :(يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِىَ لَهٗ قَوْلًا)فأخبر أنه لا يحصل يومئذ شفاعة تنفع إلا بعد رضاء قول المشفوع له، وإذنه للشافع فيه، فأما المشرک فإنه لا يرتضيه، ولا يرضى قوله، فلا يأذن للشفعاء أن يشفعوا فيه فإنه سبحانه علقها بأمرين :رضاه عن المشفوع له، وإذنه للشافع، فما لم يوجد مجموع الأمرين لم توجد الشفاعة.

وسر ذلک :أن الله له الأمر كله وحده، فليس لأحد معه من الأمر شىء ، وأعلى الخلق وأفضلهم وأكرمهم عنده :هم الرسل

والـمـلائـكة المقربون، وهم عبيد محض، لا يسبقونه بالقول، ولا يتـقـدمـون بيـن يـديـه، ولا يفعلون شيئا إلا بعد إذنه لهم، وأمرهم. ولاسيـمـا يـوم لا تـمـلک نـفــس لـنـفــس شيئا، فهم مملوكون مربوبون، أفعالهم مقيدة بأمره وإذنه .فإذا أشرک بهم المشرک، واتـخـذهـم شـفـعـاء مـن دونـه، ظنا منه أنه إذا فعل ذلک تقدموا وشـفـعوا له عند الله، فهو من أجهل الناس بحق الرب سبحانه وما يـجـب لـه ويـمتـنـع عليه فإن هذا محال ممتنع، شبيه قياس الرب تـعـالـى على الملوک والكبراء ، حيث يتخذ الرجل من خواصهم وأوليائهم من يشفع له عندهم فى الحوائج.

وبهذا القياس الفاسد عبدت الأصنام، واتخذ المشركون من دون الله الشفيع والولى.

والـفـرق بيـنهـمـا هـو الـفـرق بيـن الـمخلوق والخـالق، والرب والـمـربـوب، والسيـد والـعبـد، والـمالک والمملوک، والغنى والـفـقير، والذى لا حاجة به إلى أحد قط، والمحتاج من كل وجه إلى غيره.

فـالشـفـعاء عند المخلوقين :هـم شـركـاؤهم، فإن قيام مصالحهم بهـم، وهـم أعوانهم وأنصارهم، الذين قيام أمر الملوک والكبراء بهـم، ولـولاهـم لـمــا انبسـطــت أيـديهـم وألسنتهم فـى الـنـاس، فـلحاجتهم إليهم يحتاجون إلى قبول شفاعتهم، وإن لم يأذنوا فيها ولم يرضوا عن الشافع، لأنهم يخافون أن يردوا شفاعتهم، فتنتقض طـاعتهـم لهـم، ويـذهبون إلى غيرهم .فـلا يـجـدون بدا من قبول

شفاعتهم على الكره والرضى .فأما الغنى الذى غناه من لوازم ذاته، وكل ما سواه فقير إليه بذاته .وكل من فى السماوات والأرض عبد له، مقهورون بقهره، مصرفون .بمشيئته .لو أهلكهم جميعا لم ينقص من عزه وسلطانه وملكه وربوبيته وإلهيته مثقال ذرة.

قال تعالى :(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ)وقال سبحانه فى سيدة آى القرآن: آية الكرسى: (لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهٖ)وقال :(قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْض)

فأخبر أن حال ملكه للسموات والأرض يوجب أن تكون الشفاعة كلها له وحده، وأن أحدا لا يشفع عنده إلا بإذنه، فإنه ليس بشريك، بل مملوك محض، بخلاف شفاعة أهل الدنيا بعضهم عند بعض.

فتبين أن الشفاعة التى نفاها الله سبحانه فى القرآن هى هذه الشفاعة الشركية التى يعرفها الناس، ويفعلها بعضهم مع بعض، ولهذا يطلق نفيها تارة، بناء على أنها هى المعروفة المتعاهدة عند الناس، ويقيدها تارة بأنها لا تنفع إلا بعد إذنه، وهذه الشفاعة فى الحقيقة هى منه، فإنه الذى أذن، والذى قبل، والذى رضى عن

المشفوع والذى وفقه لفعل ما يستحق به الشفاعة وقوله.

فمتخذ الشفيع مشرك، لا تنفعه شفاعته، ولا يشفع فيه، ومتخذ الرب وحده إلهه ومعبوده ومحبوبه، ومرجوه، ومخوفه الذى يتقرب إليه وحده، ويطلب رجاءه، ويتباعد من سخطه هو الذى يأذن الله سبحانه للشفيع أن يشفع فيه.

قال تعالى :(أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُفَعَاءَ ؟) ، إلى قوله :(قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا)، وقال تعالى :(وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ أَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ) فبين سبحانه أن المتخذين شفعاء مشركون، وأن الشفاعة لا تحصل باتخاذهم هم، وإنما تحصل بإذنه للشافع، ورضاه عن المشفوع.

وسر الفرق بين الشفاعتين :أن شفاعة المخلوق للمخلوق، وسؤاله للمشفوع عنده، لا يفتقر فيها إلى المشفوع عنده، لا خلقا، ولا أمرا، ولا إذنا، بل هو سبب محرك له من خارج، كسائر الأسباب التى تحرك الأسباب، وهذا السبب المحرك قد يكون عند المتحرك لأجله ما يوافقه كمن يشفع عنده فى أمر يحبه ويرضاه، وقد يكون عنده ما يخالفه كمن يشفع إليه فى أمر يكرهه، ثم قد يكون سؤاله وشفاعته أقوى من المعارض، فيقبل شفاعة الشافع .وقد يكون المعارض الذى عنده أقوى من شفاعة الشافع، فيردها ولا يقبلها، وقد يتعارض عنده الأمران، فيبقى

متـرددا بيـن ذلک الـمعـارض الذی يوجب الرد، وبين الشفاعة التـی تـقتـضـی الـقبول، فيتوقف إلى أن يترجح عنده أحد الأمرين بمرجح، فشفاعة الإنسان عند المخلوق مثله :هی سعی فی سبب مـنـفـصـل عن المشفوع إليه يحركه به، ولو على كره منه، فمنزلة الشفاعة عنده منزلة من يشفع يأمر غيره، أو يكرهه على الفعل، إما بـقـوـة وسـلطان، وإما يرغبه شفاعته، فلا بد أن يحصل للمشفوع إليـه مـن الشـافـع إمـا رغبة يـنتـفـع بهـا، وإمـا رهبة منه تندفع عنه بشـفاعته .وهـذا بـخـلاف الشـفاعة عند الرب سبحانه، فإنه ما لم يـخـلـق شـفـاعة الشـافـع، ويأذن له فيها، ويحبها منه، ويرضى عن الشـافـع، لم يمكن أن توجد، والشافع لا يشفع عنده لحاجة الرب إليه، ولا لرهبته منه، ولا لرغبته فيما لزمه، وإنما يشفع عنده مجرد امتثـال أمـره وطاعته له، فهو مأمور بالشفاعة، مطيع بامتثال الأمر، فـإن أحـدا مـن الأنبياء والملائكة وجميع المخلوقات لا يتحرک بشـفـاعة ولا غيرها إلا بـمشيئة الله تعالى، وخلقه، فالرب سبحانه وتـعـالـی هـو الـذی يـحـرک الشـفيـع حتى يشفع، والشفيع عند الـمـخـلـوق هو الذی يحرک المشفوع إليه حتى يقبل، والشافع عـنـد الـمـخـلـوق مستـغـن عـنه فی أكثر أموره، وهو فی الحقيقة شـريـكه، ولو كان مملوكه وعبده .فـالـمشفوع عنده محتاج إليه فيـمـا يـنـالـه منه من النفع بالنصر، والمعاونة وغير ذلک، كما أن الشـافـع مـحتـاج إليـه فيما يناله منه :مـن رزق، أو نصر، أو غيره، فكل منهما محتاج إلى الآخر.

ومن وفقه الله تعالى لفهم هذا الموضع ومعرفته، تبين له حقيقة التوحيد والشرك، والفرق بين ما أثبته الله تعالى من الشفاعة وبين ما نفاه وأبطله، (ومن لم يجعل الله له نورا فماله من نور)

(إغاثة اللهفان من مصايد الشيطان، ج ١ ص ٢٢٠ الىٰ ٢٢٣، الباب الثالث عشر: فى مكايد الشيطان التى يكيد بها ابن آدم) لے

ان نقول سے دعویٰ اولیٰ منطوقاً اور دعویٰ ثانیہ مفہوماً ثابت ہے، دلیلِ ثالث نقلی ''من آیاتِ رب العالمین ''جو''عالم السرائر والضمائر '' کی شہادت ہونے کے سبب حجیت میں سب سے زیادہ وافی ہے۔وھو قولہ تعالیٰ:

قل ادعوا الذين زعمتم من دونه فلا يملكون كشف الضر عنكم

لے قلت وبعد ذلک فلا يجوز الحكم على ساجد القبور بالكفر والشرک الاكبر، بمجرد اعتقادهم فى اصحاب القبور ،انهم شفعاء هم عندالله ،مالم يستفسروا عن كيفية اعتقادهم ذالک ،وأما قبل الاستفسار فيلزم العمل بما قاله العلماء ،ان قول القائل انبت الربيع البقل ،محمول على الاسناد الحقيقى ان كان دهريا ،وعلى الاسناد العقلى المجازى ان كان موحدا ،فكذا القول بان هؤلاء شفعائنا عند الله ،يحمل على الشفاعة الشركية ،ان كان القائل غير مسلم ،وعلى الشفاعة الشرعية، ان كان مسلماً، وكذا القول بأن فلانا يضر و ينفع يحمل على الضر. والنفع بالذات ان كان كافراً جهاراً وعلى الضر والنفع باذن الله وكرامته التى اعطاه اياها، ان كان مومنا موحدا مقرا بالاسلام هكذا ينبغى ان يفهم المقام.

والحمد لله الملک المتعال لعلک عرفت بالتفصيل الذى ذكر العلامة ابن القيم مرجعه الى ماقال الشيخ (اشرف على) فى بيان الفرق فى اعتقاد التاثير وعدمه، فالمشرک يعتقد شفاعة معبوده موثرة لما له من القدرة المستقلة فى زعمه ،والموحد المعظم للقبور لا يعتقدها مؤثرة ولا الشافع ضارا ولا نافعاً وانما يعتقد عدم التخلف فى شفاعته للكرامة التى هى له عندالله، وهذا ليس بشرک، وان كان معصية ،فافهم. ظفر احمد.

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ ساجدینِ قبور پر محض ان کے اصحابِ قبور کو عنداللہ شفعاء سمجھنے پر کفر وشرکِ اکبر کا حکم لگانا درست نہیں، جب تک ان کے اعتقاد کی تفسیر نہ ہوجائے، اور مومن موحد کے فعل کو مجازی نسبت پر محمول کرنا مناسب ہے، جس کی رُو سے اس شفاعت کو اذنِ الٰہی کے ساتھ مقید مانا جائے گا، جس کا عقیدہ شفاعت کے عدمِ تخلف کا محض کرامتِ عنداللہ کی وجہ سے ہی ہوتا ہے، جس میں شرکِ حقیقی سے امتیاز ہوجاتا ہے، اگرچہ یہ بھی معصیتِ اعتقادی عملی ہے۔

ولا تحويلا .

وقوله تعالیٰ: ولا يملك الذين يدعون من دونه الشفاعة إلا من شهد بالحق.

وامثالهما من الآيات التی تفوت الحصر.

وجہِ دلالت دعویٰ اولیٰ پر یہ ہے کہ ان نصوص میں ملکِ تصرفات کی نفی کی گئی ہے، اور ملک من حیث الملک کا مقتضا (بلکہ حقیقت) تصرف غیر مقید بالاذن ہے، اور سیاق سے مقصود مزعوماتِ مشرکین کا ابطال ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایسے ہی اختیارات وتصرفات کے قائل تھے، جو کہ مقید بالاذن نہ ہوں، پس دعویٰ اولیٰ ثابت ہوگیا، اور محلِ ذم کی قیود میں مفہومِ مخالف معتبر ہوتا ہے، اس سے دعویٰ ثانیہ پر بھی دلالت ہوگئی۔

والحمد للّٰہ علی اتمام النعم والھام الحکم

سلخ جمادی الثانیۃ 1345ھ۔ فقط

(امداد الفتاویٰ مبوب، ج۶ص ۸۷تا۹۳، کتاب العقائد والکلام، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: جولائی2010ء)

(کذافی: امدادالاحکام، ج۱ص ۱۱۸، الیٰ ۱۳۲، کتاب الایمان والعقائد، مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع دوم)

مولانا اشرف علی تھانوی کے مذکورہ مفصل رسالے اور اس پر علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب کے حواشی سے معلوم ہوا کہ مشائخِ دیوبند، جو مختلف شرک و بدعات پر مشتمل اقوال وافعال کا ارتکاب کرنے والے مسلمانوں کی تکفیر میں تاویل واحتیاط کے قائل ہیں، اس کی اصولی طور پر علامہ ابنِ تیمیہ وعلامہ ابنِ قیم وغیرہ کی بعض عبارات سے بھی تائید ہوتی ہے، نیز جمہور اہلُ السنۃ والجماعۃ کے اس قول سے بھی تائید ہوتی ہے، جس میں انہوں نے مختلف اہلِ بدعت کے فرقوں کو صریح کافر ومشرک قرار دینے کے بجائے، اہلِ بدعت واہلِ ہویٰ وغیرہ قرار دیا۔

لہٰذا تکفیر کے مسئلہ میں تاویل واحتیاط کے پہلو کو بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔
جس کی تائید متعدد احادیث سے بھی ہوتی ہے، جن میں چند بنیادی چیزوں پر اسلام وایمان کا حکم لگایا گیا ہے، اوران چیزوں کی موجودگی میں کفر کا حکم لگانے سے منع کیا گیا ہے۔
چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم:ثَلَاثٌ مِنْ أَصْلِ الْإِیْمَان: الْکَفُّ عَمَّنْ، قَالَ:لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ، وَلَا نُکَفِّرُہُ بِذَنْبٍ، وَلَا نُخْرِجُہُ مِنَ الْإِسْلَامِ بِعَمَلٍ، وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰہُ إِلٰی أَنْ یُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِیَ الدَّجَّالَ لَا یُبْطِلُہُ جَوْرُ جَائِرٍ، وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ، وَالْإِیْمَانُ بِالْأَقْدَار (سنن أبی داود، رقم الحدیث ۲۵۳۲، کتاب الجهاد، باب فی الغزو مع أئمة الجور) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایمان کی جڑ سے تعلق رکھتی ہیں، ایک تو یہ کہ جو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہے، اس سے رُکا جائے، اور ہم ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے والے کی کسی گناہ کی وجہ سے تکفیر نہ کریں، اور ہم اس کو کسی عمل کی بنا پر اسلام سے خارج قرار نہ دیں، دوسرے یہ کہ جہاد میری بعثت سے شروع ہو کر اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک میری امت کا آخری فرد دجال سے قتال نہ کرلے، جس کو کسی ظلم کرنے والے کا ظلم باطل نہیں کرے گا، اور نہ انصاف کرنے والے کا انصاف اس کو باطل کرے گا، تیسرے یہ کہ تقدیروں پر ایمان لانا (ابوداؤد)

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: حسن لغیرہ، وهذا إسناد ضعیف لجهالة یزید بن أبی نشبة، بضم النون وسکون الشین المعجمة، وبعدها باء بواحدة مفتوحة وتاء تأنیث .ضبطه المنذری.
وهو فی "سنن سعید بن منصور.(2367) "
وأخرجه أبو یعلی (4311) و (4312)، والبیهقی فی "السنن156 /9 "، وفی "الاعتقاد "ص 188، والضیاء المقدسی فی "المختارة "(2741) و (2742)، والمزی فی ترجمة یزید بن أبی نشبة من "تهذیب الکمال "من طریق جعفر بن برقان، به(حاشیة سنن ابی داؤد)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک موحد ومومن کے قول وفعل میں ایسی تاویل ممکن ہو، جس کی وجہ سے صریح کفر کا حکم نہ لگتا ہو، تو ایسی تاویل کی بنا پر صریح کفر کا حکم لگانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [1]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا، وَأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِىْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ، فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِىْ ذِمَّتِهٖ (صحيح البخارى، رقم الحديث ۳۹۱، كتاب الصلاة، باب فضل استقبال القبلة)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی ہماری (یعنی مسلمانوں جیسی) نماز پڑھے اور ہمارے (یعنی مسلمانوں کے) قبلہ کی طرف (عبادت کے لئے) رُخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، تو وہ مسلمان ہے، جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے، تو تم اللہ کی ذمہ داری میں خیانت نہ کرو (بخاری)

---

[1] (ثلاث من أصل الإيمان) أصل الشىء قاعدته التى لو توهمت مرتفعة لارتفع بارتفاعها وفسرها بقوله: (الكف عمن قال "لا إله إلا الله") أى الكف عن دمه وماله وعرضه (ولا نكفره بذنب) أى لا يجعل كافرا بذنب ارتكبه وزيادة قوله: (ولا نخرجه من الإسلام بعمل) للتأكيد أو لإفادة أنه لا يكفر بالذنب ولا يقال إنه ليس بمسلم ولا يقال لا يصفه بكفر ولا إسلام أو يكون كالإعلام بأنه يأتى من يخرج المسلم بالعمل القبيح كالخوارج، وفيه رد على من يكفر بالتأويل أشد رد، (والجهاد) أى للكفار والبغاة أى اعتقاد هذا هو الخصلة الثالثة .(ماض) ماض أى ثابت مستمر. (منذ بعثنى الله) أى أمرنى به وذلك بعد هجرته – صلى الله عليه وسلم – لأنه لم يأمر به من أول بعثته فهذه مدة ابتداء شرعيته ومدة انتهائها .(إلى أن يقاتل آخر أمتى الدجال) وليس بعده جهاد لأنه لا يكون بعده إلا خروج يأجوج ومأجوج ولا يطاق قتالهم بل يهلكهم الله بالنغف كما تقدم .(لا يبطله) أى يسقط وجوبه .(جور جائر) أى جور إمام المسلمين وخليفتهم الذى إليه أمر الجهاد وبيده عقد لواء الأجياد فإن كان جائرا وجب الجهاد معه لأعداء الإسلام .(ولا عدل عادل) استطراد وإلا فهو معلوم أنه لا يسقط بعدل عادل إنما الذى يتوهم سقوطه مع الجائرين وإرشاد إلى أنه لا فرق فى وجوبه بين الأمرين وأنه كما يجب على العادل يجب مع الجائر وتقدم الكلام. (والإيمان بالأقدار) .(التنوير شرح الجامع الصغير للصنعانى، ج۵ص ۴۹، حرف الثاء المثلثة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ : أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لاَ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَإِذَا قَالُوْهَا، وَصَلَّوْا صَلَاتَنَا، وَاسْتَقْبَلُوْا قِبْلَتَنَا، وَذَبَحُوْا ذَبِيْحَتَنَا، فَقَدْ حَرُمَتْ عَلَيْنَا دِمَاؤُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ، إِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ (صحيح البخاری،رقم الحديث ٣٩٢، كتاب الصلاة، باب فضل استقبال القبلة)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں، جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں، پس جب وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ لیں، اور ہماری (یعنی مسلمانوں کی) طرح نماز پڑھنے لگیں، اور ہمارے قبلہ (یعنی بیت اللہ) کی طرف رخ کرنے لگیں، اور ہماری طرح (اللہ کا نام لے کر) ذبح کرنے لگیں، تو ہمارے اوپر ان کا خون اور ان کا مال حرام ہوجاتا ہے، سوائے کلمۂ اسلام کے حق کے (یعنی اس پر اسلام کے قانون لاگو ہوں گے، مثلاً قتل کے بدلہ میں قصاص وغیرہ) اور ان (کے باطن اور نیک وبُرے اعمال کی جزا وثواب) کا حساب اللہ کے ذمہ ہے (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَأَنْ يَسْتَقْبِلُوْا قِبْلَتَنَا، وَأَنْ يَأْكُلُوْا ذَبِيْحَتَنَا، وَأَنْ يُصَلُّوْا صَلَاتَنَا، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ حَرُمَتْ عَلَيْنَا دِمَاؤُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِيْنَ، وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ (سنن ابی داؤد، رقم الحديث ٢٦٤١، كتاب الجهاد، باب، على ما يقاتل المشركون؟) [1]

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح (حاشية سنن ابی داؤد)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں، جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کی گواہی نہ دیں، اوراس کی گواہی نہ دیں کہ محمد اللہ کے بندے اوراس کے رسول ہیں، اور ہمارے قبلہ (یعنی بیتُ اللہ) کی طرف رخ نہ کرنے لگیں، اور ہماری طرح (اللہ کا نام لے کر) ذبح نہ کرنے لگیں، اور ہماری (یعنی مسلمانوں کی) طرح نماز نہ پڑھنے لگیں، جب وہ ایسا کرلیں، تو ہمارے اوپران کا خون اوران کا مال حرام ہوجاتا ہے، سوائے اسلام کے حق کے (یعنی اس پر اسلام کے قانون لاگو ہوں گے، مثلاً قتل کے بدلہ میں قصاص وغیرہ) اور ان (کے باطن اور نیک وبُرے اعمال کی جزا وثواب) کا حساب اللہ کے ذمہ ہے (ابوداؤد)

خلاصہ یہ کہ مشائخِ دیوبند نے تکفیرِ مسلم کے معاملہ میں حتی الامکان احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، اور جب تک کسی مسلم کے قول وفعل میں صریح کفر وشرک کا حکم لگانے میں تاویل ممکن ہوئی، اس وقت تک شرکِ صوری اور گناہ وغیرہ تو قرار دیا، اوراس سے بچنے اور اجتناب کرنے کی بھی تعلیم وتلقین اور تبلیغ کی، اور کہیں متعین شخص کی تکفیر کے بغیر عام حکم بیان کرتے ہوئے، تہدیداً شرک بھی کہا، جیسا کہ کئی نصوص میں بھی اس طرح کا ذکر ہے۔

لیکن کسی متعین مومن ومسلم فرد یا جماعت پر کفرِ اکبر وشرکِ جلی کا حکم لگانے میں اس طرح کا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا، جس طرح کا طرزِ عمل محمد بن عبدالوہاب نجدی اوران کے متبعین کی طرف سے رونما ہوا، اور وہ ان کی کتابوں میں آج بھی موجود ہے۔

جس کے نتیجہ میں سخت انتشار پھیلا، اگرچہ مخالفین ومعاندین کی طرف سے محمد بن عبدالوھاب نجدی اوران کے متبعین کے اوپر الزام وبہتان تراشیوں میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔

وَاللہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.

(فصل نمبر 1)

حلف بغیر اللہ اور سجود لغیر اللہ کا مسئلہ

احادیث میں غیرُ اللہ کی قسم اٹھانے سے منع کیا گیا ہے، اور بعض احادیث میں غیرُ اللہ کی قسم اٹھانے کو اللہ کے ساتھ شرک کرنا قرار دیا گیا ہے، جس کے پیشِ نظر، غیرُ اللہ کی قسم اٹھانا منع ہے، پھر اگر غیرُ اللہ کو معبود سمجھ کر قسم اٹھائے، تو شرکِ اکبر ہے، ورنہ حرام یا مکروہ ہے، جس میں دونوں قول ہیں۔

اسی طرح قبر پر سجدہ کرنا حرام ہے، اگر کوئی مسلم، صاحبِ قبر کو معبود سمجھتے ہوئے، اور اس کی عبادت کی غرض سے سجدہ کرے، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اور اگر اس کی عبادت پیشِ نظر نہ ہو، بلکہ کسی دوسری غرض، مثلاً تکریم وتحیۃ کے طور پر سجدہ کرے، تو بہت سے حضرات کے نزدیک اس صورت میں اگرچہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی مسلم اس طرح کے مقصد سے قبر کو سجدہ کرے، تو اس پر صریح کفر وارتداد کا حکم نہیں لگایا جائے گا، البتہ اس کو اس سے منع کیا جائے گا، اور کفر کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے تنبیہ کی جائے گی۔ [1]

تاہم بہت سے علمائے عرب ونجد غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے پر مطلقاً کفر وشرک کا حکم لگانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

---

[1] أجمعوا على أن السجود لغير صنم ونحوه، كأحد الجبابرة أو الملوك أو أى مخلوق آخر هو من المحرمات وكبيرة من كبائر الذنوب، فإن أراد الساجد بسجوده عبادة ذلك المخلوق كفر وخرج عن الملة بإجماع العلماء ، وإن لم يرد بها عبادة فقد اختلف الفقهاء فقال بعض الحنفية : يكفر مطلقا سواء كانت له إرادة أو لم تكن له إرادة، وقال آخرون منهم :إذا أراد بها التحية لم يكفر بها، وإن لم تكن له إرادة كفر عند أكثر أهل العلم (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۴، ص ۲۱۱، مادة "سجود")

آگے اس سلسلے میں علامہ ابنِ تیمیہ اور چند محققین مشائخِ دیوبند وغیرہ کے حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر حلف بغیر اللہ کے متعلق فرماتے ہیں:

وقد اتفق العلماء على أنه لا تنعقد اليمين بغير الله تعالى وهو الحلف بالمخلوقات ؛ فلو حلف بالكعبة أو بالملائكة ؛ أو بالأنبياء أو بأحد من الشيوخ أو بالملوك لم تنعقد يمينه ؛ ولا يشرع له ذلك ؛ بل ينهى عنه إما نهي تحريم ؛ وإما نهي تنزيه . فإن للعلماء في ذلك قولين .والصحيح أنه نهي تحريم .ففي الصحيح عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال :(من كان حالفا فليحلف بالله أو ليصمت) وفي الترمذي عنه صلى الله عليه وسلم أنه قال (من حلف بغير الله فقد أشرك) (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية، ج ۱ ،ص ۳۳۵،توحيد الألوهية، التوسل والوسيلة،دعاء الغائب اقرب للاجابة)

ترجمہ: اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ (کسی اور) کی قسم منعقد نہیں ہوتی، جو کہ مخلوقات کے نام کا حلف اٹھانا ہے، پس اگر کسی نے کعبہ کی، یا فرشتوں کی، یا نبیوں کی یا اپنے بزرگوں میں سے کسی کی یا بادشاہوں کی قسم اٹھائی، تو اس کی قسم منعقد نہیں ہوگی، اور اس طرح کی قسم مشروع نہیں، بلکہ ممنوع ہے، یا تو نہی تحریمی ہے یا تنزیہی ہے، پس علماء کے اس بارے میں دونوں قول ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ یہ نہی تحریمی ہے، پس صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جو شخص قسم اٹھائے تو وہ اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے، اور سنن ترمذی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ جس نے اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھائی تو

اس نے شرک کیا (مجموع الفتاویٰ)

اس سے معلوم ہوا کہ باوجودیکہ حلف بغیر اللہ کو احادیث میں شرک قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ شرکِ اکبر میں داخل نہیں، اور نہی کے تحریمی وتنزیہی ہونے میں اختلاف ہے، علامہ ابنِ تیمیہ نے تحریمی کو ترجیح دی ہے، جبکہ بعض دیگر حضرات نے تنزیہی کو ترجیح دی ہے، جیسا کہ پہلے مولانا گنگوہی کے حوالہ سے گزرا۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا دوسرا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک اور مقام پر مخلوق کی قسم اٹھانے کے نہی تحریمی ہونے کے قول کو اصح قرار دیا ہے، اور اس کو شرکِ اکبر یا شرکِ جلی وہاں بھی قرار نہیں دیا۔ [1]

علامہ ابنِ تیمیہ کا تیسرا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

من حلف بالمخلوقات :كالحلف بالكعبة والملائكة والمشايخ والملوك وغير ذلک ؛ فإن هذه ليست من أيمان المسلمين ؛ بل هی شرک كما قال صلى الله عليه وسلم (من حلف بغير الله فقد أشرک (مجموع الفتاوی، لا بن تيمية، ج۳۴، ص۲۰۸، كتاب الحدود، باب حد المسكر، تنازع العلماء فی نجاستها)

---

[1] فالأيمان ثلاثة أقسام :

"أحدها "ما ليس من أيمان المسلمين وهو الحلف بالمخلوقات .كالكعبة والملائكة والمشايخ والملوک والآباء ؛ وتربتهم ونحو ذلک :فهذه يمين غير منعقدة ولا كفارة فيها باتفاق العلماء ؛ بل هی منهی عنها باتفاق أهل العلم والنهی نهی تحريم فی أصح قوليهم .ففی الصحيح عن النبی صلى الله عليه وسلم أنه قال :(من كان حالفا فليحلف بالله أو ليصمت) وقال (إن الله ينهاكم أن تحلفوا بآبائكم) وفی السنن عنه أنه قال :(من حلف بغير الله فقد أشرک(مجموع الفتاوی، لا بن تيمية، ج۳۳، ص۶۸، كتاب الطلاق، الأيمان ثلاثة اقسام)

ترجمہ: جس نے مخلوقات کی قسم اٹھائی، جیسا کہ کعبہ کی اور فرشتوں کی اور بزرگوں کی اور بادشاہوں کی اور ان کے علاوہ کی، تو یہ مسلمانوں کی قسموں سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ یہ شرک ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی تو اس نے شرک کیا (مجموع الفتاویٰ)

اس عبارت میں علامہ ابنِ تیمیہ نے حلف بغیر اللہ کو شرک سے تعبیر کیا ہے، لیکن ان کی دوسری عبارت سے اس کا شرکِ اصغر ہونا معلوم ہو چکا، جس کی وجہ سے اس کو شرکِ اکبر پر محمول کرنے کے بجائے شرکِ اصغر پر محمول کیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات مطلق شرک بول کر شرکِ اصغر بھی مراد لیا جایا کرتا ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا چوتھا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ، حلف بغیر اللہ سے متعلق اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں کہ:

ثم من أصحاب الأئمة من قال :يكره الحلف بغير الله تنزيهًا ولا يحرم .وقطع الباقون بأنه حرام، وهذا هو الصواب؛ لأن النبى صلى الله عليه وسلم أخبر أن الله ينهانا عنه، وما نهانا الله عنه فهو حرام، إلا أن يقوم دليل على أنه تنزيه، وأخبر أن هذا شرك وكفر، وكل ما سمى كفرًا وشركًا فأقل درجاته أن يكون حرامًا.

وإنما سماه شركًا؛ لأن الحلف بغير الله إنما يكون بالمعبود، فمن حلف بغير الله فقد جعل لله ندًا .فإن فعل هذا معتقدًا لعبادته فهو كافر، وإن لم يكن معتقدًا فهو مشرك فى القول دون الشرك الأكبر الذى ينقل عن الملة، كما قالوا :شرك دون شرك. وقوله صلى الله عليه وسلم : الرياء شرك . وفى ذلك أنزل

اللہ تعالی :فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ أَحَدًا (جواب فی الحلف بغير الله والصلاة إلى القبور، ويليه : فصل في الاستغاثة،لابن تيمية،ص ٦ ، أما الحلف بغير الله)

ترجمہ: پھر ائمہ اصحاب میں سے بعض کا قول یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھانا تنزیہی ہے، حرام نہیں ہے، اور باقی کا قول یہ ہے کہ یہ یقیناً حرام ہے، اور یہی قول صواب ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی خبر دی ہے کہ اللہ نے ہمیں اس سے منع فرمایا ہے، اور جس چیز سے اللہ ہمیں منع فرمائے تو وہ حرام ہوتی ہے، مگر یہ کہ کوئی دلیل اس کے تنزیہی ہونے پر قائم ہوتی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی خبر دی کہ یہ شرک اور کفر ہے، اور ہر وہ چیز جس کا نام شرک اور کفر رکھا جائے، تو اس کا اقل درجہ یہ ہے کہ وہ حرام ہو۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام شرک اس لیے رکھا کہ اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھانا، دراصل اس کو معبود قرار دینا ہوتا ہے، پس جس نے اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھائی تو اس نے اس کو اللہ کا شریک بنالیا، پھر اگر اس نے اس غیر اللہ کی عبادت (یعنی غیرُ اللہ کے معبود ہونے) کا اعتقاد رکھ کر یہ قسم اٹھائی تو وہ کافر ہو جائے گا، اور اگر اس کا یہ اعتقاد نہ ہو، تو وہ قولی (یا صورتاً) مشرک ہوگا، شرکِ اکبر کا مرتکب شمار نہیں ہوگا، جس کی وجہ سے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، جیسا کہ فقہائے کرام نے ''شرک دون شرک'' کا قول کیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ:

" الرياء شرک"

اور اسی کے متعلق (سورہ کہف میں مذکور) اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا کہ:

" فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ

بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ أَحَدًا " (جواب فی الحلف بغیر اللہ الخ)

علامہ ابنِ تیمیہ کی اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ غیرُ اللہ کی قسم اٹھانا، اس وقت شرکِ اکبر کہلاتا ہے، جبکہ غیرُ اللہ کو معبود سمجھ کر قسم اٹھائے، ورنہ وہ شرکِ اکبر کا مرتکب شمار نہیں ہوگا، بلکہ صورتاً مشرک ہوگا، اوراس کی وجہ فقہائے کرام کا ''شرک، دون شرک'' کا قول اور حدیث وآیاتِ قرآنی کی دلالت ہے۔

پس اسی طرح سے کوئی اگر اسی قسم کے دوسرے فعل کا ارتکاب کرے، مثلاً غیرُ اللہ کو سجدہ کرے، اس کا بھی یہی حکم ہوگا کہ بعض صورتوں میں حقیقی شرک اور بعض صورتوں میں گناہ ہوگا، جیسا کہ آگے علامہ ابنِ تیمیہ کے حوالہ سے ہی آتا ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا پانچواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

وبالجملة فالقيام والقعود والركوع والسجود حق للواحد المعبود :خالق السموات والأرض وما كان حقا خالصا لله لم يكن لغيره فيه نصيب :مثل الحلف بغير الله عز وجل وقد قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم " :(من كان حالفا فليحلف بالله أو ليصمت) متفق عليه وقال أيضا " :(من حلف بغير الله فقد أشرك) . فالعبادة كلها لله وحده لا شريك له (وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (مجموع الفتاوی، لا بن تیمیة، ج۲۷، ص۹۳، کتاب الفقه، الزيارة)

ترجمہ: اور خلاصہ یہ کہ قیام اور قعود اور رکوع اور سجود یہ واحد معبود کا حق ہے، جو

آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، اور جو خالص اللہ کا حق ہے، اس میں اللہ کے علاوہ کسی کا کوئی حصہ نہیں، جیسا کہ اللہ عزوجل کے علاوہ کی قسم اٹھانا، جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جو قسم اٹھائے تو اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے، متفق علیہ، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھائی تو اس نے شرک کیا، پس عبادت ساری کی ساری اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ‘‘

(مجموع الفتاویٰ)

مذکورہ عبارت میں علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے قیام، قعود، رکوع اور سجود سب کو خالص اللہ وحدہٗ کا حق قرار دیا ہے، اور اس کی نظیر میں غیرُ اللہ کی قسم اٹھانے کا ذکر کیا ہے، پس جس طرح غیرُ اللہ کی قسم اٹھانے میں اس کو معبود سمجھنے نہ سمجھنے کے اعتبار سے فرق ہے، اور اس کا خود علامہ ابنِ تیمیہ نے ذکر کیا ہے، جیسا کہ گزرا، اسی طرح رکوع، سجود وغیرہ میں بھی مذکورہ بنیاد پر فرق ملحوظ رکھنا مناسب ہوگا، کیونکہ وہ بھی حلف بغیر اللہ کی نظیر ہے۔

اور اس کی بنیاد پر ہر سجدہ لغیر اللہ کو شرکِ اکبر کا مصداق قرار دینا مناسب نہ ہوگا۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا چھٹا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنی تالیف ’’اقتضاءُ الصراط المستقیم‘‘ میں فرمایا کہ:

نهى عن الصلاة إلى ما عبد من دون الله فى الجملة وإن لم يكن العابد يقصد ذلك ولهذا ينهى عن السجود لله بين يدى الرجل وإن لم يقصد الساجد ذلك لما فيه من مشابهة السجود لغير الله ....أما السجود لغير الله وعبادته فهو محرم فى الدين الذى

اتفقت عليه رسل الله كما قال سبحانه وتعالى :

وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُوْنَ (اقتضاء الصراط المستقيم ، ج : ١ ص : ٢٢٠ و ٢٢١ ، القسم الثانى ، فصل فى ذكر الأدلة على الأمر بمخالفة الكفار عموما وفى أعيادهم خصوصا)

ترجمہ: اللہ کے علاوہ کسی بندہ کی طرف (رُخ کر کے) نماز پڑھنے سے فی الجملہ منع کیا جائے گا، اگرچہ عبادت کرنے والے کا یہ قصد نہ ہو، اوراسی وجہ سے اللہ کے لیے سجدہ کو کسی آدمی کے سامنے سجدہ کرنے سے منع کیا جاتا ہے، اگرچہ سجدہ کرنے والے کا قصد اس آدمی کا نہ ہو، کیونکہ اس میں سجود لغیر اللہ کی مشابہت پائی جاتی ہے............

اور غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ کی عبادت کرنا، یہ ہر دین میں حرام میں ہے، جس پر اللہ کے تمام رسولوں کا اتفاق ہے، جیسا کہ (سورہ زخرف میں) اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُوْنَ“

(اقتضاء الصراط المستقیم)

مذکورہ عبارت میں علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے کو اس صورت میں بھی ممنوع قرار دیا ہے، جبکہ غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے یعنی اس کو معبود سمجھنے کا قصد نہ ہو، کیونکہ اس میں سجود لغیر اللہ کی مشابہت پائی جاتی ہے، اوراس کی تمام شریعتوں میں ممانعت پائی جاتی ہے، اور آگے خود علامہ ابنِ تیمیہ کے حوالہ سے آتا ہے کہ سجود لغیر اللہ کا بطور تحیۃ کے جواز ہماری شریعت کے علاوہ میں تھا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ تمام شریعتوں میں عدمِ جواز، غیر تحیۃ والے سجدہ کا تھا، اگرچہ سجدۂ تحیۃ لغیر اللہ، ہماری شریعت میں جائز نہیں، مگر یہ شرکِ اکبر اس لیے نہیں کہ شرکِ اکبر کسی شریعت میں بھی جائز نہیں رکھا گیا، یہی تفصیل علامہ شبیر احمد عثمانی کے حوالہ سے آگے آتی ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا ساتواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ رکوع اور سجود، اللہ عز وجل ہی کے لیے جائز ہے، اگرچہ ہماری شریعت کے علاوہ میں تحیہ کے طریقہ پر اس کا جواز تھا، لیکن ہماری شریعت میں یہ بھی جائز نہیں۔ [1]

اس سے علامہ ابنِ تیمیہ کا وہ موقف معلوم ہوا، جس کا پہلے ذکر گزرا۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا آٹھواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک اور مقام پر بزرگوں کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، جس کی دلیل میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت والی احادیث کو ذکر کیا ہے، اور پھر فرمایا کہ جو شخص اس کو بطور تدین اور تقرب کے اختیار کرے گا، تو یہ عظیم ترین منکرات میں سے ہوگا، اور جو اس کے تقرب اور تدین ہونے کا اعتقاد رکھے گا، تو وہ گمراہ اور جھوٹ باندھنے والا ہوگا، جس کے سامنے اس بات کو واضح کیا جائے گا کہ یہ نہ تو دین ہے اور نہ قربت ہے، اگر وہ اس پر اصرار کرے تو اسے توبہ کرنے کا حکم دیا جائے گا، اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردیا جائے گا۔ [2]

---

[1] وأما الانحناء عند التحية :فيـنهى عنه كما فى الترمذى (عـن النبى صلى الله عليه وسلم أنهم سـألـوه عن الرجل يلقى أخاه ينحنى له ؟ قال :لا) ولأن الـركـوع والسجود لا يجوز فعله إلا لله عز وجـل ؛ وإن كـان هـذا على وجه التحية فى غير شريعتنا كما فى قصة يوسف :((وخروا له سجدا وقـال يا أبت هذا تأويل رؤياى من قبل) وفـى شـريعتنا لا يصلح السجود إلا لله بل قد تقدم نهيه عن الـقيـام كـما يفعله الأعاجم بعضها لبعض فكيف بالركوع والسجود ؟ وكذلک ما هو ركوع ناقص يدخل فى النهى عنه (مجموع الفتاوى، لا بن تيمية، ج ا ، ص۳۷۷، فصل فى الانحناء عند التحية)

[2] سئل -رحمه الله : -

عمن يبوس الأرض دائما هل يأثم ؟ وعمن يفعل ذلک لسبب أخذ رزق وهو مكره كذلک ؟

فأجاب :أما تقبيل الأرض ورفع الرأس ونحو ذلک مما فيه السجود مما يفعل قدام بعض الشيوخ

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے مذکورہ حوالہ میں بھی سجود لغیر اللہ میں تدین وتقرب کے ہونے نہ ہونے کے اعتبار سے فرق کیا ہے، جس سے بظاہر مراد یہی ہے کہ غیرُ اللہ کو معبود سمجھ کر سجدہ کرنا، خواہ وہ بطورِ قصد ہو یا بطورِ امارتِ شرک، جیسا کہ آگے آتا ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو، تو پھر یہ عظیم ترین منکرات میں سے ہوگا، یعنی صورتاً شرک، اور مشابہتِ شرک اور کبیرہ گناہ ہوگا۔

اور اس سے قبل جو محمد بن عبدالوہاب نجدی کے حوالہ سے پہلے احقاقِ حق کرنے اور توبہ کا حکم دینے اور انکار کرنے پر قتل کا ذکر گزرا، وہ غالباً علامہ ابنِ تیمیہ کے اوپر بیان کردہ اصول پر ہی مبنی ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا نواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر فرمایا کہ:

ولا يجوز السجود لغير اللّٰه من الأحياء والأموات ولا تقبيل القبور ويعزر فاعله (مجموع الفتاوى، لا بن تيمية، ج۴، ص ۱٦١، فصل فى بيان ان السلف علم ممن بعدهم واحكم الخ، تعزير من لعن احدا من المسلمين او الاشعرية)

ترجمہ: اور غیر اللہ کے لیے سجدہ کرنا جائز نہیں، خواہ زندہ کے لیے سجدہ کیا جائے، یا مردہ کے لیے، اور نہ ہی قبروں کو بوسہ دینا جائز ہے، اور اس فعل کے مرتکب کی تعزیر کی جائے گی (مجموع الفتاویٰ)

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وبعض الملوك :فلا يجوز ؛ بل لا يجوز الانحناء كالركوع أيضا كما (قالوا للنبى صلى الله عليه وسلم الرجل منا يلقى أخاه أينحنى له ؟ قال :لا) (ولما رجع معاذ من الشام سجد للنبى صلى الله عليه وسلم .فقال :ما هذا يا معاذ ؟ قال يا رسول الله رأيتهم فى الشام يسجدون لأساقفتهم ويذكرون ذلك عن أنبيائهم .فقال :كذبوا عليهم لو كنت آمرا أحدا أن يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها من أجل حقه عليها يا معاذ إنه لا ينبغى السجود إلا لله) . وأما فعل ذلك تدينا وتقربا فهذا من أعظم المنكرات ومن اعتقد مثل هذا قربة وتدينا فهو ضال مفتر بل يبين له أن هذا ليس بدين ولا قربة فإن أصر على ذلك استتيب فإن تاب وإلا قتل(مجموع الفتاوى، لا بن تيمية، ج ا ، ص ٣٧٢، مناظرة بين الشيخ والرهبان واقامة الحجة عليهم)

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے مذکورہ عبارت میں غیرُ اللہ کے لیے سجدہ کو ناجائز اوراس کے فاعل کو قابلِ تعزیر قرار دیا، صراحتاً کفر یا شرکِ اکبر قرار نہیں دیا، ورنہ تو تعزیر کے بجائے کفر اور مستحقِ قتل کا حکم لگاتے، اور ظاہر ہے کہ یہ سجدہ وہی ہوسکتا ہے، جو شرکِ اکبر یعنی غیراللہ کو معبود سمجھ کر نہ ہو، بلکہ تحیہ واکرام وغیرہ کے طور پر ہو، جیسا کہ پہلے گزرا۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا دسواں حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک مقام پر ایک دوسرے کو تواضع کے طریقہ پر سجدہ کرنے کے بارے میں فرمایا کہ غیراللہ کے لیے سجدہ کرنا جائز نہیں، لیکن علامہ ابنِ تیمیہ نے اس کو یہاں بھی شرکِ اکبر قرار نہیں دیا۔ [1]

اس سے بھی علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے اسی موقف کی ترجمانی ہوتی ہے، جو پیچھے گزرا۔

فتاویٰ ہندیہ، ردالمحتار، البحرالرائق اور فتاویٰ کاملیہ کا حوالہ

فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ:

''امام ابومنصور نے فرمایا کہ جو آدمی دوسرے کے سامنے سجدہ کرے، تو اس کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، کیونکہ وہ اس کی تعظیم کا ارادہ کرتا ہے، عبادت کا ارادہ نہیں کرتا، اور ابومنصور کے علاوہ بعض مشائخ نے فرمایا کہ غیرُ اللہ کے لیے بطور تعظیم

---

[1] سئل :عن أقوام يرقصون على الغناء بالدف ثم يسجد بعضهم لبعض على وجه التواضع .هل هذا سنة ؟ أو فعله الشيوخ الصالحون ؟ .

الجواب :لا يجوز السجود لغير الله واتخاذ الضرب بالدف والغناء والرقص عبادة هو من البدع التى لم يفعلها سلف الأمة ولا أكابر شيوخها :كالفضيل بن عياض وإبراهيم بن أدهم وأبى سليمان الدارانى ومعروف الكرخي والسرى السقطي وغير هؤلاء .وكذلك أكابر الشيوخ المتأخرين مثل :الشيخ عبد القادر والشيخ عدى والشيخ أبى مدين والشيخ أبى البيان وغير هؤلاء ، فإنهم لم يحضروا "السماع البدعى "بل كانوا يحضرون "السماع الشرعى "سماع الأنبياء وأتباعهم كسماع القرآن .والله أعلم (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية،ج ١١،ص ٢٠٤،سئل:عن أقوام يرقصون على الغناء بالدف ثم يسجد بعضهم لبعض على وجه التواضع، ما حكم هذا؟)

کے سجدہ کرنا، کبیرہ ترین گناہ ہے، بعض حضرات اس پر مطلقاً تکفیر کے قائل ہیں، لیکن اکثر حضرات کا قول یہ ہے کہ اگر عبادت کی نیت سے کرے، تو کفر ہے، اور اگر تحیّہ کی نیت سے کرے، تو کفر نہیں، لیکن حرام ہے، اور اگر کوئی ارادہ نہ ہو، تو اکثر اہلِ علم کے نزدیک کفر ہے"۔ [1]

اور رد المحتار میں ہے کہ:

"صدرُ الشہید نے فرمایا کہ غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے پر کافر قرار نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اس سے تحیّہ کا ارادہ کیا جاتا ہے، اور شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا کہ اگر غیرُ اللہ کے لیے سجدہ کرنا، تعظیم کے طریقہ پر ہو، تو کفر ہے، اور ظہیریہ میں ہے کہ غیرُ اللہ کو سجدہ کرنا، مطلقاً کفر ہے"۔ [2]

اور البحر الرائق کے "تکملۃ" میں ہے کہ:

"بعض لوگ جو بادشاہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، تو یہ حرام ہے، کیونکہ اس میں بت پرستوں کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے، اور صدرُ الشہید نے اس سجدہ کو باعثِ کفر قرار نہیں دیا، کیونکہ اس سے تحیّہ کا ارادہ کیا جاتا ہے، اور شمس الائمہ سرخسی

---

[1] قال الإمام أبو منصور -رحمه الله تعالى -إذا قبل أحد بين يدى أحد الأرض، أو انحنى له، أو طأطأ رأسه لا يكفر؛ لأنه يريد تعظيمه لا عبادته، وقال غيره :من مشايخنا رحمهم الله تعالى إذا سجد واحد لهؤلاء الجبابرة، فهو كبيرة من الكبائر، وهل يكفر؟ قال بعضهم :يكفر مطلقا، وقال أكثرهم :هذا على وجوه إن أراد به العبادة يكفر، وإن أراد به التحية لم يكفر، ويحرم عليه ذلك، وإن لم تكن له إرادة كفر عند أكثر أهل العلم(الفتاوى الهندية، ج٢، ص ٢٨١، كتاب السير، الباب التاسع، مطلب فى موجبات الكفر أنواع منها ما يتعلق بالإيمان والإسلام)

[2] (قوله إن على وجه العبادة أو التعظيم كفر إلخ) تلفيق لقولين قال الزيلعى :وذكر الصدر الشهيد أنه لا يكفر بهذا السجود، لأنه يريد به التحية وقال شمس الأئمة السرخسى :إن كان لغير الله تعالى على وجه التعظيم كفر اهـ قال القهستانى :وفى الظهيرية يكفر بالسجدة مطلقا(رد المحتار على الدر المختار، ج٦، ص٣٨٣، كتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء وغيره)

نے غیرُ اللہ کے لیے بطور تعظیم کے سجدہ کرنے کو کفر قرار دیا ہے"۔ [1]

شیخ محمد کامل بن مصطفیٰ طرابلسی حنفی (المتوفیٰ:1315ہجری) کے "الفتاویٰ الکاملیة" میں ہے کہ:

"فرشتوں کے حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کے لیے سجدہ کرنے کی حیثیت میں اختلاف ہے، پھر انہوں نے "تبیین المحارم" وغیرہ کے حوالے سے اس سجدہ کے بطورِ تحیۃ واکرام کے ہونے کو ترجیح دی ہے"۔ [2]

معلوم ہوا کہ غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے کے شرکِ اکبر یا شرکِ جلی ہونے میں اختلاف ہے، لیکن بہت سے حضرات کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اگر بطورِ عبادت نہ ہو، بلکہ بطورِ تحیۃ ہو، تو حرام وکبیرہ گناہ ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور علامہ ظفر احمد عثمانی کے حوالہ سے اس سلسلہ میں کلام اس سے پہلے باب میں ان کے تفصیلی رسالہ کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

---

[1] وما يفعله من السجود بين يدى السلطان فحرام والفاعل والراضى به آثمان لأنه أشبه بعبدة الأوثان وذكر الصدر الشهيد أنه لا يكفر بهذا السجود؛ لأنه يريد به التحية وقال شمس الأئمة السرخسى :لغير الله على وجه التعظيم كفر(تكملة البحر الرائق، ج٨،ص٢٢٦، كتاب الكراهية، فصل فى الاستبراء وغيره)

[2] سئلت: عن سجود الملائكة لآدم عليه السلام،هل كان تحية لآدم عليه السلام، او كان عبادة الله تعالىٰ، وآدم كالكعبة؟

فالجواب :والله تعالىٰ الموفق للصواب:ان العلماء اختلفوا فى ذلک ، قيل كان لله تعالىٰ ، والتوجه الى آدم للتشريف، كاستقبال الكعبة ، وقيل بل لآدم عليه السلام على وجه التحية والاكرام، ثم نسخ بقوله عليه السلام :لوامرت احدا ان يسجد لاحد لامرت المرأة ان تسجد لزوجها، تتارخانية.

قال فى تبيين المحارم: والصحيح الثانى، ولم يكن عبادة له ، بل تحية واكراما، ولذا امتنع منه ابليس، وكان جائزا فيما مضى ، كما فى قصة يوسف عليه السلام، قال ابومنصور الماتريدى ، وفيه دليل على نسخ الكتاب بالسنة افاده ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ(الفتاوىٰ الكاملية، صفحة٢٦٦، كتاب الحظر والاباحة ، مطبوعة: المكتبة الحقانية، بشاور)

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی رحمہ اللہ، غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے کے متعلق اپنے ایک رسالے کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

خلاصہ تمام رسالے کا یہ ہے کہ غیرُ اللہ کو سجدہ کرنا، اگر بقصدِ عبادت ہو، یا بصورتِ عبادت، خواہ نیت، عبادت کی نہ ہو، یہ دونوں صورتیں باجماع، کفر وشرک میں داخل ہیں، اس کے علاوہ جتنی صورتیں ہیں، بعض علماء تو ان کو بھی کفر وشرک قرار دیتے ہیں، اور بعض اس میں احتیاط کرتے ہیں، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حرام وناجائز اور قریب بکفر ہے (امداد المفتین، ص۱۷۸، کتاب السنۃ والبدعۃ، مطبوعہ: دارالاشاعت کراچی، مئی 2001ء)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ غیرُ اللہ کو بقصدِ عبادت یا بصورتِ عبادت سجدہ کرنا تو کفر وشرک ہے، اس کے علاوہ دوسری صورتوں میں اختلاف ہے، بعض علماء نے احتیاط اختیار کی، اور بعض نے کفر قرار دیا۔

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کا دوسرا حوالہ

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمہ اللہ، ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ:

غیرُ اللہ کو سجدہ کرنا اگر بنیتِ عبادت ہو، تو کفرِ صریح اور ارتدادِ محض ہے (نعوذ باللہ منہ) اور اگر بنیتِ عبادت نہ ہو، بلکہ قصدِ تعظیمِ معروف ہو، تو ارتداد وکفر تو نہیں، لیکن سخت تر گناہ اور قریب شرک ہے (جواہر الفقہ، جلد اول، صفحہ ۵۰۶، کتاب السنۃ والبدعۃ، رسالہ ''بدع الناس عن محدثات الاعراس''، طبع جدید: نومبر 2010ء، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم، کراچی)

(کذا فی: امداد المفتین، ص۱۵۴، کتاب السنۃ والبدعۃ، مطبوعہ: دارالاشاعت کراچی، مئی 2001ء)

اس عبارت میں مفتی صاحب موصوف نے اس سجدہ کو جو بطورِ عبادت نہ ہو، بلکہ بقصدِ تعظیمِ معروف یعنی بطورِ تحیۃ وغیرہ ہو، اس کو صریح کفر قرار دینے کے بجائے سخت ترین گناہ قرار دیا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کا حوالہ

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے ''مؤتمر عالمِ اسلامی، مکہ مکرمہ'' میں جو علمائے نجد اور امرائے نجد کے سامنے تقریریں اور گفتگوئیں کی ہیں، اُن میں علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے اہلِ نجد کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

(آپ لوگوں سے ہمارا) سخت اختلاف ان لوگوں کی تکفیر میں ہے، جو قبر کو سجدہ کرتے ہیں، یا چراغ جلاتے ہیں، یا غلاف چڑھاتے ہیں، ہم ان امور کو بدعت اور منکَر سمجھتے ہیں، اور ہمیشہ مبتدعین سے **جہاد بالقلم واللسان** کرتے ہیں، لیکن **عبادُ الاوثان** اور یہود ونصاریٰ کی طرح مباحُ الدم والمال نہیں سمجھتے، جس کا ذکر میں پہلی ملاقات میں آپ سے تفصیلاً کر چکا ہوں، اور آئندہ اگر وقت نے مساعدت کی، اور خدا نے توفیق بخشی، تو شیخ عبداللہ بن بلیہد وغیرہ سے اس پر مفصل کلام کیا جائے گا (انوارِ عثمانی، ص۹۳،۹۴، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435ہجری، بمطابق اکتوبر 2013عیسوی)

اس سے معلوم ہوا کہ مشائخِ دیوبند کا اہلِ نجد سے سخت اختلاف، قبر کو سجدہ کرنے وغیرہ کو شرکِ اکبر قرار دینے میں ہے، اور اس کی وجہ وہی ہے کہ مسلمان جو قبروں کو سجدہ کرتے ہیں، وہ ان حضرات کی تحقیق کے مطابق بطورِ عبادت نہیں ہوتا، بلکہ بطورِ تحیۃ وغیرہ کے ہوتا ہے، جو صراحتاً شرکِ اکبر نہیں، اور اس میں تاویل کی گنجائش ہے، اور اس سلسلہ میں تاویل نہ کرنا اور اس عمل کے مرتکبین کے ساتھ کافر ومرتد والا سلوک اختیار کرنا، خطرناک اور سخت فتنوں کا باعث ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کا دوسرا حوالہ

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ ''غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے'' کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

مسئلۂ سجود میں یمن اور نجد وغیرہ کے بعض علماء سے کچھ غلطی اور غلو ہو گیا ہے، خود میں جب ہندوستانی وفد میں ملک الحجاز سلطان ابنِ سعود کی دعوت پر گیا تھا، تو ایک روز علمائے نجد وقاہرہ وغیرہ اطراف کے علماء ایک مجمع میں جمع تھے، سلطان بھی شریک تھے، متعدد مسائل پر بحث ہوئی، اس وقت میں نے اس مجلس میں اس مسئلۂ سجود لغیر اللہ پر بھی بحث کی، اور یہ بہت ہی اہم ترین بحث تھی، اس لیے اس کی کچھ تشریح کی جاتی ہے۔

کچھ لوگوں کا مسلک یہ ہے کہ سجود لغیر اللہ، احیاء یا اموات کے لیے مطلقاً شرکِ جلی ہے، خواہ تعظیماً ہو یا تعبداً ہو۔

ان کے نزدیک تعظیماً غیر اللہ کو سجدہ کرنے والا بھی ویسا ہی کافر ومشرک ہے، جیسا کہ بت کے سامنے سجدہ کرنے والا اور اس کا حکم دنیا میں واجب القتل اور آخرت میں دائمی عذاب کا مستحق ہونا ہے، اور یہ وہی حکم ہے، جو ایک کافر ومشرک اور بت پرست کا ہے۔

الغرض سجود لغیر اللہ خواہ بنیتِ تعظیم ہو، اس میں اور سجود بنیتِ تعبد میں کوئی فرق نہیں، دونوں شرکِ جلی ہیں، اور بت پرستی کے حکم میں ہیں۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ عبادتِ غیرُ اللہ شرکِ جلی ہے، اور بت پرستی ہی کے حکم میں ہے، اب دیکھنا چاہیے کہ عبادت کے معنیٰ کیا ہیں؟

عبادت کے معنیٰ ہیں ''غـایةُ التـذلل '' یا ''التـذلـل الاقـصیٰ ''یعنی کسی کے

سامنے انتہائی اور غایت درجہ کی ذلت اختیار کرنا، اور سجدہ سب سے بڑھ کر ''غایۃُ التذلل و التذلل الاقصیٰ '' پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس سے زیادہ اور کیا تذلل ہوسکتا ہے کہ اپنی پیشانی اس کے سامنے زمین پر رکھ دے، اس لیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ سجدہ میں تعبد و تعظیم کی تقسیم ہی صحیح نہیں، خود سجدہ بہیئتہٖ تعبد ہے، عبادت کے معنیٰ علیٰ حدالکمال اس میں موجود ہیں، اس میں شک نہیں کہ بہت سے مسلمان فسادِ عقیدہ کی وجہ سے سجود بغیر اللہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اور اسلام کے بنیادی عقیدۂ توحید کے تقاضوں سے تغافل برتتے ہیں، بعض علماء نے سجدۂ تعبد اور سجدۂ تعظیم میں فرق نہیں کیا، چنانچہ علامہ شوکانی نے اس میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے ''الدرر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید''

مگر علمائے محققین ''سجود لغیر اللہ تعبداًو تعظیماً ''میں فرق کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سجود لغیر اللہ تعبداً تو یقیناً شرکِ جلی ہے، بت پرستی ہی کے حکم میں ہے، اس کا مرتکب مؤبد ومخلد فی النار ہے، اور سجدہ لغیر اللہ خواہ احیاء کے لیے ہو یا اموات کے لیے تعظیماً یعنی بنیتِ تعظیم شرکِ جلی نہیں، اس کا حکم بت پرستی کا حکم نہیں ہے، اس کا مرتکب مستوجب القتل اور مؤبد فی النار نہیں ہوگا، ہاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بھی شریعتِ محمدیہ میں بالکل حرام وشرک کا شعبہ اور گناہِ کبیرہ ہے، اس کا مرتکب مبتدع وفاسق ہے، مستحقِ تعزیر وعذابِ جہنم ہے۔

محققین دونوں کے حکم میں فرق کرتے ہیں، محققین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سجدۂ لغیر اللہ کو مطلقاً اور علی العموم شرکِ جلی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ تو ہوا ہے کہ مختلف شریعتوں میں حلال وحرام اور دوسرے احکام میں نسخ وتبدیلی ہوئی، یعنی بعض چیزیں جو اس امت پر حرام ہیں، پہلے کسی امت پر حلال تھیں یا بالعکس، بلکہ اس قسم کا نسخ وتبدل تو ایک ہی شریعت میں بھی مختلف زمانوں میں ہوا ہے، چنانچہ شراب وغیرہ کے حکم

میں یہ ظاہر ہے، مگر یہ متفق علیہ اور یقینی بات ہے کہ دنیا کی ابتداء سے آج تک آدم علیہ السلام سے لے کر سید ولدِ آدم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی نبی کی شریعت میں ایک لمحہ کے لیے بھی شرکِ جلی کو جائز نہیں رکھا گیا، اور نہ کسی امت میں ایک سیکنڈ کے لیے عبادتِ غیر اللہ کو گوارا کیا گیا۔

وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین له الدین ، حنفآء (البینۃ ، آیت نمبر ۵)

اور انہیں صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں ایک رخ ہو کر خالص اسی کی اطاعت کی نیت سے۔

انبیاء کی شریعتوں میں فروعات کے اعتبار سے کچھ اختلاف تھا، مگر اصل الاصول یعنی توحید میں اور شرکِ جلی وغیرُ اللہ کی عبادت سے منع کرنے میں ایک رائی برابر بھی اختلاف نہیں تھا۔

جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی، تو اب دیکھیے کہ خود قرآن ہی میں دو جگہ سجدۂ غیر اللہ کا ذکر ہے، ایک تو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ان کے بھائیوں کا سجدہ کرنا، کیا یہ سجدہ شرکِ جلی تھا؟ اگر شرکِ جلی ہوتا، تو یوسف علیہ السلام جو کہ نبی ہیں، ان کے سامنے خود انہیں کے لیے کس طرح کیا گیا، حالانکہ اس سے پہلے خود ہی سجن (جیل خانہ) میں اس سے برائت ظاہر کی ہے ''**ما کان لنا ان نشرک باللّٰہ من شیئ**'' یعنی ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو کسی چیز میں شریک کریں، اور عبادتِ غیر اللہ سے منع کیا ''**الا تعبدوا الا ایاہ**'' کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔

مزید براں یہ کہ ان ساجدین (یعنی سجدہ کرنے والوں) میں خود حضرت یعقوب علیہ السلام بھی تھے، تو کیا یعقوب علیہ السلام نے نبی ہو کر شرکِ جلی عبادتِ غیر اللہ کا ارتکاب کیا؟

اوراس سجدہ کوشرکِ جلی وعبادتِ غیراللہ کہہ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یوسف علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا، کیونکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شرکِ جلی ایک لمحہ کے لیے کسی شریعت میں جائز نہ تھا، اور اگر لفظِ سجدہ میں محض انحناء یعنی صرف جھکنا وغیرہ تاویل کرنا چاہیں، تو ’’خروا لہ سجدا‘‘ قرآن کے ان الفاظ میں اس تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔

دوسرا حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کا سجدہ کرنا، یہ خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، جس کو بجانہ لانے پر ابلیس ملعون ہوا، تو کیا اللہ تعالیٰ نے شرکِ جلی وعبادتِ غیرُ اللہ کا حکم کیا، یہاں بھی ’’فقعوا له ساجدین‘‘ قرآن کا لفظ ’’قعوا‘‘ اس پر دلالت کرتا ہے کہ سجدہ کے حقیقی معنیٰ مراد ہیں، تاویلِ انحناء صحیح نہیں ہے۔

لامحالہ ان دونوں جگہ آپ کو اقرار کرنا ہوگا کہ سجدہ تعظیماً تھا، تعبداً نہ تھا، اور ان دونوں میں فرق کرنا ہوگا کہ سجدۂ تعظیمی شرکِ جلی وبت پرستی کے حکم میں نہیں، ہاں شریعتِ محمدیہ میں یہ حرام ہے، معصیتِ کبیرہ ہے، فسق ہے، یوسف علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا، بقول حافظ عمادالدین ابنِ کثیر رحمہ اللہ ’’فافھم‘‘ اور انصاف سے دیکھا جائے، تو مطلق سجدہ کو ہرگز شرکِ جلی نہیں کہہ سکتے (فضل الباری شرح اردو صحیح البخاری، ج ا ص ۲۱۶ تا ۲۱۸، از مولانا شبیر احمد عثمانی، شارحِ بخاری کا سفرِ حجاز اور تحقیق مسئلہ سجود، ناشر: مکتبہ مدنیہ، لاہور، تاریخ طبع: شوال ۱۳۹۳ ہجری، نومبر 1973 عیسوی)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، کی مندرجہ بالا تقریر، اس موقف کے مطابق ہے، جو پیچھے علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی مختلف عبارات سے معلوم ہوا۔

علامہ احمد رضا خان بریلوی کا حوالہ

جناب احمد رضا خان بریلوی صاحب نے اپنے رسالہ ’’الزبدۃ الزکیۃ لتحریم سجود

التحیۃ‘‘ میں بھی یہی تفصیل بیان کی ہے کہ غیر اللہ کے لیے سجدہ عبادت تو یقینی طور پر شرکِ جلی اور واضح کفر ہے، لیکن قبر وغیرہ کو سجدۂ تحیہ یقینی طور پر حرام اور کبیرہ گناہ ہے، اور اس کے کفر ہونے میں اختلاف ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ وہ شرکِ جلی اور واضح کفر کے بجائے، کفرِ صوری میں داخل ہے۔

موصوف کے اس رسالہ کا ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

> سجدہ حضرت عزت جلالہٗ کے سوا کسی کے لیے نہیں، اس کے غیر کو سجدۂ عبادت یقیناً اجماعاً شرکِ مہین وکفرِ مبین، اور سجدۂ تحیہ حرام وگناہ کبیرہ بالیقین، اور اس کے کفر ہونے میں اختلاف علمائے دین، ایک جماعت فقہاء سے تکفیر منقول اور عند التحقیق وہ کفرِ صوری پر محمول ’’کما سیأتی بتوفیق المولیٰ سبحانہٗ وتعالیٰ‘‘ ہاں مثلِ صنم وصلیب وشمس وقمر کے لیے سجدے پر مطلقاً کفار ’’کما فی شرح المواقف وغیرہ من الاسفار‘‘ ان کے سوا مثل پیر ومزار کے لیے ہرگز ہرگز نہ جائز ومباح، جیسا کہ زید کا ادعائے باطل، نہ شرکِ حقیقی نا مغفور جیسا کہ وہابیہ کا زعمِ باطل، بلکہ حرام ہے، اور کبیرہ وفحشاء ’’فیغفر لمن یشآء ویعذب من یشآء‘‘ (فتاویٰ رضویہ، ج۲۲، ص۴۲۹، ۴۳۰، رسالہ ’’الزبدۃ الزکیۃ لتحریم سجود التحیۃ‘‘
>
> مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور، اشاعت: جمادی الاخریٰ 1423 ہجری، اگست 2002 عیسوی)

خلاصہ یہ کہ غیرُ اللہ کو سجدہ کرنے کا شرکِ جلی ہونا نہ ہونا، اگرچہ مجتہد فیہ مسئلہ ہے، لیکن مشائخِ دیوبند اور بعض دوسرے فقہائے کرام کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اگر بقصدِ عبادت اور بصورتِ عبادت نہ ہو، تو کفرِ اکبر اور شرکِ جلی نہیں، اور جو مسلمان قبروں کو سجدہ کرتے ہیں، وہ بطورِ عبادت نہیں کرتے، اور صورتِ شرک بھی اس میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ یہ مشرکین وکفار میں رائج نہیں، اس لیے مذکورہ صورت میں اس کو حرام قرار دیا جائے گا، اور اس سے منع کیا جائے گا، اور تعزیر بھی کی جائے گی، لیکن ارتداد قرار نہیں دیا جائے گا۔

اور اسی موقف کی تائید علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی مختلف عبارات سے ہوتی ہے۔

رہا اس کو نصوص میں شرک قرار دینے کا معاملہ، تو نصوص میں بعض امور پر شرک کا حکم اس لیے بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات حقیقی اور بعض اوقات مجازی شرک ہوتا ہے، جس کی نظیر غیراللہ کی قسم اٹھانے کا مسئلہ ہے۔

لہٰذا اگر وھابیہ اور نجدیہ، قبر کو سجدہ کرنے پر شرکِ جلی کا حکم لگاتے ہیں، اگرچہ وہ بطورِ عبادت کے نہ ہو، تو یہ ان کا موقف ہے، اور وہ اجتہادی طور پر اس کو اختیار کرنے اور ترجیح دینے پر گناہ گار نہ ہوں گے، لیکن اسی کے ساتھ ان کو مسئلہ ہٰذا کے اجتہادی ہونے کی وجہ سے دوسرے موقف کو بالکلیہ رَد کرنا بھی مناسب نہیں۔

اس باب میں جو علامہ ابنِ تیمیہ ومشائخِ دیوبند کے مختلف حوالہ جات پیش کیے گئے اور اس سے پہلے شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور ان کے متبعین ودیگر اہلِ علم حضرات کی عبارات پیش کی گئیں، ان سب سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں ایسا کوئی بنیادی اختلاف نہیں، جو اصولی درجہ کا ہو اور اس کی وجہ سے کسی بھی ایک جماعت کی تکفیر یا تفسیق کی جائے، البتہ اسی کے ساتھ ممکن ہے کہ مذکورہ تمام اختلافی مسائل میں یا بعض اختلافی مسائل میں کسی کا رجحان ایک جماعت کے موقف کی طرف ہو اور کسی کا رجحان دوسری جماعت کی طرف ہو، اور جب تک یہ رجحان اپنی حدود اور نیک نیتی پر مبنی وقائم رہے، اس وقت تک اس کو قابلِ نکیر وقابلِ مذمت وملامت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

البتہ جب اس میں افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو پھر اس طرزِ عمل کو اس افراط یا تفریط کی وجہ سے قابلِ نکیر وقابلِ مذمت قرار دیے جانے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔

واللہ أعلم.

خلاصۂ کلام

اس مضمون میں شروع سے اب تک جو بحث کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اوران کے متبعین، خواہ وہ سعودیہ کے حکمران ہوں، یا اس سلسلے کے علمائے کرام یا پھر عوام، ان کے بنیادی عقائد وافکار ایسے نہیں کہ جن کی بنا پر ان کو اسلام یا اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج قرار دے دیا جائے، بلکہ ان کے اصل عقائد وافکار اہلُ السنۃ والجماعۃ کے موافق ہیں، اور جن فکری وعملی مسائل میں ان کا دوسروں اور بالخصوص مشائخِ دیوبند سے اختلاف ہے، وہ اجتہادی، وفقہی اور فروعی نوعیت کا ہے، جس طرح کا اختلاف خود متکلمینِ اہلُ السنۃ والجماعۃ اور فقہاء ومجتہدین اوران کے متبعین کے درمیان ہے۔

البتہ ہر فرقہ وجماعت اور ہر سلسلہ میں کچھ ایسے لوگوں کا وجود ممکن ہے، جو افراط یا تفریط کا شکار ہوگئے ہوں، حنفیہ کے نام اور نسبت سے بھی کئی اہلِ بدعت فرقے وجود میں آئے، اور اب بھی ہیں، لیکن ان کی وجہ سے اصل مسلک اور صاحبِ مسلک کو غلط قرار نہیں دیا جاتا۔

اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق بہت سی باتیں مخالفین ومعاندین کی طرف سے جھوٹی اور بہتان والزام تراشی پر مبنی پھیلائی گئیں، جن میں ان کو دائرہ اسلام یا اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج، اور گستاخِ رسول وغیرہ کہا گیا، لیکن وہ باتیں بے بنیاد، بہتان والزام تراشیوں پر مبنی ثابت ہوئیں، اگرچہ ان غلط فہمیوں میں دین دار لوگ بھی دوسروں کی باتوں سے متاثر ہوئے۔

اور پھر ایک مہم کے طور پر توحید کے داعی اور سنت پر عمل کرنے اور شرک وبدعات سے روکنے والوں سے نفرت پیدا کرنے کے لیے ''وھابیت'' کا لفظ ایجاد واستعمال کیا گیا، جس سے مسلمانوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلیں، جن کا حقیقت سے تعلق نہ تھا۔

اس قسم کی غلط فہمیوں سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔

اور بعض دوسرے اہلِ علم کی طرح شروع میں بعض مشائخِ دیوبند کو بھی محمد بن عبدالوہاب نجدی

اور ان کے متبعین کے متعلق بہت سی باتیں متضاد یا ایسی پہنچی تھیں کہ جو واقعی اختلافِ شدید اور ان باتوں کے مرتکب کے گمراہ وفاسق ہونے کا باعث تھیں، جس کی وجہ سے انہوں نے پہلے اسی کے مطابق سخت حکم لگایا، لیکن بعد میں جب اہلِ نجد کے علماء وحکمرانوں وغیرہ سے بالمشافہ ملاقات کرنے یا ان کی مستند ومعتبر کتب ومضامین ملاحظہ کرنے کے بعد سابقہ کئی باتوں کا خلافِ حقیقت ہونا معلوم ہوا، تو ان حضرات نے اس کی وضاحت فرمائی، اور سابق سخت موقف سے رجوع فرمالیا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ جس قول سے رجوع کرلیا جائے، وہ منسوخ شمار ہوتا ہے۔

البتہ جن مسائل میں ان کا محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین سے اجتہادی وفروعی نوعیت کا اختلاف موجود ہے، اس کو تسلیم کرنا چاہیے، قطع نظر اس سے کہ کس کے نزدیک کون سا قول راجح اور کون سا قول مرجوح ہے، یہ الگ معاملہ ہے۔

ماقبل میں ان تمام باتوں کو تفصیل وتشریح کے ساتھ باحوالہ بیان کردیا گیا ہے، جس کے بعد اس بات کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ان فروعی مسائل کی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوا جائے اور ایک دوسرے کے خلاف گمراہی وضلالت کے فتوے صادر کیے جائیں اور آپس میں بدگمانی وبدزبانی کا ارتکاب کرکے وحدتِ امت کو نقصان پہنچایا جائے۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے اور باہمی اتحاد واتفاق کی توفیق عطاء فرمائے، اور تعصب اور افراط وتفریط اور بے جا انتشار وتفریق سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

فقط

وَاللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعۡلَمُ وَعِلۡمُہٗ اَتَمُّ وَاَحۡکَمُ.

محمد رضوان خان

26/ جمادی الاخریٰ/ 1440ھجری۔ 04/ مارچ/ 2019ء، بروز پیر

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی وتحقیقی سلسلہ

قیامِ رمضان وباجماعت نوافل کی تحقیق

قیامِ رمضان اور تراویح کی فضیلت اور اس کی حقیقت
قیامِ رمضان اور تراویح کی تعداد اور تراویح کو باجماعت پڑھنے کا حکم
نفل نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کے متعلق فقہائے کرام کے اقوال
اور اس سلسلہ میں مختلف پہلوؤں پر علمی وتحقیقی کلام

مؤلف
مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان
www.idaraghufran.org

نام کتاب: قیامِ رمضان و باجماعت نوافل کی تحقیق

مصنف: مفتی محمد رضوان خان

طباعتِ اوّل: ذوالقعدۃ 1441ھ - جولائی 2020ء

صفحات: 158

ملنے کا پتہ

کتب خانہ ادارہ غفران: چاہ سلطان، گلی نمبر 17، راولپنڈی، پاکستان

فون 051-5507270 فیکس 051-5702840

www.idaraghufran.org

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین
489	تمہید (من جانبِ مؤلف)
491	سوال
493	جواب
497	(فصل نمبر 1) تطوع ونفل کی جماعت سے متعلق فقہاء کے اقوال
506	''المجموع شرحُ المھذب'' کا حوالہ
507	شرح مختصر خلیل کا حوالہ
508	''کشافُ القناع'' کا حوالہ
509	علامہ ابنِ تیمیہ کا حوالہ
510	''کتابُ الاصل'' اور امام محمد کا حوالہ
514	''المبسوط للسرخسی'' اور ''المحیطُ البرھانی'' کا حوالہ
517	''البحرُ الرائق'' اور ''منحۃُ الخالق'' کا حوالہ
518	''شرحُ العینی علی الکنز'' کا حوالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(من جانبِ مؤلف)

مدتِ دراز سے حرم شریف میں رمضان کے آخری عشرہ میں بیس رکعات تراویح کے علاوہ رات کے آخری حصہ میں قیامُ اللیل کے نام سے نوافل کی جماعت کا معمول ہے، اس نماز میں دنیا بھر سے آئے ہوئے زائرین ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔

جبکہ مشائخِ حنفیہ کے بیان کردہ مشہور قول کے مطابق نوافل کی جماعت مکروہ ہے، جس سے موجودہ دور کے متعدد اہلِ افتاء کے نزدیک مکروہ تحریمی ہونا مراد لیا جاتا ہے، اور اس بناء پر وہاں نوافل کی جماعت میں شرکت کو بھی ممنوع اور گناہ کا باعث قرار دیا جاتا ہے، جس پر عوام الناس کی طرف سے طرح طرح کے شبہات کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے یہاں پاکستان وہندوستان اور بنگلہ دیش وغیرہ میں بعض مقامات پر ماہِ رمضان کی راتوں میں بیس تراویح سے فراغت کے بعد یا رمضان کے آخری عشرہ میں بعض لوگ یا حفاظ باجماعت نوافل ادا کرتے ہیں، عام مشائخِ حنفیہ کے قول کے مطابق اس کو بھی نوافل کی جماعت کے مکروہ ہونے کے باعث ناجائز قرار دیا جاتا ہے، متعدد مشائخِ دیوبند کے فتاویٰ کے مطابق بھی اس کی اجازت نہیں، جبکہ مالکیہ، شافعیہ وحنابلہ اور اسحاق بن راہویہ کا اس میں اختلاف ہے، نیز بعض مشائخِ دیوبند مثلاً حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ رمضان میں تراویح کے علاوہ نوافل کی جماعت کو جائز قرار دیتے ہیں، اور حضرت شیخ الہند نیز حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہما اللہ وغیرہ کے معمول اور اہلِ حرم، نیز مالکیہ وحنابلہ اور شافعیہ وغیرہ کے قول کو حجت میں پیش کرتے ہیں۔

موجودہ دور کے متعدد حنفی حضرات ماہِ رمضان میں نوافل کی جماعت کے جواز میں اس کو دلیل کے طور پر ذکر کرتے ہیں، جبکہ بعض حضرات اس کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے تناظر میں ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ اس مسئلہ کو نصوص اور حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہائے کرام کے وسیع تر اقوال کے تناظر میں تفصیل سے بیان کیا جائے۔

اسی مقصد کے لیے بندہ نے ایک سوال کے جواب میں مسئلہ ہٰذا کو مفصلاً تحریر کیا ہے، جو آئندہ اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر یہ امر قابلِ ملاحظہ ہے کہ پہلے بندہ نے اس مسئلہ کو صرف مشائخِ حنفیہ کے مشہور قول کے مطابق اجمالاً تحریر کیا تھا، جو بندہ کی مفصل کتاب ''نمازِ تراویح کے فضائل واحکام'' وغیرہ کا حصہ بن کر شائع ہوا تھا، لیکن اب نصوص اور صحابۂ کرام وتابعینِ عظام، نیز حنفیہ کے علاوہ غیر حنفی فقہائے کرام کے وسیع تر اقوال ملاحظہ کرنے کے بعد بندہ کی رائے میں لچک پیدا ہوگئی، اور مسئلہ ہٰذا کے مجتہَد فیہ اور فقہائے کرام کے مابین مختلَف فیہ ہونے کی وجہ سے رمضان میں بیس رکعات تراویح سے زائد تطوع کی جماعت کے فی نفسہٖ حرام یا مکروہ تحریمی قرار دینے کے قول کی طرف رجحان نہیں رہا، بلکہ اس کے جواز کی طرف رجحان ہوا، تا آنکہ اس میں کوئی دوسرا منکر شامل ہو، جس کی تفصیل اس آنے والے مضمون میں مذکور ہے، اور اب بندہ اس سلسلہ میں اپنے سابق سخت کراہت وحرمت والے موقف سے رجوع کرتا ہے۔

اسی کے ساتھ بندہ دیگر اہلِ علم حضرات سے بھی درخواست کرتا ہے کہ وہ اس قسم کے مجتہَد فیہ مسائل میں بے شک فقہائے کرام ومشائخِ عظام میں سے کسی کے قول کو بیان کریں، اور ان میں سے کسی قول کو اختیار کریں، اور ترجیح دیں، لیکن دیگر فقہاء ومجتہدین کے اقوال پر بے جا نکیر وتشدد کرنے سے اجتناب فرمائیں، جس کی موجودہ تشدد وانتہاء اور تعصب پرستی کے دور میں سخت ضرورت ہے، اور اس اہم پہلو کی طرف برسہا برس کے تجربہ ومطالعہ سے بندہ کی توجہ ہوئی ہے۔ فلِلّٰہ الحمد. والشکر علیٰ ذالک۔ محمد رضوان خان

01/ صفر المظفر/ 1439ھ 22/ اکتوبر/ 2017ء بروز اتوار

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال

ہمارا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے، تبلیغی جماعت میں بہت سے علماء اور حفاظِ کرام بھی سفر کرتے ہیں، اسی دوران ماہِ رمضان بھی آ جاتا ہے، اور مختلف مسجدوں میں چل پھر کر ہمارا کام ہوتا ہے، ایک مسجد میں پورا قرآن مجید پڑھ یا سن کر پورا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

مقامی مساجد میں وہاں کے مقررہ حفاظِ کرام تراویح پڑھاتے ہیں، جبکہ جماعت میں چلنے والے حفاظ، قرآن سنانے سے بھی محروم رہتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کو قرآن کا یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، اور مقامی مسجد میں تراویح سے الگ ہو کر اپنی الگ جماعت کرنا بھی فتنہ کا باعث ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں مقاصد کے لیے یہ طریقہ نکالا جاتا ہے کہ بیس تراویح کے بعد جب لوگ مسجد سے چلے جاتے ہیں، تو حافظ قرآن نوافل میں قرآن سناتا ہے، اور باقی جماعت کے ساتھی قرآن سنتے ہیں۔

لیکن بعض علمائے کرام اس طریقہ کو نفل نماز کی جماعت کی وجہ سے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل ماہِ رمضان المبارک میں دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان حرمین شریفین کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، اور مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی میں نمازِ تراویح ادا کرتے ہیں، اور بہت سے لوگ وہاں رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف بھی کرتے ہیں۔

جبکہ وہاں پر رمضان کے آخری عشرہ میں عشاء کے بعد تراویح کی نماز پڑھ کر رات کے آخری حصہ میں دوبارہ نوافل کی باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے، جس کو ''قیام اللیل'' یا ''قیامِ رمضان'' کا نام دیا جاتا ہے۔

بعض علمائے کرام کا کہنا یہ ہے کہ بیس رکعات تراویح کی نماز تو باجماعت پڑھنا جائز ہے، لیکن

اس کے بعد مزید ''قیام اللیل'' یا ''قیامِ رمضان'' کے نام سے باجماعت نماز پڑھنا یا تراویح کے بعد نفل نماز باجماعت پڑھنا جائز نہیں، بلکہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس نماز میں شرکت کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ عام نفل نمازیں باجماعت بڑے مجمع کے ساتھ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جس کا درجہ حرام کے قریب ہے۔ اور وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہمارے یہاں رمضان کے آخری عشرہ میں جو بعض جگہ شبینہ کا رواج ہے، اہلِ علم حضرات نے اس کے مکروہ تحریمی ہونے کا اسی لیے حکم لگایا ہے کہ وہ تراویح کے بعد نفل نماز کی شکل میں باجماعت ادا کیا جاتا ہے، اور نفل نماز کا باجماعت ادا کرنا جائز نہیں۔

جبکہ بعض اہلِ علم حضرات حرم شریف کی قیام اللیل والی نماز کو جائز کہتے ہیں، اور اس میں شرکت کو بھی جائز قرار دیتے ہیں، اور رمضان میں بیس تراویح کے بعد مزید نوافل کی جماعت کو بھی جائز کہتے ہیں، البتہ اگر اس میں کوئی دوسری خرابی شامل ہو، مثلاً ریاء کاری یا اسراف اور فضول خرچی وغیرہ، پھر اس سے منع کرتے ہیں۔

اور اس سلسلہ میں بعض علمائے دیوبند خاص طور پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہما اللہ کا حوالہ دیتے ہیں کہ یہ حضرات رمضان میں تراویح کے علاوہ تہجد کی نماز بھی باجماعت ادا کیا کرتے تھے، جس کا ذکر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''فضائلِ رمضان'' میں کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے تحریر بھی لکھی تھی، یہ تحریر ''فتاویٰ شیخ الاسلام'' میں بھی شائع ہوئی ہے (جن کی عکسی نقول ارسال ہیں)

بعض علماء کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر امام تراویح پڑھا رہا ہو اور سارے مقتدی نوافل پڑھ رہے ہوں، تو پھر جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہے، جبکہ بعض علماء اس کو بھی ناجائز کہتے ہیں۔

اس طرح ہمارے یہاں علماء اور ان کی اتباع میں عوام کے بھی دو طبقے ہوگئے ہیں، جو ایک دوسرے کے خلاف سخت موقف اختیار کرتے ہیں۔

آپ سے اس سلسلہ میں تفصیلی تحقیق کی درخواست ہے۔ بینوا وتوجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواب

آج کل شرعی احکام کے سلسلہ میں بہت سے اہلِ علم حضرات کا مطالعہ وسیع نہ ہونے ،اور فقہائے کرام کے بیان کردہ وسیع تر فقہی اقوال کا علم نہ ہونے یا کسی قول پر بے جا اصرار اور جمود اختیار کرنے کی وجہ سے علماء میں بھی دونوں طرف تشدد والا رویہ سامنے آتا ہے،اور اس مسئلہ کے دوسرے پہلو اور اس سلسلہ میں پائے جانے والے فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے دوسرے اقوال ومذاہب پر بے جا نکیر کی جاتی ہے،اور اس سے بڑھ کر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی اور مناظرے ومجادلہ کا بازار گرم کیا جاتا ہے،ایک دوسرے پر فسق وغیرہ تک کے فتوے لگائے جاتے ہیں، جس کے دنیا میں بھی تباہ کن اثرات ظاہر ہورہے ہیں، جبکہ آخرت کا وبال الگ ہے۔

فقہی ومجتہَد فیہ فروعی مسائل میں جانبِ مخالف مجتہد فقیہ کی رائے پر نکیر سے فقہائے کرام نے منع فرمایا ہے،اور خود اس طرزِ عمل کو شرعی اعتبار سے فعلِ منکر کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> جس مسئلہ میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو،اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی، کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن وسنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے،اس لیے دونوں جانبین داخل معروف ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جاسکتا ہے،اس لیے ان مسائل مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک منکر ہے، یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز وعدم جواز اور حرمت وحلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو، جیسے منکرات پر کی جاتی ہے، یا ایک دوسرے کو یا اس کے متبعین کو گمراہی یا فسق وفجور کی طرف منسوب کرتا ہو یا اس

کو ترک وظیفہ یا ارتکابِ حرام کا مجرم قرار دیتا ہو، حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی اس پر شاہد ہے، جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ یعنی اس کو خطا وار مجرم کہنا جائز نہیں (جواہر الفقہ، جلد اول، ص۴۰۸، ۴۰۹، مضمون ''وحدتِ امت'' مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ 1431ھ، نومبر 2010ء)

مذکورہ امور کی فقہائے کرام نے بھی تصریح وتفصیل بیان فرمائی ہے، جو موجودہ دور کے اصحابِ علم کے لیے قابلِ توجہ ہے، جس کے ساتھ زیرِ بحث مسئلہ کا بھی تعلق ہے۔ [۱]

---

[۱] والمعروف المطلق ما هو حق عند الله تعالى فأما ما يؤدى إليه اجتهاد المجتهدين فإنه غير معروف مطلقا إذ المجتهد يخطىء ويصيب ولكنه معروف فى حقه على معنى أنه يلزمه العمل به ما لم يتبين خطؤه ففى هذا بيان أن المعروف المطلق ما يجتمعون عليه(أصول السرخسى،لشمس الأئمة السرخسى، ج ا ،ص ٢٩٦ ،باب بيان معانى الحروف المستعملة فى الفقه،فصل فى بيان أن إجماع هذه الأمة موجب للعلم)

محل الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر وشروطه:

أ -كون المأمور به معروفا فى الشرع، وكون المنهى عنه محظور الوقوع فى الشرع.

ب -أن يكون موجودا فى الحال، وهذا احتراز عما فرغ منه.

ج -أن يكون المنكر ظاهرا بغير تجسس، فكل من أغلق بابه لا يجوز التجسس عليه، وقد نهى الله عن ذلك فقال :(ولا تجسسوا) وقال :(وأتوا البيوت من أبوابها) وقال :(لا تدخلوا بيوتا غير بيوتكم حتى تستأنسوا وتسلموا على أهلها).

د -أن يكون المنكر متفقا على تحريمه بغير خلاف معتبر، فكل ما هو محل اجتهاد فليس محلا للإنكار، بل يكون محلا للإرشاد (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٦، ص ٢٤٩، ٢٥٠، مادة ''الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر'')

يشترط فى المنكر المطلوب تغييره ما يلى:

الشرط الأول :أن يكون محظورا فى الشرع.

الشرط الثانى :أن يكون المنكر موجودا فى الحال بأن يكون الفاعل مستمرا على فعل المنكر فإن علم من حاله ترک الاستمرار على الفعل لم يجز إنكار ما وقع على الفعل.

الشرط الثالث :أن يكون المنكر ظاهرا بغير تجسس.

الشرط الرابع :أن يكون المنكر معلوما بغير اجتهاد أى أن يكون المنكر مجمعا على تحريمه.

وقال الغزالى :ولا يقتصر الإنكار على الكبيرة بل يجب النهى عن الصغائر أيضا.

قال الزرقانى :يشترط فى المنكر الذى يجب تغييره :معرفته، وأن لا يؤدى ذلک إلى ما هو أعظم منه مفسدة، وأن يظن الإفادة.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اوراجتہادی امور میں جس اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے فقیہ کا رجحان جس قول کی طرف ہو،

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾والأولان شرطان للجواز فيحرم عند فقدهما، والثالث للوجوب فيسقط عند عدم ظن الإفادة، ويبقى الجواز إن لم يتأذ فى بدنه أو عرضه، وإلا انتفى الجواز أيضا.
ويشترط أيضا فى المنكر الذى يجب تغييره :أن يكون مما أجمع على تحريمه أو ضعف مدرك القائل بجوازه، وأما ما اختلف فيه فلا ينكر على مرتكبه إن علم أنه يعتقد تحليله بتقليده القائل بالحل(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٣٩، ص ١٢٤، ١٢٥، مادة "منكر")
الشرط الرابع :أن يكون المنكر معلوما بغير اجتهاد، فكل ما هو محل للاجتهاد فلا حسبة فيه وعبر صاحب الفواكه الدوانى عن هذا الشرط بقوله :أن يكون المنكر مجمعا على تحريمه، أو يكون مدرك عدم التحريم فيه ضعيفا وبيان ذلك :أن الأحكام الشرعية على ضربين:
أحدهما :ما كان من الواجبات الظاهرة كالصلاة والصيام والزكاة والحج، أو من .المحرمات المشهورة كالزنى، والقتل، والسرقة، وشرب الخمر، وقطع الطريق، والغصب، والربا، وما أشبه ذلك فكل مسلم يعلم بها ولا يختص الاحتساب بفريق دون فريق.
والثانى :ما كان فى دقائق الأفعال والأقوال مما لا يقف على العلم به سوى العلماء ، مثل فروع العبادات والمعاملات والمناكحات وغير ذلك من الأحكام، وهذا الضرب على نوعين:
أحدهما :ما أجمع عليه أهل العلم وهذا لا خلاف فى تعلق الحسبة فيه لأهل العلم ولم يكن للعوام مدخل فيه.
والثانى :ما اختلف فيه أهل العلم مما يتعلق بالاجتهاد، فكل ما هو محل الاجتهاد فلا حسبة فيه .
ولكن هذا القول ليس على إطلاقه بل المراد به الخلاف الذى له دليل، أما ما لا دليل له فلا يعتد به ويقرر هذا الإمام ابن القيم بأن الإنكار إما أن يتوجه إلى القول والفتوى، أو العمل.
أما الأول فإذا كان القول يخالف سنة أو إجماعا شائعا وجب إنكاره اتفاقا، وإن لم يكن كذلك فإن بيان ضعفه ومخالفته للدليل إنكار مثله، وأما العمل فإذا كان على خلاف سنة أو إجماع وجب إنكاره بحسب درجات الإنكار، وكيف يقول فقيه لا إنكار فى المسائل المختلف فيها، والفقهاء من سائر الطوائف قد صرحوا بنقض حكم الحاكم إذا خالف كتابا أو سنة، وإن كان قد وافق فيه بعض العلماء .وأما إذا لم يكن فى المسألة سنة أو إجماع وللاجتهاد فيها مساغ لم تنكر على من عمل بها مجتهدا أومقلدا وقال الإمام النووى :ولا ينكر محتسب ولا غيره على غيره، وكذلك قالوا :ليس للمفتى ولا للقاضى أن يعترض على من خالفه إذا لم يخالف نصا أو إجماعا أو قياسا جليا .وهذا الحكم متفق عليه عند الأئمة الأربعة، فإن الحكم ينقض إذا خالف الكتاب أو السنة أو الإجماع أو القياس(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج١٧، ص ٢٥٧،و٢٥٨، مادة "حسبة")
إن كان الفعل متفقا على بطلانه، فإنكاره واجب على مسلم .أما إن كان مختلفا فيه، فلا إنكار فيه.
قال الزركشى :الإنكار من المنكر إنما يكون فيما اجتمع عليه، فأما المختلف فيه فلا إنكار فيه؛ لأن كل مجتهد مصيب، أو المصيب واحد.ولا نعلمه، ولم يزل الخلاف بين السلف فى الفروع، ولا ينكر أحد على غيره أمرا مجتهدا فيه، وإنما ينكرون ما خالف نصا، أو إجماعا قطعيا أو قياسا جليا، وهذا إذا كان الفاعل لا يرى تحريمه، فإن كان يراه فالأصح الإنكار(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٨، ص ١٠٩، ١١٠، مادة "بطلان") ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

خواہ اس نے اس مسئلہ میں جزوی اجتہاد ہی کیوں نہ کیا ہو، اس کو اسے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، اور اس کو اس پر ملامت کرنا یا اسے دوسرے یا اپنے مخصوص مسلک کے قول کو اختیار کرنے پر مجبور یا اس کا مکلّف قرار دینا درست نہیں، بلکہ بے جا تعصب میں داخل ہے۔ [1]

اس کے بعد عرض ہے کہ آپ نے سوال میں جن امور کا ذکر کیا ہے، ان کو علمی اعتبار سے سمجھنے کے لیے تفصیل کی ضرورت ہے۔ اس لیے آگے اس مسئلہ کے متعلق نوافل کی جماعت اور پھر رمضان میں تراویح وتطوع کی جماعت کے حکم کو الگ الگ فصلوں کے تحت ذکر کیا جاتا ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾وإن ترک النبی صلی الله علیه وسلم الإنکار علی ما یراه من الأفعال، أو ما یسمعه من الأقوال، یدل علی جواز ذلک الفعل أو القول، وأنه لا بأس به شرعا .وهذا الترک هو أحد أصول الأدلة الشرعیة، وهو نوع من أنواع السنة النبویة، ویسمیه الأصولیون (الإقرار) أو (التقریر)(الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج۷، ص ۲۶، مادة "إنکار")

[1] قال (الامام احمد بن حنبل)من أفتی الناس لیس ینبغی أن یحمل الناس علی مذهبه ویشدد علیهم(الآداب الشرعیة لابن مفلح، ج۲ص ۵۹، فصل فی قول العالم لا أدری واتقاء التهجم علی الفتوی)

وبهذا التقریر یعرف السِرُّ فی إقرار کل فریق علی العمل باجتهاده، والسر فی عدم جواز حمل السلطان الناس علی أَحد القولین أو الأقوال وإِلزامهم به، أو علی مذهب فلان وفلان، کما قال مالک وغیره من الأَئمة :لیس للفقیه أَن یحمل الناس علی مذهبه، وفی عدم جواز الِإنکار بالید فی المسائل الاجتهادیة، لکن یُبین الفقیه بسلطان الحجة العلمیة ما یعتقده، ولا یلزم أَحد باتباعه(المدخل المفصل لمذهب الإمام أحمد وتخریجات الأصحاب،لبکر بن عبد الله أبو زید بن محمد بن عبد الله بن بکر بن عثمان بن یحیی بن غیهب بن محمد ، ج ا ،ص ۱۰۴ ، المدخل الاول، المبحث الخامس: الاجتهاد فی الفقه الإسلامی وأثره فی الثروة الفقهیة فی کل مذهب)

وکان سیدی ابن سراج -رحمه الله -یقول :إذا جری الناس علی شیء له مستند صحیح وکان للإنسان مختار غیره لا ینبغی له أن یحمل الناس علی مختاره فیدخل علیهم شغبا فی أنفسهم وحیرة فی دینهم؛ إذ من شرط التغییر أن یکون متفقا علیه، اهـ.

انظر قول عیاض فی الإکمال قال ما نصه :لا ینبغی للآمر بالمعروف والناهی عن المنکر أن یحمل الناس علی مذهبه، وإنما یغیر ما اجتمع علی إحداثه، وإنکاره.

ورشح هذا أیضا محیی الدین الشافعی فی منهاجه فقال :أما المختلف فیه فلا إنکار فیه ولیس للمفتی ولا للقاضی أن یعترض علی من خالفه إذا لم یخالف نص القرآن، أو السنة أو الإجماع، ونحو هذا فی جامع الذخیرة للقرافی، ونحوه فی قواعد عز الدین(التاج والإکلیل لمختصر خلیل، لابی عبدالله محمد بن یوسف الغرناطی المالکی ،المتوفی897 :هـ، ج۲،ص ۴۵۶، کتاب الصلاة، باب فی صلاة الجماعة ،فصل فی صفة الأئمة)

(فصل نمبر 1)

تطوع ونفل کی جماعت سے متعلق فقہاء کے اقوال

اس سلسلہ میں پہلا مسئلہ عام نوافل کو جماعت کے ساتھ پڑھنے سے متعلق ہے، تو اس مسئلہ کو سمجھنے سے قبل تطوع، نفل وغیرہ کی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

تو جاننا چاہیے کہ تطوع ایسے عمل کو کہا جاتا ہے، جو فرائض و واجبات سے نیچے کے درجہ کا عمل ہو، اور اس معنیٰ کے اعتبار سے تطوع کے مفہوم میں سنت، مستحب اور نفل درجہ کی چیزیں بھی داخل ہوتی ہیں، جن کے باہم درجات میں اونچ نیچ کا کچھ فرق ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] البتہ بعض اوقات تطوع کا اطلاق فرائض، واجبات اور سنت کے علاوہ پر کیا جاتا ہے، وفیہ اقوال اُخر۔

التطوع :هو التبرع، يقال :تطوع بالشىء :تبرع به.

وقال الراغب :التطوع فى الأصل :تكلف الطاعة، وهو فى التعارف :التبرع بما لا يلزم كالتنفل .

قال تعالى :(فمن تطوع خيرا فهو خير له)

والفقهاء عندما أرادوا أن يعرفوا التطوع، عدلوا عن تعريف المصدر إلى تعريف ما هو حاصل بالمصدر، فذكروا له فى الاصطلاح ثلاثة معان:

الأول :أنه اسم لما شرع زيادة على الفرائض والواجبات، أو ما كان مخصوصا بطاعة غير واجبة، أو هو الفعل المطلوب طلبا غير جازم .وكلها معان متقاربة .وهذا ما ذكره بعض فقهاء الحنفية، وهو مذهب الحنابلة، والمشهور عند الشافعية .وهو رأى الأصوليين من غير الحنفية، وهو ما يفهم من عبارات فقهاء المالكية .

والتطوع بهذا المعنى يطلق على :السنة والمندوب والمستحب والنفل والمرغب فيه والقربة والإحسان والحسن، فهى ألفاظ مترادفة.

الثانى :أن التطوع هو ما عدا الفرائض والواجبات والسنن، وهو اتجاه الأصوليين من الحنفية، ففى كشف الأسرار :السنة هى الطريقة المسلوكة فى الدين من غير افتراض ولا وجوب، وأما حد النفل -وهو المسمى بالمندوب والمستحب والتطوع -فقيل :ما فعله خير من تركه فى الشرع . إلخ.

الثالث :التطوع :هو ما لم يرد فيه نقل بخصوصه، بل ينشئه الإنسان ابتداء ، وهو اتجاه بعض المالكية والقاضى حسين وغيره من الشافعية.

هذه هى الاتجاهات فى معنى التطوع وما يرادفه .غير أن المتتبع لما ذكره الأصوليون من غير الحنفية، وما ذكره الفقهاء فى كتبهم -بما فى ذلك الحنفية -يجد أنهم يتوسعون بإطلاق التطوع

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور ’’نفل‘‘ کا لفظ بھی تطوع کے قریب قریب معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے، جس کے عام مفہوم میں سنت بھی داخل ہوتی ہے، البتہ بعض اوقات نفل کا لفظ سنت سے نیچے کے درجہ کے عمل پر بولا جاتا ہے۔

تطوع اور نفل عمل کو کرنے میں اجروثواب ہوتا ہے، اور اس کے ترک کرنے اور چھوڑنے کا حکم اس کے درجہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔[1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

علی ما عدا الفرائض والواجبات، وبذلک یکون التطوع والسنة والنفل والمندوب والمستحب والمرغب فیه ألفاظا مترادفة، ولذلک قال السبکی :إن الخلاف لفظی.

غایة الأمر أن ما یدخل فی دائرة التطوع بعضه أعلی من بعض فی الرتبة، فأعلاه هو السنة المؤکدة، کالعیدین، والوتر عند الجمهور، ورکعتی الفجر عند الحنفیة .ویلی ذلک المندوب أو المستحب کتحیة المسجد، ویلی ذلک ما ینشئه الإنسان ابتداء ، لکن کل ذلک یسمی تطوعا والأصل فی ذلک قول النبی صلی الله علیه وسلم للرجل -الذی سأل بعدما عرف فرائض الصلاة والصیام والزکاة :هل علی غیرها؟ فقال له :لا، إلا أن تطوع (الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج۱۲، ص۱۴۶، وص۱۴۷، مادة’’تطوع‘‘)

[1] من معانی النفل -بسکون الفاء وقد تحرک -فی اللغة :الزیادة، والنفل والنافلة :ما یفعله الإنسان مما لا یجب علیه .قال الله تعالی :(ومن اللیل فتهجد به نافلة لک)

وأما فی الاصطلاح :فقد عرفه إبراهیم الحلبی الحنفی بأنه :العبادة التی لیست بفرض ولا واجب، فهی العبادة الزائدة علی ما هو لازم، فتعم السنن المؤکدة والمستحبة والتطوعات غیر المؤقتة.

وقال الدسوقی :النفل ما فعله النبی صلی الله علیه وسلم ولم یداوم علیه، أی یترکه فی بعض الأحیان ویفعله فی بعض الأحیان.وعند الشافعیة :النفل هو ما عدا الفرائض -أی من الصلاة وغیرها کالصوم والصدقة -وهو :ما طلبه الشارع طلبا غیر جازم، ویعبر عنه بالسنة والمندوب والحسن والمرغب فیه والمستحب والتطوع، فهی بمعنی واحد لترادفها علی المشهور.

الألفاظ ذات الصلة:السنة:

السنة فی اللغة :الطریقة والسیرة، یقال :سنة فلان کذا؛ أی طریقته وسیرته، حسنة کانت أو سیئة .

وأما فی الاصطلاح فقد عرفها إبراهیم الحلبی بأنها الطریقة المرضیة المسلوکة فی الدین من غیر إلزام علی سبیل المواظبة.

وقال الدسوقی :السنة ما فعله النبی صلی الله علیه وسلم وأظهره حالة کونه فی جماعة وداوم علیه ولم یدل دلیل علی وجوبه.

وأما الصلة بین النفل والسنة فقد قال الشرنبلالی :النفل أعم، إذ کل سنة نافلة ولا عکس(الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج۴۱، ص۱۰۰، ۱۰۱، مادة’’نفل‘‘)

تطوع اور نفل کے علاوہ ایک تیسرا لفظ ''مستحب'' کا بولا جاتا ہے، مستحب بھی تطوع اور نفل کی طرح ایسے عمل کو کہا جاتا ہے کہ جو فرض اور واجب سے نیچے کے درجہ کا عمل ہو، اور بعض اوقات سنت سے نیچے درجہ کے عمل کو مستحب کہا جاتا ہے۔ [1]

---

[1] الاستحباب فی اللغة :مصدر استحبه إذا أحبه، ویکون الاستحباب بمعنى الاستحسان واستحبه علیه :آثره والاستحباب عند الأصولیین غیر الحنفیة :اقتضاء خطاب الله العقل اقتضاء غیر جازم، بأن یجوز ترکه وضده الکراهیة.

ویرادف المستحب :المندوب والتطوع والطاعة والسنة والنافلة والنفل والقربة والمرغب فیه والإحسان والفضیلة والرغیبة والأدب والحسن.

وخالف بعض الشافعیة فی الترادف المذکور -کالقاضی حسین وغیره -فقالوا :إن الفعل إن واظب علیه النبی صلی الله علیه وسلم فهو السنة، وإن لم یواظب علیه -کأن فعله مرة أو مرتین -فهو المستحب، وإن لم یفعله -وهو ما ینشئه الإنسان باختیاره من الأوراد -فهو التطوع،ولم یتعرضوا للمندوب هنا لعمومه للأقسام الثلاثة بلا شک.

وهذا الخلاف لفظی، إذ حاصله أن کلا من الأقسام الثلاثة، کما یسمی باسم من الأسماء الثلاثة کما ذکر، هل یسمی بغیره منها؟ فقال البعض :لا یسمی، إذ السنة :الطریقة والعادة، والمستحب : المحبوب، والتطوع :الزیادة .والأکثر قالوا :نعم یسمی، ویصدق علی کل من الأقسام الثلاثة أنه طریقة أو عادة فی الدین، ومحبوب للشارع بطلبه، وزائد علی الواجب وذهب الحنفیة إلی أن المستحب هو ما فعله النبی صلی الله علیه وسلم مرة وترکه أخری، فیکون دون السنن المؤکدة کما قال التهانوی، بل دون سنن الزوائد کما قال أبو البقاء الکفوی.

ویسمی عندهم بالمندوب لدعاء الشارع إلیه، وبالتطوع لکونه غیر واجب، وبالنفل لزیادته علی غیره.

وإنما سمی المستحب مستحبا لاختیار الشارع إیاه علی المباح وهم بهذا یقتربون مما ذهب إلیه القاضی حسین، لولا أنهم یختلفون معه فی التطوع، حیث یجعلونه مرادفا للمستحب، ویجعله قسیما له علی ما تقدم، ویفرقون بین المستحب وبین السنة بأنها هی :الطریقة المسلوکة فی الدین من غیر التزام علی سبیل المواظبة، فیخرج المستحب بالقید الأخیر، إذ لا مواظبة علیه من قبل النبی علیه الصلاة والتسلیم.

وبعض الحنفیة لم یفرق بین المستحبات وسنن الزوائد، فقال :المستحب هو الذی یکون علی سبیل العادة، سواء أترک أحیانا أم لا.

وفی نور الأنوار شرح المنار :السنن الزوائد فی معنی المستحب، إلا أن المستحب ما أحبه العلماء ، والسنن الزوائد ما اعتاده النبی علیه السلام.

هذا وقد یطلق المستحب علی کون الفعل مطلوبا، طلبا جازما أو غیر جازم، فیشمل الفرض والسنة والندب، وعلی کونه مطلوبا طلبا غیر جازم فیشمل الأخیرین فقط (الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج۳ص ۲۱۴ و ص ۲۱۵ ،مادة"استحباب")

مستحب عمل کو کرنا اجروثواب کا باعث ہوتا ہے اوراس کے ترک کرنے اور چھوڑنے میں کوئی حرج وگناہ نہیں ہوتا۔ [1]

فقہی زبان میں سنت عمل بھی فرض اور واجب سے نیچے کے درجہ کے عمل کو کہا جاتا ہے، اسی وجہ سے سنت بول کر بعض اوقات تطوع، نفل اور مستحب عمل کو مراد لیا جاتا ہے۔

پھر سنت کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ کہ جس کی شریعت کی طرف سے تاکید بیان کی گئی ہو، اور اس پر پابندی کا حکم فرمایا گیا ہو، اور بلا عذر اس کے ترک کرنے اور چھوڑنے کو برا اور مکروہ قرار دیا گیا ہو، ایسی سنت کو سنتِ مؤکدہ کہا جاتا ہے، اگر شریعت کی طرف سے اس کی تاکید بیان نہ کی گئی ہو، اور بلا عذر اس کے ترک کرنے کو مکروہ اور برا قرار نہ دیا گیا ہو، البتہ اس پر عمل کرنے میں اجروثواب رکھا گیا ہو، اس کو سنتِ غیر مؤکدہ کہا جاتا ہے۔ [2]

---

[1] ذهب الأصوليون -من غير الحنفية -إلى أن المستحب يمدح فاعله ويثاب، ولا يذم تاركه ولا يعاقب وذلک لأن ترک المستحب جائز .غير أن هذا الترک إن ورد فيه نهى غير جازم نظر : فإن كان مخصوصا، كالنهى فى حديث الصحيحين :إذا دخل أحدكم المسجد فلا يجلس حتى يصلى ركعتين كان مكروها، وإن كان نهيا غير مخصوص، وهو النهى عن ترک المندوبات عامة المستفاد من أوامرها، فإن الأمر بالشىء يفيد النهى عن تركه، فيكون خلاف الأولى، كترک صلاة الضحى .وذلک لأن الطلب بدليل خاص آكد من الطلب بدليل عام.

والمتقدمون يطلقون المكروه على ذى النهى المخصوص وغير المخصوص، وقد يقولون فى الأول :مكروه كراهة شديدة، كما يقال فى المندوب :سنة مؤكدة .

أما الحنفية فإنهم ينصون على أن الشىء إذا كان مستحبا أو مندوبا عندهم وليس سنة فلا يكون تركه مكروها أصلا، ولا يوجب تركه إساءة أيضا فلا يوجب عتابا فى الآخرة، كترک سنن الزوائد، بل أولى فى عدم الإساءة وعدم استحقاق العتاب؛ لأنه دونها فى الدوام والمواظبة، وإن كان فعله أفضل ولمعرفة ما تبقى من مباحث الاستحباب، ككون المستحب مأمورا به، وهل يلزم بالشروع فيه؟ يرجع إلى الملحق الأصولى(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٣ص٢١٥ وص٢١٦، مادة "استحباب")

[2] السنة بالاصطلاح الفقهى:

تطلق السنة عند الشافعية والحنابلة :على المندوب، والمستحب، والتطوع، فهى ألفاظ مترادفة، فكل منها عبارة عن الفعل المطلوب طلبا غير جازم.

قال البنانى :ومثلها الحسن أو النفل والمرغب فيه .ونفى القاضى حسين وغيره ترادفها حيث قالوا: إن واظب النبى صلى الله عليه وسلم على الفعل فهو السنة، وإن لم يواظب عليه كأن فعله مرة أو

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اس کے بعد عرض ہے کہ پانچ وقت کی فرض نمازوں کو تو جماعت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، باقی تطوع یعنی غیر فرض نمازوں کے متعلق کچھ تفصیل ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کابقیہ حاشیہ﴾ مرتين فهو المستحب، أو لم يفعله وهو ما ينشئه الإنسان باختياره من الأوراد فهو التطوع .ولم يتعرض القاضي حسين ومن معه للمندوب لعمومه للأقسام الثلاثة.

ويقسم الشافعية والحنابلة السنن إلى سنن مؤكدة وغير مؤكدة .إلا أن الحنابلة يقولون :إن ترك السنن المؤكدة مكروه، أما ترك غير المؤكدة فليس بمكروه.

وقال ابن عابدين :إن المشروعات أربعة أقسام :فرض، وواجب، وسنة، ونفل .فما كان فعله أولى من تركه مع منع الترك إن ثبت بدليل قطعي ففرض، أو بظني فواجب، وبلا منع الترك إن كان مما واظب عليه الرسول صلى الله عليه وسلم أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة، وإلا فمندوب ونفل.

وهذا مطابق لقواعد الحنفية من الفرق بين الفرض والواجب خلافا للشافعية ومن معهم من قولهم بالترادف بينهما إلا في مواضع تذكر في موضعها .فالسنة عند الحنفية بالمعنى الفقهي نوعان:

أ -سنة الهدى:

وهي ما تكون إقامتها تكميلا للدين، وتتعلق بتركها كراهة أو إساءة، كصلاة الجماعة، والأذان، والإقامة، ونحوها، وذلك لأن النبي صلى الله عليه وسلم واظب عليها على سبيل العبادة، وتسمى أيضا السنة المؤكدة.

ب -سنن الزوائد:

وهي التي لا يتعلق بتركها كراهة ولا إساءة، لأن النبي صلى الله عليه وسلم فعلها على سبيل العادة، فإقامتها حسنة، كسير النبي صلى الله عليه وسلم في لباسه وقيامه، وقعوده وأكله، ونحو ذلك .

وعند المالكية :السنة ما فعله النبي صلى الله عليه وسلم وواظب عليه، وأظهره في جماعة، ولم يدل دليل على وجوبه .والرغيبة :ما رغب الشارع فيه وحده ولم يظهره في جماعة .والنفل ما فعله النبي صلى الله عليه وسلم ولم يداوم عليه؛ أي تركه في بعض الأوقات(الموسوعة الفقهية الكويتية ج۲۵،ص ۲۶۴، ۲۶۵،مادة"سنة"الأحكام المتعلقة بالسنة)

السنة لغة :المنهج والطريقة سواء أكانت محمودة أم مذمومة .ومن ذلك قوله صلى الله عليه وسلم :من سن في الإسلام سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها بعده من غير أن ينقص من أجورهم شيء ، ومن سن في الإسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير أن ينقص من أوزارهم شيء.

ثم غلب استعمال السنة في الطريقة المحمودة المستقيمة.

وتعريف السنة اصطلاحا سيأتي في بحث (سنة)

أما الرواتب فهو جمع راتبة من رتب الشيء رتوبا؛ أي استقر ودام، فهو راتب.

وسميت السنن الرواتب بذلك لمشروعية المواظبة عليها.

قال الشافعية :السنن الرواتب هي السنن التابعة لغيرها، أو التي تتوقف على غيرها أو على ما له وقت معين كالعيدين والضحى والتراويح ويطلقها الفقهاء على الصلوات المسنونة قبل الفرائض

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

فقہائے کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے، یا سنت؟

جمہور فقہائے کرام یعنی مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ایک روایت کے مطابق وتر کی نماز تطوع میں داخل ہے، البتہ اس کا درجہ سنتِ مؤکدہ ہے۔

جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ وتر کی نماز تطوع سے اوپر واجب درجہ میں داخل ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ وبعدها؛ لأنها لا يشرع أداؤها وحدها بدون تلك الفرائض .ولم يقصر الشافعية السنن الرواتب على الصلاة فقد صرحوا بأن للصوم سننا رواتب كصيام ست من شوال.

الألفاظ ذات الصلة:

أ -سنن الزوائد :هى التى تكون إقامتها حسنة ولا يتعلق بتركها كراهة ولا إساء ة، كأذان المنفرد والسواک

ب -النوافل :النوافل جمع نافلة، والنافلة لغة :ما زاد على النصيب المقدر، أو الحق أو الفرضأو ما يعطيه الإمام للمجاهد زيادة عن سهمه.

والنافلة أعم من السنة؛ لأنها تنقسم :إلى معينة ومنها السنن الرواتب، ومطلقة كصلاة الليل.

الحكم التكليفى لأداء السنن الرواتب:

يرى جمهور الفقهاء استحباب المواظبة على السنن الرواتب .وذهب مالک فى المشهور عنه : إلى أنه لا توقيت فى ذلک حماية للفرائض، لكن لا يمنع من تطوع بما شاء إذا أمن ذلک.

وصرح الحنفية أن تارک السنن الرواتب يستوجب إساء ة وكراهية .وفسر ابن عابدين استيجاب الإساء ة بالتضليل واللوم .وقال صاحب كشف الأسرار :الإساء ة دون الكراهة .وقال ابن نجيم : الإساء ة أفحش من الكراهة .وفى التلويح :ترک السنة المؤكدة قريب من الحرام .وقال الحنابلة بكراهة ترک الرواتب بلا عذر هذا فى الحضر .وفى السفر يرى جمهور الفقهاء استحباب صلاة السنن الرواتب أيضا لكنها فى الحضر آكد(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۵، ص۲۷۵،۲۷۶، مادة "سنة" السنن الرواتب)

[1] قال المالكية، والشافعية، والحنابلة، والصاحبان ورواية ثالثة عن أبى حنيفة :الوتر سنة مؤكدة .وصرح الشافعية بعد الوتر من السنن الرواتب .قال الخطيب الشربينى :الوتر قسم من الرواتب كما فى الروضة على المعتمد، وقيل :هو قسيم لها، والوتر أفضل السنن .وقال جمهور الفقهاء ما عدا الحنفية :أقله ركعة وأكثره إحدى عشرة ركعة.

وأقل الكمال فيه عند الحنفية ثلاث ركعات بتسليمة واحدة فى الأوقات كلها، وأكثره إحدى عشرة ركعة يقنت فى الركعة الأخيرة .

وذهب أبو حنيفة فى الراجح عنه إلى أن الوتر واجب (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۵ص ۲۷۹ ، مادة "السنن الرواتب")

اسی وجہ سے اگر کوئی شخص تطوع یا سنت کی نیت سے وتر کی نماز پڑھے، تو مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ، ان سب حضرات کے نزدیک (اور امام ابوحنیفہ سے مروی ایک روایت کے مطابق) وتر کی نماز درست اور ادا ہو جاتی ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے راجح قول کے مطابق بہت سے مشائخِ حنفیہ نے فرمایا کہ ادا نہیں ہوتی۔

پھر عام حالات میں وتر کی نماز باجماعت پڑھنے کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے، شافعیہ وحنابلہ غیر مسنون کہتے ہیں، مگر جواز کے قائل ہیں، مالکیہ کا موقف بھی اس کے قریب ہے، اور حنفیہ مکروہ قرار دیتے ہیں، تاہم رمضان میں تراویح کی نماز باجماعت پڑھنے کی صورت میں وتروں کو باجماعت پڑھنے کے جائز ہونے میں جمہور فقہائے کرام کا قابلِ ذکر اختلاف نہیں۔ [1]

اسی طرح نمازِ جمعہ، عیدین کی نماز (جو غیر حنفیہ کے نزدیک مسنون نماز ہے) نمازِ تراویح

---

[1] والجماعة فی صلاة الوتر سنة فی شهر رمضان عند الحنابلة ومستحبة عند الشافعية وفی قول عند الحنفية (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷ص ۱۶۱، مادة "صلاة التطوع")

أداء صلاة الوتر فی جماعة:

ينص الشافعية والحنابلة على أنه لا يسن أن يصلى الوتر فی جماعة، لكن تندب الجماعة فی الوتر الذی يكون عقب التراويح، تبعا لها. وصرح الحنفية بأنه يندب فعله حينئذ فی المسجد تبعا للتراويح، وقال بعضهم: بل يسن أن يكون الوتر فی المنزل .قال فی الفتاوى الهندية: هذا هو المختار.

وقال المالكية: يندب فعلها فی البيوت ولو جماعة إن لم تعطل المساجد عن صلاتها بها جماعة. وعللوا أفضلية الانفراد بالسلامة من الرياء، ولا يسلم منه إلا إذا صلى وحده فی بيته .

ونص الحنابلة على أن فعل الوتر فی البيت أفضل، كسائر السنن إلا لعارض، فالمعتكف يصليها فی المسجد، وإن صلى مع الإمام التراويح يصلی معه الوتر لينال فضيلة الجماعة، لكن إن كان له تهجد فإنه يتابع الإمام فی الوتر فإذا سلم الإمام لم يسلم معه بل يقوم فيشفع وتره، وذلك لينال فضيلة الجماعة.

ونص الحنابلة كذلك على أنه لو أدرك المسبوق بالوتر مع الإمام ركعة فإن كان الإمام سلم من اثنتين أجزأت المسبوق الركعة عن وتره، وإن كان الإمام لم يسلم من الركعتين فعلى المسبوق أن يقضيهما لحديث: ما أدركتم فصلوا، وما فاتكم فاقضوا (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷ص ۲۹۹، ۳۰۰، مادة "صلاة الوتر")

اورسورج گرہن کی نماز باجماعت پڑھنے کے مشروع وجائز ہونے میں بھی فقہائے کرام کا کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں، البتہ مذکورہ نمازوں کے علاوہ عام نوافل کو باجماعت پڑھنے کے حکم میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

شافعیہ کے نزدیک عام نوافل کو جماعت سے ادا کرنا اگرچہ باقاعدہ مسنون نہیں، لیکن بلاکراہت جائز ہے، خواہ تداعی واجتماع کا اہتمام ہو یا نہ ہو، اور تھوڑے افراد مل کر پڑھیں یا زیادہ افراد جمع ہوکر پڑھیں، سب کا ایک ہی حکم ہے۔

حنابلہ کے نزدیک بھی عام نوافل کو باجماعت ادا کرنا جائز ہے، البتہ بعض حنابلہ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ اسے اس طرح پابندی واہتمام کے ساتھ نہ پڑھا جائے، جس سے اس کے باجماعت سنت ہونے کا اشتباہ پیدا ہوجائے۔

مالکیہ کے نزدیک عام نوافل وتطوعات کے لیے اس شرط کے ساتھ اجتماع جائز ہے کہ جماعت کثیر نہ ہو، یا مشہور مقام میں نہ ہو، ورنہ مکروہ ہے، اور جن راتوں میں فقہاء نے اجتماع کو مکروہ وبدعت قرار دیا ہے، ان راتوں میں بھی مالکیہ کے نزدیک اجتماع مکروہ ہے۔

حنفیہ کے نزدیک عام نوافل کا جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے، جبکہ تداعی کے ساتھ ہو، جس کی تفسیر بعض حضرات نے مواظبت وپابندی سے، اور بعض نے اس سے کی ہے کہ چار آدمی یا اس سے زیادہ جماعت میں شریک ہوں، اور امام کے علاوہ چار افراد سے کم ہونے کی صورت میں عام نوافل کی جماعت مکروہ نہیں (وفيه أقوال أُخر. كما سيأتي)

جبکہ استسقاء کی نماز باجماعت پڑھنا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سنت نہیں، باقی فقہائے کرام کے نزدیک سنت ہے، اور چاند گرہن کی نماز بھی حنفیہ کے نزدیک باجماعت سنت نہیں، متعدد دوسرے فقہائے کرام اس کے باجماعت سنت ہونے کے قائل ہیں۔ [1]

---

[1] تسن الجماعة لصلاة الكسوف باتفاق بين المذاهب، وتسن للتراويح عند الحنفية والشافعية والحنابلة .وهي مندوبة عند المالكية، إذ الأفضل الانفراد بها -بعيدا عن الرياء -إن لم تعطل المساجد عن فعلها فيها .وتسن الجماعة كذلك لصلاة الاستسقاء عند المالكية والشافعية

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

آگے نوافل کی جماعت کے سلسلہ میں مختلف فقہائے کرام کی چند عربی عبارات اردو ترجمہ اور ضروری تشریح کے ساتھ ذکر کی جاتی ہیں۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

والحنابلة، أما عند الحنفية فتصلى جماعة وفرادى عند محمد، ولا تصلى إلا فرادى عند أبى حنيفة.
وتسن الجماعة لصلاة العيدين عند المالكية والشافعية. أما عند الحنفية والحنابلة فالجماعة فيها واجبة .ويسن الوتر جماعة عند الحنابلة .
وبقية التطوعات تجوز جماعة وفرادى عند الشافعية والحنابلة، وتكره جماعة عند الحنفية إذا كانت على سبيل التداعى، وعند المالكية الجماعة فى الشفع والوتر سنة والفجر خلاف الأولى .أما غير ذلک فيجوز فعله جماعة، إلا أن تكثر الجماعة أو يشتهر المكان فتكره الجماعة حذر الرياء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۱،ص ۱۵۴، ۱۵۵،مادة " تطوع"ما تسن له الجماعة من صلاة التطوع)
قال الحنفية :تكره الجماعة فى صلاة النوافل.
وقال المالكية كذلک :تكره الجماعة فى النوافل، لأن شأن النفل الانفراد به، كما تكره صلاة النفل فى جمع قليل بمكان مشتهر بين الناس، وإن لم تكن الجماعة كثيرة والمكان مشتهرا فلا تكره.
وقال الشافعية :تستحب الجماعة فى التراويح والوتر فى رمضان، ولا يستحب فعل سائر الرواتب جماعة.
وقال الحنابلة :يجوز التطوع جماعة ومنفردا؛ لأن النبى صلى الله عليه وسلم فعل الأمرين كليهما، وكان أكثر تطوعه منفردا، وصلى بابن عباس مرة، وبأنس وأمه واليتيم مرة، وأم أصحابه فى بيت عتبان مرة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۵،ص ۲۸۳،مادة" سن")
وتجوز الجماعة فى غير ما ذكر من صلاة التطوع عند جمهور الفقهاء وقالوا :يجوز التطوع جماعة وفرادى؛ لأن النبى صلى الله عليه وسلم فعل الأمرين كليهما، وكان أكثر تطوعه منفردا، وصلى بحذيفة مرة ، وبأنس وأمه واليتيم مرة ، وأم أصحابه فى بيت عتبان مرة كذلک .وعن ابن عباس - رضى الله تعالى عنهما -أنه أمه النبى صلى الله عليه وسلم .
والمالكية قيدوا الجواز بما إذا كانت الجماعة قليلة، وكان المكان غير مشتهر، فإن كثر العدد كرهت الجماعة، وكذلک تكره لو كانت الجماعة قليلة والمكان مشتهرا .
ويرى الحنفية أن الجماعة فى النفل فى غير رمضان مكروهة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷ص ۱۶۸، ۱۶۹، مادة " صلاة الجماعة ")
ذهب جمهور الفقهاء إلى أنه يجوز التطوع جماعة وفرادى؛ لأن النبى صلى الله عليه وسلم فعل الأمرين كليهما.
والأفضل فى غير التراويح المنزل، لحديث :عليكم بالصلاة فى بيوتكم، فإن خير صلاة المرء فى بيته إلا المكتوبة .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

’’المجموع شرحُ المهذب‘‘ کا حوالہ

امام نووی شافعی رحمہ اللہ (المتوفی: 676ھ) ’’المجموع شرحُ المهذب‘‘ میں فرماتے ہیں:

قد سبق أن النوافل لا تشرع الجماعة فيها إلا فى العيدين والكسوفين والاستسقاء وكذا التراويح والوتر بعدها إذا قلنا بالأصح إن الجماعة فيها أفضل وأما باقى النوافل كالسنن الراتبة مع الفرائض والضحى والنوافل المطلقة فلا تشرع فيها الجماعة أى لا تستحب لكن لو صلاها جماعة جاز ولا يقال إنه مكروه وقد نص الشافعى رحمه الله فى مختصرى البويطى والربيع على أنه لا بأس بالجماعة فى النافلة ودليل جوازها جماعة أحاديث كثيرة

(المجموع شرح المهذب، ج۴، ص۵۵، كتاب الصلاة، باب صلاة التطوع)

ترجمہ: یہ بات پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ نوافل کی جماعت عیدین اور کسوفین

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وفى رواية :صلاة المرء فى بيته أفضل من صلاته فى مسجدى هذا إلا المكتوبة .
ولكن إذا كان فى بيته ما يشغل باله، ويقلل خشوعه، فالأفضل أن يصليها فى المسجد فرادى؛ لأن اعتبار الخشوع أرجح .
ونص الحنفية على كراهة الجماعة فى التطوع إذا كان على سبيل التداعى، بأن يقتدى أربعة بواحد.
وصرح المالكية بأنه يكره الجمع فى النافلة غير التراويح إن كثرت الجماعة، سواء كان المكان الذى أريد الجمع فيه مشتهرا كالمسجد، أو لا كالبيت، أو قلت الجماعة وكان المكان مشتهرا، وذلك لخوف الرياء .
فإن قلت وكان المكان غير مشتهر فلا كراهة، إلا فى الأوقات التى صرح العلماء ببدعة الجمع فيها، كليلة النصف من شعبان، وأول جمعة من رجب، وليلة عاشوراء ، فإنه لا خلاف فى الكراهة مطلقا (الموسوعة الفقهية الكويتية ،ج۳۴ص۱۲۲ ، مادة ”قيام الليل“)

(یعنی سورج اور چاند گرہن) اور استسقاء اور تراویح اور اس کے بعد وتر کی نماز کے علاوہ میں مشروع نہیں ہے، جبکہ ہم اصح قول کے مطابق یہ کہیں کہ ان میں جماعت افضل ہے، اور جہاں تک باقی نوافل کا تعلق ہے، جیسا کہ فرائض کے ساتھ سنتِ موکدہ اور چاشت اور مطلق نوافل کی نماز، تو ان میں جماعت مشروع نہیں ہے، یعنی مستحب نہیں ہے، لیکن اگر ان کو جماعت کے ساتھ پڑھا جائے، تو جائز ہے، اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان کو جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے ''مختصر البویطی'' اور ''الربیع'' میں اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ نوافل کو جماعت سے پڑھنے میں حرج نہیں ہے، اور ان کو جماعت سے پڑھنے کے جواز کی دلیل کثیر احادیث ہیں (المجموع)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ شافعیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ عام نوافل کا جماعت سے ادا کرنا بلا کراہت جائز ہے، خواہ تداعی ہو یا نہ ہو، اور مجمع قلیل ہو یا کثیر۔

''شرح مختصر خلیل'' کا حوالہ

مالکیہ کی کتاب ''شرح مختصر خلیل'' میں ہے:

وجمع كثير لنفل أو بمكان مشتهر وإلا فلا(ش) يعنى أنه يكره اجتماع الجمع الكثير فى النافلة خشية الرياء ولو فى مسجده – عليه الصلاة والسلام – وهذا فى غير التراويح والعيدين والاستسقاء والكسوف وكذلك يكره اجتماع الجمع القليل كالثلاثة لكن بمكان مشتهر، وأما بمكان غير مشتهر فلا كراهة إلا أن يكون من الأوقات التى صرح العلماء ببدعة الجمع فيها كليلة النصف من شعبان وليلة عاشوراء فإنه لا يختلف فى كراهته

وینبغی للأئمة المنع من ذلک قاله ابن بشیر (شرح مختصر خلیل للخرشی المالکی، ج۲ص ۱۱،۱۲، باب الوقت المختار، فصل فی بیان صلاۃ النافلۃ وحکمہا)

ترجمہ: اور کثیر مجمع کا نفل نماز پڑھنا یا مشہور مکان میں پڑھنا مکروہ ہے، یعنی نفل کے لیے بڑے مجمع کا جمع ہونا مکروہ ہے، ریاء کے خوف کی وجہ سے، اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ہو، اور یہ حکم تراویح اور عیدین اور استسقاء اور کسوف کی نمازوں کے علاوہ (عام نفل نمازوں کے بارے) میں ہے، اور اسی طریقہ سے قلیل مجمع، مثلاً تین افراد کا مشہور مکان میں نوافل کے لیے جمع ہونا مکروہ ہے، لیکن غیر مشہور مکان میں مکروہ نہیں، البتہ اگر ان اوقات میں ہو، جن میں جمع ہونے کے بدعت ہونے کی علماء نے تصریح کی ہے، جیسا کہ نصف شعبان کی رات اور عاشوراء کی رات وغیرہ، تو اس کے مکروہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اور ائمہ کو اس سے منع کرنا مناسب ہے، ابنِ بشیر کا یہی قول ہے (شرح مختصر خلیل)

اس سے معلوم ہوا کہ مالکیہ کے نزدیک نوافل کو باجماعت ادا کرنا، اس صورت میں مکروہ ہے، جبکہ مجمع کثیر ہو، مثلاً تین افراد سے زیادہ ہوں، اور اگر ایسے مکان میں ہو، جو کہ معروف ہو، یعنی اس میں باجماعت نفل نماز ادا کرنے کا لوگوں کو علم ہو، اس صورت میں قلیل مجمع یعنی تین افراد میں بھی مکروہ ہے، بعض حنفیہ بھی تداعی اس صورت کو قرار دیتے ہیں، جیسا کہ آگے آتا ہے، اور جن اوقات میں اجتماعی عبادت کو فقہائے کرام نے بدعت قرار دیا ہے، اُن اوقات میں بھی اجتماع مالکیہ کے نزدیک مکروہ ہے۔

’’کشافُ القناع‘‘ کا حوالہ

حنابلہ کی کتاب ’’کشافُ القناع‘‘ میں ہے:

(ولا بـأس بـصلاة التطوع جماعة) كما تفعل فرادى؛ لأنه – صلى الـلـه عليه وسلم فعل الأمرين كليهما، وكان أكثر تطوعاته منفردا، قـاله فى الشرح، قال فى الاختيارات: ومـا سن فعله منفردا، كقيام الـلـيـل وصـلاة الـضـحـى ونحو ذلك، إن فعل جماعة فى بعض الأحيـان فـلا بأس بذلك، لكن لا يتخذ سنة راتبة (كشاف القناع عن متن الاقناع، ج ا ص ۴۳۹، ۴۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة التطوع، فصل تستحب النوافل المطلقة فى جميع الأوقات)

ترجمہ: اور نفل نماز کو جماعت سے پڑھنے میں حرج نہیں ہے، جس طرح کہ تنہا پڑھنے میں حرج نہیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فعل اختیار فرمائے ہیں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر نفل نمازیں تنہا ہوتی تھیں، شرح میں یہی قول مذکور ہے، اور اختیارات میں ہے کہ جن نمازوں کو تنہا پڑھنا مسنون ہے، جیسا کہ قیامُ اللیل اور چاشت کی نماز وغیرہ، اگر ان کو بعض اوقات جماعت کے ساتھ پڑھا جائے، تو کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو دائمی سنت نہ بنایا جائے (کشاف القناع)

اس سے معلوم ہوا کہ حنابلہ کے نزدیک عام نفل نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، مگر بعض حضرات اس کو عادت بنا لینے اور اس پر مواظبت اختیار کرنے سے منع کرتے ہیں۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا حوالہ

علامہ ابنِ تیمیہ (المتوفیٰ: 728ھ) اپنی مشہور کتاب ''اقتضاءُ الصراط المستقیم'' میں فرماتے ہیں:

وعـليـك أن تـعـلـم أنه إذا استحب التطوع المطلق فى وقت معين وجـوز الـتـطـوع فى جماعة لم يلزم من ذلك تسويغ جماعة راتبة

غير مشروعة بل ينبغي أن تفرق بين البابين.

وذلك أن الاجتماع لصلاة تطوع أو استماع قرآن أو ذكر الله ونحو ذلك إذا كان يفعل ذلك أحيانا فهذا أحسن فقد صح عن النبي صلى الله عليه و سلم أنه صلى التطوع في جماعة أحيانا

(اقتضاء الصراط المستقيم مخالفة أصحاب الجحيم، لابن تيمية، ج ۲، ص ۱۳۹، القسم الثاني، فصل في الأعياد الزمانية المبتدعة، أنواع الأعياد الزمانية المبتدعة)

ترجمہ: اور آپ پر ضروری ہے کہ یہ بات جان لیں کہ جب مطلق تطوع، معیَّن وقت میں مستحب ہو، اور جماعت کے ساتھ تطوع جائز ہو، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس غیر مشروع عمل کو جماعت کے ساتھ پابندی کے ساتھ جائز قرار دیا جائے، بلکہ دونوں بابوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نفل نماز کے لے اجتماع یا قرآن سننے کے لیے اجتماع یا ذکر اللہ وغیرہ کے لیے اجتماع، جب اس کو کبھی کبھار اختیار کیا جائے گا، تو یہ مستحسن عمل ہوگا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ یہ مروی ہے کہ آپ نے تطوع کو جماعت کے ساتھ کبھی کبھار پڑھا ہے (اقتضاء الصراط المستقيم)

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ ابنِ تیمیہ کے نزدیک نوافل کا باجماعت ادا کرنا جائز ہے، لیکن اس کو ہمیشہ کے لیے دائمی معمول بنانا یعنی اس پر مواظبت اختیار کرنا درست نہیں، علامہ شامی رحمہ اللہ نے بھی حنفیہ کے نزدیک اسی صورت کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

’’کتابُ الاصل‘‘ اور امام محمد کا حوالہ

امام محمد رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 179ھ) ’’کتابُ الاصل‘‘ میں ’’سورج گرہن کی نماز‘‘ کے

باب میں فرماتے ہیں:

قلت :وترى فى كسوف القمر صلاة؟ قال :نعم، الصلاة فيه حسنة .قلت :فهل يصلون جماعة كما يصلون فى كسوف الشمس؟ قال :لا.

قلت :فهل تكره الصلاة فى التطوع جماعة ما خلا قيام رمضان وصلاة كسوف الشمس؟ قال :نعم، ولا ينبغى أن يصلى فى كسوف الشمس جماعة إلا الإِمام الذى يصلى الجمعة ، فأما أن يصلى الناس فى مساجدهم جماعة فإنى لا أحب ذلك، وليصلوا وحداناً (الأَصلُ، لمحمد بن الحسن بن فرقد الشيبانى، ج ١، ص ٤٤٣، ٤٤٤، كتاب الصلاة، باب صلاة الكسوف)

ترجمہ: میں نے (امام ابوحنیفہ سے) عرض کیا کہ کیا آپ چاند گرہن میں نماز پڑھنے کی رائے رکھتے ہیں؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ بے شک! اس میں نماز پڑھنا بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ کیا لوگ (چاند گرہن کی نماز) سورج گرہن کی طرح باجماعت پڑھیں گے؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ نہیں (یعنی چاند گرہن کی نماز تنہا پڑھیں گے)

میں نے کہا کہ کیا ''تطوع'' کو جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے، سوائے قیامِ رمضان اور سورج گرہن کی نماز کے؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ جی ہاں! اور سورج گرہن میں نماز پڑھانا مناسب نہیں ہے، سوائے اس امام کے جو جمعہ پڑھاتا ہے، اور اگر لوگ اپنی اپنی مسجدوں میں (پنج وقتی نماز کے امام کی اقتداء میں) جماعت کے ساتھ سورج گرہن کی نماز پڑھیں، تو میں اس کو پسند نہیں کرتا، ایسی صورت میں چاہیے کہ وہ تنہا نماز پڑھیں (کتاب الاصل)

مذکورہ عبارت میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے چاند گرہن کی نماز باجماعت پڑھنے سے منع فرمایا ہے، اور پھر قیامِ رمضان اور سورج گرہن کی نماز کے علاوہ باقی تطوعات کو باجماعت پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے۔

اس عبارت سے جس طرح چاند گرہن کی نماز کا باجماعت نہ پڑھنا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح استسقاء کی نماز کا باجماعت نہ پڑھنا بھی سمجھا جاتا ہے، دوسرے موقع پر استسقاء کی نماز باجماعت نہ ہونے کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے تصریح بھی مروی ہے۔

چنانچہ امام محمد رحمہ اللہ ''کتابُ الاصل'' ہی میں ''استسقاء کی نماز'' کے باب میں فرماتے ہیں:

قلت :فهل في الاستسقاء صلاة؟ قال :لا صلاة في الاستسقاء، إنما فيه الدعاء .قلت :ولا ترى بأن يجمع فيه للصلاة ويجهر الإمام بالقراء ة؟ قال :لا أرى ذلك .إنما بلغنا عن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -أنه خرج فدعا .وبلغنا عن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه -أنه سعد المنبر فدعا واستسقى .ولم يبلغنا في ذلك صلاة إلا حديثاً واحداً شاذاً لا يؤخذ به (الأَصْلُ،لمحمد بن الحسن بن فرقد الشيباني،ج ۱،ص۴۴۷،۴۴۸، كتاب الصلاة ،باب صلاة الاستسقاء)

ترجمہ: میں نے کہا کہ کیا استسقاء میں نماز کا حکم ہے؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ استسقاء میں نماز نہیں ہے، اس میں تو صرف دعاء ہے، میں نے کہا کہ کیا آپ یہ رائے نہیں رکھتے کہ استسقاء میں نماز کے لیے جمع ہوا جائے، اور امام جہری قرائت کرے، امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک یہ حکم نہیں ہے، ہمیں تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے، اور پھر دعاء فرمائی، اور ہمیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پہنچی

ہے کہ وہ منبر پر تشریف لے گئے، پھر دعاء کی اور بارش طلب کی، اور ہمیں استسقاء کے سلسلہ میں نماز کی حدیث نہیں پہنچی، سوائے ایک شاذ حدیث کے، جس کو اختیار نہیں کیا جائے گا (کتاب الاصل)

مذکورہ عبارت میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے استسقاء کے لیے نماز کی اور بالخصوص نماز باجماعت کی نفی فرمادی ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ ''الموطأ'' میں استسقاء کی نماز کے متعلق فرماتے ہیں:

أما أبو حنيفة – رحمه اللّٰه – فكان لا يرى في الاستسقاء صلاة (مؤطا امام محمد، ج۲ ص ۶۷، كتاب الصلاة، باب الاستسقاء، تحت رقم الحديث ۲۹۳، مطبوعة :دار القلم – دمشق)

ترجمہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ''استسقاء'' میں نماز کے قائل نہیں (مؤطا امام محمد)

اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عبدالحیی لکھنوی رحمہ اللہ نے ''التعليق الممجد'' میں فرمایا:

أي على سبيل الاستنان لا أنه بدعة عنده كما نسبه بعض المتعصبين إليه فإن عدم السنية لا يستلزم البدعة كذا حققه العيني في "البناية "(التعليق الممجد على موطأ محمد ،لمحمد عبد الحی اللكنوی الهندی، ج۲ ص ۶۷، كتاب الصلاة، باب الاستسقاء، تحت رقم الحديث ۲۹۳، مطبوعة :دار القلم – دمشق)

ترجمہ: یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ استسقاء کی نماز کے سنت ہونے کی رائے نہیں رکھتے، نہ یہ کہ ان کے نزدیک یہ نماز بدعت ہو، جیسا کہ بعض متعصبین نے ان کی طرف اس بات کی نسبت کی ہے، کیونکہ کسی عمل کے سنت نہ ہونے سے اس کا بدعت ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ علامہ عینی نے (الهداية شرح البداية کی

شرح)''البنایة''میں ثابت کیا ہے(التعلیق الممجد)

''المبسوط للسرخسی''اور''المحیطُ البرھانی''کا حوالہ

شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے بھی امام محمد رحمہ اللہ کی''کتابُ الاصل''والی عبارت کا ''عیدین کے باب''میں ذکر فرمایا ہے، البتہ امام محمد کی عبارت کے الفاظ ان سے کچھ مختلف ہیں، چنانچہ شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں:

وقال فی الأصل :لا یصلی التطوع فی الجماعة ما خلا قیام رمضان و کسوف الشمس (المبسوط،لشمس الأئمة السرخسی، ج۲، ص۳۷، کتاب الصلاۃ،باب صلاۃ العیدین)

ترجمہ:''تطوع''کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا جائے گا،سوائے قیامِ رمضان اور سورج گرہن کی نماز کے(المبسوط)

امام محمد رحمہ اللہ کی''کتابُ الاصل''کی اصل عبارت پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔

متعدد مؤرخین کی تصریح کے مطابق شمس الائمہ سرخسی نے''المبسوط''کو قید خانہ میں محبوس ہونے کی حالت میں املاء کروایا ہے، جس کی وجہ سے ان کی اس کتاب میں امام محمد رحمہ اللہ کی کتب کی اصل عبارت سے کچھ فرق پیدا ہو گیا ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کی اصل کتب کی عبارت کو ترجیح حاصل ہوگی۔ [1]

اور شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ''سورج گرہن کی نماز''کے باب میں فرماتے ہیں:

---

[1] محمد بن أحمد بن أبی سهل أبو بكر السرخسی تكرر ذكره فی الهداية الإمام الكبير شمس الأئمة صاحب المبسوط وغيره أحد الفحول الأئمة الكبار أصحاب الفنون كان إماما علامة حجة متكلما فقيها أصوليا مناظرا لزم الإمام شمس الأئمة أبا محمد عبد العزيز الحلوانی حتى تخرج به وصار أنظر أهل زمانه وأخذ فی التصنيف وناظر الأقران فظهر اسمه وشاع خبره أملأ المبسوط نحو خمسة عشر مجلدا وهو فی السجن بأوزجند محبوس(الجواهر المضية فی طبقات الحنفية،لعبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشی، أبو محمد، محيی الدين الحنفی ، ج۲ ص۲۸، حرف الميم، تحت رقم الترجمة ۸۵)

ثـم الصلاة فيها فرادى لا بجماعة لأن كسوف القمر بالليل فيشق علـى الـنـاس الاجتـمـاع وربـمـا يخاف الفتنة ولم ينقل أن النبى - صـلـى الـلــه عليـه وسلم -صـلـى فيهـا بـالجمـاعة والأصل فى التـطـوعـات تـرك الـجـمـاعة فيهـا مـا خـلا قيام رمضان لاتفاق الصحابة عليه وكسوف الشمس لورود الأثر به (المبسوط للسرخسی، ج۲ص ۷۶، کتاب الصلاة، باب صلاة الكسوف)

ترجمہ: چاند گرہن کی نماز تنہا ہے، جماعت کے ساتھ نہیں، کیونکہ چاند گرہن رات کے وقت میں ہوتا ہے، جس میں لوگوں کو جمع ہونا دشوار ہوتا ہے، اور بعض اوقات (رات کے وقت لوگوں کے جمع ہونے میں) فتنہ کا بھی خوف ہوتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گرہن کی نماز باجماعت پڑھنا منقول نہیں، اور نفل نمازوں میں اصل حکم ترکِ جماعت کا ہے، سوائے قیامِ رمضان کے، کیونکہ اس پر صحابۂ کرام کا اتفاق ہے، اور سوائے سورج گرہن کے، کیونکہ اس کے بارے میں حدیث وارِد ہوئی ہے (المبسوط)

''**المحيطُ البرهانى**'' میں ہے:

ولا يـصـلـى تـطـوع بجماعة إلا قيام رمضان فقد استثنى عن النهى قيام رمـضـان، وكـمـا أن قيـام رمـضـان مستثنى عن النهى فصلاة الـكـسـوف يـجـوز أداؤها بالجماعة مع أنها تطوع ذكر محمد فى الأصل (المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى، ج ۱، ص ۴۳۸، كتاب الصلاة، الفصل العشرون فى صلاة التطوع)

ترجمہ: اور ''تطوع'' کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا جائے گا، سوائے قیامِ رمضان کے، پس جماعت کے ساتھ ممانعت سے قیامِ رمضان کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، اور جس

طریقہ سے قیامِ رمضان ممانعت سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح سورج گرہن کی نماز (بھی مستثنیٰ ہے، اس) کو بھی جماعت کے ساتھ ادا کرنا جائز ہے، باوجودیکہ یہ بھی تطوع میں داخل ہے، جس کو امام محمد نے کتابُ الاصل میں ذکر کیا ہے (المحیط البرہانی)

علامہ ابنِ ہمام نے بھی ''فتح القدیر'' میں ''حاکم'' کی ''کتاب الکافی'' کے حوالہ سے ''تطوع'' کی نماز کا سوائے قیامِ رمضان اور صلاۃِ کسوف کے مکروہ ہونا نقل کیا ہے۔ [1]

''المحیط البرھانی ''میں بھی چاند گرہن کی نماز تنہا پڑھنے کا حکم تحریر کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ چاند گرہن کی نماز کا باجماعت ثابت نہ ہونا بیان کی گئی ہے۔

پھر اس کے بعد امام محمد کی ''کتــابُ الاصــل '' کی اسی عبارت کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں قیامِ رمضان اور سورج گرہن کی نماز کے علاوہ دیگر نفل نماز کا باجماعت مکروہ ہونا مذکور ہے۔ [2]

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ظاہرُ الروایۃ میں سوائے قیامِ

---

[1] وقد صرح الحاكم أيضا فى باب صلاة الكسوف من الكافى بقوله ويكره صلاة التطوع جماعة ما خلا قيام رمضان وصلاة الكسوف(فتح القدير، ج٢،ص٩٢، كتاب الصلاة،باب الاستسقاء)

[2] وعلماؤنا رحمهم الله قالوا :بأن كسوف القمر يكون بالليل، فيشق على الناس الاجتماع بالليل، وربما تخاف الفتنة؛ ولأن كسوف القمر كان على عهد رسول الله عليه السلام ككسوف الشمس بل أكثر، فلو كان صلى بجماعة لنقل ذلك نقلا مستفيضا كما نقل فى كسوف الشمس، ولأن الأصل فى التطوعات ترك الجماعة فيها ما خلا قيام رمضان لاتفاق الصحابة عليه، وكسوف الشمس لورود الأثر به.

وهكذا قال فى الكتاب :ويكره فى صلاة التطوع جماعة ما خلا قيام رمضان، وصلاة كسوف الشمس، ولهذا قال عليه السلام :أفضل صلاة الرجل صلاته فى بيته إلا المكتوبة .ألا ترى أن ما يؤدى بالجماعة من الصلوات يؤذن لها ويقام ولا يؤذن للتطوعات ولا يقام؟ فدل أنها لا تؤدى بالجماعة.

وأما حديث عبد الله بن عباس، فلا يصح لما بينا :أن النبى عليه السلام لو كان صلى صلاة الخسوف بجماعة لنقل عنه نقلا مستفيضا، وأما اعتباره بصلاة كسوف الشمس لا يصح؛ لأنا عرفنا ذلك بالأثر، وهذا ليس فى معناه، فالأثر الوارد ثم لا يكون واردا ههنا .والله أعلم(المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى،ج٢،ص١٣٨، كتاب الصلاة،الفصل التاسع والعشرون فى صلاة الكسوف)

رمضان اور سورج گرہن کی نماز کے باقی ''تطوعات'' کے باجماعت پڑھنے کی نہی منقول ہے، جس میں چاند گرہن کی نماز بھی داخل ہے، اور استسقاء کی نماز بھی داخل ہے، جس کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے صراحتاً باجماعت پڑھنے کی نہی بھی ظاہر الروایۃ میں وارِد ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ظاہر الروایۃ میں ''قیامِ رمضان'' کے الفاظ سے استثناء مذکور ہے، جس کی مزید تفصیل آگے ''تراویح'' اور ''قیامِ رمضان'' کے بیان میں آتی ہے۔

''البحرُ الرائق'' اور ''منحةُ الخالق'' کا حوالہ

فقہ حنفی کی کتاب ''البحر الرائق'' میں ہے:

وفی الکسوف والتراويح سنة......ويستحب فی الوتر فی رمضان علی قول ولا يستحب فيه علی قول وهی مكروهة فی صلاة الخسوف وقيل لا، وأما ما عدا هذه الجملة ففی الخلاصة الاقتداء فی الوتر خارج رمضان يكره، وذكر القدوری أنه لا يكره، وأصل هذا أن التطوع بالجماعة إذا كان علی سبيل التداعی يكره (البحر الرائق، ج ا ص ٣٦٦، كتاب الصلاة، باب الامامة، صفة الامامة فی الصلاة)

ترجمہ: اور سورج گرہن کی نماز اور تراویح کی نماز میں جماعت سنت ہے......اور رمضان میں وتر کی نماز میں ایک قول کے مطابق جماعت مستحب ہے، اور دوسرے قول کے مطابق مستحب نہیں، اور چاند گرہن کی نماز میں جماعت مکروہ ہے، اور کہا گیا ہے کہ مکروہ نہیں، جہاں تک مذکورہ نمازوں کے علاوہ کا تعلق ہے، تو خلاصہ میں ہے کہ رمضان کے علاوہ وتر کی نماز میں اقتداء مکروہ ہے، اور قدوری

نے ذکر کیا ہے کہ مکروہ نہیں، اوراس مسئلہ کا اصول یہ ہے کہ (حنفیہ کے نزدیک)
نفل نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا اگر تداعی کے طور پر ہو، تو مکروہ ہے
(البحر الرائق)

مذکورہ عبارت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامی رحمہ اللہ نے ''منحة الخالق'' میں رملی کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ رمضان کے علاوہ وتر کا باجماعت پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ [1]

''البحر الرائق'' میں ''وتر اور نوافل'' کے باب میں وتروں کا حکم تراویح کی طرح بیان کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں علامہ شامی رحمہ اللہ کی طرف سے ''ردالمحتار'' میں بیان کردہ تفصیل آگے آتی ہے۔ [2]

''شرحُ العینی علی الکنز'' کا حوالہ

علامہ عینیؒ ''شرحُ العینی علی الکنز'' میں فرماتے ہیں:

ویوتر ای یوتر الامام بجماعة فی شهر رمضان للاجماع علیه، وقیل الوتر فی بیته منفردا هو الافضل، وهو المختار، واشار بقوله فقط الی انه لایجوز الوتر بجماعة فی غیر رمضان، وذکر فی النوازل ان الوتر بجماعة خارج رمضان یجوز (شرح العینی علی الکنز، ج ا ص ۸۳، کتاب الصلاة، باب فی بیان احکام الوتر والنوافل)

ترجمہ: اور امام رمضان کے مہینہ میں جماعت کے ساتھ وتر پڑھائے گا، کیونکہ اس پر اجماع ہے، اور کہا گیا ہے کہ وتر اپنے گھر میں بغیر جماعت کے افضل ہے، یہی

---

[1] (قوله الاقتداء فی الوتر خارج رمضان یکره) قال الرملی سیأتی الکلام علیه فی الحاشیة عند قوله ویوتر بجماعة فی رمضان فقط وإن الکراهة کراهة تنزیه (منحة الخالق، ج ا، ص ۳۶۶، کتاب الصلاة، باب الامامة)

[2] فالوتر کالتراویح فکما أن الجماعة فیها سنة فکذلک فی الوتر ولو صلوا الوتر بجماعة فی غیر رمضان فهو صحیح مکروه کالتطوع فی غیر رمضان بجماعة وقیده فی الکافی بأن یکون علی سبیل التداعی (البحر الرائق، ج ۲، ص ۷۵، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل)

مختار قول ہے، اور ماتن نے اپنے قول ''فقط'' سے اس طرف اشارہ کیا کہ رمضان کے علاوہ وتر جماعت کے ساتھ جائز نہیں، اور نوازل میں یہ بات مذکور ہے کہ وتر جماعت کے ساتھ رمضان کے علاوہ جائز ہے (شرح العینی)

اور مذکورہ کتاب ہی میں ''کسوف'' کے بیان میں علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

صلاة الكسوف سنة او واجبة، وصلاة الخسوف حسنة، وكذا البقية (أى صلاة الظلمة والريح والفزع) (شرح العينى على الكنز، ج ا ص ۱۰۴، كتاب الصلاة، باب فى بيان احكام الكسوف)

ترجمہ: سورج گرہن کی نماز سنت یا واجب ہے، اور چاند گرہن کی نماز مستحب (مستحسن) ہے، اور اسی طریقہ سے بقیہ نمازیں بھی مستحب ہیں (یعنی گھٹا ٹوپ تاریکی چھا جانے کے وقت، اور آندھی کے وقت اور دشمن یا قدرتی آفات سے خوف وگھبراہٹ کے وقت کی نماز) (شرح العینی)

وتر اور تطوع کو باجماعت ادا کرنے کے جائز اور ناجائز اور مکروہ وغیر مکروہ ہونے کے درمیان تطبیق وترجیح علامہ شامی رحمہ اللہ کے حوالہ سے آگے آتی ہے۔

''عمدةُ القاری'' کا حوالہ

علامہ بدرالدین عینی نے ''عمدةُ القاری'' میں فرمایا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے چاند گرہن کی نماز باجماعت پڑھنے کے صرف سنت ہونے کی نفی کی ہے، جائز ہونے کی نفی نہیں کی۔ [1]

---

[1] قالوا: وفيه دلالة على أنه يجمع فى خسوف القمر كما يجمع فى كسوف الشمس، وبه قال الشافعى وأحمد وإسحاق وأبو ثور وأهل الحديث، وذهب أبو حنيفة وأحمد ومالك إلى أن: ليس فى خسوف القمر جماعة .قلت: أبو حنيفة لم ينف الجماعة فيه، وإنما قال: الجماعة فيه غير سنة، بل هى جائزة وذلك لتعذر اجتماع الناس من أطراف البلد بالليل(عمدة القارى للعينى، ج۷ص ۶۵،۶۶، كتاب الكسوف، باب الصلاة فى كسوف الشمس)

اور''ردُّالمحتار''میں''شرحُ الزاهدی ''اور''البحر الرائق''کےحوالہ سے چاند گرہن کے متعلق''قیل''کے ساتھ ایک قول باجماعت جائز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ [1]

اور ہمارے نزدیک بھی جواز کا قول راجح ہے۔

معلوم ہوا کہ چاند گرہن کی نماز، تطوع میں داخل ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے باجماعت پڑھنے کا ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کی جماعت کو سنت نہیں کہتے، لیکن بایں ہمہ بعض حنفیہ اس کو باجماعت پڑھنا جائز قرار دیتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جماعت کی نفی کو سنیت کی نفی پر محمول کرتے ہیں، نہ کہ جواز کی نفی پر۔

جبکہ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک چاند گرہن کی نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا سنت ہے، کیونکہ سورج اور چاند گرہن کا سبب ایک ہی ہے، البتہ جس کو مسجد میں آنا متعذر ہو، اس سے اس نماز کا حکم ساقط ہوجاتا ہے۔ [2]

---

[1] قال فی الحلیة :وأما الجماعة فی صلاة الخسوف ظاهر کلام الجم الغفیر من أهل المذهب کراهتها .وفی شرح الزاهدی :وقیل جائزة عندنا لکنها لیست بسنة .اهـ.(رد المحتار علی الدر المختار، ج ١، ص ٥٥٢، کتاب الصلاة، باب الامامة)

(قوله کالخسوف للقمر إلخ) أی حیث یصلون فرادی سواء حضر الإمام أو لا کما فی البرجندی إسماعیل لأن ما ورد من أنه -علیه الصلاة والسلام -صلاه لیس فیه تصریح بالجماعة فیه والأصل عدمها کما فی الفتح وفی البحر عن المجتبی وقیل :الجماعة جائزة عندنا لکنها لیست بسنة .اهـ.(رد المحتار علی الدر المختار، ج ٢، ص ١٨٣، کتاب الصلاة،باب الکسوف)

[2] وأما صلاة خسوف القمر، ففیها رأیان :

قال الحنفیة والمالکیة :إنها تصلی فرادی (أفذاذا) کسائر النوافل؛ لأن الصلاة بجماعة فی خسوف القمر لم تنقل عن النبی صلی الله علیه وسلم، مع أن خسوفه کان أکثر من کسوف الشمس، ولأن الأصل أن غیر المکتوبة لا تؤدی بجماعة، قال النبی صلی الله علیه وسلم :صلاة الرجل فی بیته أفضل إلا المکتوبة إلا إذا ثبت بالدلیل کما فی العیدین وقیام رمضان وکسوف الشمس، ولأن الاجتماع باللیل متعذر، أو سبب الوقوع فی الفتنة.

وتصلی عند الشافعیة والحنابلة صلاة الخسوف جماعة کالکسوف، لما روی عن ابن عباس أنه صلی بالناس فی خسوف القمر، وقال :صلیت کما رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم .

ولحدیث محمود بن لبید :فإذا رأیتموها کذلک فافزعوا إلی المساجد .

وهذا الرأی أولی؛ إذ لا فرق بین الخسوف والکسوف، وتسقط عمن له عذر فی التخلف عن أداء الجماعة.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

”الدُّر المختار“ اور ”ردُّ المحتار“ کا حوالہ

”ردُّ المحتار“ میں ہے:

فالحاصل :أن الأحاديث لما اختلفت فى الصلاة بالجماعة وعدمها على وجه لا يصح به إثبات السنية لم يقل أبو حنيفة بسنيتها ولا يلزم منها قوله بأنها بدعة كما نقله عنه بعض المتعصبين بل هو قائل بالجواز اهـ:

قلت :والظاهر أن المراد به الندب والاستحباب لقوله فى الهداية قلنا :إنه فعله -عليه الصلاة والسلام -مرة وتركه أخرى فلم يكن سنة اهـ أى لأن السنة ما واظب عليه والفعل مرة مع الترك أخرى يفيد الندب تأمل (رد المحتار على الدر المختار، ج۲، ص۱۸۴، كتاب الصلاة، باب الاستسقاء)

ترجمہ: پس خلاصہ یہ نکلا کہ احادیث میں جب (استسقاء کی نماز) باجماعت ادا کرنے اور نہ کرنے کے متعلق اس طرح کا اختلاف ہوگیا کہ جس کے پیشِ نظر سنت ہونے کا ثبوت صحیح نہیں، تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سنت ہونے کا

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

أما سبب الاختلاف بين الرأيين :فهو اختلافهم فى مفهوم قوله صلى الله عليه وسلم :إن الشمس والقمر آيتان من آيات الله لا ينخسفان لموت أحد، ولا لحياته، فإذا رأيتموها، فادعوا الله، وصلوا، حتى يكشف مابكم، وتصدقوا فالفريق الثانى الذى فهم من الأمر بالصلاة فيهما معنى واحدا :وهى الصفة التى فعلها فى كسوف الشمس، رأى أن الصلاة فيها جماعة.

والفريق الأول الذى فهم من ذلك معنى مختلفا؛ لأنه لم يرو عنه عليه الصلاة والسلام أنه صلى فى خسوف القمر مع كثرة دورانه، قال :المفهوم من ذلك أقل ما ينطلق عليه اسم صلاة فى الشرع، وهى النافلة فذا(الفقه الاسلامى وادلتهٗ للزحيلى، ج۲ص ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، الباب الثانى، الفصل العاشر، المبحث الخامس۔ صلاة الكسوف والخسوف)

قول نہیں کیا، اور اس سے لازم نہیں آتا کہ استسقاء کی نماز باجماعت پڑھنا امام ابوحنیفہ کے نزدیک بدعت ہو، جیسا کہ بعض متعصبین نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں یہ قول ذکر کردیا ہے، بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جواز کے قائل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بظاہر اس جواز سے مراد ندب اور استحباب ہے، ''ہدایہ'' کے اس قول کی وجہ سے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے بعض اوقات اس کو باجماعت ادا کیا، اور بعض اوقات باجماعت ادا نہیں کیا، پس یہ سنت نہیں ہوا، کیونکہ سنت وہ چیز ہوتی ہے، جس پر نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے مواظبت (وپابندی) کی ہو، اور کسی کام کو ایک مرتبہ کرنا اور پھر چھوڑ دینا ''ندب'' کا فائدہ دیتا ہے (نہ کہ سنت ہونے کا، اس لیے استسقاء کی نماز باجماعت پڑھنا مستحب ہوا) (ردالمحتار)

''البحر الرائق'' میں بھی استسقاء کی نماز کے باجماعت جائز ہونے اور مسنون نہ ہونے کا حکم تحریر کیا گیا ہے۔ [1]

معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک استسقاء کی جماعت ہونا ایسے طریقہ پر ثابت نہیں کہ جس سے سنت کا ثبوت ہو، رہا جواز تو بعض مشائخِ حنفیہ کے نزدیک اس کا انکار نہیں۔

حنفیہ کی کتاب ''الدُّر المختار'' میں ہے:

(ولا يصلى الوتر و) لا (التطوع بجماعة خارج رمضان) أى يكره ذلك على سبيل التداعى، بأن يقتدى أربعة بواحد كما فى الدرر، ولا خلاف فى صحة الاقتداء إذ لا مانع نهر(الدر المختار)

ترجمہ: اور وتر کی نماز کو اور نفل نماز کو رمضان کے علاوہ جماعت کے ساتھ نہیں

---

[1] (قوله له صلاة لا بجماعة) عند أبى حنيفة بيان لكونها مشروعة فى حق المنفرد وأن الجماعة ليست بمشروعة لها، ولم يبين صفتها، وقد اختلف فيها والظاهر ما فى الكتاب من أنها جائزة وليست بسنة(البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج۲،ص ۱۸۱،باب صلاة الاستسقاء)

پڑھا جائے گا، یعنی ان کو جماعت کے ساتھ پڑھنا اگر تداعی کے طریقہ پر ہو، بایں طور کہ چار آدمی ایک کی اقتداء کریں، تو مکروہ ہے، ''درر'' میں اسی طرح سے ہے، البتہ اقتداء کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اس کے لیے کوئی مانع نہیں، نہر (الدرالمختار)

علامہ شامی رحمہ اللہ ''الدُّر المختار '' کے مندرجہ بالا قول کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(قوله أى يكره ذلک) أشار إلى ما قالوا من أن المراد من قول القدورى فى مختصره لا يجوز الكراهة لا عدم أصل الجواز، لكن فى الخلاصة عن القدورى أنه لا يكره، وأيده فى الحلية بما أخرجه الطحاوى عن المسور بن مخرمة، قال :دفنا أبا بكر - رضى الله تعالى عنه -ليلا فقال عمر -رضى الله عنه :-إنى لم أوتر، فقام وصفنا وراء ه فصلى بنا ثلاث ركعات لم يسلم إلا فى آخرهن .ثم قال :ويمكن أن يقال :الظاهر أن الجماعة فيه غير مستحبة، ثم إن كان ذلک أحيانا كما فعل عمر كان مباحا غير مكروه، وإن كان على سبيل المواظبة كان بدعة مكروهة لأنه خلاف المتوارث، وعليه يحمل ما ذكره القدورى فى مختصره، وما ذكره فى غير مختصره يحمل على الأول، والله أعلم اهـ.

قلت :ويؤيده أيضا ما فى البدائع من قوله :إن الجماعة فى التطوع ليست بسنة إلا فى قيام رمضان اهـ فإن نفى السنية لا يستلزم الكراهة، نعم إن كان مع المواظبة كان بدعة فيكره .وفى حاشية البحر للخير الرملى :علل الكراهة فى الضياء والنهاية بأن الوتر

نفل من وجه حتى وجبت القراء ة في جميعها، وتؤدى بغير أذان وإقامة، والنفل بالجماعة غير مستحب لأنه لم تفعله الصحابة في غير رمضان اهـ وهو كالصريح في أنها كراهة تنزيه تأمل .اهـ.

(قوله على سبيل التداعي) هو أن يدعو بعضهم بعضا كما في المغرب، وفسره الواني بالكثرة وهو لازم معناه.

(قوله أربعة بواحد) أما اقتداء واحد بواحد أو اثنين بواحد فلا يكره، وثلاثة بواحد فيه خلاف (رد المحتار على الدر المختار، ج۲، ص ۴۹، كتاب الصلاة،باب الوتر والنوافل)

ترجمہ: یعنی وتر اور نوافل کو رمضان کے علاوہ جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قدوری کی مختصر میں مذکور ”لایجوز“ کے قول سے مکروہ ہونا مراد ہے، اصل جواز کا نہ ہونا مراد نہیں، لیکن ’’خلاصہ‘‘ میں ’’قدوری‘‘ سے یہ منقول ہے کہ مکروہ نہیں، جس کی تائید ’’حلیہ‘‘ میں امام طحاوی کی اس روایت سے کی گئی ہے کہ مسور بن مخرمہ نے فرمایا کہ ہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات میں دفن کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے وتر نہیں پڑھے، وہ وتر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے، اور ہم نے ان کے پیچھے صف بندی کی، پھر انہوں نے ہمیں تین رکعتیں پڑھائیں، جن کے آخر میں ہی سلام پھیرا، پھر صاحبِ حلیہ نے فرمایا کہ یہ کہا جانا ممکن ہے کہ راجح یہ ہے کہ رمضان کے علاوہ وتر اور نوافل کی جماعت مستحب نہیں ہے، پھر اگر وہ اتفاقاً ہو، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمل کیا، تو یہ فعل بلا کراہت مباح ہوگا، اور اگر مواظبت اور دوام کے ساتھ ہو، تو بدعت اور مکروہ ہوگا، کیونکہ یہ خلافِ متوارث ہے، اور اسی (یعنی مواظبت کے ساتھ مکروہ وبدعت ہونے) پر قدوری کی مختصر کا قول بھی محمول ہوگا،

اور قدوری کی مختصر کے علاوہ میں جو مذکور ہے (یعنی مکروہ نہ ہونا) اس کو اول (یعنی احیاناً واتفاقاً) پر محمول کیا جائے گا، واللہ اعلم۔

(علامہ شامی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس بات کی تائید بدائع کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ نفل کی جماعت قیامِ رمضان کے علاوہ میں سنت نہیں، بدائع کی عبارت ختم ہوئی۔

پس سنّیت کی نفی کراہت کو مستلزم نہیں، البتہ اگر مواظبت کے ساتھ ہو، تو بدعت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے، اور خیر الرملی کے بحر کے حاشیہ میں ہے کہ ''الضیاء'' اور ''النہایۃ'' میں کراہت کی یہ علت بیان کی گئی ہے کہ وتر من وجہٍ نفل ہے، یہاں تک کہ اس کی تمام رکعتوں میں قرائت واجب ہے، اور وتر کو اذان واقامت کے بغیر ادا کیا جاتا ہے، اور جماعت کے ساتھ نفل مستحب نہیں، اس لیے کہ صحابہ نے رمضان کے علاوہ ان کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا، ''الضیاء'' اور ''النہایۃ'' کی عبارت ختم ہوئی، اور یہ اس بارے میں صریح ہے کہ وتر اور نوافل کو جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے، اس پر غور کر لینا چاہیے، رملی کی عبارت ختم ہوئی۔

اور صاحبِ درِمختار کا یہ قول کہ تداعی کے طریقہ پر (نوافل کی جماعت مکروہ ہے) تداعی کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ، بعض کو دعوت دیں، جیسا کہ ''مغرب'' میں ہے، اور ''وانی'' نے تداعی کی تفسیر کثرت کے ساتھ کی ہے، اور کثرت تداعی کے معنیٰ کو مستلزم ہے (یعنی جب تداعی کی جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں عموماً کثرت پیدا ہو جاتی ہے)

اور صاحبِ درمختار کا یہ قول کہ چار افراد ایک کی اقتداء کریں، یہ تداعی میں داخل ہے، جہاں تک ایک آدمی کی دوسرے کی اقتداء کرنے یا دو آدمیوں کی ایک آدمی کی

اقتداء کرنے کا تعلق ہے، تو یہ مکروہ نہیں، اور تین آدمیوں کی ایک آدمی کی اقتداء کرنے کے (مکروہ ہونے نہ ہونے کے) بارے میں اختلاف ہے (ردالمحتار)

علامہ شامی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت اور اس میں مذکور تطبیق سے معلوم ہوا کہ عام نوافل کو جماعت کے ساتھ پڑھنا، اگر تداعی کے ساتھ اتفاقاً واحیاناً ہو، تو حنفیہ کے نزدیک مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولیٰ ہے، گناہ نہیں، جس کا حاصل جواز نکلتا ہے، اور اگر مواظبتاً ودائماً یعنی عادت بنا کر ہو، تو بدعت ومکروہ تحریمی ہے، اور اگر تداعی کے بغیر ہو، تو بلاکراہت جائز ہے۔

''الفتاویٰ الهندية'' کا حوالہ

''الفتاویٰ الهندية'' میں ہے:

التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعى يكره وفى الأصل للصدر الشهيد أما إذا صلوا بجماعة بغير أذان وإقامة فى ناحية المسجد لا يكره، وقال شمس الأئمة الحلوانى :إن كان سوى الإمام ثلاثة لا يكره بالاتفاق وفى الأربع اختلف المشايخ والأصح أنه يكره .هكذا فى الخلاصة (الفتاویٰ الهندية، ج ا، ص ۸۳، كتاب الصلاة، الباب الخامس، الفصل الأول)

ترجمہ: نفل نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا، جب تداعی کے طور پر ہو، مکروہ ہے، اور صدرُ الشہید کی ''کتاب الاصل'' میں ہے کہ جب جماعت کے ساتھ اذان اور اقامت کے بغیر مسجد کے کنارے میں پڑھیں، تو مکروہ نہیں، اور شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا کہ اگر امام کے علاوہ تین افراد ہوں، تو بالاتفاق مکروہ نہیں، اور چار ہوں، تو مشائخ کا اختلاف ہے، اصح مکروہ ہونا ہے، خلاصہ میں اسی طرح ہے (الفتاویٰ الهندية)

اس سے معلوم ہوا کہ نوافل کی جماعت کے متعلق ''صدر الشہید'' اور ''حلوانی'' کا اختلاف ہے، جو تداعی کی حقیقت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

''اعلاءُ السنن'' کا حوالہ

''اعلاءُ السنن'' میں ہے:

قلت: وتفسير التداعى بالاهتمام والمواظبة اولى من تفسيرها بالعدد والكثرة كما لا يخفى............ فالتنفل بالجماعة على سبيل المواظبة يكره اتفاقا، واختلفوا فيما اذا كانت بدونها، فاجازه بعضهم مطلقا كالحلوانى، ومنعه بعضهم اذا كانوا اربعا سوى الامام (اعلاء السنن، ج٧ص ١٧١، كتاب الصلاة، باب كراهة الجماعة فى النوافل والوتر سوى التراويح والكسوف والاستسقاء والعيدين بالتداعى، مطبوعة: دارالفكر، بيروت، لبنان،الطبعة الاولىٰ ١٤٢١ھ، 2001ء)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ تداعی کی تفسیر اہتمام اور مواظبت سے کرنا، عدد اور کثرت کے ساتھ تفسیر کرنے کے مقابلہ میں بہتر ہے، جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں...... پس نوافل کی جماعت مواظبت (و پابندی) کے ساتھ بالاتفاق مکروہ ہے، اور مواظبت کے بغیر نوافل کی جماعت کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض حضرات جیسا کہ حلوانی اس کی مطلق اجازت دیتے ہیں، اور بعض حضرات اس سے منع کرتے ہیں، جبکہ مقتدی امام کے علاوہ چار ہوں (اعلاء السنن)

مذکورہ عبارت میں حلوانی کی طرف جو قول منسوب کیا گیا ہے، اس سے پہلی عبارت میں حلوانی کی طرف دوسرا قول منسوب کیا گیا ہے۔

بہر حال تداعی کی تفسیر جس طرح امام کے علاوہ چار افراد کے موجود ہونے سے کی گئی ہے، اسی

طرح اہتمام ومواظبت و پابندی کے ساتھ بھی کی گئی ہے، جس کو بعض حضرات نے بہتر تفسیر قرار دیا ہے، اور مواظبت واہتمام کے بغیر باجماعت تطوع کے جواز وکراہت میں اختلاف ہے، علامہ شامی نے اس کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کا حوالہ

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ مؤطا امام مالک کی فارسی شرح ''المصفّٰی''میں فرماتے ہیں:

> مسئلہ: ازیں حدیث واحادیثِ دیگر معلوم شدہ است کہ نمازِ نفل باجماعت خواندن مکروہ نیست، آرے التزام مثل التزام آں درفرض وعیدین وکسوف بدعت است (المصفّٰی، ج ا ص ۱۶۶، باب جواز الجماعة فی النافلة، مطبوعہ: مطبع فاروقی، دھلی)
>
> ترجمہ: مسئلہ: اس حدیث اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفل نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ نہیں، البتہ فرض نماز اور عیدین اور سورج گرہن وغیرہ کی نماز کے التزام کی طرح اس کی جماعت کا التزام کرنا بدعت ہے (مصفّٰی)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک عام نفل نماز کا احیاناً باجماعت پڑھنا مکروہ نہیں، قطع نظر تداعی وغیر تداعی کے، البتہ فرض نماز، عیدین اور سورج گرہن وغیرہ کی طرح جماعت کا التزام کرنا بدعت ہے۔

اس بحث کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ نمازِ تراویح، سورج گرہن اور رمضان میں وتر کی نماز کے علاوہ نوافل کی جماعت کے بارے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چاند گرہن کی نماز اور اسی طرح استسقاء کی نماز تنہا پڑھنے

کا حکم ہے، البتہ بعض حنفیہ اس حکم کو سنت کی نفی پر محمول کرتے ہوئے جواز کے قائل ہیں، اور دیگر عام فقہائے کرام کے نزدیک ان نمازوں کو بھی باجماعت پڑھنا سنت ہے۔ [1]

جہاں تک دوسری عام نوافل نمازوں کو باجماعت پڑھنے کا تعلق ہے، تو شافعیہ کے نزدیک نوافل کو جماعت سے ادا کرنا بلا کراہت جائز ہے، خواہ تداعی واجتماع کا اہتمام ہو یا نہ ہو۔

اور حنابلہ کے نزدیک بھی نوافل کو باجماعت ادا کرنا جائز ہے، البتہ بعض حنابلہ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ اسے دائماً ومواظبتاً نہ پڑھا جائے، جس سے اس کے باجماعت سنت ہونے کا اشتباہ پیدا ہو جائے۔

اور مالکیہ کے نزدیک نوافل وتطوعات کے لیے اس شرط کے ساتھ اجتماع جائز ہے کہ جماعت کثیر نہ ہو، یا مشہور مقام میں نہ ہو، ورنہ مکروہ ہے، اور جن راتوں کے اندر فقہاء نے اجتماع کو مکروہ وبدعت قرار دیا ہے، ان راتوں میں بھی مالکیہ کے نزدیک اجتماع مکروہ ہے۔

اور حنفیہ کے نزدیک نوافل کا جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے، جبکہ تداعی کے ساتھ ہو، جس کی تفسیر بعض حضرات نے اہتمام ومواظبت سے، اور بعض نے اس سے کی ہے کہ چار آدمی یا

---

[1] اتفق الفقهاء على أن الجماعة سنة فى صلاة الكسوف .وسوى الشافعية والحنابلة بين الكسوف والخسوف فى سنية الجماعة فيهما، أما الحنفية والمالكية فلا يرون صلاة الجماعة فى صلاة الخسوف.

والجماعة فى صلاة الاستسقاء سنة عند المالكية، والشافعية، والحنابلة، ومحمد، وأبى يوسف خلافا لأبى حنيفة، فإنه لا يرى فيها صلاة أصلا .

والجماعة فى صلاة التراويح سنة عند الحنفية، والشافعية، والحنابلة ومستحبة عند المالكية والجماعة فى صلاة الوتر سنة فى شهر رمضان عند الحنابلة، ومستحبة عند الشافعية وفى قول عند الحنفية .

وتجوز الجماعة فى غير ما ذكر من صلاة التطوع عند جمهور الفقهاء وقالوا :يجوز التطوع جماعة وفرادى؛ لأن النبى صلى الله عليه وسلم فعل الأمرين كليهما، وكان أكثر تطوعه منفردا، وصلى بحذيفة مرة ، وبأنس وأمه واليتيم مرة ، وأم أصحابه فى بيت عتبان مرة كذلك .

وعن ابن عباس -رضى الله تعالى عنهما -أنه أمه النبى صلى الله عليه وسلم .

والمالكية قيدوا الجواز بما إذا كانت الجماعة قليلة، وكان المكان غير مشتهر، فإن كثر العدد كرهت الجماعة، وكذلك تكره لو كانت الجماعة قليلة والمكان مشتهرا.

ويرى الحنفية أن الجماعة فى النفل فى غير رمضان مكروهة (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ٢٧ ص١٦٨ ، ١٦٩ ، مادة "صلاة الجماعة")

اس سے زیادہ جماعت میں شریک ہوں۔ ؎

؎ تسن الجماعة لصلاة الكسوف باتفاق بين المذاهب، وتسن للتراويح عند الحنفية والشافعية والحنابلة .وهى مندوبة عند المالكية، إذ الأفضل الانفراد بها -بعيدا عن الرياء -إن لم تعطل المساجد عن فعلها فيها .وتسن الجماعة كذلك لصلاة الاستسقاء عند المالكية والشافعية والحنابلة، أما عند الحنفية فتصلى جماعة وفرادى عند محمد، ولا تصلى إلا فرادى عند أبى حنيفة.
وتسن الجماعة لصلاة العيدين عند المالكية والشافعية. أما عند الحنفية والحنابلة فالجماعة فيها واجبة .ويسن الوتر جماعة عند الحنابلة .
وبقية التطوعات تجوز جماعة وفرادى عند الشافعية والحنابلة، وتكره جماعة عند الحنفية إذا كانت على سبيل التداعى، وعند المالكية الجماعة فى الشفع والوتر سنة والفجر خلاف الأولى .أما غير ذلك فيجوز فعله جماعة، إلا أن تكثر الجماعة أو يشتهر المكان فتكره الجماعة حذر الرياء (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج١٢، ص١٥٤، ١٥٥، مادة' تطوع"ما تسن له الجماعة من صلاة التطوع)
قال الحنفية :تكره الجماعة فى صلاة النوافل.
وقال المالكية كذلك :تكره الجماعة فى النوافل، لأن شأن النفل الانفراد به، كما تكره صلاة النفل فى جمع قليل بمكان مشتهر بين الناس، وإن لم تكن الجماعة كثيرة والمكان مشتهرا فلا تكره.
وقال الشافعية :تستحب الجماعة فى التراويح والوتر فى رمضان، ولا يستحب فعل سائر الرواتب جماعة.
وقال الحنابلة :يجوز التطوع جماعة ومنفردا؛ لأن النبى صلى الله عليه وسلم فعل الأمرين كليهما، وكان أكثر تطوعه منفردا، وصلى بابن عباس مرة، وبأنس وأمه واليتيم مرة، وأم أصحابه فى بيت عتبان مرة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٥، ص٢٨٣، مادة" سن ")
ذهب جمهور الفقهاء إلى أنه يجوز التطوع جماعة وفرادى؛ لأن النبى صلى الله عليه وسلم فعل الأمرين كليهما.
والأفضل فى غير التراويح المنزل، لحديث :عليكم بالصلاة فى بيوتكم، فإن خير صلاة المرء فى بيته إلا المكتوبة .
وفى رواية :صلاة المرء فى بيته أفضل من صلاته فى مسجدى هذا إلا المكتوبة .
ولكن إذا كان فى بيته ما يشغل باله، ويقلل خشوعه، فالأفضل أن يصليها فى المسجد فرادى؛ لأن اعتبار الخشوع أرجح .
ونص الحنفية على كراهة الجماعة فى التطوع إذا كان على سبيل التداعى، بأن يقتدى أربعة بواحد.
وصرح المالكية بأنه يكره الجمع فى النافلة غير التراويح إن كثرت الجماعة، سواء كان المكان الذى أريد الجمع فيه مشتهرا كالمسجد، أو لا كالبيت، أو قلت الجماعة وكان المكان مشتهرا، وذلك لخوف الرياء .

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

پس موجودہ دور کے بعض حنفیہ کا اہتمام اور مواظبت کے بغیر احیاناً تطوع باجماعت پڑھنے پر عدمِ جواز اور حرمت کا حکم لگانا راجح معلوم نہیں ہوا۔

جہاں تک قیامِ رمضان اور شہرِ رمضان میں بیس رکعات، یا اس سے زیادہ باجماعت پڑھنے کا تعلق ہے، تو اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ [1]

واللہ تعالیٰ اعلم.

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

فإن قلت وكان المكان غير مشتهر فلا كراهة، إلا في الأوقات التي صرح العلماء ببدعة الجمع فيها، كليلة النصف من شعبان، وأول جمعة من رجب، وليلة عاشوراء ، فإنه لا خلاف في الكراهة مطلقا (الموسوعة الفقهية الكويتية ، ج٣٤ص ١٢٢ ، مادة "قيام الليل")

[1] اہتمام اور مواظبت کے بغیر اتفاقاً عام نوافل وتطوع کی نماز باجماعت پڑھنے پر کراہتِ تحریمی کا حکم لگانا، تو عندالحنفیۃ بھی درست نہیں، خواہ نفل کی جماعت میں چار سے زیادہ افراد کیوں نہ شریک ہوں۔

اور ظاہر ہے کہ عموماً، عام نوافل وتطوع کی نماز باجماعت بڑے مجمع کے ساتھ، اہتمام ومواظبت کے ساتھ نہیں پڑھی جاتی۔

اور اگر کسی وقت اہتمام ومواظبت کے ساتھ بڑے مجمع کے ساتھ پڑھی جائے، تو پھر اس پر عندالحنفیۃ کراہت کا حکم لگانے میں کوئی تردد نہیں، تاہم اس صورت میں بھی اس پر کراہتِ تنزیہی، یا کراہتِ تحریمی کا حکم لگانے میں کلام کی گنجائش ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس متعین صورت کے مالہٗ وماعلیہ پر نظر کر کے تنزیہی، یا تحریمی کا متعین حکم لگایا جائے۔

جبکہ بعض فقہائے کرام اہتمام ومواظبت کی قید لگائے بغیر، بڑے مجمع کے ساتھ عام نوافل وتطوع کی نماز باجماعت پڑھنے پر بھی کراہت کا حکم نہیں لگاتے۔

اور ماہِ رمضان میں جمہور کے نزدیک بیس رکعات تک تو تراویح کے مفہوم میں داخل ہیں، جن کو باجماعت پڑھنے کے مکروہ قرار دینے کے کوئی معنیٰ نہیں، اور متعدد فقہائے کرام بیس سے زائد رکعات کو بھی، تراویح، یا قیامِ رمضان کے مفہوم میں داخل مان کر باجماعت پڑھنے کو مکروہ قرار نہیں دیتے، بلکہ مالکیہ وغیرہ تو چالیس رکعات تک کو بھی تراویح، یا قیامِ رمضان کے مفہوم میں داخل مانتے ہیں، جس کے پیشِ نظر رمضان کی راتوں میں نوافل کی جماعت کا معاملہ دوسرے دنوں سے بھی اھوَن ہے۔

اور کسی بھی قول کو ترجیح دینے کے بعد، بہر حال اس قسم کے اجتہادی واختلافی مسائل میں، ایک دوسرے کے قول، یا فعل پر، نکیر وتحقیر کا طرزِ عمل درست نہیں ہوتا۔

اور ہمارے یہاں بعض حنفیہ کی طرف سے عام دنوں میں اتفاقاً، یا ماہِ رمضانُ المبارک کی مخصوص راتوں میں، نوافل کی جماعت پر جس انداز میں نکیر اور اس پر عمل کرنے والوں کی تحقیر کا طرزِ عمل اپنایا جاتا ہے، یہ درست طرزِ عمل نہیں۔

اور جس قسم کی تحریرات سے اس قسم کا طرزِ عمل ناشی ہو، ان پر بھی نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

اور ہمارے پیشِ نظر یہی نکتہ ہے کہ اس قسم کے فروعی نوعیت کے اجتہادی واختلافی مسائل میں تشدد یا تعصب کے طرزِ عمل سے اجتناب کیا جائے، جس کی مزید تفصیل آگے آتی ہے۔ محمد رضوان خان۔

(فصل نمبر 2)

قیامِ رمضان کی فضیلت اوراس کی تحقیق

متعدد احادیث میں قیامِ رمضان کی فضیلت وارِد ہے، جس سے فقہائے کرام نے تراویح کو مراد لیا ہے۔

لیکن متعدد محدثین نے فرمایا کہ قیامِ رمضان تراویح کے ساتھ مختص نہیں ہے، البتہ تراویح کے ذریعہ سے قیامِ رمضان کا مقصود حاصل ہوجاتا ہے۔ [1]

قیامِ رمضان کی فضیلت سے متعلق احادیث

پہلے قیامِ رمضان کی فضیلت وترغیب کے سلسلہ میں چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۳۷، کتاب الایمان، بَاب تطوع قیام رمضان من الایمان)

ترجمہ: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے رمضان (کی رات) میں قیام کیا، ایمان کی حالت میں اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے اخلاص کے ساتھ تو یہ عمل اس کے سابقہ گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

---

[1] قیام لیالی رمضان: لا خلاف بین الفقهاء فی سنیة قیام لیالی رمضان، لقوله صلی الله علیه وسلم: من قام رمضان إیمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه .

وقال الفقهاء: إن التراویح هی قیام رمضان، ولذلک فالأفضل استیعاب أکثر اللیل بها؛ لأنها قیام اللیل(الموسوعة الفقهیة الکویتیة، ج۳۴ص۱۲۳، مادة "قیام اللیل")

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرَغِّبُ فِيْ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَأْمُرَهُمْ فِيْهِ بِعَزِيْمَةٍ فَيَقُوْلُ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (صحيح مسلم،رقم الحديث ٧٥٩"١٧٤"، ابو داؤد، رقم الحديث ١٣٧٣؛مؤطاامام مالك ،الترغيب فى الصلاة فى رمضان، ترمذى، باب الترغيب فى قيام رمضان، وما جاء فيه من الفضل) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو قیامِ رمضان کی ترغیب دیا کرتے تھے، اس کا وجوبی ولازمی حکم نہیں فرماتے تھے، پس آپ فرماتے تھے کہ جو شخص رمضان کا قیام کرے، ایمان کی حالت میں اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے ،تو اس کے گزشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے (مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُرَغِّبُ النَّاسَ فِيْ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَأْمُرَهُمْ بِعَزِيْمَةِ أَمْرٍ فِيْهِ فَيَقُوْلُ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (سنن النسائى،رقم الحديث ٢١٩١، كتاب الصيام، ثواب من قام رمضان وصامه إيمانا واحتسابا)

ترجمہ: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو قیامِ رمضان کی ترغیب دیا کرتے تھے،اس کا وجوبی ولازمی حکم نہیں فرماتے تھے، پس آپ فرماتے تھے کہ جو شخص رمضان کا قیام ایمان کی حالت میں اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے کرے تو اس کے گزشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے (سنن النسائی)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فَرَضَ صِيَامَ رَمَضَانَ عَلَيْكُمْ وَسَنَنْتُ لَكُمْ

---

[1] وقال الترمذى بعد نقل هٰذا الحديث: وفى الباب عن عائشة، وقد روى هذا الحديث أيضا عن الزهرى، عن عروة، عن عائشة .هذا حديث حسن صحيح.

قِيَامَهُ فَمَنْ صَامَهُ وَقَامَهُ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ (سنن النسائی،رقم الحديث ٢٢١٠، كتاب الصيام، ثواب من قام رمضان وصامه ايمانا واحتسابا، واللفظ لهٗ؛ ابنِ ماجة، رقم الحديث ١٣٢٨، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء فی قيام شهر رمضان) [1]

ترجمہ: بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض قرار دیے اور میں نے رمضان کی رات میں قیام کو سنت قرار دیا، پس جس شخص نے رمضان کا روزہ رکھا اور رمضان میں قیام کیا، ایمان کی حالت میں اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے اخلاص کے ساتھ تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح سے نکل جائے گا جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت تھا (سنن النسائی)

مذکورہ احادیث سے قیامِ رمضان کی فضیلت وترغیب معلوم ہوئی۔

قیامِ رمضان کی مراد سے متعلق محدثین کے اقوال

رمضان میں نمازِ تراویح کے باجماعت مشروع اور مسنون یا مستحب ہونے پر فقہائے کرام کا اتفاق ہے۔ [2]

---

[1] قال المناوی: إسناده حسن (فيض القدير للمناوی، تحت رقم الحديث ١٦٩٠)
وقال الذهبی: هذا حديث حسن غريب (سير اعلام النبلاء، ج ١، ص ١٧، تحت ترجمة عبد الرحمن بن عوف بن عبد عوف الزهری)
وقال الاعظمی: إسناده ضعيف ومعناه ثابت (صحيح ابن خزيمة)

[2] اتفق الفقهاء على مشروعية الجماعة فی صلاة التراويح؛ لفعل النبی صلى الله عليه وسلم كما سبق، ولفعل الصحابة – رضوان الله تعالى عليهم – ومن تبعهم منذ زمن عمر بن الخطاب – رضی الله عنه –؛ ولاستمرار العمل عليه حتى الآن.
وذهب جمهور الفقهاء إلى أن الجماعة فی صلاة التراويح سنة.
قال الحنفية: صلاة التراويح بالجماعة سنة على الكفاية فی الأصح، فلو تركها الكل أسائوا، أما لو تخلف عنها رجل من أفراد الناس وصلى فی بيته فقد ترك الفضيلة، وإن صلى فی البيت بالجماعة لم ينل فضل جماعة المسجد.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

البتہ قیامِ رمضان سے متعلق جو احادیث ذکر کی گئیں، ان میں قیامِ رمضان سے تراویح وغیرہ مراد ہونے کے متعلق تھوڑا بہت اختلاف ہے، اس کے متعلق چند محدثین کی تشریح وتوضیح ملاحظہ فرمائیں۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والمراد بقيام رمضان صلاة التراويح(شرح النووی علی مسلم، ج۶ ص ۳۹، کتاب صلاة المسافرين وقصرها،باب الترغيب فی قيام رمضان)

ترجمہ: اور قیامِ رمضان سے مراد تراویح کی نماز ہے (نووی شرح مسلم)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ احادیث میں قیامِ رمضان سے تراویح مراد ہے۔

علامہ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے قیامِ رمضان سے مطلق قیام مراد لیا ہے، اور امام نووی کے مذکورہ قول کی بھی تشریح کی ہے، اور علامہ کرمانی کے قیامِ رمضان سے تراویح مراد ہونے کے متفق

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ وقال المالكية: تندب صلاة التراويح فی البيوت إن لم تعطل المساجد، وذلک لخبر: عليكم بالصلاة فی بيوتكم، فإن خير صلاة المرء فی بيته إلا الصلاة المكتوبة ولخوف الرياء وهو حرام، واختلفوا فيما إذا صلاها فی بيته، هل يصليها وحده أو مع أهل بيته؟ قولان، قال الزرقانی: لعلهما فی الأفضلية سواء.

وندب صلاة التراويح – فی البيوت عندهم – مشروط بثلاثة أمور: أن لا تعطل المساجد، وأن ينشط لفعلها فی بيته، ولا يقعد عنها، وأن يكون غير آفاقی بالحرمين، فإن تخلف شرط كان فعلها فی المسجد أفضل، وقال الزرقانی: يكره لمن فی المسجد الانفراد بها عن الجماعة التی يصلونها فيه، وأولى إذا كان انفراده يعطل جماعة المسجد .

وقال الشافعية: تسن الجماعة فی التراويح على الأصح؛ لحديث عائشة – رضی الله تعالى عنها – الذی سبق ذكره؛ وللأثر عن عمر – رضی الله تعالى عنه – ولعمل الناس على ذلک.

ومقابل الأصح عندهم أن الانفراد بصلاة التراويح أفضل كغيرها من صلاة الليل لبعده عن الرياء .

وقال الحنابلة: صلاة التراويح جماعة أفضل من صلاتها فرادى، قال أحمد: كان علی وجابر وعبد الله – رضی الله عنهم – يصلونها فی الجماعة .

وفی حديث أبی ذر – رضی الله تعالى عنه – أن النبی صلى الله عليه وسلم جمع أهله ونسائه، وقال: إن الرجل إذا صلى مع الإمام حتى ينصرف كتب له قيام ليلة .

وقالوا: إن تعذرت الجماعة صلى وحده لعموم قول النبی صلى الله عليه وسلم: من قام رمضان إيمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۷ ص ۱۴۶، ۱۴۷، مادة "صلاة التراويح")

علیہ قول ہونے سے اتفاق نہیں کیا۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

باب فضل من قام رمضان أی قام لیالیه مصلیا والمراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام کما قدمناه فی التهجد سواء وذکر النووی أن المراد بقیام رمضان صلاة التراویح یعنی أنه یحصل بها المطلوب من القیام لا أن قیام رمضان لا یکون إلا بها وأغرب الکرمانی فقال اتفقوا علی أن المراد بقیام رمضان صلاة التراویح

(فتح الباری، ج۴، ص ۲۵۱، کتاب صلاة التراویح، باب فضل من قام رمضان)

ترجمہ: جس نے رمضان میں قیام کیا، یہ باب اس شخص کی فضیلت کے متعلق ہے، جس نے رمضان کی رات میں نماز پڑھ کر قیام کیا، اور قیامِ لیل سے مراد وہ ہے، جس سے مطلق قیام حاصل ہو جائے، جیسا کہ ہم نے تہجد کے بیان میں یہی تفصیل ذکر کی ہے، اور نووی نے یہ ذکر کیا ہے کہ قیامِ رمضان سے مراد نمازِ تراویح ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تراویح کے ذریعہ سے قیام کا مطلوب حاصل ہو جاتا ہے، لیکن یہ مطلب نہیں کہ قیامِ رمضان صرف تراویح کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے، اور کرمانی نے نہایت عجیب بات کی ہے کہ قیامِ رمضان سے نمازِ تراویح مراد ہونے پر اتفاق ہے (فتح الباری)

مطلب یہ ہے کہ علامہ ابنِ حجر کے نزدیک قیامِ رمضان کی مراد خاص تراویح نہیں ہے، البتہ اس سے قیامِ رمضان کا مقصود اعلیٰ طریقہ پر حاصل ہو جاتا ہے، اور احادیث میں بیان کردہ قیامِ رمضان کی تراویح کے ذریعہ سے فضیلت حاصل ہو جاتی ہے، اور قیامِ رمضان سے تراویح مراد ہونے پر اتفاق ہونے کا قول غریب ہے، کیونکہ یہ اتفاق ثابت نہیں۔ **ومن ادعیٰ فعلیه البیان۔**

علامہ ابنِ ملقن رحمہ اللہ نے بھی عموم کو ہی ترجیح دی ہے، اور اس کو محقق قول قرار دیا ہے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

المُراد بالقيام في الحديث صلاة التراويح كذا قاله أصحابنا وغيرهم من العلماء، والتحقيق كما نبه عليه النووي أن يُقال: التراويح محصلة لفضيلة قيام رمضان، ولكن لا تنحصر الفضيلة فيها ولا المراد بها، بل في أي وقت من الليل صلى تطوعًا حصل هذا الغرض (التوضيح لشرح الجامع الصحيح، ج۳، ص ۶۷، کتاب الایمان، باب تطوع قيام رمضان من الإيمان)

ترجمہ: حدیث میں قیام سے مراد نمازِ تراویح ہے، جیسا کہ ہمارے اصحاب اور دیگر علماء نے فرمایا، لیکن تحقیقی بات جس پر نووی نے متنبہ کیا ہے، یہ ہے کہ تراویح کے ذریعہ قیامِ رمضان کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے، مگر یہ فضیلت تراویح میں منحصر نہیں ہے، اور نہ ہی خاص تراویح مراد ہے، بلکہ رات کے جس وقت میں بھی نفل نماز پڑھ لی جائے، یہ غرض حاصل ہوجاتی ہے (التوضیح)

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ، صحیح بخاری کی شرح میں قیامِ رمضان کے تطوع کی بحث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

ومعنى من قام رمضان: من قام بالطاعة في ليالي رمضان، ويقال: يريد صلاة التراويح، وقال بعضهم: لا يختص ذلك بصلاة التراويح بل في أي وقت صلى تطوعا حصل له ذلك الفضل (عمدة القاری شرح صحیح البخاری، ج ۱، ص ۲۳۳، کتاب الایمان، باب تطوع قيام رمضان من الإيمان)

ترجمہ: اور ''جس نے رمضان میں قیام کیا'' اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اطاعت کے ساتھ رمضان کی راتوں میں قیام کیا، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے تراویح کی نماز مراد ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ قیامِ رمضان تراویح

کی نماز کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ رمضان میں کسی بھی وقت میں جب نفل نماز پڑھے، تو اس سے یہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے (عمدۃ القاری)

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ کتاب التراویح ''باب فضل من قام رمضان'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أی هذا باب فی بیان فضل من قام رمضان .قال الکرمانی :اتفقوا علی أن المراد بقیامه صلاة التراویح .قلت :قال النووی :المراد بقیام رمضان صلاة التراویح، ولکن الاتفاق من أین أخذه؟ بل المراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، سواء کان قلیلا أو کثیرا (عمدة القاری، ج ١١، ص ١٢٤، کتاب التراویح، باب فضل من قام رمضان)

ترجمہ: یعنی یہ باب قیامِ رمضان کی فضیلت کے بیان کے بارے میں ہے، کرمانی نے فرمایا کہ اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قیامِ رمضان سے مراد نمازِ تراویح ہے، میں کہتا ہوں کہ نووی نے یہ بات فرمائی ہے کہ قیامِ رمضان سے مراد نمازِ تراویح ہے، لیکن اس بات پر اتفاق معلوم نہیں کرمانی نے کہاں سے لیا ہے، بلکہ قیامِ لیل سے مراد یہ ہے، جس کے ذریعہ مطلق قیام حاصل ہوجائے، چاہے قلیل ہو یا کثیر ہو (عمدة القاری)

مذکورہ عبارات سے بھی معلوم ہوا کہ قیامِ رمضان کی عام یا خاص مراد ہونے کے متعلق اقوال مختلف ہیں، اور قیامِ رمضان سے خاص تراویح مراد ہونے کو متفق علیہ قول قرار دینے سے متعدد محدثین کو اختلاف ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ ''مشکاةُ المصابیح'' کی شرح میں فرماتے ہیں:

من قام رمضان، أی :أحیا لیالیه بالعبادة، أو أتی بقیام رمضان وهو التراویح، أو قام إلی صلاة رمضان (مرقاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح، ج٣، ص ٩٦٦، کتاب الصلاة، باب قیام شهر رمضان)

ترجمہ: جس نے رمضان میں قیام کیا، یعنی رمضان کی راتوں کو عبادت کے ساتھ زندہ کیا، یا قیامِ رمضان کو ادا کیا، جس سے تراویح مراد ہے، یا رمضان کی نماز کو قائم کیا (مرقاۃُ المفاتیح)

ایک اور مقام پر ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومن قام رمضان "أى ليـاليـه أو معظمها، أو بعض كل ليلة بصلاة التـراويـح وغيـرهـا، مـن التلاوة والذكر والطواف ونحوها (مـرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج۴، ص ۱۳۶۲، كتاب الصوم)

ترجمہ: اور جس نے رمضان میں قیام کیا، یعنی رمضان کی راتوں یا بڑے حصہ میں یا ہر رات کے بعض حصہ میں نمازِ تراویح وغیرہ، مثلاً تلاوت اور ذکر اور طواف وغیرہ کو قائم کیا (مرقاۃُ المفاتیح)

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ قیامِ رمضان کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أى :صـلاة التراويح قاله النووى :وقال غيره :بـل مطلق الصلاة الحاصل بها قيام الليل (التعليق الممجد على موطأ محمد شرح لموطأ مالك برواية محمد بن الحسن، ج ۱ ص ۳۵۴، تحت رقم الحديث ۲۴۰، ابواب الصلاة، باب قيام شهر رمضان وما فيه من الفضل)

ترجمہ: اس سے مراد نمازِ تراویح ہے، امام نووی کا قول یہی ہے، اور امام نووی کے علاوہ دیگر حضرات کا قول یہ ہے کہ مطلق نماز جس سے بھی قیامُ اللیل حاصل ہو جائے، وہ مراد ہے (التعليق الممجد)

امام قسطلانی رحمہ اللہ بخاری کی شرح میں فرماتے ہیں:

(من قام) بـالـطاعة صلاة التراويح أو غيرها من الطاعات فى ليالى (رمضان) حـال كـون قيامه (إرشـاد السـارى لشـرح صـحيح البخارى، ج ۱، ص ۱۲۲، كتاب الايمان، باب تطوع قيام رمضان من الإيمان)

ترجمہ: جس نے رمضان کی راتوں میں نمازِ تراویح یا دوسری عبادات کے ذریعہ طاعت بجالاکر قیام کیا(ارشادُ الساری)

امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(من قام رمضان) أی قام بالطاعة فی رمضان أتی بقیام رمضان وهو التراویح أو قام إلی صلاة رمضان أو إلی إحیاء لیالیه بالعبادة غیر لیلة القدر تقدیرا ویحصل بنحو تلاوة أو صلاة أو ذکر أو علم شرعی وکذا کل عمل أخروی ویکفی بمعظم اللیل وقیل بصلاة العشاء والصبح جماعة (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، تحت رقم الحدیث ۸۹۰۱)

ترجمہ: جس نے رمضان میں قیام کیا، یعنی رمضان میں طاعت کے ساتھ قیام کیا، رمضان کے قیام یعنی تراویح کو ادا کیا، یا رمضان کی نماز کو قائم کیا، یا لیلۃُ القدر کے علاوہ اس کی راتوں کو عبادت کے ساتھ زندہ کیا۔

اور قیامِ رمضان، تلاوت یا نماز یا ذکر یا علمِ شرعی سے حاصل ہوجاتا ہے، اور اسی طریقہ سے ہر اخروی عمل کے ذریعہ سے حاصل ہوجاتا ہے، اور رات کے بڑے حصہ سے حاصل ہوجاتا ہے، اور ایک قول کے مطابق عشاء اور فجر کی نماز باجماعت پڑھنے سے حاصل ہوجاتا ہے(فیضُ القدیر)

امام صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(من قام رمضان) أی قام بالطاعة فی لیالیه من تلاوة أو صلاة أو علم شرعی أو ذکر الله (التنویر شرح الجامع الصغیر،للصنعانی، تحت رقم الحدیث ۸۸۸۲)

ترجمہ: جس نے قیامِ رمضان کیا، یعنی رمضان کی راتوں میں تلاوت یا نماز یا علمِ

شرعی یا ذکرُ اللہ جیسی طاعت ادا کر کے قیام کیا (التنویر)

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقال " :خشيت أن تفرض عليكم فتعجزوا عنها "فيه دليل على جواز الجمع للنوافل عامة ولجمع رمضان خاصة، لكن كره أهل العلم الجمع للنوافل مشهرا وعلى التوالى إلا قيام رمضان، فلم يختلفوا فى استحباب الجمع فيه (شرح صحيح مسلم للقاضى عياض المسمى إكمال المعلم بفوائد مسلم، ج٣،ص ١١٤، كتاب صلاة المسافرين وقصرها،باب الترغيب فى قيام رمضان ، وهو التراويح)

ترجمہ: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مجھے اس بات کا خوف ہوگیا کہ تم پر یہ نماز فرض نہ کردی جائے، پھر تم اس کو نبھانے سے عاجز ہوجاؤ'' اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ نوافل کے لیے جمع ہونا عموماً اور قیامِ رمضان کے لیے جمع ہونا خصوصاً جائز ہے، لیکن اہلِ علم نے نوافل کے لیے علی الاعلان اور پابندی کے ساتھ جمع ہونے کو مکروہ قرار دیا ہے، سوائے قیامِ رمضان کے، جس کے لیے جمع ہونے کے مستحب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں (اکمالُ المعلم)

معلوم ہوا کہ احادیث میں خاص رمضان کی راتوں میں قیام کی جو فضیلت وارِد ہے، اس کی خصوصی یا عمومی مراد ہونے کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ متعدد احادیث میں قیامِ رمضان کی فضیلت وارد ہے، اور ان احادیث میں مذکور قیامِ رمضان کی عمومی یا خصوصی مراد ہونے میں علماء وفقہاء کے اقوال مختلف ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ تراویح کے ذریعہ سے بھی قیامِ رمضان کا مقصد بالاتفاق حاصل ہوجاتا ہے، اور

یہ اختلاف دراصل ایسا ہی ہے، جیسا کہ قیامُ اللیل اور تہجد کے متعلق اختلاف ہے۔ [1]

مگر یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ قیامِ لیل کی عمومی یا خصوصی مراد ہونے کی مذکورہ بحث سے تراویح کی سنت و اہمیت اور اس کے اصل حکم پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ تراویح کا مسنون ہونا ''قیامِ لیل'' کی فضیلت والی مذکورہ احادیث کے علاوہ مستقل دلائل مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور صحابۂ کرام کے تعامل اور اجماعِ امت وغیرہ سے ثابت ہے۔

پھر جس کے نزدیک تراویح کی جتنی رکعات ہیں، اس کے نزدیک قیامِ رمضان کی مخصوص مراد یعنی تراویح کی فضیلت وترغیب کا حکم، ان تمام رکعات کو شامل ہوگا۔

واللہ تعالیٰ أعلم.

---

[1] قيام الليل:التعريف:(القيام فى اللغة: نقيض الجلوس) .
والليل فى اللغة من مغرب الشمس إلى طلوع الفجر الصادق.
وفى اصطلاح الفقهاء هو: قضاء الليل ولو ساعة بالصلاة أو غيرها، ولا يشترط أن يكون مستغرقا لأكثر الليل.
ويرى ابن عباس رضى الله تعالى عنهما أنه يحصل بصلاة العشاء جماعة والعزم على صلاة الصبح جماعة، لقول رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى العشاء فى جماعة فكأنما قام نصف الليل، ومن صلى الصبح فى جماعة فكأنما صلى الليل كله.
وجاء فى مراقى الفلاح: معنى القيام أن يكون مشتغلا معظم الليل بطاعة، وقيل: ساعة منه، يقرأ القرآن أو يسمع الحديث أو يسبح أو يصلى على النبى صلى الله عليه وسلم ....
والصلة بين قيام الليل والتهجد :أن قيام الليل أعم من التهجد(الموسوعة الفهقية الكويتية ، ج٣٤ص١١٧، ١١٨، مادة "قيام الليل")
قيام الليل:الأصل فى قيام الليل أن يطلق على الاشتغال فيه بالصلاة دون غيرها .وقد يطلق على الاشتغال بمطلق الطاعة من تلاوة وتسبيح ونحوهما.
وقيام الليل قد يسبقه نوم بعد صلاة العشاء وقد لا يسبقه(الموسوعة الفهقية الكويتية ، ج١٤ ص٨٦، مادة "تهجد")
إحياء الليل، ويطلق عليه بعض الفقهاء أيضا قيام الليل، هو: إمضاء الليل، أو أكثره فى العبادة كالصلاة والذكر وقرائة القرآن الكريم، ونحو ذلک.(ر:إحياء الليل) .
وإحياء الليل: يكون فى كل ليلة من ليالى العام، ويكون بأى من العبادات المذكورة أو نحوها وليس بخصوص الصلاة.
أما صلاة التراويح فتكون فى ليالى رمضان خاصة(الموسوعة الفهقية الكويتية ، ج٢٧ص ١٣٦، مادة "صلاة التراويح")
صلاة الليل وقيام الليل أعم من التهجد(رد المحتار، ج٢ ص٢٤، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل)

(فصل نمبر 3)

رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت کی اہمیت

یوں تو قیامِ رمضان کی فضیلت اور تراویح کی سنت کا تعلق رمضان المبارک کے پورے مہینہ سے ہے۔ [1]

---

[1] ملحوظ رہے کہ مشائخِ حنفیہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ایک مرتبہ ختمِ قرآن کے بعد بھی رمضان کی بقیہ راتوں میں تراویح سنت ہے کہ نہیں؟ ہمارے نزدیک اس میں راجح قول سنت ہونے کا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر شروع سے ہی کوئی حافظِ قرآن نہ ملنے یا کسی دوسری وجہ سے تراویح میں قرآن پڑھنے یا سننے کا موقع نہ ملے، تب بھی تراویح سنت ہے۔فکذا ههنا۔

واختلفوا فيمن يختم قبل تمام الشهر فقيل يصلى العشاء فى بقية الشهر من غير تراويح ولا يكره له ذلک؛ لأنها شرعت لأجل ختم القرآن وقد حصل مرة وقيل يصلى التراويح ويقرأ فيها ما يشاء(تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق، ج ا ،ص ۱۷۹ ،کتاب الصلاة،باب الوتر والنوافل)

ثم إذا ختم قبل آخره قيل لا يكره له ترک التراويح فيما بقى لأنها شرعت لأجل الختم مرة وقيل يصليها ويقرأ فيها ما شاء (منية المصلى وغنية المبتدى،ص۲۲۷، کتاب الصلاة)

وفى شرح المنية :ثم إذا ختم قبل آخر الشهر قيل لا يكره له ترک التراويح فيما بقى لأنها شرعت لأجل ختم القرآن مرة قال أبو على النسفى، وقيل يصليها ويقرأ فيها ما شاء ذكره فى الذخيرة اهـ.(رد المحتار على الدر المختار، ج۲،ص۴۷،کتاب الصلاة،باب الوتر والنوافل)

قال القاضى الإمام أبو على النسفى رحمه الله، وإذا ختم فى التراويح مرة وصلى العشاء بقية الشهر من غير تراويح يجوز من غير كراهة؛ لأن التراويح ما شرعت بحق نفسها بل لأجل القراء ة فيها، فالسنة هو الختم مرة وقد ختم مرة، فلو أمرناه بالتراويح بعد ذلک أمرناه بهابحق نفسها وإنها ما شرعت بحق نفسها(المحيط البرهانى، ج ا ص ۴۶۰، کتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر فى التراويح والوتر)

وفى "الذخيرة :"إذا ختم على العشرين مثلا فله أن يقرأ فى بقية الشهر ما شاء الله .قال القاضى أبو على النسفى :إذا ختم وصلى العشاء فى بقية الشهر من غير تراويح جاز من غير كراهة، لأنها شرعت لأجل ختم القرآن مرة(البناية شرح الهداية، ج۲،ص ۵۵۶،کتاب الصلاة،فصل فى قيام شهر رمضان)

ولو حصل الختم بليلة التاسع أو الحادى والعشرين لا يترک التراويح فى بقية الشهر؛ لأنها سنة فى جميع الشهر(الجوهرة النيرة، ج ا ،ص۹۸، کتاب الصلاة،باب قيام شهر رمضان)

ولو ختم فى التراويح فى ليلة ثم لم يصل التراويح جاز بلا كراهة لأنه ما شرعت التراويح إلا للقراء ة (مجمع الانهر، ج ا ص ۱۳۶ ، ۱۳۷ ،کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل ، فصل التراويح)

تاہم بعض احادیث میں رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں خصوصی قیام اور عبادت کی اہمیت کا ذکر ہے، اسی قسم کی احادیث کے پیشِ نظر بعض حضرات رمضان کی دوسری راتوں کے مقابلہ میں رمضان کے آخری عشرہ یا اس کی مخصوص راتوں میں قیامِ رمضان یا تراویح کی رکعات میں اضافہ کے قائل ہیں۔

آخری عشرہ میں عبادت کی اہمیت سے متعلق احادیث

اس سلسلہ میں چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَادَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَاَحْيَا لَيْلَهٗ وَ اَيْقَظَ اَهْلَهٗ (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۲۰۲۴، کتاب صلاۃ التراویح، باب العمل فی العشر الأواخر من رمضان)

ترجمہ: جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تہبند کو مضبوط باندھ لیتے تھے اور رات بھر عبادت کرتے تھے اور اپنے گھر والوں کو (بھی عبادت کے لئے) جگاتے تھے (بخاری)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُوْقِظُ أَهْلَهٗ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ (سنن الترمذی، رقم الحدیث ۷۹۵، ابواب الصوم، باب ماجاء فی لیلۃ القدر، مسند احمد، رقم الحدیث ۷۲۶) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اپنے اہلِ خانہ کو (عبادت کے لئے) جگاتے تھے (ترمذی)

---

[1] قال الترمذی: هذا حديث حسن صحيح.
قال شعيب الارنؤوط: اسناده حسن رجاله ثقات (حاشية مسند احمد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ أَيْقَظَ أَهْلَهُ، وَرَفَعَ الْمِئْزَرَ،قِيْلَ لِأَبِيْ بَكْرٍ:مَا رَفْعُ الْمِئْزَرِ ؟ قَالَ:اِعْتَزَلَ النِّسَاءَ

(مسند احمد، رقم الحديث ۱۰۳) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ رمضان کا آخری عشرہ داخل ہونے پر اپنے گھر والوں کو جگاتے تھے، اور اپنا تہبند مضبوط کر لیتے تھے، ابوبکر راوی سے معلوم کیا گیا کہ تہبند مضبوط کرنا کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بیویوں سے علیحدگی اختیار کرتے تھے (مسند احمد)

محدثین نے تہبند کس لینے کا ایک مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ خوب محنت اور کوشش سے عبادت کرتے تھے، اور یہ لفظ ایسا ہی ہے جیسے اُردو کی بول وچال میں محنت کا کام بتانے کے لئے بولا جاتا ہے کہ ''کمر کس لو'' [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِيْ غَيْرِهٖ (صحيح مسلم،رقم الحديث ۱۱۷۵ "۸" كتاب الاعتكاف، باب الاجتهاد فى العشر الأواخر من شهر رمضان)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں کے اندر جتنی محنت سے عبادت کرتے تھے اس کے علاوہ دوسرے دنوں میں اتنی محنت نہ کرتے تھے (مسلم)

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده حسن(حاشية مسند احمد)

[2] واعتزل النساء، وهو يؤيد أن المراد بالشد المبالغة فى الجد، قال النووى :قيل :معنى شد المئزر الاجتهاد فى العبادات زيادة على عادته -صلى الله عليه وسلم -فى غيره، ومعناه التشمير فى العبادة، يقال :شددت فى هذا الأمر مئزرى أى تشمرت له وتفرغت، وقيل : هو كناية عن اعتزال النساء وترك النكاح، ودواعيه وأسبابه، وهو كناية عن التشمير للعبادة والاعتزال من النساء معا (مرقاة المفاتيح ،ج۴ص ۱۴۴۱، كتاب الصوم، باب ليلة القدر)

یعنی اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے رمضان ہی محنت کے ساتھ عبادت کرتے تھے، لیکن آخری عشرہ میں پہلے دوعشروں سے بھی زیادہ محنت کے ساتھ عبادت کرتے تھے۔

امام مروزی نے ابنِ لہیعۃ کی سند سے واہب بن عبداللہ معافی سے روایت کیا ہے کہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی حضرت زینب نے فرمایا کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا بَقِيَ مِنَ الشَّهْرِ عَشَرَةُ أَيَّامٍ لَمْ يَذَرْ أَحَدًا مِنْ أَهْلِهٖ يُطِيْقُ الْقِيَامَ إِلَّا أَقَامَهٗ.

وَقَالَ هُشَيْمٌ , أَخْبَرَنَا خَالِدٌ , عَنْ أَبِيْ عُثْمَانَ كَانُوْا يُعَظِّمُوْنَ ثَلَاثَ عَشَرَاتٍ؛ الْعَشْرُ الْأُوَلُ مِنَ الْمُحَرَّمِ , وَالْعَشْرُ الْأُوَلُ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ , وَالْعَشْرُ الْأَوَاخِرُ مِنْ رَمَضَانَ (مختصر قيام الليل وقيام رمضان وكتاب الوتر ،للمروزی، ص٢٤٧،باب الاجتهاد فی العشر الأواخر من رمضان)

ترجمہ: جب ماہِ رمضان کے دس دن باقی رہ جاتے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں میں سے کسی کو بھی جو قیام کی قدرت رکھتا ہو، قیام کرائے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔

ہشیم کہتے ہیں کہ ہمیں خالد نے حضرت ابوعثمان کی یہ روایت بیان کی کہ سلف تین عشروں کی تعظیم کیا کرتے تھے، ایک تو محرم کے پہلے عشرہ کی، دوسرے ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کی، تیسرے رمضان کے آخری عشرہ کی (مختصر قيام الليل)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضانُ المبارک کے آخری عشرہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کو بھی اہتمام سے قیامِ رمضان کراتے تھے، جس سے رمضان کے پہلے دوعشروں کے مقابلہ میں آخری عشرہ میں قیامِ رمضان کی زیادہ اہمیت معلوم ہوئی۔

مذکورہ حدیث کی سند میں اگرچہ ''ابنِ لہیعہ'' کی وجہ سے کچھ ضعف پایا جاتا ہے، لیکن یہ رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت میں محنت وکثرت کی دیگر صحیح احادیث کے پیشِ نظر یہ

روایت حسن درجہ میں داخل ہے۔

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ رمضانُ المبارک کے آخری عشرہ میں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوب عبادت میں مصروف ہوجایا کرتے تھے۔

اور بعض روایات میں جو رمضان کا مہینہ داخل ہونے پر تہبند کس لینے کا ذکر ملتا ہے۔ [1]

وہ مذکورہ روایات کے خلاف نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے رمضان ہی عبادت کی کثرت کیا کرتے تھے، خاص طور پر جبکہ شروع میں آپ نے پورے مہینے کا اعتکاف فرمایا، تو اس وقت پورے مہینے بیویوں سے علیٰحدگی رہی، اور رمضان کے آخری عشرہ میں، اس سے بھی زیادہ کثرت کے ساتھ عبادت کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ رمضان کے آخری عشرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بہت محنت اور کوشش سے عبادت کرتے تھے، اور گھر والوں کو بھی اس مقصد کیلئے حسبِ قدرت جگاتے تھے، اس لئے دونوں قسم کی روایات اپنی جگہ درست ہیں۔

مذکورہ احادیث کے متعلق محدثین کے اقوال

اب مذکورہ احادیث کے سلسلہ میں چند محدثین کی تشریح وتوضیح ملاحظہ فرمائیں۔

امام نووی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 676ھ) فرماتے ہیں:

ففی هذا الحديث أنه يستحب أن يزاد من العبادات فی العشر الأواخر من رمضان واستحباب إحياء لياليه بالعبادات وأما قول أصحابنا يكره قيام الليل كله فمعناه الدوام عليه ولم يقولوا

---

[1] عن عائشة، زوج النبی صلی الله عليه وسلم أنها، قالت: " كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا دخل شهر رمضان شد مئزره، ثم لم يأت فراشه حتى ينسلخ " (شعب الایمان للبیهقی، رقم الحدیث ۳۳۵۲، کتاب الصیام، باب فضائل شهر رمضان، فضائل الاوقات للبیهقی رقم الحدیث ۶۷، صحیح ابنِ خزیمة رقم الحدیث ۲۲۱۶، الکامل لابن عدی، ج۶ ص۲۰۷)

بكراهة ليلة وليلتين والعشر ولهذا اتفقوا على استحباب إحياء ليلتى العيدين وغير ذلك (شرح النووى علىٰ مسلم، ج۸ص ۷۱، کتاب الاعتكاف، باب الاجتهاد فى العشر الأواخر من شهر رمضان)

ترجمہ: پس اس حدیث میں یہ بات مذکور ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں عبادات میں اضافہ کرنا مستحب ہے، اوراس آخری عشرہ کی راتوں کوعبادات کے ساتھ زندہ رکھنا بھی مستحب ہے، جہاں تک ہمارے اصحاب کے اس قول کا تعلق ہے کہ پوری رات قیام کرنا مکروہ ہے، تواس سے مراددوام اور پابندی ہے، اسی وجہ سے انہوں نے ایک اوردوراتیں یا عشرہ کے قیام کی کراہت کا قول نہیں کیا، اوراسی وجہ سے ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عیدین وغیرہ کی راتوں کو عبادات سے زندہ رکھنا مستحب ہے (نووی)

ملاعلی قاری رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1014ھ) فرماتے ہیں:

(كان رسول الله – صلى الله عليه وسلم – يجتهد فى العشر الأواخر) أى يبالغ فى طلب ليلة القدر فيها، كذا قيل، والأظهر أنه يجتهد فى زيادة الطاعة والعبادة (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج۴،ص ۱۴۴۱، كتاب الصوم،باب ليلة القدر)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری عشرہ میں خوب محنت کرتے تھے، یعنی اس میں لیلۃُ القدر کوطلب کرنے میں مبالغہ کیا کرتے تھے، ایک قول یہی ہے، لیکن زیادہ راجح یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طاعت اورعبادت کے اضافہ میں محنت کرتے تھے (مرقاۃ)

ملاعلی قاری رحمہ اللہ ایک اورحدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

(وأحيا ليله) أى غالبه بالصلاة والذكر وتلاوة القرآن (مرقاة المفاتيح

شرح مشکاة المصابیح، ج۴،ص ۱۴۴۱، کتاب الصوم،باب لیلة القدر)

ترجمہ: اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) آخری عشرہ کی رات کو زندہ کرتے تھے، یعنی اس کے اکثر حصہ میں نماز، اور ذکر اور تلاوتِ قرآن کا اہتمام فرماتے تھے (مرقاة)

اس بحث کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ آخری عشرہ میں عبادت میں خاص جدوجہد اور محنت کا متعدد احادیث میں ذکر آیا ہے، اور ان احادیث میں جو عبادت میں جدوجہد اور خصوصی قیام کا ذکر آیا ہے، اس سے متعدد محدثین وفقہائے کرام نے عبادت کی کثرت کو مراد لیا ہے، جس کے پیشِ نظر بعض حضرات ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں قیامِ رمضان اور تراویح یا تطوع باجماعت اضافی تعداد میں پڑھنے پر استدلال کرتے ہیں۔

وہ الگ بات ہے کہ کس کو اس استدلال سے کس درجہ میں اختلاف ہے، یا اتفاق ہے، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ مذکورہ موقف بھی بے بنیاد اور بلا دلیل نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم.

(فصل نمبر 4)

تراویح کی کمیّت اور باجماعت ادا کرنے سے متعلق فقہاء کے اقوال

جمہور فقہائے کرام کے نزدیک قیامِ رمضان یا تراویح کی کم از کم بیس رکعات ہیں، البتہ بعض مالکیہ کے نزدیک تراویح کی چھتیس رکعات ہیں، اور بعض حضرات مثلاً اسحاق بن راہویہ کے نزدیک چالیس رکعات ہیں، اور فقہائے کرام کے نزدیک تراویح کا باجماعت ادا کرنا مشروع ہے۔ [1]

رمضان المبارک میں تراویح کی کمیّت وتعداد اور اس کو باجماعت ادا کرنے سے متعلق چند محدثین وفقہائے کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائیں۔

امام ترمذی کا حوالہ

امام ترمذی رحمہ اللہ (المتوفی: 279ھ) اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''سنن الترمذی'' میں

[1] قیام رمضان:

أورد الشافعية فی السنن الرواتب قيام رمضان، فقد سن رسول الله صلى الله عليه وسلم قيام رمضان.

وذهب جمهور الفقهاء إلى أن قيام رمضان سنة مؤكدة وهو عشرون ركعة تؤدى بعد سنة العشاء، وتعتبر من الرواتب لأنها تؤدى بعد الفريضة، يسلم على رأس كل ركعتين، ويتروح كل أربع ركعات بجلسة خفيفة يذكر فيها الله تعالى، ثم تصلى الوتر جماعة بعد ذلک .

وذكر بعض المالكية أن قيام رمضان ست وثلاثون ركعة يسلم كل ركعتين، ويسن لها الجماعة، كما كان عليه الحال فی خلافة عمر بن عبد العزيز (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٥ ص ٢٧٩، ٢٨٠، مادة " سن")

ایک حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

واختلف أهل العلم فی قیام رمضان، فرأى بعضهم: أن يصلى إحدى وأربعين ركعة مع الوتر، وهو قول أهل المدينة، والعمل على هذا عندهم بالمدينة.

وأكثر أهل العلم على ما روى عن عمر، وعلى، وغيرهما من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم عشرين ركعة.

وهو قول الثورى، وابن المبارك، والشافعى "وقال الشافعى: وهكذا أدركت ببلدنا بمكة يصلون عشرين ركعة.

وقال أحمد: روى فى هذا ألوان ولم يقض فيه بشىء وقال إسحاق: بل نختار إحدى وأربعين ركعة على ما روى عن أبى بن كعب .

واختار ابن المبارك، وأحمد، وإسحاق: الصلاة مع الإمام فى شهر رمضان "واختار الشافعى: أن يصلى الرجل وحده إذا كان قارئا (سنن الترمذی، تحت رقم الحدیث ۸۰۶، ج۳ص ۱۶۰، ابواب الصوم، باب ما جاء فی قیام شهر رمضان)

ترجمہ: اہلِ علم کا قیامِ رمضان کے بارے میں اختلاف ہے، پس بعض حضرات وتر سمیت اکتالیس رکعات کے قائل ہیں، اور اہلِ مدینہ کا قول یہی ہے، اور اسی پر ان کے نزدیک مدینہ منورہ میں عمل ہے۔

اور اکثر (وجمہور) اہلِ علم اس پر ہیں جو حضرت عمر اور حضرت علی اور ان کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور وہ بیس رکعات ہیں۔

اور حضرت سفیان ثوری (المتوفی سنہ 161 ہجری) اور حضرت ابنِ مبارک (المتوفی سنہ 181 ہجری) اور حضرت امام شافعی رحمہم اللہ (المتوفی سنہ 204 ہجری) کا بھی یہی قول ہے، اور امام شافعی کا بیان ہے کہ میں نے اپنے مکہ شہر کے لوگوں کو تراویح کی بیس رکعت پڑھتے دیکھا ہے۔

اور امام احمد نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں، جس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، اور اسحاق بن راہویہ (المتوفی سنہ 238 ہجری) نے فرمایا کہ ہم اکتالیس (41) رکعتوں کو اختیار کرتے ہیں، حضرت ابی بن کعب کی روایات کی بناء پر۔

اور ابنِ مبارک اور امام احمد اور اسحاق بن راہویہ نے رمضان کے مہینہ میں نماز کو امام کے ساتھ (یعنی باجماعت پڑھنے کو) اختیار کیا ہے، اور امام شافعی نے اگر کوئی قاری ہو، اس کے لیے تنہا نماز پڑھنے کو اختیار کیا ہے (ترمذی)

اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کی نماز کی تعداد جمہور فقہائے کرام کے نزدیک بیس رکعات ہے، البتہ بعض حضرات مثلاً مالکیہ واہلِ مدینہ وتروں سمیت اکتالیس رکعتوں کے قائل ہیں، اور اس پر مسجدِ نبوی میں عمل بھی ہوتا رہا ہے، جس پر نکیر نہیں کی گئی۔

اور پیچھے گزر چکا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ، کثیر مجمع اور مشہور مقام میں نوافل کی جماعت کو مکروہ قرار دیتے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک رمضان میں بیس سے زیادہ چھتیس یا چالیس رکعات عام نوافل کے بجائے قیامِ رمضان کی مخصوص مراد، تراویح میں داخل ہونے کی وجہ سے مشروع ہیں۔ واللہ اعلم۔

''محمد بن نصر المروزی'' کا حوالہ

''محمد بن نصر المروزی'' (المتوفی: 294ھ) اپنی کتاب ''قیامِ رمضان'' میں

تراویح اور قیامِ رمضان کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وعن يزيد بن رومان :كان الناس يقومون في زمان عمر بن الخطاب رضى الله عنه في رمضان بثلاث وعشرين ركعة.

وهب بن كيسان رحمه الله : ما زال الناس يقومون بست وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث إلى اليوم في رمضان.

زيد بن وهب رحمه الله : كان عبد الله بن مسعود رضى الله عنه يصلى بنا في شهر رمضان فينصرف وعليه ليل قال الأعمش : كان يصلى عشرين ركعة ويوتر بثلاث.

وقال عطاء : أدركتهم يصلون في رمضان عشرين ركعة ، والوتر ثلاث ركعات.

عبد الله بن قيس عن شتير : وكان من أصحاب عبد الله المعدودين أنه كان يصلى بهم في رمضان عشرين ركعة ويوتر بثلاث .

محمد بن سيرين : إن معاذا أبا حليمة القارء كان يصلى بالناس في رمضان إحدى وأربعين ركعة .

ابن أبي ذئب ، عن صالح مولى التوأمة قال : أدركت الناس قبل الحرة يقومون بإحدى وأربعين ركعة يوترون منها بخمس قال ابن أبي ذئب : فقلت : لا يسلمون بينهن ؟ فقال : بل يسلمون بين كل ثنتين ويوترون بواحدة إلا أنهم يصلون جميعا.

عمرو بن مهاجر : إن عمر بن عبد العزيز كانت تقوم العامة بحضرته في رمضان بخمس عشرة تسليمة وهو في قبته لا ندرى ما يصنع .

داود بن قيس قال : أدركت المدينة فى زمان أبان بن عثمان وعمر بن عبد العزيز يصلون ستة وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث .

نافع : لم أدرك الناس إلا وهم يصلون تسعا وثلاثين ركعة ويوترون منها بثلاث.

ورقاء بن إياس : كان سعيد بن جبير يصلي بنا في رمضان من أول الشهر إلى عشرين ليلة ست ترويحات ، فإذا دخل العشر زاد ترويحة .

حبيب بن أبى عمرة رحمه الله : كان سعيد بن جبير يصلي في رمضان ست ترويحات يسلم بين كل ركعتين ، كل ترويحة أربع ركعات يسلم تسليمة واحدة في كل ركعتين .

يونس رحمه الله : أدركت مسجد الجامع قبل فتنة ابن الأشعث يصلي بهم عبد الرحمن بن أبى بكر وسعيد بن أبى الحسن ، وعمران العبدى كانوا يصلون خمس تراويح ، فإذا دخل العشر زادوا واحدة ، ويقنتون فى النصف الآخر ، ويختمون القرآن مرتين.

عمران بن حدير رحمه الله : كان أبو مجلز يصلي بهم أربع ترويحات ويقرأ بهم سبع القرآن في كل ليلة.

ذكوان الجرشي رحمه الله : شهدت زرارة بن أوفى يصلي بالحى فى رمضان ست ترويحات ، فإذا كان فى آخر الشهر صلى سبع ترويحات كل ليلة ، وشهدته فى آخر صلاته يصلي ست ركعات لا يقعد بينهن يقعد فى السادسة .

ابن القاسم : سمعت مالكا رحمه الله يذكر أن جعفر بن سليمان أرسل إليه يسأله : أنتقص من قيام رمضان ، فنهاه عن ذلک ، فقيل له : قد كره ذلک ، قال : نعم ، وقد قام الناس هذا القيام قديما ، قيل له : فكم القيام ؟ فقال : تسع وثلاثون ركعة بالوتر.

ابن أيمن : قال مالک : أستحب أن يقوم الناس فی رمضان بثمان وثلاثين ركعة ثم يسلم الإمام والناس ثم يوتر بهم بواحدة ، وهذا العمل بالمدينة قبل الحرة منذ بضع ومائة سنة إلى اليوم.

وقال إسحاق بن منصور : قلت لأحمد بن حنبل : كم من ركعة تصلى فی قيام شهر رمضان ؟ فقال : قد قيل فيه ألوان نحوا من أربعين ، إنما هو تطوع ، قال إسحاق : نختار أربعين ركعة وتكون القرائة أخف.

الزعفرانی عن الشافعی رحمه الله : رأيت الناس يقومون بالمدينة تسعا وثلاثين ركعة قال : وأحب إلى عشرون ، قال : وكذلک يقومون بمكة ، قال : وليس فی شیء من هذا ضيق ولا حد ينتهی إليه ، لأنه نافلة فإن أطالوا القيام وأقلوا السجود فحسن ، وهو أحب إلی ، وإن أكثروا الركوع والسجود فحسن (مختصر قيام الليل و قيام رمضان وكتاب الوتر لمحمد بن نصر المروزی، ص ۲۲۰ الیٰ ۲۲۲، باب عدد الركعات التی يقوم بها الإمام للناس فی رمضان)

ترجمہ: اور یزید بن رومان سے روایت ہے کہ لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ماہِ رمضان میں تیئیس (23) رکعات پڑھا کرتے تھے۔

(اور جلیل القدر تابعی) وھب بن کیسان رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 127ھ) فرماتے ہیں

کہ لوگ رمضان میں آج تک متواتر چھتیس رکعات اور تین وتر پڑھتے رہے۔ [1]

زید بن وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیں رمضان کے مہینہ میں نماز پڑھاتے تھے، پھر واپس چلے جاتے تھے، اور ابھی رات باقی ہوتی تھی، حضرت اعمش کہتے ہیں کہ وہ بیس رکعات اور تین وتر پڑھا کرتے تھے، اور حضرت عطاء کہتے ہیں کہ میں نے صحابۂ کرام کو رمضان میں بیس رکعات اور تین وتر پڑھتے ہوئے پایا۔

حضرت عبداللہ بن قیس، حضرت شُتیر سے روایت کرتے ہیں اور ان کا شمار حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں ہوتا ہے کہ وہ ان کو رمضان میں بیس رکعات اور تین وتر پڑھاتے تھے۔

(جلیل القدر تابعی) محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ ابوحلیمہ معاذ القاری (المتوفی: 63ھ) لوگوں کو رمضان میں اکتالیس رکعات پڑھایا کرتے تھے۔ [2]

---

[1] وهب بن كيسان أبو نعيم الأسدى (ع)الفقيه، أبو نعيم الأسدى، المدنى، المؤدب، من موالى آل الزبير بن العوام.رأى أبا هريرة.
وحدث عن: ابن عباس، وأبى سعيد الخدرى، وجابر، وابن الزبير، وعمر بن أبى سلمة.
روى عنه: عبيد الله بن عمر، وهشام بن عروة، وابن إسحاق، ومالك، وآخرون، وثقوه.مات: فى سنة سبع وعشرين ومائة(سير اعلام النبلاء، ج۵ص ۲۲۶، تحت رقم الترجمة ۹۳)

[2] ابوحلیمہ معاذ قاری کے بارے میں ایک قول صحابی ہونے کا ہے، ان کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رمضان کے مہینہ میں تراویح پڑھانے کے لیے مامور فرمایا تھا۔

معاذ بن الحارث الأنصارى المازنى النجارى ، أبو حليمة ويقال: أبو الحارث، المدنى المعروف بالقارء له صحبة .قال أبو عمر بن عبد البر:شهد الخندق وقيل: إنه لم يدرك من حياة النبى صلى الله عليه وسلم إلا ست سنين، وهو الذى أقامه عمر ابن الخطاب فى من أقام فى شهر رمضان ليصلى التراويح وكان ممن شهد الجسر مع أبى عبيد، ففر حين فروا، فقال عمر: أنا لهم فئة.
وروى عن: أبى بكر الصديق عبد الله بن أبى قحافة، وعثمان ابن عفان، وعمر بن الخطاب.
روى عنه: سعيد المقبرى، وأبو الوليد عبد الله بن الحارث البصرى، وعمران بن أبى أنس، ونافع مولى ابن عمر.وحكى عنه عبد الله بن عون (ل) قنوته فى شهر رمضان، ولم يدركه.
قال أبو حاتم : يقال: إنه قتل يوم الحرة .وقال الحاكم أبو أحمد قتل يوم الحرة فى ذى الحجة سنة ثلاث وستين، وهو ابن تسع وستين .روى له أبو داود فى كتاب "المسائل(تهذيب الكمال، ج۲۸ص۱۱۷، ۱۱۸، تحت رقم الترجمة ۶۰۲۲)

ابنِ ابی ذئب، صالح مولیٰ تو ئمۃ (المتوفی: 125ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو "واقعہ حرہ" (یعنی 63 ہجری) سے پہلے اکتالیس رکعات پڑھتے ہوئے پایا، جن میں سے پانچ وتر کی رکعات تھیں۔ [1]

ابنِ ابی ذئب کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وتروں کی پانچ رکعات کے درمیان سلام نہیں پھیرتے تھے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ جی ہاں! ہر دو رکعات پر سلام پھیرتے تھے، اور ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے، مگر وہ اکٹھی نماز پڑھا کرتے تھے (یعنی وہ تمام اکتالیس رکعات آگے پیچھے ایک وقت میں پڑھا کرتے تھے) [2]

عمرو بن مہاجر کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی موجودگی میں لوگ

---

[1] ملحوظ رہے کہ نمازِ وتر کی کم از کم یا زیادہ سے زیادہ رکعات کے متعلق فقہائے کرام کی آراء مختلف ہیں۔
شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک نمازِ وتر کی کم از کم ایک رکعت ہے، اور نمازِ وتر کی ایک رکعت کا پڑھنا ان کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔
اور حنفیہ کے نزدیک نمازِ وتر ایک سلام کے ساتھ تین رکعات نمازِ مغرب کی طرح ہیں، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ، اور حنفیہ کے نزدیک وتر کی ایک رکعت کا پڑھنا جائز نہیں۔
اور شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک وتر کی زیادہ سے زیادہ گیارہ اور ایک قول کے مطابق تیرہ رکعات ہیں۔
البتہ شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک وتر کا ادنیٰ کمال تین رکعات ہیں، اور ایک رکعت پر اکتفاء کرنا خلافِ اولیٰ ہے، اور تین رکعات سے زیادہ اکمل درجہ پانچ رکعات اور پھر سات رکعات اور پھر نو رکعات اور پھر گیارہ رکعات پڑھنے کا ہے۔
اور مالکیہ کے نزدیک وتر کی ایک رکعت اس طرح ہے کہ اس سے پہلے الگ سلام کے ساتھ کم از کم دو رکعات نفل پڑھے جائیں، خواہ وہ دو رکعات نمازِ عشاء کے بعد کی دو رکعت سنتوں کی شکل میں ہوں، یا کوئی اور ہوں، اور مالکیہ کے نزدیک وتر کی ایک رکعت اس طرح پڑھنا کہ اس سے پہلے کم از کم دو رکعت نفل الگ سلام کے ساتھ نہ پڑھے جائیں، بلا عذر ایسا کرنا مکروہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا دوسرا رسالہ "غیر حنفی کی اقتداء میں نماز کا حکم"، مشمولہ: علمی وتحقیقی رسائل، جلد اول، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی)

[2] صالح بن نبهان المدنى مولى التوأمة بفتح المثناة وسكون الواو بعدها همزة مفتوحة صدوق اختلط قال ابن عدى لا بأس برواية القدماء عنه كابن أبى ذئب وابن جريج من الرابعة (تقريب التهذيب لابنِ حجر، ص ٢٧٢، تحت رقم الترجمة ٢٨٩٢)
قال أبو بكر بن أبى عاصم: مات سنة خمس وعشرين ومئة. روى له أبو داود، والترمذى وابن ماجه (تهذيب الكمال للمزى، ج١٣ ص ١٠٤، تحت رقم الترجمة ٢٨٤٢)

رمضان میں پندرہ سلام کے ساتھ (یعنی تیس 30 رکعات) نماز پڑھتے تھے، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے خیمہ میں ہوتے تھے، اور ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا کرتے تھے۔

داؤد بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے ابان بن عثمان اور عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں مدینہ کے لوگوں کو چھتیس رکعات اور تین وتر پڑھتے ہوئے پایا۔ [1]

---

[1] حضرت ابان بن عثمان، خلیفۂ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، جن کی وفات 105ھ میں ہوئی، یہ اپنے زمانہ میں سات سال مدینہ منورہ میں امارت کے عہدے پر فائز رہے۔

حدثنا ابن مهدی، عن داود بن قیس، قال: أدركت الناس بالمدينة فی زمن عمر بن عبد العزيز وأبان بن عثمان يصلون ستة وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث(مصنف ابنِ ابی شيبة، رقم الحديث ۷۷۷۱، باب كم يصلی فی رمضان من ركعة)

داود بن قيس الفراء .وكان يقال له الدباغ .ويكنى أبا سليمان مولى لقريش .مات بالمدينة فی خلافة أبی جعفر .قال :أخبرنا عبد الله بن مسلمة بن قعنب الحارثی .قال :ما رأيت بالمدينة رجلين كانا أفضل من داود بن قيس .ومن الحجاج بن صفوان(الطبقات الكبرى لابنِ سعد، ج۵،ص ۴۵۲، تحت رقم الترجمة ۱۳۲۹)

أبان بن عثمان بن عفان الأموی المدنی (م)الإمام، الفقيه، الأمير، أبو سعد ابن أمير المؤمنين أبی عمرو الأموی، المدنی .سمع :أباه، وزيد بن ثابت .حدث عنه :عمرو بن دينار، والزهری، وأبو الزناد، وجماعة.له أحاديث قليلة، ووفادة على عبد الملك.

قال ابن أبی الزناد :عن أبيه، عن أبان، سمعت عثمان يقول :من قال فی أول يومه وليلته :بسم الله الذی لا يضر مع اسمه شیء فی الأرض ولا فی السماء وهو السميع العليم، لم يضره ذلك اليوم شیء، أو تلك الليلة.فلما أصاب أبان الفالج، قال :إنی -والله -نسيت هذا الدعاء هذه الليلة ليمضی فی أمر الله.حديث صحيح .ورواه عن أبان :منذر بن عبد الله الحزامی، ومحمد بن كعب القرظی.أخرجه :الترمذی .

قال ابن سعد:ثقة، له أحاديث عن أبيه.وكان به صمم، ووضح كثير، أصابه الفالج فی أواخر عمره.

قال خليفة:هو أخو عمرو، وأمهما :أم عمرو بنت جندب.قال الواقدی :كان ولاية أبان على المدينة سبع سنين.وعن أبی الزناد، قال :مات أبان قبل عبد الملك بن مروان.

قال يحيى القطان :فقهاء المدينة عشرة :أبان بن عثمان، وسعيد بن المسيب ...، وذكر سائرهم.

قال مالك :حدثنی عبد الله بن أبی بكر :أن والده أبا بكر بن حزم كان يتعلم من أبان القضاء .

وعن عمرو بن شعيب، قال :ما رأيت أحدا أعلم بحديث ولا فقه من أبان بن عثمان.

وقال خليفة :إن أبانا توفی سنة خمس ومائة(سير أعلام النبلاء، ج۴،ص ۳۵۱ الیٰ ۳۵۳، تحت رقم الترجمة ۱۳۳)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو انتالیس (39) رکعات پڑھتے ہوئے پایا، جن میں سے تین رکعات وتر کی ہوتی تھیں۔

ورقاء بن ایاس کہتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ ہمیں رمضان کی ابتداء میں بیس دن تک چھ ترویحے (یعنی چوبیس رکعات) پڑھاتے تھے، اور جب آخری عشرہ آجاتا، تو ایک ترویحہ (یعنی چار رکعات) زیادہ کردیتے (اور اس طرح مجموعی طور پر اٹھائیس رکعات پڑھایا کرتے تھے) [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

أبان بن عثمان بن عفان القرشي الأموي، أبو سعيد......قال أحمد بن عبد الله العجلي:مدني تابعي ثقة من كبار التابعين .وقال محمد بن سعد :توفي بالمدينة في خلافة يزيد بن عبد الملك، وكان ثقة، وله أحاديث، وكان به صمم ووضح ، وأصابه الفالج، قبل أن يموت بسنة.وقال خليفة بن خياط: توفي سنة خمس ومئة(تهذيب الكمال في أسماء الرجال، ج٢،ص١٦ الىٰ ١٨ ، ملخصاً ، تحت رقم الترجمة ١٤١)

أبان "بن عثمان بن عفان الأموي أبو سعيد ويقال أبو عبد الله .روى عن أبيه وزيد بن ثابت وأسامة بن زيد ,وعنه ابنه عبد الرحمن وعمر بن عبد العزيز وأبو الزناد والزهري ونبيه بن وهب وغيرهم. قال عمرو بن شعيب" :ما رأيت أعلم بحديث ولا فقه منه ,"وعده يحيى القطان في فقهاء المدينة , وقال العجلي" :ثقة من كبار التابعين ,"وقال ابن سعد " :مدني تابعي ثقة وله أحاديث ,وكان به صمم ووضح وأصابه الفالج قبل أن يموت بسنة ,"وقال خليفة" :مات سنة ."105قلت :إنما قال خليفة مات أبان في خلافة يزيد بن عبد الملك ثم ذكر وفاته يزيد سنة ,105وكذا قال بن حبان في "الثقات ."وقال البخاري " :قال خالد بن مخلد حدثني الحكم بن الصلت ثنا أبو الزناد:قال مات أبان قبل يزيد بن عبد الملك ,وحكى في "التاريخ "عن مالك أنه كان قد علم أشياء من قضاء أبيه ,وكان معلم عبد الله بن أبي بكر ,وقال الأثرم" :قلت لأحمد أبان بن عثمان سمع من أبيه قال :لا ."قلت :حديثه في "صحيح مسلم "مصرح بالسماع من أبيه ,وأفاد بن الحذاء في "رجال الموطأ "أن أمه أم عمرو بنت جندب الدوسية(تهذيب التهذيب،لا بن حجر العسقلاني، ج ١ ص٩٦،تحت رقم الترجمة ١٧٣)

[1] حضرت سعید بن جبیر جلیل القدر تابعی اور کئی صحابۂ کرام کے شاگرد ہیں، ان کو حجاج بن یوسف نے پچانوے ہجری میں شہید کیا۔

حدثنا محمد بن فضيل ، عن وقاء ، قال : كان سعيد بن جبير يؤمنا في رمضان فيصلي بنا عشرين ليلة ست ترويحات ، فإذا كان العشر الأخر اعتكف في المسجد وصلى بنا سبع ترويحات(مصنف ابنِ ابى شيبة، رقم الحديث ٧٧٤٢، باب كم يصلي في رمضان من ركعة)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

حبیب بن ابی عمرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ رمضان میں چھ ترویحے (یعنی چوبیس رکعات) پڑھتے، اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے، اور ہر ترویحہ چار رکعات کا ہوتا تھا، اور ہر دو رکعتوں کے بعد ایک مرتبہ سلام پھیرتے تھے۔

یونس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابنِ اشعث کے فتنہ کے زمانے سے پہلے جامع مسجد میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور سعید بن ابی الحسن اور عمران العبدی کو پانچ ترویحے (یعنی بیس رکعات) پڑھتے ہوئے پایا، پھر جب آخری عشرہ آجاتا تو ایک ترویحہ زیادہ کردیتے (یعنی چوبیس رکعات پڑھتے تھے) اور آخری نصف میں قنوت پڑھتے، اور قرآن مجید کو دو مرتبہ ختم فرماتے تھے۔

عمران بن حدیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابومجلز اُن کو چار ترویحے پڑھاتے تھے، اور ہر رات میں قرآن مجید کا ساتواں حصہ (ایک منزل) پڑھا کرتے تھے۔

حضرت ذکوان جرشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت زرارہ بن اوفیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اپنے قبیلے کو رمضان میں چھ ترویحے (یعنی چوبیس رکعات) پڑھا رہے تھے، اور جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو ہر رات میں سات ترویحے (یعنی اٹھائیس رکعات) پڑھاتے، اور میں ان کی خدمت میں ان کی نماز کے

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

سعید بن جبیر بن هشام الأسدی الوالبی ، مولاهم ، أبو محمد ، ويقال :أبو عبد الله الكوفی. ووالبة هو ابن الحارث بن ثعلبة بن دودان بن أسد بن خزيمة ، فيما قاله له محمد بن حبيب.روى عن :أنس بن مالك (د س) ، والضحاك بن قيس الفهرى وعبد الله بن الزبير ، وعبد الله بن عباس (ع) ، وعبد الله بن عمر بن الخطاب (ع) ، وعبد الله بن مغفل (م ق) ، وعدى بن حاتم (ت س) ، وعمرو بن ميمون الأودى (خ) ، وأبى سعيد الخدرى (ت) ، وأبى عبد الرحمن السلمى (خ م س) ، وأبى مسعود الأنصارى ، وأبى موسى الاشعرى (س) ، وأبى هريرة ، وعائشة.............وقال أبو القاسم هبة الله بن الحسن الطبرى :هو ثقة ، إمام حجة على المسلمين ، قتل فى شعبان سنة خمس وتسعين ، وهو ابن تسع وأربعين سنة .روى له الجماعة (تهذيب الكمال ج١٠ ص٣٥٨ تا ٣٧٦ ملخصاً، تحت رقم الترجمة ٢٢٤٥)

آخری حصے میں حاضر ہوا، تو وہ چھ رکعات پڑھ رہے تھے، جس میں انہوں نے قعدہ نہیں کیا، بلکہ چھٹی رکعت میں قعدہ کیا (ممکن ہے کہ یہ چھ رکعات ''وتر'' میں داخل ہوں، جس کے بعض فقہاء قائل ہیں)

ابنِ قاسم فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جعفر بن سلیمان نے ان سے سوال کیا کہ کیا میں قیامِ رمضان میں سے کچھ کم کردوں، تو امام مالک نے اس سے منع کردیا، ان سے عرض کیا گیا کہ کیا آپ اس کم کرنے کو مکروہ سمجھتے ہیں، امام مالک نے فرمایا کہ جی ہاں! کیونکہ لوگ اس قیامِ رمضان پر قدیم زمانے سے عمل کرتے آرہے ہیں، ان سے عرض کیا گیا کہ کتنا قیام ہے؟ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وتر سمیت انتالیس رکعات ہیں۔

ابنِ ایمن فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ لوگوں کو رمضان میں اڑتیس (38) رکعات پڑھائی جائیں، پھر لوگ اور امام سلام پھیرے، اور پھر ایک رکعت وتر پڑھیں، اور ''واقعہ حرہ'' سے پہلے سے آج تک اہلِ مدینہ کا عمل سو سال سے بھی زیادہ سے اس پر ہے۔

اور اسحاق بن منصور فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے عرض کیا کہ رمضان کے مہینہ میں قیامِ رمضان میں کتنی رکعات پڑھنی چاہیے؟ امام احمد نے فرمایا کہ اس میں چالیس (40) رکعات تک کئی اقوال ہیں، اور یہ نفل نماز ہے (جس میں اسی طرح کا توسع ہوتا ہے) اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ ہم چالیس (40) رکعات والے قول کو اختیار کرتے ہیں، جس میں قرائت کی مقدار کم ہو۔

زعفرانی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے لوگوں کو مدینہ میں انتالیس (39) رکعات پڑھتے ہوئے پایا ہے، اور فرمایا کہ مجھے بیس (20)

رکعات زیادہ پسند ہیں، اور فرمایا کہ مکہ میں بھی بیس (20) رکعات پڑھی جاتی ہیں، ان میں سے کسی کے اندر تنگی نہیں ہے، اور نہ اس کی کوئی حد ہے، جس پر انتہیٰ ہو، کیونکہ یہ نفل نماز ہے، پس اگر وہ قیام لمبا کریں اور سجود (یعنی رکعات) کم کریں، تو اچھا ہے، اور یہی مجھے زیادہ محبوب ہے، اور اگر رکوع اور سجود (یعنی رکعات) زیادہ کریں تو بھی اچھا ہے (قیامِ رمضان)

مذکورہ تفصیلی عبارت سے معلوم ہوا کہ اگرچہ جمہور کے نزدیک بیس رکعات تراویح مسنون ہیں، لیکن خیرالقرون کے دور اور پہلی صدی میں تراویح کی نماز وتروں سمیت چھتیس (36) اور اکتالیس (41) رکعات تک مدینہ منورہ میں پڑھی گئیں ہیں، اور ان پر تابعین کے دور میں نکیر نہیں کی گئی، امام مالک رحمہ اللہ تو اس میں حرج نہیں سمجھتے، بلکہ اس کو ہی اختیار کرتے ہیں، اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ بھی اس سلسلہ میں وسعت کے قائل ہیں، گویا کہ بیس رکعات سے زائد کے باجماعت ادا کرنے کو مذکورہ جمہور فقہائے کرام ناجائز ومکروہ نہیں سمجھتے، جس کی مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

اور مذکورہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آخری عشرہ میں پہلے دو عشروں کے مقابلہ رکعات کی زیادتی بھی اس دور سے ثابت ہے۔

علامہ بدرُالدین عینی کا حوالہ

علامہ بدرُالدین عینی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 855ھ) ''صحیح البخاری'' کی شرح ''عمدۃُ القاری'' میں فرماتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فی العدد المستحب فی قیام رمضان علی أقوال کثیرة، فقیل :إحدی وأربعون .وقال الترمذی :رأی بعضهم أن یصلی إحدی وأربعین رکعة مع الوتر، وهو قول أهل المدینة،

والعمل على هذا عندهم بالمدينة .قال شيخنا، رحمه الله :وهو أكثر ما قيل فيه .

قلت :ذكر ابن عبد البر في (الاستذكار) : عن الأسود بن يزيد كان يصلي أربعين ركعة، ويوتر بسبع، هكذا ذكره، ولم يقل :إن الوتر من الأربعين .

وقيل :ثمان وثلاثون، رواه محمد بن نصر من طريق ابن أيمن عن مالك .قال :يستحب أن يقوم الناس في رمضان بثمان وثلاثين ركعة، ثم يسلم الإمام والناس، ثم يوتر بهم بواحدة .قال :وهذا العمل بالمدينة قبل الحرة منذ بضع ومائة سنة إلى اليوم، هذا روى ابن أيمن عن مالک، وكأنه جمع ركعتين من الوتر مع قيام رمضان وسماها من قيام رمضان، وإلا فالمشهور عن مالک ست وثلاثون والوتر بثلاث، والعدد واحد .

وقيل :ست وثلاثون، وهو الذي عليه عمل أهل المدينة، وروى ابن وهب، قال :سمعت عبد الله بن عمر يحدث عن نافع، قال : لم أدرک الناس إلا وهم يصلون تسعا وثلاثين ركعة ويوترون منها بثلاث .

وقيل :أربع وثلاثون على ما حكي عن زرارة بن أوفى أنه كذلک كان يصلي بهم في العشر الأخير.

وقيل :ثمان وعشرون، وهو المروي عن زرارة بن أوفى في العشرين الأولين من الشهر، وكان سعيد بن جبير يفعله في العشر الأخير .

وقيل :أربع وعشرون، وهو مروى عن سعيد بن جبير .

وقيل :عشرون، وحكاه الترمذى عن أكثر أهل العلم، فإنه روى عن عمر وعلي وغيرهما من الصحابة، وهو قول أصحابنا الحنفية(عمدة القارى شرح صحيح البخارى، ج ۱۱، ص ۱۲۶، كتاب التراويح، باب فضل من قام رمضان)

ترجمہ: علماء کا قیامِ رمضان کی مستحب تعداد میں اختلاف ہے، اور اس سلسلہ میں کثیر اقوال ہیں، ایک قول اکتالیس (41) رکعتوں کا ہے، اور امام ترمذی نے فرمایا کہ بعض حضرات وتر سمیت اکتالیس (41) رکعات کے قائل ہیں، اور اہلِ مدینہ کا قول یہی ہے، اور اسی پر ان کا عمل ہے، ہمارے شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس باب میں سب سے زیادہ رکعات کا یہی (یعنی اکتالیس رکعات والا) قول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ابنِ عبدالبر نے ''الاستذکار'' میں اسود بن یزید سے روایت کیا ہے کہ وہ چالیس (40) رکعتیں پڑھتے تھے، اور وتر سات رکعت پڑھتے تھے، اسی طرح انہوں نے ذکر کیا ہے، یہ نہیں کہا کہ وتر چالیس (40) میں شامل ہوتے تھے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ تراویح کی اڑتیس (38) رکعتیں ہیں، اس کو محمد بن نصر نے ابنِ ایمن سے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ امام مالک نے فرمایا کہ مستحب یہ ہے کہ رمضان میں اڑتیس (38) رکعتیں پڑھی جائیں، پھر امام اور مقتدی سلام پھیریں، اور اس کے بعد ایک وتر پڑھیں، اور فرمایا کہ مدینہ میں واقعہ ''حرہ'' سے پہلے سے آج تک سو سال سے زیادہ سے اسی پر عمل ہے، یہ ابنِ ایمن نے امام مالک سے روایت کیا ہے، گویا کہ انہوں نے وتر کی دو رکعتوں کو بھی قیامِ رمضان کی رکعتوں کے ساتھ جمع کر دیا (اس طرح 36

اور 38 میں تطبیق ہوجاتی ہے) اوراس سارے مجموعے کو قیامِ رمضان کا نام دیا، ورنہ امام مالک سے مشہور قول چھتیس (36) رکعت اور تین (3) وتر کا ہے(اس طرح 36 اور 38 کے عدد میں ٹکراؤ نہیں) ایک ہی عدد ہیں (تعبیریں دو طرح سے ہیں)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چھتیس (36) رکعتیں ہیں، اور یہ وہ قول ہے، جس پر اہلِ مدینہ کا عمل ہے، ابنِ وہب سے روایت ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمر سے سنا، انہوں نے نافع کو یہ حدیث بتلائی کہ میں نے لوگوں کو انتالیس (39) رکعات پڑھتے ہوئے پایا، اور وہ تین رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چونتیس (34) رکعتیں ہیں، جیسا کہ زرارہ بن اوفیٰ سے حکایت ہے کہ انہوں نے اسی طرح آخری عشرہ میں پڑھیں۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اٹھائیس (28) رکعتیں ہیں، اور یہ زرارہ بن اوفیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے رمضان کے پہلے دو عشروں میں اسی طرح پڑھیں، اور حضرت سعید بن جبیر (تابعی) آخری عشرہ میں اسی طرح (یعنی 28 رکعات) پڑھتے تھے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چوبیس (24) رکعتیں ہیں، اور یہ (جلیل القدر تابعی) حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بیس (20) رکعتیں ہیں، اوراس کو امام ترمذی نے حکایت کیا ہے کہ یہ اکثر اہلِ علم کا قول ہے، اور یہ قول حضرت عمر، حضرت علی اور دیگر کئی صحابۂ کرام سے مروی ہے، اور (علامہ عینی فرماتے ہیں کہ) ہمارے حنفی اصحاب کا یہی (20 رکعات کا) قول ہے (عمدۃ القاری)

علامہ ابنِ حجر کا حوالہ

علامہ ابنِ حجر رحمہ اللہ (المتوفی: 852ھ) ''صحیح البخاری'' کی شرح ''فتح الباری'' میں فرماتے ہیں:

والاختلاف فيما زاد عن العشرين راجع إلى الاختلاف فى الوتر وكأنه كان تارة يوتر بواحدة وتارة بثلاث وروى محمد بن نصر من طريق داود بن قيس قال أدركت الناس فى إمارة أبان بن عثمان وعمر بن عبد العزيز يعنى بالمدينة يقومون بست وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث.

وقال مالك هو الأمر القديم عندنا وعن الزعفرانى عن الشافعى رأيت الناس يقومون بالمدينة بتسع وثلاثين وبمكة بثلاث وعشرين وليس فى شىء من ذلك ضيق وعنه قال إن أطالوا القيام وأقلوا السجود فحسن وإن أكثروا السجود وأخفوا القرائة فحسن والأول أحب إلى .

وقال الترمذى أكثر ما قيل فيه أنها تصلى إحدى وأربعين ركعة يعنى بالوتر كذا قال .

وقد نقل بن عبد البر عن الأسود بن يزيد تصلى أربعين ويوتر بسبع وقيل ثمان وثلاثين ذكره محمد بن نصر عن بن أيمن عن مالك وهذا يمكن رده إلى الأول بانضمام ثلاث الوتر لكن صرح فى روايته بأنه يوتر بواحدة فتكون أربعين إلا واحدة قال مالك وعلى هذا العمل منذ بضع ومائة سنة .

وعن مالک ست وأربعين وثلاث الوتر وهذا هو المشهور عنه وقد رواه بن وهب عن العمرى عن نافع قال لم أدرك الناس إلا وهم يصلون تسعا وثلاثين يوترون منها بثلاث وعن زرارة بن أوفى أنه كان يصلى بهم بالبصرة أربعا وثلاثين ويوتر وعن سعيد بن جبير أربعا وعشرين وقيل ست عشرة غير الوتر (فتح البارى شرح صحيح البخارى، ج۴،ص ۲۵۴، ۲۵۵، كتاب صلاة التراويح ،قوله باب فضل من قام رمضان)

ترجمہ: بیس سے زیادہ رکعات کی تعداد میں اختلاف، وتر میں اختلاف کی طرف راجع ہے، گویا کہ بعض اوقات ایک وتر پڑھا (جس کے غیر حنفیہ قائل ہیں) اور بعض اوقات تین وتر پڑھے، اور محمد بن نصر نے داؤد بن قیس کی سند سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابان بن عثمان اور عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں لوگوں کو چھتیس (36) رکعات تراویح اور تین (3) رکعات وتر پڑھتے ہوئے پایا ہے۔

اور امام مالک نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک یہ امرِ قدیم ہے، اور زعفرانی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ میں نے لوگوں کو مدینہ منورہ میں انتالیس (39) رکعات پڑھتے ہوئے دیکھا، اور مکہ میں (وتروں سمیت) تیئیس (23) رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا، اور ان میں سے کسی کے اندر تنگی نہیں ہے، اور امام شافعی سے ہی مروی ہے کہ اگر قیام لمبا کریں اور سجدے (یعنی رکعتیں) کم پڑھیں، تو بھی اچھا ہے، اور اگر سجدے (یعنی رکعتیں) زیادہ پڑھیں اور قرائت ہلکی کریں، تو بھی اچھا ہے، اور پہلا طریقہ مجھے زیادہ پسند ہے۔

اور امام ترمذی نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں اکثر (یعنی زیادہ رکعات والا) قول وتر سمیت اکتالیس (41) رکعات کا ہے، اور ابنِ عبدالبر نے اسود بن یزید سے نقل

کیا ہے کہ چالیس (40) رکعتیں اور تین (3) وتر پڑھے جائیں گے، اور ایک قول اڑتیس (38) رکعات کا ہے، جس کو محمد بن نصر نے ابنِ ایمن کی سند سے امام مالک سے روایت کیا ہے، اور ممکن ہے کہ اس کو پہلے قول کی طرف لوٹا دیا جائے، تین (3) وتر شامل کر کے، لیکن انہوں نے اپنی روایت میں ایک وتر پڑھنے کی تصریح کی ہے، اس طرح چالیس (40) رکعتیں بنتی ہیں، سوائے ایک کے، امام مالک نے فرمایا کہ اسی پر سو سال سے زائد سے عمل ہے۔

اور امام مالک سے چھیالیس (46) رکعات اور تین (3) وتر کی روایت بھی مروی ہے، اور ان کا مشہور قول یہی ہے، اور ابنِ وہب نے عمری سے اور انہوں نے نافع سے روایت کیا ہے کہ میں نے جن لوگوں کو بھی پایا، تو وہ چھتیس (36) رکعتیں اور تین (3) وتر ہی پڑھتے تھے، اور زرارہ بن اوفی کے متعلق مروی ہے کہ وہ لوگوں کو بصرہ میں چونتیس (34) رکعتیں اور وتر پڑھاتے تھے، اور حضرت سعید بن جبیر سے چوبیس (24) رکعتیں مروی ہیں، اور ایک قول وتر کے علاوہ سولہ (16) رکعتوں کا ہے (فتح الباری)

امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی زندگی میں یہ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں سو سال سے زائد عرصہ سے چالیس رکعات پڑھنے پر عمل ہے، اس زمانہ میں جب بیس سے زائد رکعات باجماعت ادا کرنے پر نکیر نہیں کی گئی، تو اس کو حرام یا مکروہ تحریمی قرار دینے کا قول بظاہر راجح قرار دیا جانا مشکل ہے، البتہ بیس سے زائد رکعات کے باجماعت مسنون ہونے کی نفی کی جائے، تو حرج نہیں، اور اگر بیس رکعات کے مسنون ہونے کی مشابہت کی وجہ سے مکروہ قرار دیا جائے، تو بھی مضائقہ نہیں، لیکن اس علت کے مرتفع ہونے کی صورت میں یہ حکم بھی مرتفع ہونا چاہیے، اور جواز کا حکم ہونا چاہیے، ہمارے نزدیک یہی راجح ہے، جس کی مزید توضیح آگے آتی ہے۔

علامہ ابنِ بطال کا حوالہ

علامہ ابنِ بطال رحمہ اللہ (المتوفی: 449ھ) صحیح بخاری کی شرح میں فرماتے ہیں:

وبهذا قال الثورى، والكوفيون، والشافعى، وأحمد، فكان الأمر على ذلك إلى زمن معاوية، فشق على الناس طول القيام لطول القراءة، فخففوا القراءة وكثروا من الركوع، وكانوا يصلون تسعا وثلاثين ركعة، فالوتر منها ثلاث ركعات، فاستقر الأمر على ذلك وتواطأ عليه الناس، وبهذا قال مالك، فليس ما جاء من اختلاف أحاديث قيام رمضان يتناقض، وإنما ذلك فى زمان بعد زمان، والله الموفق(شرح صحيح البخارى لابن بطال، ج۴،ص ۱۴۹، كتاب الصيام،باب فضل من قام رمضان)

ترجمہ: اور یہی (بیس رکعات تراویح کا) قول امام ثوری، اور اہلِ کوفہ اور امام شافعی اور امام احمد کا ہے، اور اسی پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک عمل رہا، پھر لوگوں پر طولِ قرائت کی وجہ سے طولِ قیام بھاری ہوگیا، تو انہوں نے قرائت میں تخفیف کی، اور رکعات میں تکثیر کی، اور وہ انتالیس (39) رکعات پڑھنے لگے، جن میں سے تین وتر تھے، پھر اسی پر عمل جاری رہا، اور لوگ متواتر اس پر عمل پیرا رہے، یہی امام مالک کا قول ہے، پس قیامِ رمضان سے متعلق احادیث میں ایسا اختلاف نہیں، جو ایک دوسرے کے مقابل ہو، کیونکہ یہ اختلاف مختلف زمانوں سے متعلق ہے، واللہ الموفق (شرح صحیح بخاری)

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ جمہور فقہائے کرام کے نزدیک تراویح کی بیس رکعات ہیں، لیکن بیس رکعات سے زیادہ رکعات کو بھی خیرُ القرون کے دور میں مدینہ منورہ میں گوارا کیا

گیا تھا، اور ان پر نکیر نہیں کی گئی تھی، امام مالک رحمہ اللہ نے اہلِ مدینہ کے تعامل و عمل کو ہی اختیار فرمایا ہے، جو کم از کم جواز کی دلیل ہے، اگرچہ خلفائے راشدین وغیرہ کا تعامل نہ ہونے کی وجہ سے بیس سے زائد کو مسنون قرار نہ دیا جائے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ بیس اور اس سے زیادہ رکعات کا اختلاف مختلف زمانوں پر مبنی ہے، لہٰذا ان میں تعارض نہیں۔

علامہ قسطلانی کا حوالہ

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 923ھ) ''صحیح البخاری'' کی شرح ''ارشاد الساری'' میں فرماتے ہیں:

ولم يذكر في هذا الحديث عدد الركعات التي كان يصلي بها أبي، والمعروف وهو الذي عليه الجمهور أنه عشرون ركعة بعشر تسليمات وذلك خمس ترويحات كل ترويحة أربع ركعات بتسليمتين غير الوتر وهو ثلاث ركعات......

واختار مالك -رحمه الله -أن تصلى ستا وثلاثين ركعة غير الوتر وقال :إن عليه العمل بالمدينة وقد قال المالكية كانت ثلاثا وعشرين ثم جعلت تسعا وثلاثين أي بالشفع والوتر فيهما، وذكر في النوادر عن ابن حبيب أنها كانت أولا إحدى عشرة ركعة إلا أنهم كانوا يطيلون القراء ة فثقل عليهم ذلك فزادوا في أعداد الركعات وخففوا القراء ة وكانوا يصلون عشرين ركعة غير الشفع والوتر بقراء ة متوسطة ثم خففوا القراء ة وجعلوا عدد ركعاتها ستا وثلاثين غير الشفع والوتر قال ومضى الأمر على ذلك اهـ.

وفي مصنف ابن أبي شيبة عن داود بن قيس قال :أدركت الناس بالمدينة في زمن عمر بن عبد العزيز وأبان بن عثمان يصلون ستا وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث، وإنما فعل أهل المدينة هذا لأنهم أرادوا مساواة أهل مكة فإنهم كانوا يطوفون سبعا بين كل ترويحتين فجعل أهل المدينة مكان كل سبع أربع ركعات، وقد حكى الولي بن العراقي أن والده الحافظ لما ولي إمامة مسجد المدينة أحيا سنتهم القديمة في ذلك مع مراعاة ما عليه الأكثر فكان يصلي التراويح أول الليل بعشرين ركعة على المعتاد ثم يقوم آخر الليل في المسجد بست عشرة ركعة فيختم في الجماعة في شهر رمضان ختمتين واستمر على ذلك عمل أهل المدينة فهم عليه إلى الآن، فنسأل الله الكريم المنان، أن يبلغنا صلاتها كذلك في ذاك المكان، في عافية وأمان، استودعه تعالى ذلك ونعمة الإسلام.

وقد قال النووي قال الشافعي والأصحاب ولا يجوز ذلك أي صلاتها ستا وثلاثين ركعة لغير أهل المدينة لأن لأهلها شرفا بهجرته -صلى الله عليه وسلم-، وهذا يخالفه قول الشافعي المروي عنه في المعرفة للبيهقي وليس في شيء من هذا ضيق ولا حد ينتهي إليه لأنه نافلة فإن أطالوا القيام وأقلوا السجود فحسن وهذا أحب إلي وإن أكثروا الركوع والسجود فحسن.

وقول الحليمي :ومن اقتدى بأهل المدينة فقام بست وثلاين فحسن أيضا لأنهم إنما أرادوا بما صنعوا الاقتداء بأهل مكة في

الاستكثار من الفضل لا المنافسة كما ظن بعضهم، قال: والاقتصار على عشرين مع القراء ة فيها بما يقرؤه غيره فى ست وثلاثين ركعة أفضل لفضل طول القيام على كثرة الركوع والسجود .وعن الشافعى أيضا فيما رواه عنه الزعفرانى :رأيت الناس يقومون بالمدينة بتسع وثلاثين وبمكة بثلاث وعشرين وليس فى شيء من ذلك ضيق اهـ.

وقال الحنابلة :والتراويح عشرون ولا بأس بالزيادة نصا أى عن الإمام أحمد(إرشاد السارى لشرح صحيح البخارى، للقسطلانى، ج۳، ص۴۲۷، كتاب صلاة التراويح،باب فضل من قام رمضان)

ترجمہ: اوراس حدیث میں ان رکعات کی تعداد کا ذکر نہیں کیا گیا، جن کو حضرت اُبی پڑھایا کرتے تھے، اور مشہور تعداد جو کہ جمہور کی اختیار کردہ بھی ہے، وہ بیس (20) رکعتیں ہیں، دس سلام کے ساتھ، جو کہ پانچ ترویحے ہیں، ہر ترویحہ چار رکعات پر دو سلاموں کے ساتھ ہوتا ہے، سوائے وتر کے، جو کہ تین رکعات ہیں......

اور امام مالک رحمہ اللہ نے وتر کے علاوہ چھتیس (36) رکعات پڑھنے کو اختیار کیا ہے، اور فرمایا کہ اسی پر مدینہ منورہ میں عمل تھا، اور مالکیہ نے فرمایا کہ دراصل پہلے تیئیس (23) رکعات تھیں، پھر شفع اور وتر (یعنی تین رکعات) کو شامل کر کے انتالیس (39) رکعتیں کردی گئیں، اور نوادر میں ابنِ حبیب کی روایت میں یہ مذکور ہے کہ پہلے گیارہ (11) رکعتیں تھیں، مگر وہ قرائت طویل کیا کرتے تھے، پھر ان پر یہ بھاری گزرا، تو انہوں نے رکعات کی تعداد زیادہ کردی، اور قرائت میں تخفیف کردی، اور وہ شفع اور وتر کے علاوہ متوسط قرائت کے ساتھ بیس (20) رکعات پڑھنے لگے، پھر انہوں نے قرائت میں مزید تخفیف کی، اور انہوں نے

رکعات کی تعداد شفع اور وتر کے علاوہ چھتیس (36) کردی، اور اسی پر عمل جاری رہا (ابنِ حبیب کا کلام ختم ہوا)

اور مصنف ابنِ ابی شیبہ میں داؤد بن قیس سے روایت ہے کہ میں نے مدینہ منورہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ابان بن عثمان کے زمانہ میں لوگوں کو چھتیس (36) رکعات اور تین وتر پڑھتے ہوئے پایا، اور اہلِ مدینہ نے یہ فعل اس لیے اختیار کیا کہ انہوں نے اہلِ مکہ کی مساوات کرنی چاہی، کیونکہ اہلِ مکہ ہر دو ترویحوں کے درمیان سات چکروں کا طواف کیا کرتے تھے، پس اہلِ مدینہ نے سات چکروں کی جگہ چار رکعات کا اضافہ کرلیا، اور ولی بن عراقی نے روایت کیا ہے کہ ان کے والد حافظ کو جب مدینہ کی مسجد کی امامت کی ذمہ داری سپرد کی گئی، تو انہوں نے اس سلسلہ میں قدیم سنت کو اکثر کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے زندہ کردیا، پس وہ اول رات میں بیس (20) رکعات تراویح عام عادت کے مطابق پڑھایا کرتے تھے، پھر اس کے بعد رات کے آخری حصہ میں مسجد میں سولہ (16) رکعتیں پڑھایا کرتے تھے (جن کا مجموعہ بیس رکعات کے ساتھ مل کر چھتیس رکعات ہوجاتا تھا) اس طرح وہ ماہِ رمضان میں جماعت کے اندر دو قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے، اور اسی پر اہلِ مدینہ کا عمل جاری رہا، جو آج تک جاری ہے ’’فنسأل الله الكريم المنان، أن يبلغنا صلاتها كذلك فى ذاك المكان، فى عافية وأمان، استودعه تعالى ذلك ونعمة الإسلام‘‘

اور امام نووی نے فرمایا کہ امام شافعی اور ان کے اصحاب کا قول یہ ہے کہ یہ نماز یعنی چھتیس (36) رکعتیں اہلِ مدینہ کے علاوہ کے لیے جائز نہیں، کیونکہ اہلِ مدینہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی وجہ سے شرف حاصل ہے، لیکن یہ بات خود امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی اس تصریح کے خلاف ہے، جو بیہقی نے معرفۃ السنن میں

روایت کیا ہے کہ ان میں سے کسی کے اندر تنگی نہیں ہے، اور نہ اس کی کوئی حد ہے، جس پر انتہا ہو، کیونکہ یہ نفل نماز ہے، پس اگر وہ قیام لمبا کریں اور سجود کم کریں، تو اچھا ہے، اور یہی مجھے زیادہ محبوب ہے، اور اگر رکوع اور سجود (یعنی رکعات) زیادہ کریں تو بھی اچھا ہے۔[1]

اور نووی کی یہ بات حلیمی کے اس قول کے بھی خلاف ہے کہ جو اہلِ مدینہ کی اقتداء کر کے چھتیس (36) رکعات پڑھیں، تو یہ بھی اچھا ہے، کیونکہ انہوں نے فضیلت زیادہ حاصل کرنے کے لیے اہلِ مکہ کے فعل کی اقتداء کا ارادہ کیا ہے، مقابلہ کا ارادہ نہیں کیا، جیسا کہ بعض نے گمان کیا ہے، لیکن انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ بیس (20) رکعات پر اکتفاء کرنا اس میں اتنی قرائت کر کے، جتنی دوسرے چھتیس (36) رکعات میں قرائت کرتے ہیں، یہ افضل ہے، بوجہ طولِ قیام کے کثرتِ رکوع وسجود سے افضل ہونے کے، اور امام شافعی سے ہی زعفرانی نے روایت کیا ہے کہ میں نے مدینہ میں لوگوں کو انتالیس (39) رکعات اور مکہ میں تیئیس (23) رکعات پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، اور ان میں سے کسی کے اندر تنگی نہیں ہے (لہٰذا نووی کا قول راجح نہ ہوا، اور امام شافعی کے نزدیک غیر اہلِ مدینہ کے لیے بیس رکعات سے زیادہ تراویح پڑھنے کا جائز ہونا راجح ہوا)

اور حنابلہ نے فرمایا کہ تراویح بیس (20) رکعات ہیں، لیکن امام احمد کی تصریح کے مطابق بیس سے زیادہ میں بھی کوئی حرج نہیں (ارشاد الساری)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ متعدد مالکیہ کے نزدیک چھتیس رکعات قیامُ اللیل بمعنیٰ تراویح میں داخل ہیں، اور وہ ان کے اہلِ مدینہ اور غیر اہلِ مدینہ سب کے لیے باجماعت

---

[1] قال الشافعي: وليس في شيء من هذا ضيق، ولا حد ينتهى إليه؛ لأنه نافلة فإن أطالوا القيام وأقلوا السجود فحسن، وهو أحب إلي، وإن أكثروا الركوع والسجود فحسن (معرفة السنن والآثار للبيهقي، تحت رقم الرواية ٥٤١٢)

پڑھنے کے قائل ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ بھی بیس سے زیادہ رکعات کے سلسلہ میں تنگی وسختی کے قائل نہیں، خواہ اہلِ مدینہ یہ عمل اختیار کریں یا دوسرے حضرات، جبکہ اسحاق بن راہویہ بھی چالیس رکعات کے قائل ہیں۔

صحیح بخاری کے مذکورہ تمام شراح ان امور کو پے در پے نقل کرتے آئے ہیں۔

علامہ قسطلانی اور حلیمی وغیرہ کے بقول راجح یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک غیر اہلِ مدینہ کو بھی اتنی ہی رکعات پڑھنا جائز ہے، ان کے نزدیک اس حکم میں تنگی نہیں ہے۔

البتہ امام نووی وغیرہ، غیر اہلِ مدینہ کے لیے بیس سے زیادہ تراویح کو ناجائز قرار دیتے ہیں، متعدد شافعیہ نے اس قول کو معتمد قرار دیا ہے۔

پھر شافعیہ کے نزدیک اہلِ مدینہ اور غیر اہلِ مدینہ کے متعلق مذکورہ اختلاف بیس سے زیادہ رکعات کو بحیثیتِ تراویح پڑھنے کے متعلق ہے، کیونکہ ان کے نزدیک تراویح کے لیے نیتِ خاص ضروری ہے، اور تراویح کی بیس رکعات ہیں، ورنہ اگر بیس سے زائد رکعات کو وتر یا تہجد یا مطلق تطوع کی حیثیت سے باجماعت پڑھا جائے، تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے جواز میں شبہ نہیں، کیونکہ مذکورہ صورتوں میں ان کے نزدیک یہ زائد رکعات، تراویح کے بجائے تطوع، تہجد یا وتروں میں داخل ہیں، جن کو باجماعت پڑھنا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے، جیسا کہ تطوع اور نفل کی جماعت کے بیان میں گزرا، اور آگے بعض مشائخِ حنفیہ کی عبارات میں بھی اس کی تصریح آتی ہے۔ [1]

---

[1] ولأهل المدينة فعلها ستا وثلاثين؛ لأن العشرين خمس ترويحات فكان أهل مكة يطوفون بين كل ترويحتين سبعة أشواط فجعل أهل المدينة بدل كل أسبوع ترويحة؛ ليساووهم .قال الشيخان: ولا يجوز ذلک لغيرهم؛ لأن لأهلها شرفا بهجرته -صلى الله عليه وسلم -ومدفنه وهذا يخالفه قول الحليمى ومن اقتدى بأهل المدينة فقام بست وثلاثين فحسن أيضا لأنهم إنما أرادوا بما صنعوا الاقتداء بأهل مكة فى الاستكثار من الفضل لا المنافسة كما ظن بعضهم قال :والاقتصار على عشرين مع القراءة فيها بما يقرؤه غيره فى ست وثلاثين أفضل لفضل طول القيام على كثرة الركوع، والسجود قال الأذرعى، والقلب إلى ما قاله أميل وغير أهل المدينة من سائر البلاد أحوج

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جہاں تک تراویح کے بارے میں گیارہ رکعات والی روایت کا تعلق ہے، تو ہمارے نزدیک اس کا ''وہم'' ہونا راجح ہے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

علامہ ابنِ عبدالبر قرطبی کا حوالہ

علامہ ابنِ عبدالبر قرطبی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 463ھ) ''الاستذکار'' میں فرماتے ہیں:

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

إلى الازدياد فى الفضل من أهل المدينة، ثم قال وإذا قلنا بالمشهور فزاد على عشرين ركعة بنية التراويح، أو قيام رمضان هل يكون كما لو زاد فى الوتر على إحدى عشرة وظاهر كلام الشافعى أنه مثله وقياس كلام الحليمى وجماعة الصحة، وهو المختار(أسنى المطالب فى شرح روض الطالب،لزكريا بن محمد بن زكريا الأنصارى، السنيكى، ج ا،ص ١ ٠ ٢، كتاب الصلاة،الباب السابع فى صلاة التطوع)

(قوله: ولا يجوز ذلك لغيرهم) أشار إلى تصحيحه (قوله: هل يكون كما لو زاد فى الوتر إلخ) أشار إلى تصحيحه (قوله: وظاهر كلام الشافعى أنه مثله) وهو المعتمد (حاشية الرملى الكبير علىٰ أسنى المطالب فى شرح روض الطالب، ج ا،ص ١ ٠ ٢، كتاب الصلاة،الباب السابع فى صلاة التطوع)

قال ابن قدامة فى المغنى وصالح ضعيف ثم لا يدرى من الناس الذين أخبر عنهم فلعله قد أدرك جماعة من الناس يفعلون ذلك وليس ذلك بحجة.ثم لو ثبت أن أهل المدينة كلهم فعلوه لكان ما فعله عمر -رضى الله عنه -وأجمع عليه الصحابة فى عصره أولى بالاتباع انتهى وقال بعض أهل العلم وإنما فعل هذا أهل المدينة لأنهم أرادوا مساواة أهل مكة فإن أهل مكة كانوا يطوفون سبعا بين كل ترويحتين فجعل أهل المدينة مكان كل سبع أربع ركعات وقال الحليمى من أصحابنا فى منهاجه فمن اقتدى بأهل مكة فقام بعشرين فحسن ومن اقتدى بأهل المدينة فقام بست وثلاثين فحسن أيضا لأنهم إنما أرادوا بما صنعوا الاقتداء بأهل مكة فى الاستكثار من الفضل لا المنافسة كما ظن بعض الناس قال ومن اقتصر على عشرين وقرأ فيها بما يقرؤه غيره فى ست وثلاثين كان أفضل لأن طول القيام أفضل من كثرة الركوع والسجود قيل والسر فى العشرين أن الراتبة فى غير رمضان عشر ركعات فضوعفت فيه لأنه وقت جد وتشمير انتهى ولما ولى والدى -رحمه الله - إمامة مسجد المدينة أحيا سنتهم القديمة فى ذلك مع مراعاة ما عليه الأكثر فكان يصلى التراويح أول الليل بعشرين ركعة على المعتاد ثم يقوم آخر الليل فى المسجد بست عشرة ركعة فيختم فى الجماعة فى شهر رمضان ختمتين واستمر على ذلك عمل أهل المدينة بعده فهم عليه إلى الآن وكان الأسود بن يزيد يصلى أربعين ركعة يوتر بسبع رواه ابن أبى شيبة وقال الشافعى -رحمه الله - وليس فى شىء من هذا ضيق ولا حد ينتهى إليه لأنه نافلة فإن أطالوا القيام وأقلوا السجود فحسن وهو أحب إلى وإن أكثروا الركوع والسجود فحسن(طرح التثريب فى شرح التقريب،لزين الدين العراقى، ج٣،ص٩٨، كتاب الصلاة،باب قيام رمضان)

وقد روى مالك عن يزيد بن رومان قال كان الناس يقومون فى زمن عمر بن الخطاب فى رمضان بثلاث وعشرين ركعة.

وهذا كله يشهد بأن الرواية بإحدى عشرة ركعة وهم وغلط وأن الصحيح ثلاث وعشرون وإحدى وعشرون ركعة والله أعلم.

وقد روى أبو شيبة واسمه إبراهيم بن علية بن عثمان عن الحكم عن بن عباس أن رسول الله عليه السلام كان يصلى فى رمضان عشرين ركعة والوتر. وليس أبو شيبة بالقوى عندهم.

ذكره بن أبى شيبة عن يزيد بن رومان عن أبى شيبة إبراهيم بن عثمان.

وروى عشرون ركعة عن على وشتير بن شكل وابن أبى مليكة والحارث الهمدانى وأبى البخترى.

وهو قول جمهور العلماء وبه قال الكوفيون والشافعى وأكثر الفقهاء وهو الصحيح عن أبى بن كعب (من غير خلاف من الصحابة)

وقال عطاء أدركت الناس وهم يصلون ثلاثا وعشرين ركعة بالوتر.

وكان الأسود بن يزيد يصلى أربعين ركعة ويوتر بسبع.

وذكر بن القاسم عن مالك تسع وثلاثون والوتر ثلاث. وزعم أنه الأمر القديم.

وذكر بن أبى شيبة قال حدثنا عبد الرحمن بن مهدى عن داود بن قيس قال أدركت الناس بالمدينة فى زمن عمر بن عبد العزيز

وأبان بن عثمان يصلون ستا وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث.

وقال الثورى وأبو حنيفة والشافعي وأحمد بن داود قيام رمضان عشرون ركعة سوى الوتر لا يقام بأكثر منها استحبابا.

وذكر عن وكيع عن حسن بن صالح عن عمرو بن قيس عن أبي الحسين عن علي أنه أمر رجلا يصلي بهم في رمضان عشرين ركعة.

وهذا هو الاختيار عندنا وبالله توفيقنا (الاستذكار، لا بن عبد البر القرطبي، ج۲، ص ۷۰، كتاب الصلاة في رمضان، باب ما جاء في قيام رمضان)

ترجمہ: اور امام مالک نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تیئیس (23) رکعات پڑھا کرتے تھے (جس میں تین وتر بھی شامل تھے)

اور یہ سب امور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تراویح سے متعلق) گیارہ رکعات کی روایت وہم اور غلطی پر مبنی ہے، اور صحیح روایت تیئیس اور اکیس رکعات کی ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ابوشیبہ جن کا نام ابراہیم بن علیہ بن عثمان ہے، انہوں نے حکم سے اور انہوں نے ابنِ عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھا کرتے تھے، لیکن ابوشیبہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہیں۔

اس کو ابنِ ابی شیبہ نے یزید بن رومان سے انہوں نے ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کی سند سے ذکر کیا ہے۔

اور بیس (20) رکعات حضرت علی اور شتیر بن شکل اور ابنِ ابی ملیکہ اور حارث ہمدانی اور ابوالبختری سے بھی مروی ہیں۔

اور یہی جمہور علماء کا قول ہے، اہلِ کوفہ اور امام شافعی اور اکثر فقہاء کا قول بھی یہی

ہے، اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اصحاب کا اختلاف کیے بغیر بھی یہی صحیح طور پر مروی ہے۔

اور حضرت عطاء نے فرمایا کہ میں نے لوگوں کو تیئیس (23) رکعات وتر سمیت پڑھتے ہوئے پایا۔

اور حضرت اسود بن یزید چالیس (40) رکعات پڑھتے تھے اور سات رکعات وتر پڑھتے تھے۔ [1]

اور ابن القاسم نے امام مالک سے انتالیس (39) رکعات اور تین رکعات وتر

---

[1] ملحوظ رہے کہ "اسود بن یزید" کوفہ کے بڑے عالم تھے۔

لیکن ہمیں اسود بن یزید کے بارے میں چالیس رکعات کا ثبوت کسی سند سے نہیں مل سکا۔

البتہ حضرت اسود بن یزید کے بیٹے عبدالرحمٰن بن اسود کے بارے میں محمد بن نصر المروزی نے چالیس رکعات پڑھانے کی روایت ذکر کی ہے، ممکن ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسود کے بجائے اسود بن یزید کا نام ذکر کرنے میں بعض حضرات سے خطاء واقع ہوگئی ہو۔

حضرت عبدالرحمٰن بن اسود، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت کے زمانہ میں ہوئے ہیں، جن کی وفات 99 ہجری بتلائی جاتی ہے۔

حفص بن غياث ، عن الحسن بن عبيد الله : أنه كان يصلى بهم عبد الرحمن بن الأسود من أول الليل إلى آخره يعنى فى شهر رمضان وكان يصلى بهم أربعين ركعة والوتر (قيام الليل لمحمد بن نصر المروزى، ص ۲۵۹ ،باب ما يدعى به فى ليلة القدر)

عبد الرحمن بن الأسود بن يزيد النخعى (ع)ابن قيس، أبو حفص النخعى، الكوفى، الفقيه، الإمام ابن الإمام.

حدث عن: أبيه، وعمه؛ علقمة بن قيس، وعائشة، وابن الزبير، وغيرهم.وأدرك أيام عمر.

حدث عنه: الأعمش، وإسماعيل بن أبى خالد، ومحمد بن إسحاق، وحجاج بن أرطاة، ومالك بن مغول، وزبيد اليامى، وأبو إسرائيل الملائى، وأبو بكر النهشلى، وعبد الرحمن المسعودى، وآخرون......قال خليفة: مات سنة ثمان، أو تسع وتسعين .وذكر ابن عساكر: أنه وفد على عمر بن عبد العزيز(سير اعلام النبلاء، ج۵ص ۱۱، ۱۲، ملخصاً، تحت رقم الترجمة ۵)

الأسود بن يزيد بن قيس الإمام أبو عمرو النخعى الفقيه الزاهد العابد عالم الكوفة وابن أخى عالمها علقمة وخال إبراهيم النخعى الفقيه وأخو عبد الرحمن بن يزيد :أخذ عن معاذ وابن مسعود وحذيفة وبلال والكبار .حدث عنه ابنه عبد الرحمن وإبراهيم وأبو إسحاق السبيعى وعدة(تذكرة الحفاظ،للذهبى، ج ۱،ص ۴۱، تحت رقم الترجمة ۲/۷۔ ۲۹)

ذکر کیے ہیں، اوران کا یہ گمان ہے کہ یہ قدیمی حکم ہے۔

ابنِ ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز اورابان بن عثمان کے زمانہ میں مدینہ میں لوگوں کو چھتیس (36) رکعات اور تین وتر پڑھتے ہوئے پایا ہے۔

اورامام ثوری، امام ابوحنیفہ اورامام شافعی اوراحمد بن داؤد نے فرمایا کہ قیامِ رمضان بیس (20) رکعات ہیں سوائے وتر کے، اس سے زیادہ مستحب نہیں۔

اور وکیع نے حسن بن صالح سے اور انہوں نے عمرو بن قیس سے انہوں نے ابوالحسین سے روایت کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعات پڑھائے۔

اوریہی قول اللہ کی توفیق سے ہمارے ہاں مختار ہے (الاستذکار)

اس سے معلوم ہوا کہ جمہور فقہائے کرام کے نزدیک تراویح کی بیس رکعات سنت ہیں، اور امام مالک کے علاوہ کسی کے نزدیک بیس سے زیادہ مستحب نہیں، جو عدمِ جواز کو مستلزم نہیں، اسی وجہ سے متعدد تابعین سے بیس سے زیادہ رکعات کا پڑھنا بھی ثابت ہے، جس پر اس دور میں نکیر نہیں کی گئی، لہٰذا اس عمل کو فی نفسہٖ بدعت یا حرام وغیرہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے، تا آنکہ کوئی دوسرا منکر وخرابی اس میں شامل نہ ہو۔

اور بیس رکعات پر اضافہ کب ہوا؟ اس میں مالکیہ کا ایک قول حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں ہونے کا، دوسرا قول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہونے کا اور تیسرا قول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہونے کا ہے۔ واللہ اعلم۔ [1]

---

[1] (قوله :فجعلت ستا وثلاثين) قال العلماء :وسبب ذلک أن الركعات العشرين خمس ترويحات كل ترويحة أربع ركعات، وكان أهل مكة يطوفون بين كل ترويحتين سبعة أشواط ويصلون ركعتي الطواف أفرادا وكانوا لا يفعلون ذلک بين الفريضة والتراويح ولا بين التراويح والوتر فأراد أهل المدينة أن يساووهم فى الفضيلة فجعلوا مكان كل أسبوع ترويحة فحصل أربع

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

علامہ ابنِ رشد کا حوالہ

ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن رشد قرطبی (الشهير بابن رشد الحفيد، المتوفیٰ: 595ھ) فرماتے ہیں:

وأجمعوا على أن قيام شهر رمضان مرغب فيه أكثر من سائر الاشهر............

واختلفوا فى المختار من عدد الركعات التى يقوم بها الناس فى رمضان، فاختار مالک فى أحد قوليه، وأبو حنيفة، والشافعى، وأحمد، وداود، القيام بعشرين ركعة سوى الوتر.

وذكر ابن القاسم عن مالک أنه كان يستحسن ستا وثلاثين ركعة، والوتر ثلاث.

وسبب اختلافهم :اختلاف النقل فى ذلک، وذلک أن مالكا

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

ترويحات وهى ست عشرة ركعة تضم إلى العشرين تصير ستا وثلاثين ومع ركعات الشفع والوتر الثلاث تصير تسعا وثلاثين ركعة قاله البساطى فى شرح البردة والجاعل له ستة وثلاثين عمر بن عبد العزيز وقيل عثمان وقيل معاوية أقوال(حاشية العدوى على شرح مختصر خليل للحرشى، ج٢،ص٩، باب الوقت المختار،فصل فى بيان صلاة النافلة وحكمها)

(ستا وثلاثين ركعة غير الشفع والوتر) والذى أمرهم بصلاتها كذلک عمر بن عبد العزيز -رضى الله عنه -لما رأى فى ذلک من المصلحة؛ لأنهم كانوا يطيلون فى القراء ة الموجبة للسآمة والملل، فأمرهم بتقصير القراء ة وزيادة الركعات، والسلطان إذا نهج منهجا لا تجوز مخالفته ولا سيما عمر بن عبد العزيز -رضى الله عنه -، وهذا اختاره مالک فى المدونة واستحسنه وعليه عمل أهل المدينة، ورجح بعض أتباعه الأول الذى جمع عمر بن الخطاب الناس عليها لاستمرار العمل فى جميع الأمصار عليه لذلک صدر به خليل بقوله :ثلاث وعشرون بالشفع والوتر .(وكل ذلک) أى العدد من العشرين أو الستة والثلاثين (واسع) أى جائز وهذا غير ضرورى الذكر(الفواكه الدوانى على رسالة ابن أبى زيد القيروانى، ج١،ص٣١٩، باب فى الصيام،حكم التراويح فى رمضان)

روی عن یزید بن رومان قال :کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب بثلاث وعشرین رکعة وخرج ابن أبی شیبة عن داود ابن قیس قال :أدرکت الناس بالمدینة فی زمان عمر بن عبد العزیز، وأبان بن عثمان یصلون ستا وثلاثین رکعة، ویوترون بثلاث وذکر ابن القاسم عن مالک أنه الامر القدیم :یعنی القیام بست وثلاثین رکعة (بدایة المجتهد ونهایة المقتصد،للامام القاضی بن رشد القرطبی الاندلسی،ج ۱،ص ۱۶۸،الباب الخامس :فی قیام رمضان)

ترجمہ: اور (فقہاء کا) اس بات پر اجماع ہے کہ رمضان کے مہینہ میں قیام کی ترغیب وفضیلت دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے......

اور فقہاء کا رمضان میں لوگوں کے قیام کرنے کی رکعات کی تعداد کے مختار ہونے میں اختلاف ہے، امام مالک نے دو قولوں میں سے ایک قول کے مطابق، اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور امام احمد اور داود نے وتر کے علاوہ بیس (20) رکعات کے ذریعہ سے قیام کو اختیار کیا ہے۔

اور ابنِ قاسم نے امام مالک سے چھتیس (36) رکعات اور تین وتر کا مستحسن ہونا ذکر کیا ہے۔

اور ان حضرات کے اختلاف کا سبب اس سلسلہ میں (سلف سے) نقل کا مختلف ہونا ہے، چنانچہ امام مالک نے یزید بن رومان سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگ تیئیس (23) رکعات کے ذریعہ قیام کیا کرتے تھے، اور ابنِ ابی شیبہ نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں، مدینہ منورہ میں لوگوں کو اور ابان بن عثمان کو چھتیس (36) رکعتیں اور تین وتر پڑھتے ہوئے پایا، اور ابنِ قاسم نے امام

مالک سے روایت کیا ہے کہ چھتیس (36) رکعتوں کے ذریعہ قیام کرنا امرِ قدیم ہے (بداية المجتهد)

امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کا حوالہ

ابو یعقوب اسحاق بن منصور بن بہرام الکوسج (المتوفیٰ: 251ھ) فرماتے ہیں:

قلت: كم من ركعة يصلى فى قيام شهر رمضان؟

قال: قد قيل فيه ألوان، يروى نحواً من أربعين، إنما هو تطوع.

قال إسحاق: نختار أربعين ركعة وتكون القراء ة أخف.

قلت: الصلاة فى الجماعة أحب إليك أم يصلى وحده فى قيام شهر رمضان؟

قال: يعجبنى أن يصلى فى الجماعة يحيى السنة.

قال إسحاق: أجاد، كما قال (مسائل الإمام أحمد بن حنبل وإسحاق بن راهويه، ج۲ ص۷۵۵ الیٰ ۷۵۹، كتاب الطهارة والصلاة)

ترجمہ: میں نے کہا کہ ماہِ رمضان کے قیام میں کتنی رکعتیں پڑھی جائیں گی؟ امام احمد نے فرمایا کہ اس میں مختلف الوان مروی ہیں، جو چالیس رکعات کے قریب تک پہنچے ہوئے ہیں، بس یہ نماز تو تطوع ہے (جس میں ان سب اقوال والوان کی گنجائش پائی جاتی ہے) اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ ہم چالیس (40) رکعات کو اختیار کرتے ہیں، جن میں قرائت ہلکی ہوگی۔

میں نے کہا کہ ماہِ رمضان کے قیام میں آپ کو جماعت زیادہ پسند ہے یا تنہا نماز پڑھنا؟ امام احمد نے فرمایا کہ مجھے جماعت کے ساتھ پڑھنا زیادہ محبوب ہے، جس میں سنت کا احیاء ہوتا ہے، اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ امام احمد نے بہت اچھی بات فرمائی (مسائل الامام احمد)

اسحاق بن راہویہ کا شمار مجتہدین میں سے ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام مالک رحمہ اللہ کے علاوہ امام اسحاق بن راہویہ بھی قیامِ رمضان کی بیس سے زیادہ یعنی چالیس رکعات باجماعت پڑھنے کو اختیار کرتے ہیں۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا حوالہ

ملا علی قاری رحمہ اللہ ''مشکاۃُ المصابیح '' کی شرح ''مرقاۃُ المفاتیح '' میں فرماتے ہیں:

قال ابن تيمية الحنبلى: اعلم أنه لم يوقت رسول الله صلى الله عليه وسلم فى التراويح عددا معينا، بل لا يزيد فى رمضان، ولا فى غيره على ثلاث عشرة ركعة، لكن كان يطيل الركعات، فلما جمعهم عمر على أبى كان يصلى بهم عشرين ركعة، ثم يوتر بثلاث، وكان يخفف القراء ة، بقدر ما زاد من الركعات ;لأن ذلك أخف على المأمومين من تطويل الركعة الواحدة، ثم كان طائفة من السلف يقومون بأربعين ركعة ويوترون بثلاث، وآخرون بست وثلاثين وأوتروا بثلاث، وهذا كله حسن سائغ، ومن ظن أن قيام رمضان فيه عدد معين موقت عن النبى صلى الله عليه وسلم لا يزيد ولا ينقص، فقد أخطأ (مرقاة المفاتيح، ج٣ص ٩٧٢، كتاب الصلاة، باب قيام شهر رمضان)

ترجمہ: ابنِ تیمیہ حنبلی نے فرمایا کہ: یہ بات جان لینی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کے بارے میں کوئی متعین عدد مقرر نہیں فرمایا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں تیرہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا

کرتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (طولِ قرائت کی وجہ سے) لمبی رکعتیں پڑھا کرتے تھے، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر لوگوں کو جمع فرمایا، تو وہ ان کو بیس رکعات پڑھایا کرتے تھے، پھر تین رکعات وتر پڑھایا کرتے تھے، اور وہ ہلکی قرائت کیا کرتے تھے، اس کے بقدر کہ جس میں رکعات زیادہ ہو جائیں، کیونکہ یہ مقتدیوں پر ایک رکعت کے لمبا کرنے کے مقابلہ میں زیادہ سہل تھا، پھر سلف کی ایک جماعت چالیس رکعات اور تین وتر پڑھا کرتی تھی، اور دوسری جماعت چھتیس رکعات اور تین وتر پڑھا کرتی تھی، اور یہ سب بہتر ہے، جائز ہے، اور جس نے یہ گمان کیا کہ قیامِ رمضان کا معین عدد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے طے شدہ ہے، جس میں کمی زیادتی کی گنجائش نہیں، تو اس نے خطاء کی (مرقاۃ)

ملا علی قاری نے "مشکـاۃُ المصابیح" کی شرح میں علامہ ابنِ تیمیہ حنبلی کے جس قول کا ذکر فرمایا ہے، علامہ ابنِ تیمیہ کے فتاویٰ میں اس کی تصریح پائی جاتی ہے۔ [1]

ہم نے تراویح کی تعداد سے متعلق اپنی دوسری تالیف میں دلائل کے ساتھ جمہور کے کم از کم بیس رکعات تراویح کے مسنون ہونے کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے، اس لیے ہمارے

---

[1] نفس قيام رمضان لم يوقت النبي صلى الله عليه وسلم فيه عددا معينا ؛ بل كان هو -صلى الله عليه وسلم -لا يزيد في رمضان ولا غيره على ثلاث عشرة ركعة لكن كان يطيل الركعات فلما جمعهم عمر على أبي بن كعب كان يصلي بهم عشرين ركعة ثم يوتر بثلاث وكان يخف القراءة بقدر ما زاد من الركعات لأن ذلك أخف على المأمومين من تطويل الركعة الواحدة ثم كان طائفة من السلف يقومون بأربعين ركعة ويوترون بثلاث وآخرون قاموا بست وثلاثين وأوتروا بثلاث .
وهذا كله سائغ فكيفما قام في رمضان من هذه الوجوه فقد أحسن .والأفضل يختلف باختلاف أحوال المصلين فإن كان فيهم احتمال لطول القيام فالقيام بعشر ركعات وثلاث بعدها .كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي لنفسه في رمضان وغيره هو الأفضل وإن كانوا لا يحتملونه فالقيام بعشرين هو الأفضل وهو الذي يعمل به أكثر المسلمين فإنه وسط بين العشر وبين الأربعين وإن قام بأربعين وغيرها جاز ذلك ولا يكره شيء من ذلك (مجموع الفتاوى،لابن تيمية، ج ٢٢، ص ٢٧٢، كتاب الفقه، الصلاة ،باب صفة الصلاة)

نزدیک راجح یہی ہے کہ تراویح کی بیس رکعات تو سنت ہیں، اور اس سے زائد جائز ہیں، بیس رکعات سے زائد کا درجہ بیس رکعات تراویح کی طرح سے سنت نہیں، اور ہم بیس رکعات سے کم تراویح کے ذریعہ سنتِ تراویح کی ادائیگی کو مرجوح سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

علامہ ابنِ اثیر جزری کا حوالہ

علامہ ابنِ اثیر جزری (المتوفی: 606ھ) ''مسندُ الشافعی'' کی شرح میں فرماتے ہیں:

قال الشافعی :إن صلى رجل لنفسه فی بیته فی رمضان فهو أحب إلیَّ، وإن صلی فی جماعة فحسن، وأحب إلی إذا كانوا جماعة أن یصلوا عشرین ركعة ویوتروا بثلاث.

قال :ورأیت الناس یقومون بالمدینة تسعاً وثلاثین ركعة وأحب إلی عشرون .

قال :ولیس فی شیء من هذا ضیق ولا حد ینتهی إلیه، لأنه نافلة (الشافی فی شرح مسند الشافعی لابن الأثیر، ج۲،ص ۲۶۶، كتاب الصلاة، القسم الثانی،الفصل الرابع،فی صلاة التراویح)

ترجمہ: امام شافعی نے فرمایا کہ اگر رمضان میں کوئی شخص (تراویح وغیرہ کی) تنہا نماز پڑھے، تو یہ مجھے زیادہ محبوب ہے، اور اگر جماعت کے ساتھ پڑھے، تو یہ اچھا ہے، اور جب جماعت کے ساتھ پڑھے، تو مجھے بیس (20) رکعتیں اور تین وتر پڑھنا زیادہ پسند ہے، اور میں نے مدینہ میں لوگوں کو انتالیس (39) رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا، اور مجھے بیس رکعتیں زیادہ پسند ہیں۔

اور فرمایا کہ ان میں سے کسی پہلو میں تنگی نہیں، اور نہ کوئی ایسی حد بندی ہے، جس پر حکم کی انتہاء ہو جائے، کیونکہ یہ نفل نماز ہے (الشافی)

اس سے معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق تراویح کی نماز ''تطوع'' میں داخل ہے، اور بیس سے زیادہ رکعات پڑھنے میں حرج نہیں، جس میں اہلِ مدینہ وغیر اہلِ مدینہ کی قید کا ذکر نہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی کا حوالہ

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 911ھ) ''الحاوی للفتاویٰ'' میں فرماتے ہیں:

العلماء اختلفوا فی عددها ولو ثبت ذلک من فعل النبی صلی الله علیه وسلّم لم یختلف فیه کعدد الوتر والرواتب.
فروی عن الأسود بن یزید أنه کان یصلیها أربعین رکعة غیر الوتر .وعن مالک : التراویح ست وثلاثون رکعة غیر الوتر لقول نافع : أدرکت الناس وهم یقومون رمضان بتسع وثلاثین رکعة یوترون منها بثلاث(الحاوی للفتاویٰ للسیوطی، ج ۱ ص ۴۱۵، کتاب الصلاة، المصابیح فی صلاة التراویح)

ترجمہ: علماء کا تراویح کی رکعات کی تعداد میں اختلاف ہے، اور اگر اس کی تعداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے (صحیح وصریح اور متعین طریقہ پر) ثابت ہوتی، تو اس میں اختلاف نہ ہوتا، جیسا کہ وتر اور سنتِ مؤکدہ نمازوں کی تعداد کا معاملہ ہے۔

پس اسود بن یزید سے مروی ہے کہ وہ لوگوں کو وتر کے علاوہ چالیس (40) رکعتیں پڑھایا کرتے تھے، اور امام مالک سے تراویح کا وتروں کے علاوہ چھتیس (36) رکعتیں ہونا منقول ہے، حضرت نافع کے اس قول کی وجہ سے کہ میں نے لوگوں کو

رمضان میں انتالیس (39) رکعت پڑھتے ہوئے پایا، جن میں سے تین رکعتیں وتر کی تھیں (الحاوی)

مذکورہ عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ ماہِ رمضان میں بیس سے زائد چالیس رکعات کا باجماعت پڑھنا مالکیہ کے نزدیک جائز ہونے میں تو شبہ نہیں، اور بعض شافعیہ وحنابلہ اور اسحاق بن راہویہ بھی اس کے جواز سے متفق ہیں۔

علامہ ابنِ قدامہ کا حوالہ

موفق الدین عبداللہ بن احمد مقدسی حنبلی، المعروف ابنِ قدامہ مقدسی (المتوفی: 620ہجری) نے ''المغنی لابنِ قدامة ''میں فرماتے ہیں کہ:

فصل: فأما التعقيب، وهو أن يصلي بعد التراويح نافلة أخرى جماعة، أو يصلي التراويح في جماعة أخرى .فعن أحمد: أنه لا بأس به؛ لأن أنس بن مالك قال: ما يرجعون إلا لخير يرجونه، أو لشر يحذرونه .وكان لا يرى به بأسا .ونقل محمد بن الحكم عنه الكراهة، إلا أنه قول قديم، والعمل على ما رواه الجماعة (المغنی لابنِ قدامة الحنبلی، ج۲ص۱۲۵، کتاب الصلاۃ، فصل الصلاۃ بعد التراویح)

ترجمہ: فصل: جہاں تک ''تعقیب'' کا حکم ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ تراویح کے بعد مزید نوافل جماعت کے ساتھ پڑھی جائیں، یا تراویح دوسری جماعت کے ساتھ پڑھی جائیں، تو امام احمد سے مروی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ وہ اس خیر کی طرف ہی لوٹیں گے، جس کی وہ امید کرتے ہیں، یا اس شر کے لیے جس سے وہ ڈرتے ہیں، اور وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، اور محمد بن حکم نے امام احمد سے اس کے بارے میں مکروہ ہونا

نقل کیا ہے، لیکن یہ قدیم قول ہے، اور عمل اس کے مطابق ہے، جس کو جماعت نے روایت کیا ہے (یعنی بیس سے زائد کا مکروہ نہ ہونا) (المغنی)

شیخ وھبۃُ الزحیلی کا حوالہ

شیخ وھبۃُ الزحیلی (المتوفیٰ:1436ھ) فرماتے ہیں:

ولا يكره تعقيب التطوع بعد التراويح وبعد الوتر فى جماعة، سواء طال الفصل أو قصر (الفقه الإسلامي وأدلته، ج٢،ص ١٠٩٢، الباب الثانی :الصلاة ،الفصل الثامن،النوع الثالث)

ترجمہ: اور تراویح اور وتر کے بعد باجماعت نوافل پڑھنا مکروہ نہیں، خواہ تراویح اور نوافل کی نماز کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو یا کم ہو (الفقہ الاسلامی)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ تراویح سے فارغ ہو کر تطوعات کا باجماعت ادا کرنا حنابلہ کے نزدیک جائز ہے، اور شافعیہ بھی اس کے جواز سے متفق ہیں، جبکہ مالکیہ خود چھتیس یا چالیس رکعات کو مستحسن قرار دیتے ہیں، البتہ بعض شافعیہ بحیثیتِ تراویح بیس پر زیادتی کو اہلِ مدینہ کے ساتھ مختص کرتے ہیں، جبکہ بعض عموم کے قائل ہیں۔

شیخ محمد صالح المنجد اور ''اللجنۃُ الدائمۃ'' کا حوالہ

شیخ محمد صالح المنجد ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

أولا :صلاة التراويح هى قيام الليل فى رمضان ، وليس فى قيام الليل فى رمضان ولا غيره حد محدود من الصلاة لا يتعداه المسلم ، فله أن يصلى بالليل فى رمضان وفى غيره ما شاء من الصلاة .

ولو قسم أهل المسجد صلاة الليل فى رمضان جزئين : جزء بعد

العشاء ، وجزء آخر الليل ليدركوا فضيلة وقت السحر ويجتهدوا فـي العبـادة ، وخـاصة فـي الـعشر الأواخر ، ويجعلوا الوتر آخر الصلاة : فلا حرج عليهم في ذلك .

قال علماء اللجنة الدائمة للإفتاء :

"لا بأس أن يزيد في عدد الركعات في العشر الأواخر عن عددها فـي الـعشرين الأول ويقسمها إلى قسمين : قسـما يصليه في أول الـليـل ويـخـففه على أنه تراويح كما في العشرين الأول ، وقسما يـصـليه في آخر الليل ويطيله على أنه تهجد ، فقد كان النبي صلى الـلـه عـليه وسلم يجتهد في العشر الأواخر ما لا يجتهد في غيرها ."انتهى من "فتاوى اللجنة الدائمة المجموعة الثانية (٦/٨٢)

ثانيا :من صلى التراويح في مسجد ، ثم وجد مسجدا آخر لا يزال يـصـلي ، فذهب فصلى مع الناس : فـلا حـرج عليه أيضا ، لكن لا يـصلي الوتر مرتين ، فإذا أوتر مع الأول لم يوتر مع الثاني ؛ لأنه لا وتران في ليلة .

ومثل هذا : لـو كـان إمـاما يصلي بالناس في مسجدين ، أو يصلي بجماعتين : فـي أول الليل ، وفي آخره ، أو كان يصلي مأموما مع إحـداهـمـا ، ويصلي إماما بالأخرى ؛ كل ذلك جائز لا حرج فيه إن شاء الله (الاسلام سوال و جواب، المشرف العام "الشیخ محمد صالح المنجد، رقـم الفتوىٰ: 221803،هـل تـجـوز صـلاة التـراويـح مرتين في الليلة، تاریخ النشر: 08-10-2014، https://islamqa.info/ar/221803)

ترجمہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ نمازِ تراویح ہی رمضان میں قیام اللیل ہے، اور رمضان اورغیرِ رمضان میں قیام اللیل کے سلسلہ میں نماز کی کوئی حد متعین نہیں،

جس سے مسلم کو تعدی کرنا جائز نہ ہو، پس مسلم کو رمضان اور غیرِ رمضان کی رات میں جتنی چاہے نماز پڑھنا جائز ہے۔

اور اگر مسجد والے رمضان کی رات کی نماز کو دو حصوں میں تقسیم کردیں، ایک حصہ عشاء کے بعد پڑھیں، اور دوسرا حصہ رات کے آخر میں پڑھیں، تاکہ وہ سحری کے وقت کی فضیلت کو پالیں، اور عبادت میں اجتہاد کریں، خاص طور سے آخری عشرہ میں (جس کا احادیث میں ذکر آیا ہے) اور وتر کو رات کی آخری نماز بنالیں، تو اس میں ان پر کوئی حرج نہیں۔

علماء اللجنة الدائمة للافتاء نے فرمایا کہ ''رمضان کے آخری عشرہ میں رکعات کی تعداد کو پہلے دو عشروں کی تعداد کے مقابلہ میں زیادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، جس کے دو حصے کرلیے جائیں، ایک حصہ رات کے اول حصہ میں پڑھیں، جس میں تراویح ہونے کی وجہ سے پہلے دو عشروں کی طرح تخفیف کریں، اور دوسرا حصہ رات کے آخری حصہ میں پڑھیں، جس کو تہجد ہونے کی بنیاد پر لمبا کریں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اتنی محنت سے عبادت کرتے تھے، جو دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے، لجنۃ کے فتوے کی عبارت ختم ہوئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس نے ایک مسجد میں تراویح پڑھ لی، پھر اس نے دوسری مسجد میں پایا، جہاں ابھی تراویح پڑھ رہے تھے، پھر اس نے ان لوگوں کے ساتھ بھی نماز پڑھی، تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن وتر دو مرتبہ نہ پڑھے، پس جب پہلی جماعت میں وتر پڑھ لیے، تو دوسری جماعت کے ساتھ وتر نہ پڑھے، کیونکہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہوتے۔

اسی طرح اگر کوئی امام لوگوں کو دو مسجدوں میں نماز پڑھائے، یا دو جماعتوں میں

امامت کرائے، ایک رات کے اول حصہ میں، دوسرے رات کے آخری حصہ میں یا ان میں سے ایک کے ساتھ مقتدی بن کر نماز پڑھے، اور دوسری کے ساتھ امام بن کر نماز پڑھائے، یہ تمام طریقے جائز ہیں، جن میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں (الاسلام)

عرب علماء کی فتاویٰ لجنہ کا مذکورہ فتویٰ "اللجنةُ الدائمة" طرف سے بھی شائع ہو چکا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ جمہور فقہائے کرام کے نزدیک تراویح کی کم از کم بیس رکعات سنت ہیں، اگرچہ بعض حضرات بیس سے کم رکعات کے جواز کے بھی قائل ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ، بیس سے زیادہ مثلاً چھتیس یا چالیس رکعات تک کو مستحب قرار دیتے ہیں، امام اسحاق بن راہویہ بھی چالیس رکعات کو مستحب قرار دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک یہ تمام رکعات قیام اللیل کے خصوصی مفہوم یعنی تراویح میں داخل ہیں۔

---

[1] ولا بأس أن يزيد فى عدد الركعات فى العشر الأواخر عن عددها فى العشرين الأول ويقسمها إلى قسمين قسما يصليه فى أول الليل ويخففه على أنه تراويح كما فى العشرين الأول وقسما يصليه فى آخر الليل ويطيله على أنه تهجد فقد كان النبى صلى الله عليه وسلم يجتهد فى العشر الأواخر ما لا يجتهد فى غيرها وكان إذا دخلت العشر الأواخر شمر وشد المئزر وأحيا ليله وأيقظ أهله تحريا لليلة القدر، فالذى يقول لا يزيد فى آخر الشهر عما كان يصليه فى أول الشهر مخالف لهدى النبى صلى الله عليه وسلم ومخالف لما كان عليه السلف الصالح من طول القيام فى آخر الشهر فى آخر الليل فالواجب اتباع سنته صلى الله عليه وسلم وسنة الخلفاء الراشدين من بعده وحث المسلمين على صلاة التراويح وصلاة القيام لا تخذيلهم عن ذلك وإلقاء الشبه التى تقلل من اهتمامهم بقيام رمضان.

وبالله التوفيق، وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم.

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء

عضو	عضو	عضو
بكر أبو زيد	صالح الفوزان	عبد الله بن غديان
نائب الرئيس		الرئيس
عبد العزيز آل الشيخ		عبد العزيز بن عبد الله بن باز

(فتاویٰ اللجنة الدائمة، المجموعة الثانية، ج٦، ص ٨٣، رقم الفتویٰ: ١٩٨٥٤)

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ باوجود، اس کے کہ وہ بیس رکعات کو سنت قرار دیتے ہیں، مگر وہ بھی بیس رکعات سے زیادہ کو باجماعت پڑھنا جائز قرار دیتے ہیں، بلکہ تراویح کے بعد مزید نوافل کی جماعت کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ فقہائے کرام بیس رکعات سے زیادہ قیامِ رمضان، یا تراویح، یا تطوع کے عنوان سے باجماعت مکروہ ہونے کے قائل نہیں، جبکہ امام مالک عام نوافل کو کثیر مجمع اور مشہور مقام میں مکروہ کہتے ہیں، مگر وہ رمضان میں بیس سے زیادہ چھتیس یا چالیس رکعات کو تراویح، یا قیامِ رمضان ہونے کی وجہ سے ہی جائز قرار دے رہے ہیں۔

اور بعض حضرات خصوصیت کے ساتھ رمضان کے آخری عشرہ میں قیام اللیل کی کمیت زیادہ ہونے کے قائل ہیں، کیونکہ اس عشرہ میں عبادت کی کثرت کا نصوص میں ذکر آیا ہے، جن کا ذکر پہلے اپنے مقام پر گزر چکا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب سے ''قیامِ رمضان'' اور ''تطوع فی شھرِ رمضان'' کی باجماعت ادا کرنے کے جواز کی تصریح منقول ہے، لیکن بیس سے زائد رکعات کو باجماعت ادا کرنے کی کراہت یا عدمِ جواز کی تصریح منقول نہیں۔

البتہ متعدد مشائخِ حنفیہ کے نزدیک رمضان میں تراویح کے علاوہ نوافل باجماعت پڑھنا اور بعض حضرات کے نزدیک بیس رکعات تراویح سے زیادہ باجماعت پڑھنا مکروہ ہے، مگر بعض مشائخِ حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے، وہ رمضان میں بیس تراویح سے زائد اور نوافل یا تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اب ذیل میں اس کے متعلق حنفیہ کی عبارات ملاحظہ فرمائیں۔

''موطأ امام محمد'' کا حوالہ

امام محمد رحمہ اللہ (المتوفی: 179ھ) ''مؤطا امام محمد'' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رمضان کی

چندراتوں میں باجماعت ''تطوع'' پڑھنے اور''قیامِ رمضان'' کی ترغیب اورفضیلت والی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وبهذا كله نأخذ لا بأس بالصلاة فى شهر رمضان أن يصلى الناس تطوعا بإمام لأن المسلمين قد أجمعوا على ذلك ورأوه حسنا. وقد روى عن النبى صلى الله عليه و سلم أنه قال :ما رآه المؤمنون حسنا فهو عند الله حسن وما رآه المسلمون قبيحا فهو عند الله قبيح (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن، ج ۱، ص۳۵۵، ابواب الصلاة ،باب قيام شهر رمضان وما فيه من الفضل)

ترجمہ: اوراسی سب کوہم لیتے ہیں، رمضان کے مہینہ میں اس طرح نماز پڑھنے میں حرج نہیں کہ لوگ امام کی اقتداء میں ''تطوع'' کی نماز پڑھیں، کیونکہ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے، اورانہوں نے اس کو اچھا عمل سمجھا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ جس چیز کو مومن اچھا سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک اچھی ہوتی ہے، اور جس کو مسلمان قبیح سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بھی قبیح ہوتی ہے (موطأ امام محمد)

امام محمد رحمہ اللہ نے رمضان کے مہینہ میں باجماعت ''تطوع'' کو جائز قرار دیا ہے۔

مذکورہ عبارت میں ''تطوع'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

پھراس کی یہ دلیل دی گئی ہے کہ رمضان کے مہینہ میں باجماعت ''تطوع'' ادا کرنے پر مسلمانوں کا اجماع ہے، اوراس کو انہوں نے اچھا عمل سمجھا ہے، پھراس کی دلیل میں ایک حدیث کو پیش کیا گیا ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ نے مذکورہ عبارت میں جس حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، وہ دراصل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر ہے، جس کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے

روایت کیا ہے، اور یہ حکماً مرفوع ہے۔[1]

''مؤطا امام محمد '' کی شرح ''التعلیق الممجد ''میں علامہ عبدالحیی لکھنوی رحمہ اللہ (1225ھ) مذکورہ عبارت کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أقول : كلام محمد -رحمه الله تعالى -ههنا صاف من الكدورات لأنه إنما استدل بهذا الحديث على حسن قيام رمضان بالجماعة، وهو أمر استحسنه الصحابة والتابعون والأئمة المجتهدون والعلماء الكاملون، وما استحسنه هؤلاء فهو عند الله حسن بلا ريب، وما استقبحه هؤلاء فهو عند الله قبيح بلا ريب، وبالجملة فهذا الحديث نعم الدليل على حسن ما استحسنه الصحابة وغيرهم من المجتهدين، وقبح ما استقبحوه، وأما ما استحسنه غيرهم من العلماء فالمرجع فيه إلى القرون الثلاثة، أو إلى دخوله فى أصل من الأصول الشرعية، فما لم يوجد فى القرون الثلاثة، ولم يستحسنه أهل الاجتهاد ولم يوجد له دليل صريح أو ما يدخل فيه من الأصول الشرعية، فهو ضلالة بلا ريب، وإن استحسنه مستحسن، فافهم(التعليق الممجد على موطأ محمد ،لمحمد عبد الحى اللكنوى الهندى، ج ۱، ۶۳۴، كتاب الصلاة ،باب قيام شهر رمضان وما فيه من الفضل)

---

[1] عن عبد الله بن مسعود، قال: " إن الله نظر فى قلوب العباد، فوجد قلب محمد صلى الله عليه وسلم خير قلوب العباد، فاصطفاه لنفسه، فابتعثه برسالته، ثم نظر فى قلوب العباد بعد قلب محمد، فوجد قلوب أصحابه خير قلوب العباد، فجعلهم وزراء نبيه، يقاتلون على دينه، فما رأى المسلمون حسنا، فهو عند الله حسن، وما رأوا سيئا فهو عند الله سيء "(مسند الإمام أحمد بن حنبل، رقم الحديث ۳۶۰۰)

قال شعيب الارنؤوط:إسناده حسن من أجل عاصم -وهو ابن أبى النجود-، وبقية رجاله ثقات رجال الشيخين غير أبى بكر -وهو ابن عياش-، فمن رجال البخارى، وأخرج له مسلم فى "المقدمة (حاشية مسند احمد)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ یہاں پر امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا کلام کدورات سے صاف ہے، کیونکہ انہوں نے اس حدیث سے ''قیامِ رمضان'' کے باجماعت ادا کرنے کے اچھا عمل ہونے پر استدلال کیا ہے، اور یہ ایسا عمل ہے، جس کو صحابہ اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین اور علمائے کاملین نے اچھا سمجھا ہے، اور جس عمل کو یہ حضرات اچھا سمجھیں، وہ عمل بلاشبہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوتا ہے، اور جس عمل کو یہ حضرات برا سمجھیں، وہ عمل بلاشبہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہوتا ہے، خلاصہ یہ کہ یہ حدیث اس بات کی نہایت عمدہ دلیل ہے کہ جس عمل کو صحابہ اور ان کے علاوہ مجتہدین اچھا سمجھیں، وہ اچھا ہوتا ہے، اور جس عمل کو یہ برا سمجھیں، وہ برا ہوتا ہے، اور جس عمل کو ان حضرات کے علاوہ دوسرے علماء اچھا سمجھیں، تو اس کا مرجع قرونِ ثلاثہ ہوگا (جس کا حدیث ''خیر القرون قرنی، الخ'' میں ذکر آیا ہے) یا اس کا مرجع شریعت کے قواعد میں سے کسی قاعدہ میں داخل ہونا ہوگا، پس جو عمل قرونِ ثلاثہ میں نہ پایا جائے، اور نہ ہی اس کو اہلِ اجتہاد اچھا سمجھیں، اور نہ ہی اس کی کوئی صریح دلیل پائی جائے، اور نہ ہی شریعت کے قاعدوں میں سے کوئی ایسا قاعدہ پایا جائے، جس کے تحت میں وہ داخل ہو، تو وہ بلاشبہ ضلالت ہوگا، اگرچہ اس کو کوئی اچھا سمجھنے والا اچھا کیوں نہ سمجھے، یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے (التعلیق الممجد)

یہ بات باحوالہ تفصیل کے ساتھ پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ بیس سے زائد یعنی چھتیس یا چالیس رکعات ''قیامِ رمضان'' اور ''تطوعِ رمضان'' کو باجماعت تابعین کے دور میں ادا کیا گیا ہے، جو خیرالقرون میں داخل ہے، اور اس کو امام مالک اور اسحاق بن راہویہ جیسے مجتہدین نے مستحسن قرار دیا ہے، اور اس دور میں اس پر نکیر نہیں کی گئی، لہٰذا مذکورہ تفصیل کے پیشِ نظر بیس سے زائد چھتیس یا چالیس رکعات کو عدمِ جواز کا حکم دیا جانا مشکل معلوم ہوتا ہے،

بالخصوص جبکہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ سے بیس سے زائد رکعات کے باجماعت ادا کرنے کے مکروہ ہونے کی تصریح بھی منقول نہیں، بلکہ اس کے برعکس قیامِ رمضان اور تطوعِ رمضان کے مطلق الفاظ کے ساتھ جواز منقول ہے۔

اور اس میں فی نفسہٖ جس طرح رمضان کی راتوں کی تمام ''تطوعات'' داخل ہونے کا احتمال ہے، اسی طرح بیس سے زائد رکعات پر تراویح کے اطلاق کا بھی احتمال ہے، قطع نظر اس سے کہ کون کس احتمال کو راجح سمجھتا ہے، اور کون مرجوح سمجھتا ہے۔

''کتابُ الاصل'' کا حوالہ

امام محمد رحمہ اللہ ''کتابُ الاصل'' میں ''سورج گرہن کی نماز'' کے باب میں فرماتے ہیں:

قلت :وترى فى كسوف القمر صلاة؟ قال :نعم، الصلاة فيه حسنة .قلت :فهل يصلون جماعة كما يصلون فى كسوف الشمس؟ قال :لا.

قلت :فهل تكره الصلاة فى التطوع جماعة ما خلا قيام رمضان وصلاة كسوف الشمس؟ قال :نعم، ولا ينبغى أن يصلى فى كسوف الشمس جماعة إلا الإمام الذى يصلى الجمعة ، فأما أن يصلى الناس فى مساجدهم جماعة فإنى لا أحب ذلك، وليصلوا وحداناً (الأَصْلُ، لمحمد بن الحسن بن فرقد الشيبانى، ج ۱، ص ۳۶۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الكسوف)

ترجمہ: میں نے (امام ابوحنیفہ سے) کہا کہ آپ چاند گرہن میں نماز پڑھنے کی رائے رکھتے ہیں؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ بے شک! اس میں نماز پڑھنا بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ کیا لوگ سورج گرہن کی طرح نماز پڑھیں گے؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ نہیں۔

میں نے کہا کہ کیا ''تطوع'' کو جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے، سوائے قیامِ رمضان اور سورج گرہن کی نماز کے؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ جی ہاں! اور سورج گرہن میں نماز پڑھانا مناسب نہیں ہے، سوائے اس امام کے جو جمعہ پڑھاتا ہے، اور اگر لوگ اپنی مسجدوں میں جماعت کے ساتھ سورج گرہن کی نماز پڑھیں، تو میں اس کو پسند نہیں کرتا، ایسی صورت میں چاہیے کہ وہ تنہا نماز پڑھیں

(کتابُ الاصل)

مذکورہ عبارت میں قیامِ رمضان اور سورج گرہن کی نماز کے علاوہ باقی تطوعات کو باجماعت پڑھنا مکروہ قرار دیا گیا ہے، اور باقی ''تطوعات'' میں چاند گرہن اور استسقاء کی نماز بھی داخل ہے، مگر متعدد مشائخِ حنفیہ نے اس کی توجیہ سنیت کی نفی سے کی ہے، جس کا مآل جواز نکلتا ہے، اسی وجہ سے انہوں نے استسقاء اور چاند گرہن کی نماز باجماعت ادا کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

مذکورہ عبارت میں بھی ''تطوع'' باجماعت ادا کرنے کے غیر مکروہ ہونے میں قیامِ رمضان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے امام محمد رحمہ اللہ کی ''کتابُ الاصل'' والی مذکورہ عبارت کا ''عیدین کے باب'' میں ذکر فرمایا ہے، اس میں اگرچہ انہوں نے الفاظ کچھ مختلف نقل کیے ہیں، لیکن اس میں بھی قیامِ رمضان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ [1]

اس کے علاوہ ''المحیطُ البرھانی'' میں بھی ''کتابُ الاصل'' کی مذکورہ عبارت کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں ''قیامِ رمضان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ [2]

---

[1] وقال فی الأصل :لا یصلی التطوع فی الجماعة ما خلا قیام رمضان وکسوف الشمس(المبسوط،لشمس الأئمة السرخسی، ج۲، ص۳۷، کتاب الصلاة، باب صلاة العیدین)

[2] ولا یصلی تطوع بجماعة إلا قیام رمضان فقد استثنی عن النهی قیام رمضان، وکما أن قیام رمضان مستثنی عن النهی فصلاة الکسوف یجوز أداؤها بالجماعة مع أنها تطوع ذکر محمد فی الأصل (المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی، ج۱، ص۴۳۸، کتاب الصلاة، الفصل العشرون فی صلاة التطوع)

علامہ ابنِ ہمام نے بھی ''فتحُ القدیر ''میں ''حاکم'' کی ''کتابُ الکافی ''کے حوالہ سے ''تطوع'' کی نماز کا سوائے قیامِ رمضان اور صلاۃِ کسوف کے مکروہ ہونا نقل کیا ہے۔[1]

نیز ''المحیطُ البرھانی ''میں ایک اور مقام پر امام محمد کی ''کتابُ الاصل '' کی اسی عبارت کا ذکر کیا گیا ہے۔[2]

البتہ ''المحیطُ البرھانی ''میں ایک مقام پر امام محمد رحمہ اللہ کی ''کتابُ الاصل '' کی عبارت کا ذکر کرتے ہوئے ''قیامِ رمضان '' کے بجائے تراویح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔[3]

اولاً تو امام محمد رحمہ اللہ سے تراویح کے بجائے ''قیامِ رمضان ''اور ''تطوع فی شھرِ رمضان '' کے الفاظ مروی ہیں، جن کی تراویح کے ساتھ تعبیر شمس الائمہ سرخسی وغیرہ مشائخِ حنفیہ کی طرف سے کی گئی ہے، اور امام محمد رحمہ اللہ کی اصل عبارت میں جو ''تطوع ''اور ''قیامِ رمضان '' کے الفاظ مذکور ہیں، وہ تراویح کے علاوہ قیامِ رمضان کی عمومی مراد کو بھی شامل ہونے کا احتمال رکھتے ہیں۔

دوسرے تراویح کا اطلاق جس طریقہ سے بیس رکعات پر ہوتا ہے، اسی طریقہ سے بیس سے زائد رکعات پر بھی اس کا اطلاق ہوسکتا ہے، چنانچہ چھتیس یا چالیس رکعات پر امام مالک اور اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ جیسے مجتہدین نے اطلاق کیا ہے۔

---

[1] وقد صرح الحاکم أیضا فی باب صلاۃ الکسوف من الکافی بقولہ ویکرہ صلاۃ التطوع جماعۃ ما خلا قیام رمضان وصلاۃ الکسوف(فتح القدیر، ج۲،ص ۹۲، کتاب الصلاۃ،باب الاستسقاء)

[2] وھکذا قال فی الکتاب :ویکرہ فی صلاۃ التطوع جماعۃ ما خلا قیام رمضان، وصلاۃ کسوف الشمس(المحیط البرھانی فی الفقہ النعمانی، ج۲،ص ۱۳۸، کتاب الصلاۃ،الفصل التاسع والعشرون فی صلاۃ الکسوف)

[3] وقال محمد رحمہ اللہ فی کتاب الصلاۃ لا یقام شیء من التطوع بجماعۃ ما خلا التراویح فی رمضان، وکسوف الشمس، وصلاۃ العیدین تؤدی بجماعۃ لو کان صلاۃ العید تطوعا لقال ما خلا التراویح فی رمضان وکسوف الشمس وصلاۃ العیدین(المحیط البرھانی فی الفقہ النعمانی، ج۲،ص ۹۴، کتاب الصلاۃ،الفصل السادس والعشرون)

لہٰذا امام محمد رحمہ اللہ کی عبارت سے خاص تراویح اور وہ بھی بیس کے عدد کے ساتھ باجماعت ادا کرنے کے جواز اور باقی رکعات کے باجماعت پڑھنے کے مکروہ یا عدمِ جواز پر صریح دلالت نہیں پائی جاتی، البتہ بعض مشائخِ حنفیہ نے اپنے اجتہاد سے اس تخصیص پر دلالت مانی ہے، جبکہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے عموم پر دلالت کو ترجیح دی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

شمسُ الائمۃ سرخسی کا حوالہ

شمسُ الائمۃ سرخسی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 483ھ) فرماتے ہیں:

(الفصل الأول فی عدد الرکعات)فإنها عشرون رکعة سوی الوتر عندنا وقال مالک -رحمه الله تعالی -السنة فیها ستة وثلاثون قیل من أراد أن یعمل بقول مالک -رحمه الله تعالی -ویسلک مسلکه ینبغی أن یفعل .کما قال أبو حنیفة -رحمه الله تعالی - یصلی عشرین رکعة کما هو السنة ویصلی الباقی فرادی کل تسلیمتین أربع رکعات وهذا مذهبنا وقال الشافعی -رحمه الله تعالی -لا بأس بأداء الکل جماعة کما قال مالک -رحمه الله تعالی -بناء علی أن النوافل بجماعة مستحب عنده وهو مکروه عندنا(المبسوط،لشمس الأئمة السرخسی، ج۲،ص۱۴۵، کتاب التراویح،الفصل الأول)

ترجمہ: پہلی فصل تراویح کی رکعات کی تعداد کے بارے میں ہے، پس یہ ہمارے نزدیک وتروں کے علاوہ بیس (20) رکعتیں ہیں، اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تراویح میں سنت چھتیس (36) رکعات ہیں۔

کہا گیا ہے کہ جو امام مالک رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنا چاہے، اور ان کے مسلک

پر چلنا چاہے، تو اس کے لیے ایسا کرنا مناسب ہے۔

جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ بیس رکعتیں پڑھی جائیں گی، اسی طرح سنت ہے، اور باقی رکعتیں تنہا پڑھی جائیں گی، ہر چار رکعتیں دو سلاموں کے ساتھ، اور یہ ہمارا مذہب ہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام رکعتوں کو جماعت کے ساتھ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس بنیاد پر کہ نوافل کی جماعت ان کے نزدیک مستحب ہے، اور ہمارے نزدیک مکروہ ہے (المبسوط)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک چھتیس رکعات تراویح کو باجماعت پڑھنا سنت ہے، اور جو کوئی ان کے مسلک پر عمل کرنا چاہے، اس کے لیے جائز ہے۔

اور یہ جواز غالباً مذہبِ معین کا لزوم نہ ہونے کے قول پر مبنی ہے، جس کو متعدد حضرات نے راجح قرار دیا ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہماری دوسری کتاب ''فقہ واجتہاد میں توسع واعتدال'') [1]

---

[1] علامہ عبدالحیئ لکھنوی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

جوازِ تقلیدِ شخصی کا عقیدہ محققینِ حنفیہ کے موافق ہے، علامہ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی حنفی رحمہ اللہ القوی ''شرح مسلم الثبوت'' میں لکھتے ہیں:

''لایجب الاستمرار ویصح الانتقال وھذا ھو الحق الذی ینبغی ان یؤمن ویعتقد بہ''

''ہمیشہ ایک ہی شخص کا مقلد رہنا واجب نہیں ہے، بلکہ ایک مذہب کو چھوڑ کے دوسرا مذہب اختیار کر لینا جائز ہے، اور یہی درست ہے، اس پر ایمان لانا چاہیے اور اس کا اعتقاد رکھنا چاہیے''

علامہ ابنِ ہمام حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لو التزم مذھبا معینا کابی حنیفۃ والشافعی رحمھما اللہ فقیل یلزمہ وقیل لا وھو الاصح''

اگر کسی خاص مذہب کو لازم کرلیا، مثلاً ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کا مذہب تو بعضوں کے نزدیک اس مذہب کی تقلید واجب ہے، اور بعضوں کے نزدیک نہیں، اور یہی صحیح ہے''

اور علامہ شرنبلالی حنفی رحمہ اللہ نے ''عقد الفرید'' میں لکھا ہے:

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

فتاویٰ قاضی خان کا حوالہ

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

فإن صلوا بالجماعة ستاً وثلاثين كما قال مالك رحمه الله تعالى لا بأس به عند الشافعي رحمه الله تعالى وعندنا أن صلوا

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

"ليس على الإنسان إلتزام مذهب معين"

''لازم نہیں ہے انسان پر مذہبِ معین کا التزام''

اور یہی علامہ محمد عبدالعظیم حنفی مفتیِ مکہ وشاہ ولی اللہ محدث دہلوی وشاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وامیر حاج سید بادشاہ وقاضی ابوعاصم رحمہم اللہ کا مختار ہے، جن کا شمار کبارِ مشائخِ احناف میں ہے (مجموعہ فتاویٰ عبدالحیی، ج۳ص ۱۹۸، ۱۹۹، کتاب التقلید، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی)

علامہ شرنبلالی کے رسالہ ''العقد الفرید'' کی اصل عبارت مندرجہ ذیل ہے:

فتحصل مما ذكرناه أنه ليس على الإنسان إلتزام مذهب معين، وأنه يجوز له العمل بما يخالف ما عمله على مذهبه، مقلِّداً فيه غير إمامه، مستجمعاً شروطه(العقد الفريد لبيان الراجح من الخلاف فى جواز التقليد، ص ١٨، متى يلزم العمل بقول المفتي؟)

ثم اعلم أنه ذكر فى التحرير وشرحه أيضا أنه يجوز تقليد المفضول مع وجود الأفضل .وبه قال الحنفية والمالكية وأكثر الحنابلة والشافعية .وفى رواية عن أحمد وطائفة كثيرة من الفقهاء لا يجوز .ثم ذكر أنه لو التزم مذهبا معينا .كأبى حنيفة والشافعى، فقيل يلزمه، وقيل لا وهو الأصح اهـ وقد شاع أن العامى لا مذهب له.

إذا علمت ذلك ظهر لك أن ما ذكر عن النسفى من وجوب اعتقاد أن مذهبه صواب يحتمل الخطأ مبنى على أنه لا يجوز تقليد المفضول وأنه يلزمه التزام مذهبه وأن ذلك لا يتأتى فى العامى.

وقد رأيت فى آخر فتاوى ابن حجر الفقهية التصريح ببعض ذلك فإنه سئل عن عبارة النسفى المذكورة، ثم حرر أن قول أئمة الشافعية كذلك، ثم قال إن ذلك مبنى على الضعيف من أنه يجب تقليد الأعلم دون غيره.

والأصح أنه يتخير فى تقليد أى شاء ولو مفضولا وإن اعتقده كذلك، وحينئذ فلا يمكن أن يقطع أو يظن أنه على الصواب، بل على المقلد أن يعتقد أن ما ذهب إليه إمامه يحتمل أنه الحق .قال ابن حجر :ثم رأيت المحقق ابن الهمام صرح بما يؤيده حيث قال فى شرح الهداية :إن أخذ العامى بما يقع فى قلبه أنه أصوب أولى، وعلى هذا استفتى مجتهدين فاختلفا عليه الأولى أن يأخذ بما يميل إليه قلبه منهما .وعندى أنه لو أخذ بقول الذى لا يميل إليه جاز؛ لأن ميله وعدمه سواء ، والواجب عليه

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

بالجماعة عشرين ركعة وما زاد على ذلك إلى ست وثلاثين فرادى فرادى فهو مستحب وإن صلوا الزيادة بالجماعة يكره بناء على أن التنفل بالجماعة غير التراويح مكروه عندنا وعنده ليس بمكروه

(فتاوى قاضى خان، ج ١، ص١٦٨، كتاب الصوم، باب التراويح، فصل فى مقدار التراويح)

ترجمہ: پھر اگر لوگ جماعت کے ساتھ چھتیس (36) رکعات تراویح پڑھیں، جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، تو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی حرج نہیں (بلکہ امام احمد کے نزدیک بھی حرج نہیں، کما مر) اور ہمارے نزدیک اگر بیس رکعتیں جماعت کے ساتھ پڑھیں، اور اس سے زیادہ چھتیس رکعات تک تنہا تنہا پڑھیں، تو یہ مستحب ہے، اور اگر بیس سے زائد جماعت کے ساتھ پڑھیں، تو ہمارے نزدیک مکروہ ہے، اس بناء پر کہ تراویح کے علاوہ نفل جماعت کے ساتھ پڑھنا ہمارے نزدیک مکروہ ہے، اور ان کے نزدیک مکروہ نہیں

(فتاویٰ قاضی خان)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

تقليد مجتهد وقد فعل .اهـ.(رد المحتار على الدر المختار، ج ١، ص٤٨، مقدمة)

(وقيل لا) يجب الاستمرار ويصح الانتقال وهذا هو الحق الذى ينبغى أن يؤمن ويعتقد به لكن ينبغى أن لا يكون الانتقال للتلهى فان التلهى حرام قطعا فى التمذهب كان أو فى غيره (إذ لا واجب إلا ما أوجبه الله تعالى) والحكم له (ولم يوجب على أحد أن يتمذهب بمذهب رجل من الأئمة) فايجابه تشريع شرع جديد ولك أن تستدل عليه بان اختلاف العلماء رحمة بالنص وترفيه فى حق الخلق فلو لزم العمل بمذهب كان هذا نقمة وشدة .

(وقيل) من التزم (كمن لم يلتزم فلا يرجع عما قلده فيه وفى غيره يقلد من شاء وعليه السبكى) من الشافعية (وفى التحرير وهو الغالب على الظن لعدم ما يوجبه شرعا) أى لانه ليس للاتباع لمذهب واحد موجب شرعى وهذا انما يدل على جزء الدعوى هو انه يقلد من شاء ثم البيان قطعى إذ ما لم يوجبه الشرع باطلا لان التشريع بالرأى حرام وأما أنه لا يرجع عما قلد فيه فلم يلزم منه قطعا فلا ينطبق الدليل على الدعوى (فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، ج ٢، ص٤٣٧، ٤٣٨، خاتمة : الاجتهاد بذل الطاقة من الفقيه، مطبوعة: دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الاولىٰ: 1423هـ . 2002ء)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مشائخِ حنفیہ کے نزدیک بیس رکعات تراویح سے زیادہ چھتیس رکعات کو باجماعت ادا کرنا مستحب نہیں، بلکہ مکروہ ہے۔

اور مالکیہ وشافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک مکروہ نہیں، خواہ اس کی وجہ مذکورہ رکعات کا قیامِ رمضان کی خصوصی مراد یعنی تراویح میں داخل ہونا ہو، یا بیس سے زائد کا تطوع میں داخل ہونا اور تطوع کا باجماعت جائز ہونا ہو۔

’’المحیطُ البرهانی‘‘ کا حوالہ

’’المحیطُ البرهانی‘‘ میں ہے:

وأما الكلام فی كمیتها، فنقول إنها مقدرة بعشرين ركعة عندنا وعند الشافعی رحمه الله، وعند مالك رحمة الله أنها مقدرة بست وثلاثين ركعة اتباعا لعمر وعلی رضی الله عنهما، فإن قاموا بما قال مالك رحمه الله تعالىٰ بالجماعة، فعند الشافعی رحمه الله تعالىٰ لا بأس ، وعندنا يكره بناء على أن التنفل بالجماعة بما شاؤوا يكره، خلافا للشافعی رحمه الله تعالىٰ، وإن أتوا بما زاد على العشرين إلى تمام ست وثلاثين فرادى، فلا بأس به وهو مستحب (المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی، ج ۱، ص ۴۵۶، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر فی التراويح والوتر)

ترجمہ: جہاں تک تراویح کی کمیت وتعداد کے سلسلہ میں کلام کا تعلق ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بیس (20) رکعات کی تعداد مقرر ہے، اور امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک چھتیس (36) رکعات کی تعداد مقرر ہے، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی اتباع کی وجہ سے۔

اگر لوگ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق (چھتیس رکعات) باجماعت

ادا کریں، تو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ (نیز امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ) کے نزدیک کوئی حرج نہیں، اور ہمارے نزدیک مکروہ ہے، اس بناء پر کہ جماعت کے ساتھ نفل نماز جتنی وہ چاہیں مکروہ ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کا اس میں اختلاف ہے۔

لیکن بیس (20) سے زائد چھتیس (36) رکعات تک اگر تنہا پڑھیں، تو (ہمارے نزدیک بھی) کوئی حرج نہیں، بلکہ مستحب ہے (المحیطُ البرهانی)

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ مشائخِ حنفیہ بیس سے زیادہ تراویح کی رکعات کو باجماعت پڑھنا مطلق نوافل کی جماعت کے قاعدہ پر تخریج کرتے ہوئے مکروہ قرار دیتے ہیں، جس سے مکروہ تنزیہی مراد ہونے کا بھی امکان ہے، اور مکروہ تحریمی ہونے کا بھی، اور جب جلیل القدر تابعین اور اہلِ مدینہ کے تعامل سے چھتیس یا چالیس رکعات تک باجماعت پڑھنا ثابت ہے، اور مالکیہ، حنابلہ و شافعیہ اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ سب بحیثیتِ تراویح یا بحیثیتِ تطوع اس کے جواز کے قائل ہیں، تو ہمارا رجحان اس طرف ہے کہ مشائخِ حنفیہ کے نزدیک رمضان میں تراویح سمیت چھتیس یا چالیس رکعات تک باجماعت پڑھنا مکروہ تحریمی کے بجائے مکروہ تنزیہی یا جائز ہو، بالخصوص جبکہ یہ عمل بعض فقہاء کے نزدیک قیامِ رمضان کے مفہوم میں بھی داخل ہے، اور پورے سال مواظبت و دوام کے ساتھ ادا کرنے کے بجائے صرف رمضان میں اس کو اختیار کیا جاتا ہے، جس کے لیے تراویح کی شکل میں تطوع کی جماعت پر اتفاق ہے، ان جیسی وجوہات کی بناء پر ہمیں اس کو مکروہ تحریمی قرار دینا راجح معلوم نہیں ہوتا۔ **كما مر التفصيل بحوالة ردالمحتار في جماعة التطوع۔**

”المحيطُ البرهاني“ کا ایک اور حوالہ

”المحيطُ البرهاني“ میں ایک مقام پر ہے:

ولو أن إماما يصلي التراويح في مسجدين، في كل مسجد على

الکمال لا یجوز؛ لأنه یتکرر، هکذا حکی عن الشیخ الامام الفقیه أبی بکر الإسکاف.

ثم قال أبو بکر، سمعت أبا نصر یقول :یجوز لأهل کِلا المسجدین.

قال الشیخ الامام الفقیه أبو اللیث رحمه الله :قول أبو بکر أحب إلی، وذکر القاضی الإمام أبو علی النسفی رحمه الله :فیمن صلی العشاء والتراویح والوتر فی منزله، ثم أم قوما آخرین فی التراویح ونوی الإمامة کره له ذلک، ولا یکره للمأمومین.

ولو لم ینو الإمامة وشرع فی الصلاة ، فاقتدی الناس به لم یکره لواحد منهما.

والمقتدی إذا صلاها فی مسجدین لا بأس به؛ لأن اقتداء ه فی المسجد الثانی یکون اقتداء المتطوع بمن یصلی السنة، ولکن ینبغی أن یوتر فی المسجد الثانی، هکذا حکی عن الفقیه أبی القاسم رحمه الله معناه لا یوتر فی المسجد الأول، ویوتر فی المسجد الثانی.

ولو صلی التراویح ثم أرادوا أن یصلوها ثانیا،یصلوها فرادی

(المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی، ج ۱ ،ص ۴۵۸، کتاب الصلاۃ،الفصل الثالث عشر فی التراویح والوتر)

ترجمہ: اور اگر ایک امام دو مسجدوں میں تراویح پڑھائے، ہر مسجد میں مکمل (یعنی بیس بیس تراویح) پڑھائے، تو جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں تراویح مکرر ہوجائے گی، شیخ امام فقیہ ابوبکر اسکاف سے اسی طرح مروی ہے۔

پھر ابوبکر اسکاف نے فرمایا کہ میں نے شیخ ابونصر کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (مذکورہ

صورت میں) دونوں مسجد والوں کے لیے جائز ہے۔

شیخ امام فقیہ ابواللیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر اسکاف کا قول مجھے زیادہ پسند ہے، اور قاضی امام ابوعلی نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء اور تراویح اور وتر کی نماز اپنے گھر میں پڑھ لی، پھر وہ دوسری قوم کی تراویح میں امامت کرائے، اور امامت کی نیت کرے، تو اس کو ایسا کرنا مکروہ ہے، اور مقتدیوں کے لیے مکروہ نہیں ہے۔

اور اگر اس نے امامت کی نیت نہیں کی، اور اس نے نماز شروع کر دی، پھر لوگوں نے اس کی اقتداء کی، تو مقتدی اور امام کسی کے لیے بھی مکروہ نہیں ہے۔

اور مقتدی جب دو مسجدوں میں تراویح کی نماز پڑھے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس کا دوسری مسجد میں اقتداء کرنا، دراصل نفل پڑھنے والے کا سنت پڑھنے والے کی اقتداء کرنا کہلائے گا، جس میں کوئی حرج نہیں، لیکن مناسب یہ ہے کہ وہ دوسری مسجد میں وتر پڑھے، اسی طریقہ سے فقیہ ابوالقاسم رحمہ اللہ سے مروی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی مسجد میں وتر نہ پڑھے، بلکہ دوسری مسجد میں وتر پڑھے (تاکہ ایک رات میں دو مرتبہ وتر پڑھنا لازم نہ آئے، جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے "لاوتران فی لیلۃ")

اور اگر لوگوں نے تراویح پڑھ لی، پھر وہ دوبارہ تراویح پڑھنا چاہیں، تو وہ تنہا پڑھیں گے (المحیط البرهانی)

فتاویٰ قاضی خان میں بھی یہی تفصیل مذکور ہے۔ [1]

---

[1] ولو صلى إمام واحد التراويح فی مسجدين كل مسجد على وجه الكمال اختلف المشايخ فيه حكی عن أبی بكر الإسكاف رحمه الله تعالى أنه لا يجوز .قال أبو بكر سمعت أبا نصر أنه قال يجوز لأهل المسجدين جميعاً كما لو أذن المؤذن وأقام وصلى ثم أتى مسجداً آخر فأذن وأقام وصلى معهم فإنه لا يكره وإنما يكره إذا أذن وأقام ولا يصلی معهم كذلك فی التراويح.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اور''الجوهرة النيرة''میں بھی ابوبکر اسکاف اور ابونصر کے دونوں قول مذکور ہیں۔ [1]
مذکورہ عبارات کی توضیح آگے آتی ہے۔

''بدائعُ الصنائع'' کا حوالہ

''بدائعُ الصنائع''میں ہے:

ولا يصلى إمام واحد التراويح فى مسجدين فى كل مسجد على الكمال ولا له فعل ولا يحتسب التالى من التراويح، وعلى القوم أن يعيدوا؛ لأن صلاة إمامهم نافلة، وصلاتهم سنة والسنة أقوى فلم يصح الاقتداء ؛ لأن السنة لا تتكرر فى وقت واحد، وما صلى فى المسجد الأول محسوب، وليس على القوم أن يعيدوا.

ولا بأس لغير الإمام أن يصلى التراويح فى مسجدين؛ لأنه اقتداء المتطوع بمن يصلى السنة، وأنه جائز كما لو صلى المكتوبة ثم أدرك الجماعة ودخل فيها والله أعلم.

إذا صلوا التراويح ثم أرادوا أن يصلوها ثانيا يصلون فرادى لا بجماعة؛ لأن الثانية تطوع مطلق، والتطوع المطلق بجماعة

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ولو صلى التراويح مرتين فى مسجد واحد يكره كما لو أذن وأقام مرتين فى مسجد واحد واختار الفقيه أبو الليث رحمه الله تعالى قول أبى بكر رحمه الله تعالى وهذا إذا أم للناس مرتين فإن لم يكن إماماً وصلى التراويح فى مسجد بجماعة ثم أدرك جماعة فى مسجد آخر فدخل معهم وصلى لا بأس به كما لو صلى المكتوبة ثم أدرك الجماعة جاز أن يصلى معهم إلا الفجر والعصر(فتاوى قاضى خان، ج ١، ص١٦٧، كتاب الصوم، باب التراويح)

[1] ولو صلى الإمام التراويح فى مسجدين فى كل مسجد على الكمال قال أبو بكر الإسكاف لا يجوز.
وقال أبو نصر يجوز لأهل المسجدين واختار أبو الليث قول الإسكاف. وهو الصحيح(الجوهرة النيرة، ج ١، ص٩٨، كتاب الصلاة، باب قيام شهر رمضان)

مکروہ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ۱، ص ۲۸۹، کتاب الصلاۃ، فصل فی سنن صلاۃ التراویح)

ترجمہ: اور ایک امام دو مسجدوں میں مکمل تراویح نہیں پڑھا سکتا، اس کو ایسا کرنا جائز نہیں، اور دوسری مسجد کی نماز، تراویح میں شمار نہیں ہوگی، اور دوسری مسجد کے مقتدیوں کو تراویح کے اعادہ کرنے کا حکم ہوگا، کیونکہ ان کے امام کی نماز نفل ہے، اور ان مقتدیوں کی نماز سنت ہے، اور سنت کا درجہ زیادہ قوی ہوتا ہے، لہٰذا اقتداء درست نہیں ہوگی، کیونکہ ایک وقت میں سنت مکرر نہیں ہوتی، اور پہلی مسجد میں جو نماز پڑھائی وہ تراویح میں شمار ہوگی، اور اس مسجد کے مقتدیوں کو اعادہ کا حکم نہیں ہوگا۔

اور امام کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے دو مسجدوں میں (بیس بیس) تراویح پڑھنے میں حرج نہیں، کیونکہ یہ نفل پڑھنے والے کی اقتداء کرنا ہے، اس امام کی جو سنت پڑھتا ہے، اور یہ جائز ہے، جیسا کہ کوئی فرض نماز پڑھنے کے بعد، جماعت کو پائے، اور جماعت میں شامل ہوجائے (اس میں بھی حرج نہیں) واللہ اعلم۔

جب لوگوں نے تراویح پڑھ لی، پھر وہ دوسری مرتبہ تراویح پڑھنا چاہیں، تو وہ تنہا پڑھیں گے، جماعت کے ساتھ نہیں پڑھیں گے، کیونکہ دوسری نماز مطلق تطوع میں داخل ہے، اور مطلق تطوع جماعت کے ساتھ مکروہ ہے (بدائعُ الصنائع)

''البحرُ الرائق ''میں بھی خلاصہ کے حوالہ سے یہی حکم مذکور ہے۔ [1]

اور''الفتاویٰ البزازیة''میں بھی اسی طرح ہے۔ [2]

---

[1] وفی الخلاصة....إمام یصلی التراویح فی مسجدین کل مسجد علی وجه الکمال لا یجوز لأنه لا یتکرر ولو اقتدی بالإمام فی التراویح وهو قد صلی مرة لا بأس به ویکون هذا اقتداء المتطوع بمن یصلی السنة ولو صلوا التراویح ثم أرادوا أن یصلوا ثانیا یصلون فرادی انتهی(البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج ۲، ص ۷۳، باب الوتر والنوافل، صلاة التراویح)

[2] الإمامة فی التراویح مرتین تکره لأنه لم یشرع مکرراً ولو أم فی الأول ثم صلی فی الثانی مقتدیاً أو اقتدی مرتین لا یکره وهو اقتداء المتطوع فی السنن *صلوها بجماعة ثم أرادوا إعادتها بالجماعة یکره بل یصلون فرادی لأن النفل بجماعة علی التداعی یکره إلا بالنص وفی الزائد لم یرد(الفتاوی البزازیة، ج ۱، ص ۱۴، کتاب الصلاة، الثالث التراویح)

اور ’’الفتاویٰ الھندیۃ ‘‘میں ’’المضمرات ‘‘ کے حوالہ سے ابوبکر اسکاف کے قول پر فتویٰ کا حکم مذکور ہے۔ [1]

’’الھدایۃ‘‘ کی شرح ’’البنایۃ‘‘ میں پہلے ایک امام کے دو مسجدوں میں تراویح پڑھانے کی عدمِ کراہت کے قول کو صحیح قرار دیا گیا ہے، اور پھر اس کے بعد محیط اور واقعات کے حوالہ سے اس کا عدمِ جواز مذکور ہے، اور ساتھ ہی دوسری مرتبہ تراویح پڑھنے کی صورت میں، تنہا پڑھنے کا حکم بھی مذکور ہے۔ [2]

’’خلاصۃُ الفتاویٰ‘‘ کا حوالہ

’’خلاصۃُ الفتاویٰ‘‘ میں ہے کہ:

ولو زاد على العشرين بالجماعة يكره عندنا بناء على ان صلاة التطوع بالجماعة مكروه (خلاصۃُ الفتاویٰ، ج ۱ ص ۶۳، کتاب الصلاۃ، الفصل الثالث فی التراویح)

---

[1] ولو صلى التراويح مرتين فی مسجد واحد يكره، كذا فی فتاوی قاضی خان.
إمام يصلی التراويح فی مسجدين فی كل مسجد على الكمال لا يجوز، كذا فی محيط السرخسی والفتوى على ذلك، كذا فی المضمرات.
والمقتدی إذا صلاها فی مسجدين لا بأس به ولا ينبغی أن يوتر فی المسجد الثانی ولو صلى التراويح ثم أرادوا أن يصلوا ثانيا فرادى، كذا فی التتارخانية.
لو صلى العشاء والتراويح والوتر فی منزله ثم أم قوما آخرين فی التراويح ونوى الإمامة كره ولا يكره للقوم ولو لم ينو الإمامة أولا وشرع فی الركوع واقتدى به الناس فی التراويح لم يكره لواحد منهما، كذا فی فتاوی قاضی خان(الفتاوی الهندية، ج ۱،ص ۱۱۶ ،كتاب الصلاة،الباب التاسع فی النوافل،فصل فی التراويح)

[2] ولا بأس بالتراويح فی مسجدين لكن يوتر فی الثانی، واختلفوا فی الإمام والصحيح أنه لا يكره.
وفی "المحيط "و "الواقعات :"إذا صلى الإمام فی مسجدين فی كل واحد منهما على الكمال لا يجوز لأن السنن لا تتكرر فی وقت واحد، فإن صلوها مرة ثانية يصلونها فرادى(البناية شرح الهداية، ج ۲،ص ۵۶۰،باب النوافل،فصل فی قيام شهر رمضان)

ترجمہ: اور اگر بیس رکعات سے زیادہ (تراویح) جماعت کے ساتھ پڑھے، تو یہ ہمارے نزدیک مکروہ ہے، اس بناء پر کہ تطوع کی جماعت مکروہ ہے (خلاصۃ الفتاویٰ)

مشائخِ حنفیہ کی عبارات سے معلوم ہوا کہ رمضان میں تراویح پڑھ کر دوبارہ جماعت کرنا متعدد مشائخِ حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے، اور مذکورہ عبارات سے مراد بظاہر بیس رکعات سے زائد تراویح کی جماعت کا مشائخِ حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہونا معلوم ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ مکروہ تنزیہی ہو، یا مکروہ تحریمی۔

اور یہ حکم مذکورہ مشائخِ حنفیہ کے نزدیک ہے، مالکیہ کے نزدیک تو چالیس رکعات تک تمام ہی قیام اللیل یا تراویح میں داخل ہیں، اور شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک بیس رکعات کے بعد مزید رکعات کی جماعت میں شمولیت جائز ہے، خواہ اس وجہ سے کہ بیس سے زائد رکعات کو تراویح کے تابع قرار دیا جائے، یا ان کو مستقل نوافل کا حکم دیا جائے۔

اور مذکورہ مشائخِ حنفیہ کی عبارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر امام تراویح پڑھ رہا ہو، اور اس کے مقتدی نوافل پڑھ رہے ہوں، تو یہ صورت ان کے نزدیک بھی جائز ہے۔

اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے مشائخِ حنفیہ نے تھوڑے یا زیادہ یا تمام مقتدیوں کے نوافل پڑھنے نہ پڑھنے کی قید نہیں لگائی، جس کے پیشِ نظر بظاہر راجح یہی معلوم ہوا کہ مذکورہ صورتوں کے حکم میں فرق نہیں، اور مذکورہ سب صورتیں حنفیہ کے نزدیک جائز ہیں، لہٰذا بعض اردو فتاویٰ میں جو تھوڑے یا زیادہ مقتدیوں کے تراویح، یا نفل پڑھنے کی بنیاد پر حکم کی تقسیم کی گئی ہے، یہ تقسیم راجح معلوم نہ ہوسکی، کیونکہ اصل بنیاد امام کی حیثیت پر ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا حوالہ

جہاں تک شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1377ھ) کا تعلق ہے، تو انہوں نے مذکورہ مشائخِ حنفیہ کے بیان کردہ موقف کے مقابلہ میں جمہور غیر مشائخِ

حنفیہ کا موقف اختیار کرتے ہوئے بیس سے زائد رکعات کو قیامِ رمضان کے تابع قرار دیتے ہوئے جائز فرمایا ہے۔

چنانچہ رمضان میں نفل کی جماعت سے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد رحمہ اللہ کی تحریر ''روزنامہ الجمعیۃ دہلی شیخ الاسلام نمبر'' میں جو شائع ہوئی تھی، اور اس کو ''فتاویٰ شیخ الاسلام'' میں مولانا مفتی سلمان منصور پوری صاحب نے بھی نقل فرمایا ہے، وہ ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

''فتح القدیر ج اول، باب الاستسقاء ص ۴۳۸ میں ہے۔

وقد صرح الحاکم أیضا فی باب صلاة الکسوف من الکافی بقوله ''ویکره صلاة التطوع جماعة ما خلا قیام رمضان وصلاة الکسوف، وهذا خلاف ما ذکر شیخ الإسلام''. [1]

اور ردالمحتار ج اص ۵۲۳ پر ہے:

قلت ویویده ایضا ما فی البدائع من قوله ان الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان اھ۔

و فیه والنفل بالجماعة غیر مستحب، لانه لم یفعله الصحابة فی غیر رمضان اھ۔

مذکورہ بالا نصوص میں قیامِ رمضان کی تصریح فرمائی گئی ہے، اس کی تخصیص تراویح کے ساتھ نہیں کی گئی، چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیسری شب تک اور صحابۂ کرام سے آخری شب تک نوافل باجماعت پڑھنا منقول ہے، جیسا کہ موطا امام مالک وغیرہ میں بکثرت مروی ہے، اس لیے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھے جائیں، خواہ تراویح ہوں یا تہجد، اوائلِ شب میں ہوں، یا اواخرِ

---

[1] اس عبارت اور امام محمد رحمہ اللہ کی ''کتاب الاصل'' کی عبارت کی توضیح پہلے گزر چکی ہے۔ محمد رضوان۔

شب میں، سب میں جماعت کی اجازت ہوگی۔

موطا امام مالک صفحہ ۱۱۱ میں ہے:

”قال محمد: وبهذا نأخذ، لا بأس بالصلاة فی شهر رمضان، أن يصلى الناسبإمام تطوعا ، لأن المسلمين قد أجمعوا على ذلک اهـ“. [۱]

فتح الباری ج رابع ص ۲۱۵ باب ”فضل من قام رمضان“ میں ہے:

أی قيام لياليه مصليا والمراد من قيام الليل ما يحصل به مطلق القيام كما قدمناه فی التهجد سواء كان قليلا او كثيرا، وذكر النووی أن المراد بقيام رمضان صلاة التراويح يعنی أنه يحصل بها المطلوب من القيام لا أن قيام رمضان لا يكون إلا بها وأغرب الكرمانی فقال اتفقوا على أن المراد بقيام رمضان صلاة التراويح، اهـ.

قلت: قال النووی: المراد بقيام رمضان صلاة التراويح، و لكن اتفاق من اين اخذه بل المراد من قيام الليل ما يحصل به مطلق القيام، سواء كان قليلا او كثيرا، اهـ.

و قال العينی فی الجزء الاول صفحه ۲۸۱ من كتاب الايمان من عمدة القاری ما نصه:

ومعنى من قام رمضان: من قام بالطاعة فی ليالی رمضان، ويقال: يريد صلاة التراويح، وقال بعضهم: لا يختص ذلک بصلاة التراويح بل فی أی وقت صلى تطوعا حصل له ذلک الفضل، اهـ. [۲]

---

[۱] اس عبارت کی توضیح ہماری طرف سے پہلے گزر چکی ہے۔ محمد رضوان۔

[۲] مذکورہ مکمل عبارات مع ترجمہ اور ضروری تشریح کے پہلے ذکر کی جا چکی ہیں۔ محمد رضوان۔

نصوص مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوتے ہیں:

(1) ہر جماعت نوافل کی کراہت مطلقاً نہیں ہے، بلکہ اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں۔

(2) مستثنیات میں لفظِ قیام رمضان اور کسوف کو ذکر کیا گیا ہے۔

(3) امام محمد، اور حاکم اور صاحب بدائع وغیرہ متقدمین (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے لفظ قیام رمضان ذکر فرمایا ہے، جو کہ مخصوص بالتراویح نہیں ہے۔

(4) قیامِ رمضان کو مخصوص بالتراویح کرنا قول مرجوح ہے، جو کہ علامہ کرمانی اور علامہ نووی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اس کے خلاف حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور امام عینی رحمہما اللہ تعالیٰ قیامِ رمضان سے تمام نوافل مراد لے رہے ہیں، خواہ تراویح ہو یا تہجد ہو یا دیگر نوافل، اور امام نووی کے قول کو مؤول قرار دیتے ہوئے اپنے قول کی طرف لوٹاتے ہیں، اور کرمانی کے قول کو غریب اور مخدوش قرار دیتے ہیں، اور یہی امر مدلول مطابقی بھی ہے۔

بنا بریں فتاویٰ رشیدیہ کی تصریح جلد ثانی صفحہ ۵۹ اور جلد اول صفحہ ۴۹ جس میں مستثنیات کو منحصر تراویح کے ساتھ کیا گیا ہے، قول مرجوح پر مبنی ہے، پس رمضان کی جملہ نوافل کی جماعت، خواہ بالتداعی ہو، یا بلا تداعی، سب کی سب ماذون فیہ بلکہ مستحب ہوں گی، اور ترغیب "من قام رمضان" الحدیث، کے تحت داخل ہوں گی، اس پر نکیر کرنا غیر صحیح ہوگا، بلکہ جملہ طاعات، طواف نفل یا عمرہ وغیرہ اسی میں محسوب اور مرغوب فیہ قرار دیئے جائیں گے، **کما ذکر العینی رحمہ اللہ تعالیٰ**۔

ہم نے حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کا عمل بھی مکہ معظّمہ میں اسی پر پایا ہے، اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا بھی یہی معمول تھا، اور حرمین شریفین میں قدیم سے عمل سنت عشریہ

وغیرہ کا جو کہ بالخصوص شوافع کا، اور چالیس رکعت کا عمل جو کہ موالک کا معمول بہ تھا، اور اہلِ مکہ کا قدیمی عمل ہر ترویحہ پر اسبوع طواف کا اسی کا موید ہے، واللہ اعلم

(فتاویٰ شیخ الاسلام، ص۲۴۳، ترتیب: مولانا مفتی سلمان منصور پوری، مطبوعہ: جمعیۃ پبلیکیشنز، لاہور، اشاعتِ دوم:2015ء) [1]

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے نزدیک رمضان میں بیس تراویح سے زائد تطوع کے جواز کے لیے قیامِ رمضان کی نصوص اور رمضان میں تراویح جو کہ تطوع ہے، اس کے مکروہ نہ ہونے، بلکہ باجماعت مشروع ہونے اور قیامِ رمضان کے مفہوم کی وسعت کے اپنے نزدیک راجح ہونے اور چند اکابر اور اہلِ حرمین کے معمول نیز مالکیہ وشافعیہ اور حنابلہ کے قول کو مستدل بنایا ہے، ان سب امور کی تفصیل پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ نے اپنے اجتہاد کے پیشِ نظر ان مشائخِ حنفیہ کے قول کو راجح نہیں سمجھا، جو قیامِ رمضان کے مفہوم کو مخصوص بالتراویح اور مخصوص بالعشرین قرار دیتے ہوئے، اس سے زیادہ کو باجماعت پڑھنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ حنفیہ کی ظاہر الروایۃ اور اصحابِ مذہب کی اصل عبارات میں اس تخصیص کی صراحت نہیں، اور عموم کا احتمال پایا جاتا ہے، جس کا ذکر تفصیلاً پہلے کیا جا چکا۔

اور اس قسم کے فروعی واجتہادی مسائل میں اگر کسی صاحبِ اجتہاد کا خواہ وہ خاص اس جزوی مسئلہ میں ہو، دوسرے اصحابِ تخریج وغیرہ بلکہ اپنے منتسب فقہائے کرام سے مختلف ہو، تو اصولی اعتبار سے اس کو اپنے اجتہاد پر جاری وقائم رہنے کا حکم ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں ہوتا، ہم اس سلسلہ میں شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ کے استدلال وموقف کو ان کے اجتہاد پر محمول کرتے ہیں۔

---

[1] (کذا فی: فقہی مقالات، ج۲، ص۳۷ تا ۳۹، رسالہ: رمضان میں نفل کی جماعت، بعنوان: جواب از حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، منقول از ''شیخ الاسلام نمبر'' صفحہ ۵۴ روزنامہ الجمعیۃ، دہلی، جواب سوال از جماعت نوافل در رمضان غیر تراویح، مطبوعہ: میمن اسلامک پبلشرز کراچی، تاریخ اشاعت: جولائی 1996)

ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ موقف سے اختلاف کرتے ہوئے، اس کا مفصل جواب تحریر فرمایا ہے، اور انہوں نے اس سلسلہ میں پیچھے ذکر کردہ عام مشائخِ حنفیہ کے قول کو راجح قرار دیا ہے، جس میں وہ اپنے مطمحِ نظر کے مطابق حق بجانب ہیں، اس پر کچھ تبصرہ آگے آتا ہے۔
یہ بات ملحوظ رہے کہ اجتہاد میں تجزّی ہونے کا قول راجح ہے، اور کسی مسئلہ میں اجتہاد کے نتیجہ میں جس کا رجحان جس طرف ہو، اس کو اسی کی اتباع کا حکم ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے اپنے اجتہاد کی روشنی میں اپنی رائے کو اختیار فرمایا، دوسرے مشائخِ حنفیہ کا قول ان کے اجتہاد کے مقابلہ میں ان پر حجت نہیں، اگرچہ دوسرے حضرات اپنے حق میں حجت سمجھیں۔ [1]

---

[1] (مسئلة *اختلف فی تجزی الاجتهاد) بأن یکون مجتهدا فی بعض المسائل دون بعض (ویتفرع علیه اجتهاد الفرض) أی من له معرفة فی نصوص فرائض السهام والآثار الواردة فیها (فی الفرائض) یجتهد (فقط) دون غیرها من الأحکام (فالأکثر) قالوا (نعم) یتجزی الاجتهاد (ومنهم) الإمام حجة الإسلام (الغزالی) قدس سره من الشافعیة (و) الشیخ (ابن الهمام) رحمه الله منا ویلوح رضا صاحب البدیع به أیضا (وهو الأشبه) بالصواب (وقیل لا) یتجزی (وتوقف ابن الحاجب لنا کما أقول أوّلا ترک العلم) الحاصل (عن دلیل إلی تقلید) وهو لیس بعلم حقیقة (خلاف المعقول) فلا یلتفت إلیه (کیف وفیه) أی فی التقلید (ریب) عند المقلد هل هو مطابق أم لا وما عن الدلیل خال عن هذا الریب (وقد قال) رسول الله صلی الله علیه وآله وأصحابه وسلم (دع ما یریبک إلی مالا یریبک و) لنا (ثانیا) قوله صل الله علیه وسلم (استفت نفسک وان أفتاک المفتون ففیه ترجیح اجتهاده علی اجتهاد غیره) حیث أمر بالاستفتاء من نفسه ولنا ثالثا إن المجتهد فی البعض یعرف حکمه عن دلیل منصوب من قبل الشارع فیحصل له معرفة حکم الله تعالی بجیب اتباعه ولا یسوغ ترکه بقول أحد فانا انما أمرنا بالاتباع لقول رسول الله صل الله علیه وسلم واتباع غیره بظن أنه حال فإذا علم حکم من قوله صلی الله علیه وآله وأصحابه وسلم فقد ظن أن ما ورائه مخالف لحکمه فیحرم اتباعه ومن له حسن أدب بأحکام الله تعالی لا یتعدی عن هذا الأصل فافهم(فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، الجزء الثانی، صفحة ٤٠٥،٤٠٦، خاتمة : الاجتهاد بذل الطاقة من الفقیه، مطبوعة: دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الاولیٰ:1423ھ . 2002ء)
(المجتهد بعد اجتهاده) ومعرفة الحکم (ممنوع من التقلید فیه جماعا) لان ما علمه حکم الله لا یترکه بقول أحد(فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت،الجزء الثانی، صفحة ٤٢٦،خاتمة : الاجتهاد بذل الطاقة من الفقیه، مطبوعة: دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الاولیٰ: 1423ھ . 2002ء)

چند مشائخِ دیوبند کا حوالہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب کی سوانح شیخ الہند کے حوالہ سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے رمضان کے معمولات میں فرماتے ہیں:

تراویح سے فارغ ہوکر بہت دیر تک حاضرین کو مضامینِ علمیہ اور حکایاتِ اکابر سے محظوظ فرماتے، اور پھر اگر موقع ملتا، تو چند منٹ کے لیے لیٹ جاتے، اس کے بعد نوافل شروع ہوتی، ایک حافظ دو چار پارے سنا کر فارغ ہوکر آرام کرتا، مگر حضرت اسی طرح مستعد رہتے، اور دوسرا حافظ شروع کر دیتا، اسی طرح متعدد حفاظ باری باری کئی کئی پارے سناتے، قاری بدلتے رہتے تھے، مگر مولانا کبھی دو تین بجے تک اور کبھی بالکل سحر کے وقت تک اسی طرح کھڑے سنتے رہتے، بعض رمضان میں فرائض مسجد میں پڑھ کر مکان میں باجماعت خدام وحاضرین تراویح پڑھتے، اور اسی طرح چار چار اور چھ چھ بلکہ کبھی کبھی دس دس پارے تراویح میں پڑھے جاتے، تراویح ختم ہوجاتی، تو کوئی حافظ نوافل میں شروع کر دیتا تھا، تمام رات یہی لطف رہتا (رسالہ ''ضمیمہ فضائل رمضان، المعروف بہ اکابر کا رمضان''، صفحہ ۲۷، ۲۸، ناشر: کتب خانہ یحیوی، متصل مظاہر علوم، سہارنپور، ہندوستان)

اس عبارت میں تراویح ختم ہونے کے بعد نوافل میں حافظ کے قرآن پڑھنے کا ذکر ہے، اور اس کے لیے دو چار افراد کی شمولیت کی قید کا ذکر نہیں، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے اپنی تحریر میں اس کو بطورِ استدلال پیش فرمایا ہے، جیسا کہ گزرا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ فضائلِ رمضان کے ضمیمہ میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

سلہٹ میں حضرت (مدنی) رحمۃ اللہ علیہ نماز اور تراویح کی امامت خود فرماتے، اس لیے تراویح کی شرکت کے لیے دور دراز سے سینکڑوں آدمی آتے، اور تراویح وتہجد کی نماز میں شرکت فرما کر صبح کو سب اپنے گھر روانہ ہو جاتے (رسالہ ''ضمیمہ فضائل رمضان، المعروف بہ اکابر کا رمضان''، صفحہ ۴۴)

مزید فرماتے ہیں:

اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد (حضرت مدنی) مسجد میں تہجد کے لیے تشریف لے جاتے، جو لوگ تہجد کی شرکت کے لیے دور دور سے آتے، وہ سب حضرت (مدنی) نوراللہ مرقدہٗ کے پہنچنے سے پہلے ورنہ پہلی رکعت میں ضرور شریک ہو جاتے (رسالہ ''ضمیمہ فضائل رمضان، المعروف بہ اکابر کا رمضان''، صفحہ ۴۷)

نیز فرماتے ہیں:

تیسویں رمضان چہار شنبہ کو عید کا چاند دیکھنے کے بعد حضرت شیخ (مدنی) مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر تشریف لے گئے، اس شب میں بھی تہجد کی نماز باجماعت ہوئی، اور حضرت نے اس قدر طویل قیام فرمایا کہ سارے رمضان میں کسی رات اتنا طویل قیام تہجد میں نہیں فرمایا، صبح ٹھیک ساڑھے نو بجے حضرت نے اسی مسجد میں عید کی نماز پڑھائی (رسالہ ''ضمیمہ فضائل رمضان، المعروف بہ اکابر کا رمضان''، صفحہ ۴۹)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ بعض مشائخِ حنفیہ، بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ رمضان کی راتوں میں بیس رکعات سے زائد رکعاتِ تطوع میں جماعت کو گوارا کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں سختی وتشدد کے قائل نہیں۔

ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی نے مشائخِ حنفیہ کے مشہور قول کو ترجیح دی ہے، اور انہوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی تحریر میں مذکورہ دلائل کا جواب تحریر فرمایا ہے، جس کے بعد اسی تحریر میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

صاحب مدظلہم العالی نے یہ بھی فرمایا کہ:

آخر میں یہ گزارش ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی عظمتِ شان، جلالتِ قدر اور علمی تبحر کے پیشِ نظر تو اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کی جرائت کسی بڑے عالم کو بھی نہیں ہونی چاہئے، چہ جائیکہ مجھ جیسا طفلِ مکتب اس پر کچھ لکھے۔

لیکن الحمدللہ! جماعتِ دیوبند کی خصوصیت اور انہی بزرگوں کی تعلیم وتلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم دکھائی کہ مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہارِ خیال انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے، اس لیے بنامِ خدا تعالیٰ جو کچھ اس میں تحقیق سے مجھ پر واضح ہوا، وہ لکھ دیا، اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ بزرگوں کی شان میں ادنیٰ ترکِ ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں۔ آمین (فقہی مقالات، جلد۲، صفحہ ۵۵، ۵۶، مطبوعہ: میمن اسلامک پبلشرز، کراچی، اشاعت: جولائی 1996ء)

حضرت شیخ مفتی صاحب موصوف مدظلہم کا مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے کو ادب کے خلاف سمجھنے کی نفی کرنا موجودہ دور کے اہلِ علم حضرات کے لیے قابلِ نمونہ اور بہت اہمیت کا حامل ہے، جس کی خلاف ورزی کی وجہ سے علمی دنیا میں متعدد مفاسد جنم لے رہے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ نے بھی جن مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیا، فقہاء ومشائخِ حنفیہ کی تصریح کے مطابق انہوں نے اس کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فیض بلکہ ان کے اقوال ہی سے تعبیر فرمایا۔[1]

---

[1] روی عن جمیع أصحاب أبی حنیفة من الکبار کأبی یوسف ومحمد وزفر والحسن أنهم قالوا ما قلنا فی مسألة قولا إلا وهی روایة عن أبی حنیفة وأقسموا علیه أیمانا غلاظا (العقود الدریة فی تنقیح الفتاوی الحامدیة، ج ۱، ص ۱۰۹، کتاب الوقف، الباب الأول فی وقف المریض أرضه أو داره فی مرض موته)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مسائل بعض قطعی ہوتے ہیں، ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی، بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں، ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ، مرید نے پیر کے ساتھ، قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ، واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے، اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کی، اور نہ ایک نے دوسرے کو ضال اور عاصی کہا، نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا۔

مسائلِ اجتہادیہ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے، ایک دلائل کے اختلاف سے، جیسے حنفی، شافعی میں ''قرائت خلف الامام'' کے مسئلہ میں، دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے، جیسے امام صاحب اور صاحبین نے نکاحِ صابئات کے مسئلہ میں (تحفۃُ العلماء، جلد۲، صفحہ۹۷، ترتیب: مولانا مفتی محمد زید صاحب، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قلب میں اکابر کی محبت وعظمت اور ان کے علمی وعملی بلند مقام کی وقعت کے باوجود مسائلِ شرعیہ میں دلائل کے پیشِ نظر ان سے اختلافِ رائے واجب ہے (رسالہ ''صبح صادق'' مشمولہ احسن الفتاویٰ جلد۲ صفحہ۱۹۰)

مذکورہ تصریحات کے پیشِ نظر رمضان میں نوافل کی جماعت کے متعلق، حضرت شیخ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی کی طرف سے حضرت مدنی رحمہ اللہ کی تحریر کے جواب میں پیش فرمودہ چند باتیں، جو قابلِ غور محسوس ہوئیں، وہ ذیل میں عرض کی جاتی ہیں۔

ہم یہ پہلے عرض چکے ہیں کہ جزوی اجتہاد کے جمہور کے نزدیک مشروع ہونے کے راجح قول کی بناء پر جس طرح حضرت مدنی رحمہ اللہ کو اپنے اجتہاد کے پیشِ نظر اپنے نزدیک راجح موقف کو اختیار کرنے کا حق ہے، اسی طرح حضرت شیخ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

العالی کو بھی اپنے نزدیک راجح قول کو اختیار کرنے کا حق ہے، اور دونوں حضرات اپنے اپنے اجتہاد کے مکلّف وپابند ہیں، لیکن بعض فقہاء کا قول بعض پر حجت نہ ہونے کی وجہ سے اگر کوئی حضرت مدنی رحمہ اللہ کے موقف کو راجح سمجھتا ہے، اس میں بھی کوئی عیب نہیں، جس طرح حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے موقف کو راجح سمجھنے بلکہ اسے متعدد مشائخِ حنفیہ کا ترجمان قرار دینے میں عیب نہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی اپنے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

تراویح، استسقاء اور کسوف کے علاوہ دوسری نفلوں کی جماعت اگر بالتداعی ہو، تو بہر صورت مکروہ تحریمی ہے، خواہ وہ نفلیں رمضان میں پڑھی جائیں، یا غیر رمضان میں، یہی مسلک عام فقہاء ومحدثین کا ہے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتویٰ اور تعامل رہا ہے (فقہی مقالات، جلد دوم، صفحہ ۴۱، بعنوان: رمضان میں نفل کی جماعت، مطبوعہ: میمن اسلام پبلشرز، کراچی، تاریخِ اشاعت: جولائی 1996ء)

اسی مضمون میں آگے چل کر ایک مقام پر حضرت مفتی صاحب موصوف مدظلہم العالی تحریر فرماتے ہیں:

رمضان کی کسی اور نفل مثلاً تہجد وغیرہ میں کہیں کسی سے جماعت منقول نہیں (ایضاً صفحہ ۴۶)

مزید آگے چل کر حضرت مفتی صاحب موصوف مدظلہم العالی فرماتے ہیں:

’’اس بحث میں فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک جماعت صرف تراویح کی جائز ہے (ایضاً، صفحہ ۵۴، ۵۵)

مذکورہ عبارات سے بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ مخصوص نوافل اور بیس رکعات تراویح کے علاوہ تداعی کے ساتھ نوافل کا باجماعت ادا کرنا رمضان اور غیرِ رمضان میں عام فقہاء ومحدثین کے مسلک اور سلفِ صالحین کے فتوے وتعامل کے مطابق جائز نہیں، بلکہ مکروہ تحریمی ہے، اور رمضان میں بیس رکعات تراویح سے زائد رکعات یا تہجد میں جماعت کا مذکورہ حضرات سے

ثبوت نہیں۔

لیکن محدثین وفقہائے کرام کی عبارات واقوال (جو پیچھے ذکر کیے جا چکے) کے پیشِ نظر اس سے اتفاق مشکل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ شافعیہ وحنابلہ تو عام نوافل کی جماعت کو جائز قرار دیتے ہیں، اور مالکیہ اور اسحاق بن راہویہ (جو کہ مجتہد مطلق ہیں) بیس سے زائد چالیس رکعات تک کو باجماعت پڑھنا سنت یا مستحب اور کم از کم جائز قرار دیتے ہیں، حنابلہ اور شافعیہ بھی اس کے جواز سے متفق ہیں، البتہ بعض شافعیہ جواز کو اہلِ مدینہ کے ساتھ مختص رکھتے ہیں، لیکن حنابلہ وشافعیہ کے نزدیک تراویح کے بعد مزید نوافل باجماعت پڑھنا بھی مکروہ نہیں، اور قیامُ اللیل کے عنوان سے رات کے آخری حصہ میں باجماعت نوافل کا حرمین میں صدیوں سے معمول ہے، تابعین کے دور میں بھی بلانکیر بیس سے زائد رکعات باجماعت پر مدینہ منورہ میں عمل ہوا، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب سے بیس رکعات سے زائد کے باجماعت مکروہ ہونے کی تصریح منقول نہیں، بلکہ ان سے رمضان میں تطوع یا قیامِ رمضان کی جماعت کا جواز مروی ہے، جس سے متعدد مشائخِ حنفیہ مخصوص تراویح کی نماز اور بیس کے مخصوص عدد کو مراد لے کر بیس سے زائد باجماعت ادا کرنے کو غیر مستحب ومکروہ قرار دیتے ہیں، اس کی تفصیل ماسبق میں ذکر کی جا چکی ہے۔

پھر یہ مسلک عام فقہاء ومحدثین کا کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ [1]

---

[1] (ثم الذين يلونهم) ، وهم أتباع التابعين، والمعنى أن الصحابة والتابعين وتبعهم هؤلاء القرون الثلاثة المرتبة فى الفضيلة، ففى النهاية :القرن أهل كل زمان وهو مقدار التوسط فى أعمار أهل كل زمان، مأخوذ من الاقتران، فكأنه المقدار الذى يقترن فيه أهل ذلك الزمان فى أعمارهم وأحوالهم . وقيل :القرن أربعون سنة، وقيل :ثمانون، وقيل :مائة، وقيل :هو مطلق من الزمان، وهو مصدر قرن يقرن .قال السيوطى :والأصح أنه لا ينضبط بمدة فقرنه -صلى الله عليه وسلم -هم الصحابة، وكانت مدتهم من المبعث إلى آخر من مات من الصحابة مائة وعشرين سنة، وقرن التابعين من مائة سنة إلى نحو سبعين، وقرن أتباع التابعين من ثم إلى نحو العشرين ومائتين(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج ۹، ص ۳۸۷۸، كتاب المناقب والفضائل، باب مناقب الصحابة رضى الله عنهم أجمعين)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

جہاں تک متعدد مشائخِ حنفیہ کی طرف سے رمضان میں بیس رکعات سے زائد باجماعت ادا کرنے کو مکروہ قرار دینے کا تعلق ہے، تو اولاً تو اس سے مکروہ تنزیہی مراد ہونے کا احتمال ہے، جس میں گناہ لازم نہیں آتا، چنانچہ علامہ شامی کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ عام نوافل کو جماعت کے ساتھ پڑھنا، اگر تداعی کے ساتھ اتفاقاً واحیاناً ہو، تو حنفیہ کے نزدیک گناہ نہیں، اور رمضان کی بعض راتوں میں تراویح کے بعد نوافل کا باجماعت ادا کرنا، احیاناً میں داخل ہے، بالخصوص جب بیس رکعات سے زائد کے لیے عام مجمع اور ترغیب کا بھی اہتمام نہ ہو، جس طرح بیس رکعات تراویح کے لیے ہوتا ہے۔

دوسرے رمضان المبارک کی راتوں میں بیس سے زائد رکعات، بعض اقوال کے پیشِ نظر قیامُ اللیل میں داخل ہیں، جن کو تراویح کا حکم دیتے ہوئے، یا تراویح کے تابع قرار دیتے ہوئے، باجماعت ادا کرنے کی جمہور فقہائے کرام کے نزدیک گنجائش ہے، لیکن بیس رکعات کے صحابۂ کرام سے تواتراً ثبوت کی وجہ سے ان کا درجہ تو عمومی ترغیب کے ساتھ سنت ہونے کا ہے، اور بیس سے زائد رکعات کا اس حیثیت سے ثبوت نہیں پایا جاتا، البتہ متعدد جلیل القدر تابعین اور مجتہدین سے ثبوت پایا جاتا ہے، جن کو اگرچہ عام سنت نہ کہا جائے، لیکن جواز کا انکار مشکل

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

ظاهر أحوال الناس كان فى عصر التابعين وأتباعهم الصلاح والصدق ، لما دل عليه حديث النبى صلى الله عليه وسلم ومن أجله كان يقول عمر بن الخطاب رضى الله عنه : " المسلمون عدول بعضهم على بعض ، إلا مجلودا حدا ، مجربا عليه شهادة ، أو ظنينا فى ولاء ، أو قرابة . "

وكان إبراهيم النخعي يقول : " المسلمون عدول (الفصول فى الاصول ،لابى بكر الجصاص، ج٣ص ١٤٦ ،١٤٧ ،الباب الحادى والثلاثون فى الأمر المطلق هل يقتضى التكرار، باب القول فى الخبر المرسل)

النبى صلى الله عليه و سلم أثنى على عصر التابعين وجعلهم خير القرون بعد قرن الصحابة رضى الله عنهم(جامع التحصيل فى أحكام المراسيل،لأبى سعيد بن خليل بن كيكلدى أبو سعيد العلائى، ص ٧٢،الباب الثالث فى ذكر الأدلة الدالة للأقوال المتقدمة)

وقول التابعي وان لم يكن حجة عندالجمهور ، ولكنه حجة عندنا معشر الحنفية على الاصح، اذاكان تابعيا كبيرا ظهرت فتواه فى زمن الصحابة(اعلاء السنن ج٢ ص ١٩٢ ، كتاب الصلاة، باب وضع اليدين تحت السرة وكيفية الوضع)

ہے، جیسا کہ استسقاء اور چاند گرہن کی نماز باجماعت کے متعلق تفصیلاً ذکر کیا گیا۔ [1]

تیسرے رمضان المبارک میں بیس سے زائد رکعات تراویح کے باجماعت ادا کرنے پر، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب سے صراحتاً کراہت کا حکم منقول نہیں، البتہ بعد کے متعدد مشائخِ حنفیہ نے اس کی کراہت کو مطلق تطوع کے اصولی حکم پر تخریج کیا ہے، اور اس طرح کی تخریج کا حکم اصحابِ مذہب سے منقول تصریح سے اہون ہوا کرتا ہے، اور تخریج میں بھی اختلاف ممکن ہوا کرتا ہے، اسی وجہ سے بعض مشائخِ حنفیہ کا اس سے اختلاف ہے۔ [2]

جہاں تک حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی طرف سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود

---

[1] علامہ سید سلیمان ندوی صاحب رحمہ اللہ ''حیاتِ مالک'' میں فرماتے ہیں:

مدینہ کی فقہ کا بڑا حصہ امام مالک سے پہلے خود حضرت عمر کے زیرِ ریاست صحابہ کی مجلس میں اور ان کے نواسہ عمر بن عبدالعزیز کی زیرِ صدارت تابعین کی مجلس میں مرتب ہو چکا تھا۔

امام مالک کے فقہ وفتاویٰ کی بنیاد اسی فقہِ مدینہ پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوّٰی کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''امام مالک بنائے فقہ را بر حدیث آنحضرت نہادہ است کہ مسند باشد یا مرسلِ ثقاۃ، بعد ازاں بر قضایائے عمر و بعد ازاں بر فتوای ابن عمر و بعد ازاں بر فتاوائے سائر صحابہ و فقہائے مدینہ، سعید بن مسیّب و عروہ بن زبیر، قاسم و سالم، و سلیمان بن یسار، و ابوسلمہ و ابوبکر بن عبدالرحمان و ابوبکر بن عمر، و عمر بن عبدالعزیز''

موطا کی طرزِ استدلال اور احادیث وآثار کا جس نے بغور ودقت مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا کہ امام مالک کی فقہ وفتاویٰ کی بھی بنیاد واصول ہیں، اور انہیں اصول پر امام مالک فتاوائے فقہیہ کا جواب دیتے تھے (حیاتِ مالک، ص ۴۶، مطبوعہ: مطبع معارف، اعظم گڑھ، طبع دوم 1340ھ، 1917ء)

[2] لعلک تتفطن من هذا البحث انه ليس كل ما في الفتاوىٰ المعتبرة المختلطة: كالخلاصة، والظهيرية، و فتاوىٰ قاضيخان، وغيرها من الفتاوىٰ التي لم يميز اصحابها بين المذهب والتخريج وغيره قول ابي حنيفة و صاحبيه، بل منها ما هو منقول عنهم، و منها ماهو مستنبط الفقهاء، و منها ماهو مخرج الفقهاء، فيجب على الناظر فيها ان لا يتجاسر على نسبة كل ما فيها اليهم، بل يميز بين ماهو قولهم وما هو مخرج من بعدهم، ومن لم يتميز بين ذلک وبين هذا اشكل الامر عليه، الا ترىٰ في مسئلة العشر في العشر في بحث الحياض، فان الفتاوىٰ مملوئة من اعتبارة والفتوىٰ عليه، مع انه ليس مذهب صاحب المذهب، انما مذهبه كما صرح به محمد في "المؤطا" وقدماء اصحابنا هو: انه لو كان الحوض بحيث لا يتحرک احد جوانبه بتحريک الجانب الآخر لا يتنجس بوقوع النجاسة فيه، و الا يتنجس، و من لم يتقنه وظن انه مذهب صاحب المذهب تعسر عليه الامر في تاصيله على اصل شرعي معتمد عليه، و قد حققت هذا البحث بما لامزيد عليه، في " شرح شرح الوقاية" فليراجع (النافع الكبير شرح الجامع الصغير"، صفحة ٢٠، مقدمة ،الفصل الاول،مطبوعة:ادارة القرآن والعلوم الاسلامية، كراتشي)

الحسن اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہما اللہ کے پیش کردہ تعامل کا تعلق ہے، تو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

رہا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہٗ العزیز کا عمل، تو حضرت حاجی صاحب رحمۃُ اللہ علیہ کا عمل تو معلوم نہیں، البتہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے متعلق اتنی بات یقین کے درجہ میں معلوم ہے کہ آپ نے شروع میں تہجد کی جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ایک دو افراد کے ساتھ کی ہے، لیکن بعد میں جب لوگ زیادہ آنے لگے، تو اسی کراہت کی وجہ سے آپ نے ساری رات تراویح کا معمول بنالیا تھا، عموماً آٹھ دس پارے تراویح میں جماعت سے پڑھے جاتے تھے، اور تراویح ہی سحری کے وقت ختم کی جاتی تھی، جس کے شاہد دیوبند میں آج بھی سینکڑوں حضرات ہوں گے۔ **واللہ أعلم بحقیقۃ الحال** (فقہی مقالات، جلد دوم، صفحہ ۵۵، بعنوان: رمضان میں نفل کی جماعت، مطبوعہ: میمن اسلام پبلشرز، کراچی، تاریخِ اشاعت: جولائی 1996ء)

مگر اس سلسلہ میں عرض ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے اپنا مشاہدہ بیان فرمایا ہے، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ نے بھی فضائلِ رمضان میں اس کا ذکر فرمایا ہے، جس میں تراویح سے فارغ ہو کر پھر نوافل کی جماعت اور اس میں الگ سے قرآن مجید کی قرائت کا ذکر فرمایا ہے، اس لیے حضرت مدنی رحمہ اللہ نے اپنے مشاہدہ میں جو کچھ دیکھا، انہوں نے اس کو ہی نقل فرمایا، اور وہ اسی کے مکلّف ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی طرف سے قیامِ رمضان کی پیش کردہ تشریح کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

قیامِ رمضان کا لفظ لغوی اعتبار سے تو بے شک عام ہے، مگر عرفِ عام، فقہاء اور عام محدثین کا یہ ہے کہ اس کو صرف تراویح میں خاص کرتے ہیں (فقہی مقالات، جلد دوم، صفحہ ۴۸، بعنوان: رمضان میں نفل کی جماعت، مطبوعہ: میمن اسلام پبلشرز، کراچی)

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اگرچہ متعدد حضرات نے قیامِ رمضان کو تراویح کے ساتھ خاص رکھا ہے، لیکن بعض حضرات نے اس کو عام بھی رکھا ہے، اور مطلق تطوع کی جماعت سے ''قیامِ رمضان'' اور ''تطوعِ رمضان، تنفلِ رمضان'' وغیرہ کے الفاظ سے رمضان کی راتوں کی تطوعات میں جماعت کو مستثنیٰ کیا ہے۔ [1]

اس قسم کے الفاظ اصولی اعتبار سے رمضان کی راتوں میں ''تراویح کی بیس اور اس سے زائد رکعات'' اور مطلق نوافل سب کو شامل ہونے کا احتمال رکھتے ہیں، جس طرح صرف تراویح اور بیس تراویح مراد ہونے کا احتمال بھی رکھتے ہیں۔ [2]

---

[1] ولا يصلى نافلة فى جماعة إلا قيام رمضان(تحفة الفقهاء للسمرقندى، ج ا ص ۱۶۵ ، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

الجماعة فى النفل فى غير رمضان مكروه(فتح القدير ، ج ا ص ۴۷۰، كتاب الصلاة، باب ادراک الفريضة)

كراهة النفل بجماعة خارج رمضان إنما هو إذا كان الإمام والقوم متنفلين(فتح القدير ، ج ا ص ۴۷۳، كتاب الصلاة، باب ادراک الفريضة)

الجماعة فى التطوع ليست بسنة إلا فى قيام رمضان(ردالمحتار، ج۲ص ۴۸، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل)

التنفل بجماعة مكروه خارج رمضان(ردالمحتار، ج۲ص ۵۳، كتاب الصلاة، باب ادراک الفريضة)

ولا يصلى تطوع بجماعة إلا قيام رمضان فقد استثنى عن النهى قيام رمضان، وكما أن قيام رمضان مستثنى عن النهى فصلاة الكسوف يجوز أداؤها بالجماعة مع أنها تطوع (المحيط البرهانى، ج ا ص ۴۳۸، كتاب الصلاة، الفصل العشرون فى صلاة التطوع)

أدى النفل بجماعة خارج رمضان مكروه(المحيط البرهانى، ج ا ص ۴۵۲، كتاب الصلاة، الفصل الحادى والعشرون فى التطوع قبل الفرض وبعده وفواته عن وقته وتركه بعذر وبغير عذر)

الأصل فى التطوعات ترک الجماعة فيها ما خلا قيام رمضان لاتفاق الصحابة عليه(المحيط البرهانى، ج۲ص ۱۳۸ ، كتاب الصلاة،الفصل التاسع والعشرون فى صلاة الكسوف)

[2] التطوع :اسم لما شرع زيادة على الفرض والواجب وهو فرد من أفراد التبرع، فالتبرع قد يكون واجبا، وقد لا يكون واجبا، ويكون التطوع أيضا فى العبادات، وهى النوافل كلها الزائدة عن الفروض والواجبات(الموسوعة الفقهية الكويتية،ج ۱۰ ،ص ۶۵،مادة "تبرع")

التطوع على وجهين :سنة مؤكدة وهى الرواتب .وغير مؤكدة وهى ما زاد عليها(ردالمحتار، ج۲ص ۶۰ ، كتاب الصلاة، باب ادراک الفريضة)

وقد يطلق النفل على ما يشمل السنن الرواتب، ومنه قوله :باب الوتر والنوافل، ومنه تسمية الحج نافلة لأن النفل الزيادة، وهو زائد على الفرض مع أنه من شعائر الدين العامة(ردالمحتار، ج ا ص ۱۰۳ ، كتاب الطهارة، سنن الوضوء)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے اپنے اجتہاد سے عموم کو ترجیح دی ہے، لہٰذا جو مشائخ اس کو تراویح اور اس سے بڑھ کر بیس تراویح کے عدد کے ساتھ خاص کرتے ہیں، ان کا قول حضرت مدنی رحمہ اللہ کے اجتہاد پر حجت نہیں۔

دوسرے اگر تراویح کے ساتھ خاص رکھا جائے، تب بھی بیس رکعات تراویح سے زائد یعنی چھتیس یا چالیس رکعات تک پر بعض فقہائے کرام تراویح کا اطلاق مانتے ہیں، جن میں امام مالک اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ سرفہرست ہیں، اور دوسرے دو مجتہدین یعنی امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ بھی بحیثیتِ تراویح یا تطوع کے اس پر عمل کی گنجائش کے قائل ہیں، اور یہ سب گنجائش باجماعت ادا کرنے کی صورت میں ہے، حرمین میں صدیوں سے اسی پر عمل بھی ہے، جس کو حضرت مدنی رحمہ اللہ دلیل وتائید کے طور پر پیش کرتے ہیں، لہٰذا حضرت مدنی رحمہ اللہ اپنے اجتہاد میں حق بجانب ہیں، اگر کوئی ان کے مقابلہ میں متعدد مشائخِ حنفیہ کے کراہت والے قول کو قابلِ حجت سمجھتا ہے، تو جس طرح اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اسی طرح دوسرے مجتہدین وفقہائے کرام کے قول کو اپنے اجتہاد میں ترجیح دینے والے پر بھی کوئی الزام نہیں، کیونکہ یہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ ''بعض فقہاء کا قول بعض پر حجت نہیں ہوا کرتا''

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

اور اقوال بعض فقہاء کے بعض پر حجت نہیں ہو سکتے (امداد الفتاویٰ، ج۵، ص۱۵۲، کتاب السلوک، مطبوعہ: دار العلوم کراچی، تاریخِ طبع: ۱۴۰۹ ہجری)

اور جب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا اجتہاد اصولی اعتبار سے درست ہوا اور اس کی تائید بعض مجتہد فقہائے کرام کے قول اور بعض اکابر کے تعامل سے بھی ہو رہی ہو، تو ان پر تفرد یا شذوذ کا الزام بھی عائد نہیں ہونا چاہیے۔

آج کل ہمارے تنگ علمی ماحول میں اولاً تو کسی کی طرف سے جزوی اجتہاد کو بھی گوارا نہیں کیا جاتا، اور اگر کوئی جزوی اجتہاد کرتا بھی ہے، تو اس جزوی مجتہد کی طرف سے معروف اور روایتی

قول کے خلاف رائے سامنے آنے پر اس کی تردید کی کوشش کی جاتی ہے، اور جب تک اس کی ہر پہلو اور ہر سطح پر تردید نہیں کردی جاتی، اس وقت تک کام کو مکمل نہیں سمجھا جاتا، جو ہمارے یہاں تشدد و جمود کی اچھی مثال یا اچھی روایت نہیں۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مالکیہ وغیرہ تو بیس سے زائد یعنی چھتیس یا چالیس رکعات تک کو بحیثیتِ تراویح مشروع قرار دیتے ہیں، مگر حضرت مدنی رحمہ اللہ اس کے بجائے بحیثیتِ تہجد بیس سے زائد رکعات کو جائز کہہ رہے ہیں، لہٰذا حضرت مدنی رحمہ اللہ کا موقف مالکیہ وغیرہ سے مختلف ہوا۔

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ تراویح خود تطوع میں داخل ہیں، اور حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ تطوع کی نیت سے بھی تراویح جائز ہیں، البتہ شافعیہ اور حنابلہ اور بعض حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے۔

چنانچہ شافعیہ اور بعض حنفیہ اور حنابلہ کے مذہب کے مطابق نمازِ تراویح کے لیے نیت کی تعیین شرط ہے، لہٰذا اس قول کے مطابق تراویح کی نماز مطلق نیت کے ساتھ صحیح نہیں ہے، بلکہ قیامِ رمضان یا تراویح کی نیت کرنا ضروری ہے۔ [1]

---

[1] تعيين النية فى صلاة التراويح:

ذهب الشافعية وبعض الحنفية، وهو المذهب عند الحنابلة إلى اشتراط تعيين النية فى التراويح، فلا تصح التراويح بنية مطلقة، بل ينوى صلاة ركعتين من قيام رمضان أو من التراويح لحديث :إنما الأعمال بالنيات وليتميز إحرامه بهما عن غيره.

وعلل الحنفية القائلون بذلك قولهم بأن التراويح سنة، والسنة عندهم لا تتأدى بنية مطلق الصلاة أو نية التطوع، واستدلوا بما روى الحسن عن أبى حنيفة أنه :لا تتأدى ركعتا الفجر إلا بنية السنة.

لكنهم اختلفوا فى تجديد النية لكل ركعتين من التراويح، قال ابن عابدين فى الخلاصة :الصحيح نعم؛ لأنه صلاة على حدة، وفى الخانية :الأصح لا، فإن الكل بمنزلة صلاة واحدة، ثم قال ويظهر لى (ترجيح) التصحيح الأول؛ لأنه بالسلام خرج من الصلاة حقيقة، فلا بد من دخوله فيها بالنية، ولا شك أنه الأحوط خروجا من الخلاف.

وقال عامة مشايخ الحنفية :إن التراويح وسائر السنن تتأدى بنية مطلقة؛ لأنها وإن كانت سنة لا تخرج عن كونها نافلة، والنوافل تتأدى بمطلق النية، إلا أن الاحتياط أن ينوى التراويح أو سنة

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

لیکن اکثر اور عام متاخرین مشائخِ حنفیہ کے نزدیک تراویح کی نماز مطلق نیت کے ساتھ بھی درست ہوجاتی ہے، کیونکہ وہ اگرچہ سنت ہے، لیکن وہ تطوع اور نوافل سے خارج نہیں ہے، اور نوافل مطلق نیت کے ساتھ درست ہوجاتے ہیں، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ تراویح کی نیت کی جائے یا سنتِ وقت کی نیت کی جائے یا قیامِ رمضان کی نیت کی جائے، تاکہ اختلافی مسئلہ میں احتیاط پر عمل ہوجائے۔ [1]

نیز شافعیہ وحنابلہ بحیثیتِ تطوع کے بھی جواز کی تصریح فرمارہے ہیں، اور بعض فقہاء قیامِ لیل کے مفہوم میں داخل مان رہے ہیں، لہٰذا حضرت مدنی رحمہ اللہ کا استدلال بے بنیاد نہ ہوا۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الوقت أو قيام رمضان احترازا عن موضع الخلاف.

وذهب الحنابلة إلى أنه يندب في كل ركعتين من التراويح أن ينوي فيقول سرا :أصلي ركعتين من التراويح المسنونة أو من قيام رمضان(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٢٧ص ١٤٠، ١٤١، مادة "صلاة التراويح")

[1] نوع آخر في نية التراويح:إذا نوى التراويح أو سنة الليل (أو) الوقت، أو قيام الليل في النيتين يجوز وصار كما إذا نوى الظهر أو فرض الوقت، فإنه يجوز وإن نوى صلاة مطلقة، أو نوى تطوعا فحسب، اختلف المشايخ فيه، ذكر بعض المتقدمين أنه لا يجوز؛ لأنها سنة والسنة لا تتأدى بنية التطوع أو بنية الصلاة المطلقة روى الحسن عن أبي حنيفة رحمة الله عليهما ذلك في ركعتي الفجر، أو يقول :هذه الصلاة مخصوصة كالمكتوبات، فلا تتأدى بمطلق النية ولا بنية التطوع كالمكتوبات، وأكثر المتأخرين على أن التراويح وسائر السنن تتأدى بمطلق النية، لأنها نافلة لكن واظب عليها رسول الله صلى الله عليه وسلم والنوافل تتأدى بمطلق النية، والاحتياط في التراويح أن ينوي التراويح، أو بنية الوقت أو قيام الليل، وفي سائر السنن الاحتياط أن ينوي الصلاة متابعا لرسول الله عليه السلام(المحيط البرهاني في الفقه النعماني،ج ١،ص ٤٥٩،كتاب الصلاة،الفصل الثالث عشر في التراويح والوتر)

ومنها نية التراويح أو نية قيام رمضان، أو نية سنة الوقت.

ولو نوى الصلاة مطلقا، أو نوى التطوع، قال بعض المشايخ :لا يجوز؛ لأنها سنة والسنة لا تتأدى بنية مطلق الصلاة، أو نية التطوع واستدلوا بما روى الحسن عن أبي حنيفة أن ركعتي الفجر لا تتأدى إلا بنية السنة، وقال عامة مشايخنا :إن التراويح وسائر السنن تتأدى بمطلق النية؛ ولأنها وإن كانت سنة لا تخرج عن كونها نافلة، والنوافل تتأدى بمطلق النية إلا أن الاحتياط أن ينوي التراويح، أو سنة الوقت، أو قيام رمضان احترازا عن موضع الخلاف(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،ج ١،ص٢٨٨،كتاب الصلاة،فصل في سنن صلاة التراويح)

اس بحث کا خلاصہ

مذکورہ بالا تمام تر تفصیل کے بعد ہم رمضان المبارک میں تراویح کی بیس رکعات کو تو سنت قرار دیتے ہیں، اور ان کو مواظبت و پابندی کے ساتھ عمومی حیثیت وترغیبِ عام کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کے قائل ہیں، اور بیس سے زیادہ رکعات مثلاً سولہ یا بیس مزید رکعات کو باجماعت پڑھنا فی نفسہٖ ممنوع یا حرام قرار نہیں دیتے، جب تک کوئی دوسری خرابی شامل نہ ہو، بلکہ اس کو مباح وجائز زمرہ میں داخل مانتے ہیں، جیسا کہ چاند گرہن اور نمازِ استسقاء کے سلسلہ میں بھی متعدد حنفیہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کی یہی توجیہ بیان فرمائی ہے، اور علامہ شامی رحمہ اللہ وغیرہ کا نوافل کے سلسلہ میں یہ قول بھی مطلق نوافل کی جماعت کے ضمن میں گزر چکا ہے کہ سنت کی نفی کراہیت کو مستلزم نہیں، بلکہ جواز کو بھی شامل ہوسکتی ہے، لیکن بیس رکعات کی طرح عمومی اہتمام وترغیب کے ساتھ پڑھنے سے ان کے سنت ہونے کا اشتباہ ہوتا ہے، جبکہ رمضان المبارک میں تراویح کی بیس رکعات کے سنت ہونے کے دلائل قوی و مستحکم ہیں، جس کی تفصیل ہم دوسری تالیف میں بیان کرچکے ہیں۔

جس کے پیشِ نظر رمضان میں بیس رکعات تراویح سے زائد رکعات کو باجماعت ادا کرنے کے جواز کے لیے یہ قید ملحوظ رکھنا مناسب ہے کہ بیس سے زائد رکعات کو بیس تراویح کی حیثیت سے مجمع عام میں نہ پڑھا جائے، بلکہ ان کو تراویح سے الگ اور ممتاز کر کے صرف شوق وذوق رکھنے والے افراد تک محدود رکھا جائے، جو بصدق واخلاص مزید تلاوت وقیام کرنا چاہتے ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

خلاصۂ کلام

شروع سے اب تک جو تفصیل ذکر کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مخصوص سنن ونوافل (مثلاً تراویح، گرہن وغیرہ) کے علاوہ عام نوافل کو باجماعت ادا کرنے کے سلسلہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، شافعیہ کے نزدیک نوافل کو جماعت سے ادا کرنا بلاکراہت جائز ہے، خواہ تداعی واجتماع کا اہتمام ہو یا نہ ہو۔

اور حنابلہ کے نزدیک بھی نوافل کو باجماعت ادا کرنا جائز ہے، البتہ بعض حنابلہ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ اسے دائماً ومواظبتاً نہ پڑھا جائے۔

اور مالکیہ کے نزدیک نوافل وتطوعات کے لیے اس شرط کے ساتھ اجتماع جائز ہے کہ جماعت کثیر نہ ہو، یا مشہور مقام میں نہ ہو، ورنہ مکروہ ہے۔

اور حنفیہ کے نزدیک نوافل کا جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے، جبکہ تداعی کے ساتھ ہو، جس کی تفسیر بعض حضرات نے اہتمام ومواظبت سے، اور بعض نے اس سے کی ہے کہ چار آدمی، یا اس سے زیادہ جماعت میں شریک ہوں۔

مذکورہ حکم تو عام دنوں میں نوافل کی جماعت کے متعلق تھا۔

جہاں تک رمضان میں تراویح کی بیس سے زیادہ رکعات کو باجماعت پڑھنے کا تعلق ہے، تو مالکیہ کے نزدیک بیس تراویح سمیت چھتیس رکعات اور دوسرے قول کے مطابق نیز امام اسحاق بن راہویہ کے نزدیک چالیس رکعات تک باجماعت پڑھنا سنت ومستحب یا کم از کم جائز ہے، اور حنابلہ اور شافعیہ بھی اہلِ مدینہ کی تخصیص یا عدمِ تخصیص کے اقوال کے ساتھ اس کے جواز سے متفق ہیں، حنابلہ وشافعیہ وغیرہ کے نزدیک تراویح کے بعد مزید نوافل باجماعت پڑھنا بھی مکروہ نہیں، بیس تراویح کے بعد قیامُ اللیل کے عنوان سے رات کے آخری حصہ میں باجماعت نوافل کا حرمین میں صدیوں سے معمول ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے

اصحاب سے بیس تراویح سے زائد کے باجماعت مکروہ ہونے کی تصریح منقول نہیں، البتہ متعدد مشائخِ حنفیہ بیس سے زائد رکعات کے باجماعت پڑھنے کو عام نوافل کی جماعت پر قیاس کرتے ہوئے غیر مستحب ومکروہ قرار دیتے ہیں، جس کے مکروہ تنزیہی ہونے کا بھی احتمال ہے، اور مکروہ تحریمی ہونے کا بھی، متعدد مشائخِ دیوبند نے اس سے مکروہ تحریمی ہونا مراد لیا ہے، جبکہ بعض نے اس سے اختلاف کیا ہے، دلائل وقرائن سے اس کے مکروہ تحریمی ہونے کا پہلو ہمیں راجح معلوم نہ ہوا، بلکہ بیس سے زائد مزید سولہ یا بیس رکعات تک باجماعت ادا کرنے کا مسنون نہ ہونا، اور جائز ومباح یا زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ ہونا معلوم ہوا، جب تک اس میں کوئی دوسری خرابی ومنکر شامل نہ ہو، جس میں ایک خرابی ہمارے نزدیک بیس رکعات مسنون کے ساتھ اشتباہ والتباس ہے، جس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ بیس تراویح کو تو مجمعِ عام اور ترغیبِ عام کے ساتھ مواظبتاً ادا کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے، لیکن بیس رکعات تراویح سے زائد سولہ یا بیس رکعات تک کو بیس تراویح کی حیثیت سے مجمع عام میں بیس تراویح کی طرح اہتمام ومواظبت سے نہ پڑھنا چاہیے، بلکہ ان کو بیس رکعات تراویح سے الگ تھلگ صرف شوق وذوق رکھنے والے افراد تک محدود رکھا جائے، جو بصدق واخلاص مزید تلاوت وقیام کرنا چاہتے ہیں۔

اور اگر امام تراویح پڑھا رہا ہو، اور بعض یا سب مقتدی نوافل پڑھ رہے ہوں، تو یہ صورت جمہور فقہائے کرام سمیت مشائخِ حنفیہ کے نزدیک بھی جائز ہے، اور بعض اردو فتاویٰ میں اس صورت کو جو ناجائز قرار دیا گیا ہے، اس کی طرف ہمارا رجحان نہیں ہوسکا۔

اور مذکورہ تفصیل کے پیشِ نظر ہمارے نزدیک حرمین شریفین میں رمضان کے آخری عشرہ میں، قیامُ اللیل کی نماز میں شرکت کا جواز راجح ہے۔

ملحوظہ:

یہ ملحوظ رہے کہ مذکورہ حکم فی نفسہٖ تطوع کی جماعت اور رمضان المبارک میں بیس سے زائد

رکعات کو باجماعت ادا کرنے کے متعلق ہے، اگر ریاکاری، ایذارسانی، اسراف اور فضول خرچی وغیرہ جیسے منکرات ومفاسد شامل ہوں، تو پھر اس کا حکم مختلف ہوگا۔

اور متعدد حنفیہ ومشائخ جو بیس رکعات تراویح سے زائد باجماعت ادا کرنے کو مکروہ تحریمی یا حرام قرار دیتے ہیں، وہ ہمارے نزدیک انتہائی قابلِ احترام ہیں، لیکن کسی کے قابلِ احترام اور اپنے اکابر میں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی ہر رائے سے اتفاق کیا جائے، اختلافِ رائے کے باوجود احترامِ رائے واحترامِ شخصیات کا سلسلہ ہماری تاریخ میں بھرا پڑا ہے، بلکہ احترام کے ساتھ اختلاف بھی ان ہی حضرات کا علمی ومعنوی فیض ہوتا ہے، جس کے متعلق کچھ تصریحات اس مضمون میں ذکر کی جاچکی ہیں۔

فقط

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَتَمُّ وَاَحْکَمُ.

محمد رضوان خان

01/صفر المظفر/1439ھ 22/اکتوبر/2017ء بروز اتوار

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

(رائے گرامی)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

(نائب صدر وشیخ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی)

بندہ محمد رضوان نے مذکورہ مضمون کا ابتدائی مسودہ مرتب کر کے حضرت شیخ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی رائے عالی حاصل کرنے کے لیے ارسال کیا، اگرچہ حضرت مفتی صاحب موصوف کی گوناگوں مصروفیات اور کثرتِ اسفار کے باعث اس طرح کسی مفصل مضمون پر نظرِ ثانی کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے بندہ عموماً حضرت کو اپنے مضامین پر نظرِ ثانی کی زحمت دینے سے گریز کرتا ہے، لیکن چونکہ زیرِ بحث موضوع پر حضرت موصوف نے بھی تحقیق فرمائی تھی، جس کا بندہ کے مضمون میں بھی ذکر ہے، اس لیے اس مضمون کے مسودہ کو حضرت کی خدمت میں ارسال کرنا ضروری خیال کیا۔

حضرت کی طرف سے اس کا جواب موصول ہونے کے انتظار میں کچھ تاخیر ہوگئی، تقریباً آٹھ ماہ بعد یہ جواب موصول ہوا، اب حضرت کی طرف سے جو رائے عالی موصول ہوئی، اس کو ذیل میں نقل کیا جارہا ہے۔

خیال تھا کہ حضرت والا کے اس مکتوب گرامی کے بعد حضرت کی خدمت میں مزید چند معروضات پیش کروں، لیکن شاید اس کی وجہ سے مزید غیر معمولی تاخیر ہوجائے، اس لیے بندہ نے اختصار کے ساتھ اپنی معروضات حضرت والا کے مکتوب کے ذیل میں حواشی کے اندر ہی ذکر کردی ہیں۔ اب حضرت والا کا وہ مکتوبِ گرامی ملاحظہ فرمایئے، جو بندہ کے مذکورہ مضمون کے متعلق موصول ہوا، ساتھ ہی بندہ محمد رضوان کی طرف سے حواشی میں متعلقہ معروضات بھی ملاحظہ فرمایئے۔ محمد رضوان۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم بندہ جناب مولانا مفتی محمد رضوان صاحب حفظکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

قیامِ رمضان کے بارے میں آپ کے رسالے کا مسودہ عرصۂ دراز سے میرے پاس ہے،

آپ نے اس کے بارے میں بندہ کی رائے معلوم کی تھی، مگر ہجومِ اسفار واشغال نے اطمینان سے دیکھنے کی مہلت نہ دی، اب عید الاضحیٰ کی تعطیلات میں بہت سے منتظر کاموں کو نمٹانے کی نوبت آئی، تو یہ رسالہ بھی دیکھا۔

دیکھنے کے بعد بھی یہ بات مشتبہ رہی کہ آپ کا نقطۂ نظر تراویح کے علاوہ نوافل کی جماعت کے اہتمام کے بارے میں کیا ہے؟ [۱]

اگر مقصد یہ ہے کہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے، اور جو حضرات شافعیہ یا حنابلہ کے قول کو راجح سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، تو وہ قابلِ نکیر نہیں، تو یہ بات فی الجملہ درست ہے۔ [۲]

---

[۱] بندہ محمد رضوان نے اپنی طرف سے اس مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر الگ الگ بحث وتحقیق کی کوشش کی تھی، ایک تو مطلقاً نوافل کو باجماعت پڑھنے کے مسئلہ پر، دوسرے ماہِ رمضان میں بیس رکعات سے زائد چالیس رکعات تک باجماعت پڑھنے کے مسئلہ پر۔

اور بندہ کے نزدیک رمضان میں چالیس رکعات تک تراویح کے چونکہ مالکیہ قائل ہیں اور یہ خیر القرون کے دور میں مدینہ منورہ میں معمول بھا رہی ہیں۔ اس لئے اس کو مکروہِ تحریمی قرار دینے کی طرف بندہ کا رجحان نہ ہوسکا، جس کو بندہ نے اپنے مضمون میں واضح طور پر لکھنے کی کوشش کی ہے، خلاصہ میں بھی اس کا ذکر ہے، اور بندہ کو اس کے مکروہِ تحریمی قرار دینے سے اتفاق نہ ہوسکا۔ نہ ہی اس پر کراہتِ تحریمی کی دلیل کا منطبق ہونا واضح ہوا۔

بندہ نے کراہتِ تحریمی وتنزیہی کے ثبوت سے متعلق تفصیلی بحث اپنے ایک دوسرے مضمون میں ذکر کردی ہے۔

محمد رضوان

[۲] اس مسئلہ کا مجتہد فیہا ہونا تو واضح ہے، اور مجتہد فیہا مسائل کے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جس مسئلہ میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو، اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی، کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن وسنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے، اس لیے دونوں جانبین داخل معروف ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جاسکتا ہے، اس لیے ان مسائل مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک منکر ہے، یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز وعدم جواز اور حرمت وحلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو، جیسے منکرات پر کی جاتی ہے، یا ایک دوسرے کو یا اس کے متبعین کو گمراہی یا فسق وفجور کی طرف منسوب کرتا ہو، یا اس کو ترک وظیفہ یا ارتکاب حرام کا مجرم قرار دیتا ہو، حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

لیکن اگر مقصد یہ ہے کہ فقہِ حنفی کی رُو سے نوافل کی جماعت رمضان میں بلا کراہت جائز ہے، تو اس کا کوئی ثبوت آپ کے رسالہ میں کہیں نہیں ملا۔ [1]

بندہ کے رسالے میں ساری بحث، فقہِ حنفی کی بنیاد پر ہے۔

دوسرے مذاہب سے اس میں تعرض نہیں کیا گیا۔

جیسا کہ عموماً ہمارے فتاویٰ میں فقہ حنفی ہی کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ [2]

《گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ》 اس پر شاہد ہے، جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ یعنی اس کو خطاوار مجرم کہنا جائز نہیں (جواہر الفقہ، جلد اول، ص ۴۰۸، ۴۰۹، مضمون ''وحدتِ امت''، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ 1431ھ، نومبر 2010ء)''

بندہ نے اس طرح کی کئی عبارات اپنی دوسری تالیف ''اجتہادی اختلاف اور باہمی تعصب'' میں نقل کردی ہیں، جن سے مندرجہ بالا موقف کی تائید اور موجودہ دور کے ان جامد و متشدد مقلدین کی تردید ہوتی ہے، جو اس قسم کے اجتہادی مسائل میں صرف اپنے مسلک کی کوئی کراہت لازم آنے پر نکیر کرتے ہیں، اور سب لوگوں کو اپنے فتوے کا مکلّف و پابند ہونا ضروری سمجھتے ہیں، یا عامۃ الناس کے لیے بھی کسی مخصوص مذہب، یا شخصی امام کی تقلید کو ضروری قرار دیتے ہیں، جبکہ فقہائے کرام نے خود ''**العامی لا مذهب لهٗ**'' فرما کر اس کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ محمد رضوان۔

[1] بندہ کو ماہِ رمضان میں بیس رکعات سے زائد کے مکروہِ تحریمی ہونے کی کوئی شرعی وفقہی مستند دلیل نہیں ملی۔

ظاہر ہے کہ پہلے کسی چیز کا مکروہِ تحریمی ہونا دلیل سے ثابت ہو، تبھی اس کے جواب کی ضرورت ہوگی اور بندے نے اس سلسلہ میں اپنا موقف رسالہ کے خلاصۂ کلام میں بھی آخر میں ذکر کر دیا ہے، جس میں بندہ نے تحریر کیا ہے کہ:

''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب سے بیس تراویح سے زائد کے باجماعت مکروہ ہونے کی تصریح منقول نہیں، البتہ متعدد مشائخِ حنفیہ بیس سے زائد رکعات کے باجماعت پڑھنے کو عام نوافل کی جماعت پر قیاس کرتے ہوئے غیر مستحب و مکروہ قرار دیتے ہیں، جس کے مکروہ تنزیہی ہونے کا بھی احتمال ہے، اور مکروہ تحریمی ہونے کا بھی، متعدد مشائخِ دیوبند نے اس سے مکروہ تحریمی ہونا مراد لیا ہے، جبکہ بعض نے اس سے اختلاف کیا ہے، دلائل وقرائن سے اس کے مکروہ تحریمی ہونے کا پہلو ہمیں راجح معلوم نہ ہوا، بلکہ بیس سے زائد مزید سولہ یا بیس رکعات تک باجماعت ادا کرنے کا مسنون نہ ہونا، اور جائز ومباح یا زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ ہونا معلوم ہوا، جب تک اس میں کوئی دوسری خرابی ومنکر شامل نہ ہو'' الخ۔

اور بندہ نے اپنے مذکورہ موقف کے مستدلات اور اس سلسلہ میں حنفیہ کی متعدد عبارات اپنے مضمون میں ذکر کردی ہیں، اور اسی موقف پر بندہ کو ابھی تک شرح صدر ہے۔ محمد رضوان۔

[2] اگرچہ ایک عرصہ سے ہمارے یہاں کے فتاویٰ میں صرف فقہ حنفی کی بنیاد پر ہی حکم بیان کیا جاتا رہا ہے، لیکن اب جبکہ گلوبلائزیشن کا زمانہ آچکا ہے، اور اکثر ممالک میں دوسرے ممالک کے لوگوں کی آمد ورفت اور مختلف قسم کے تعلقات میں

《بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں》

اور جہاں رسالے میں یہ کہا گیا ہے کہ:

''اس بحث میں فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں''۔

تو اس سے مراد فقہاءِ حنفیہ ہیں۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

اضافہ ہو گیا ہے۔ بالخصوص ان مسائل میں، جن سے مختلف فقہ کے لوگوں کا مشترکہ واسطہ پڑ رہا ہو، جیسا کہ رمضان میں حرمین میں صلاۃ اللیل کا مسئلہ، کہ موجودہ زمانہ میں دنیا کے تمام اطراف واکناف سے مختلف فقہ سے منسلک افراد، حرمین شریفین میں ماہِ رمضان میں عمرہ واعتکاف وغیرہ کے لیے حاضر ہوتے ہیں، جہاں رات کے وقت میں قیام اللیل کے نام سے باجماعت نماز پڑھی جاتی ہے، اور وہاں پر موجود زائرین اس میں جوق در جوق شرکت کرتے ہیں، اور وہ اس نماز باجماعت میں شامل ہونے کے متعلق حکم بھی دریافت کرتے ہیں، اور اس میں شرکت کے مکروہِ تحریمی ہونے کا سن کر مختلف قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔

اس قسم کے مسائل میں بندہ محمد رضوان کے خیال میں حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہائے کرام کے اقوال کی تحقیق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بالاخص جب کسی مسئلہ کی مدلل انداز میں تحقیق کی جا رہی ہو۔

بندہ اس قسم کے مسائل میں دیگر فقہائے کرام کے اقوال کو واضح ومنقح کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے، جس کی مختلف جہات سے موجودہ زمانے میں ضرورت واہمیت پیدا ہو گئی ہے، اگرچہ بعض متشددین کو بندے کے اس طرزِ عمل سے اتفاق نہیں۔

محمد رضوان خان

[1] بندہ محمد رضوان کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی کی درجِ ذیل عبارات سے اس کے برخلاف مفہوم ہوا تھا:

(1)......تراویح، استسقاء اور کسوف کے علاوہ دوسری نفلوں کی جماعت اگر بالتداعی ہو، تو بہر صورت مکروہ تحریمی ہے، خواہ وہ نفلیں رمضان میں پڑھی جائیں، یا غیر رمضان میں، یہی مسلک عام فقہاء ومحدثین کا ہے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتویٰ اور تعامل رہا ہے (فقہی مقالات، جلد دوم، صفحہ ۴۱، بعنوان: رمضان میں نفل کی جماعت، مطبوعہ: میمن اسلامک پبلشرز، کراچی، تاریخ اشاعت: جولائی 1996ء)

(2)......رمضان کی کسی اور نفل مثلاً تہجد وغیرہ میں کہیں کسی سے جماعت منقول نہیں (ایضاً، صفحہ ۴۶)

(3)......اس بحث میں فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک جماعت صرف تراویح کی جائز ہے (ایضاً، صفحہ ۵۴، ۵۵)

حضرت مفتی صاحب موصوف کا پورا مضمون رمضان میں تراویح کے بعد نوافل کی جماعت سے متعلق ہے، حضرت مدنی اس کے جواز کے قائل تھے، اور حضرت مفتی صاحب موصوف نے حضرت مدنی کے جواب میں ہی یہ مضمون تحریر فرمایا ہے، جس میں حضرت مدنی کے موقف سے عدمِ توافق کا اظہار کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت مدنی کے پیش کردہ نکات پر تنقید کی گئی ہے۔

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

والسلام

بندہ

محمد تقی عثمانی

۱۵/۱۲/۱۴۳۹ھ

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

نیز فقہی مقالات کی مندرجہ بالا عبارات میں رمضان وغیر رمضان میں تداعی کے ساتھ نوافل کی جماعت کے مکروہ تحریمی ہونے کا مسلک عام فقہاء ومحدثین کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور سلفِ صالحین کے فتوے اور تعامل کا بھی اسی کے مطابق ہونا بیان کیا گیا ہے، اور تہجد وغیرہ میں کسی سے جماعت کا منقول نہ ہونا بیان کیا گیا ہے، اور اس بحث میں فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہ ہونا بیان کیا گیا ہے، اور سب کے نزدیک تراویح کی جماعت کے ساتھ جواز کے حصر کو ذکر کیا گیا ہے۔

اور سیاق وسباق سے بھی بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ تمام بحث، رمضان میں، بیس رکعات تراویح سے زائد کے لیے ہے۔

لیکن اب حضرت والا نے اپنے درج بالا مکتوب میں خود وضاحت فرمادی کہ جہاں انہوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

''اس بحث میں فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، تو اس سے مراد فقہاء حنفیہ ہیں''

مگر اوپر فقہی مقالات کی تیسری عبارت میں تو یہ الفاظ تحریر کیے گئے ہیں کہ:

''اس بحث میں فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں''

اور اس سے پہلی دو عبارات میں تداعی کے ساتھ نوافل کی جماعت کے مکروہ تحریمی ہونے کا مسلک عام فقہاء ومحدثین کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور سلفِ صالحین کے فتوے اور تعامل کا بھی اسی کے مطابق ہونا بیان کیا گیا ہے، اور تہجد وغیرہ میں کسی سے جماعت کا منقول نہ ہونا بیان کیا گیا ہے، اور پھر اس کے بعد اس بحث میں فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہ ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، جس سے عام قاری کو یہی تاثر ملتا ہے کہ شاید جمہور فقہاء ومحدثین کے نزدیک رمضان میں تراویح کی بیس رکعات سے زیادہ کا باجماعت پڑھنا مکروہ تحریمی ہو۔

جبکہ اس کے مکروہ تحریمی ہونے پر، حنفیہ کا بھی اتفاق ثابت نہ ہوسکا، چہ جائیکہ جمہور فقہاء ومحدثین کا اتفاق ثابت ہو۔

جب تک ان عبارات کے متن یا حواشی میں وضاحت نہیں کی جائے گی، اس وقت تک یہ شبہات ان عبارات سے بظاہر ناشی رہیں گے، اور ان کی وجہ سے دوسرے موقف پر، بعض لوگوں کی طرف سے نکیر کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔

اس لیے بندہ کو حضرت والا کے مکتوب میں بیان کردہ توجیہات پر شرح صدر نہ ہوسکا، اور حضرت والا کے مضمون میں ماہِ رمضان کے اندر، بیس رکعات تراویح سے زیادہ پر، اور عام دنوں میں استسقاء اور کسوف کے علاوہ دوسری نفلوں کی جماعت پر، تداعی کے ساتھ، بہرصورت کراہتِ تحریمی کا حکم لگانے، اور اس کراہتِ تحریمی کو عام فقہاء ومحدثین کا مسلک قرار دینے، اور اس میں فقہاء علیہم الرحمۃ کا کوئی اختلاف نہ ہونے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتویٰ اور تعامل ہونے کے موقف پر اطمینان نہ ہوا، اور تاحال بندہ کو اپنے موقف پر ہی اطمینان وشرح صدر ہے، جو مذکورہ مضمون میں تفصیل کے ساتھ بیان کردیا گیا۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔ محمد رضوان خان۔

علمی و تحقیقی رسائل
شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور ان کے متبعین، خواہ
وہ سعودیہ کے حکمران ہوں، یا اس سلسلے کے علمائے کرام یا پھر عوام، ان
کے بنیادی عقائدوافکار ایسے نہیں کہ جن کی بنا پر ان کو اسلام یا اہلُ السنۃ والجماعۃ سے
خارج قرار دے دیا جائے، بلکہ ان کے اصل عقائدوافکار اہلُ السنۃ والجماعۃ کے موافق ہیں، اور
جن فکری وعملی مسائل میں ان کا دوسروں اور بالخصوص مشائخِ دیوبند سے اختلاف ہے، وہ اجتہادی، و
فقہی اور فروعی نوعیت کا ہے، جس طرح کا اختلاف خود متکلمینِ اہل السنۃ والجماعۃ اور فقہاء ومجتہدین اور ان کے
متبعین کے درمیان ہے۔ البتہ ہر فرقہ وجماعت اور ہر سلسلہ میں کچھ ایسے لوگوں کا وجود ممکن ہے، جو افراط یا تفریط
کا شکار ہوگئے ہوں، حنفیہ کے نام اور نسبت سے بھی کئی اہلِ بدعت فرقے وجود میں آئے، اور اب بھی ہیں، لیکن ان
کی وجہ سے اصل مسلک اور صاحبِ مسلک کو غلط قرار نہیں دیا جاتا۔ اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق بہت سی
باتیں مخالفین ومعاندین کی طرف سے جھوٹی اور بہتان والزام تراشی پر مبنی پھیلائی گئیں، جن میں ان کو دائرہ اسلام
یا اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج، اور گستاخِ رسول وغیرہ کہا گیا، لیکن وہ باتیں بے بنیاد، بہتان والزام تراشیوں
پر مبنی ثابت ہوئیں، اگرچہ ان غلط فہمیوں میں دین دار لوگ بھی دوسروں کی باتوں سے متاثر ہوئے۔ اور
پھر ایک مہم کے طور پر توحید کے داعی اور سنت پر عمل کرنے اور شرک وبدعات سے روکنے والوں
سے نفرت پیدا کرنے کے لیے ''وھابیت'' کا لفظ ایجادواستعمال کیا گیا، جس سے
مسلمانوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلیں، جن کا حقیقت
سے تعلق نہ تھا۔ (صفحہ نمبر 479)